اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگارِ علامۂ فضیلت آب جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوںؔ مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: منصور احمد

فہرستِ مضامین

جلد ۱۸ — نمبر ۱

بابت ماہِ جولائی سنہ ۱۹۳۰ء

تصویر:- غربت محبت کے پر کاٹ رہی ہے۔

پھول کلیاں

پالوں اُن گئی گذری خوبصورتیوں کو، اُن امنگوں کو، اُن آرزوؤں کو لیکن اک نئے رنگ میں!
اپنے آپ کو اُن سے برتر نہ سمجھوں بلکہ اُن کو خود برتر و بہتر بنالوں اپنے آپ سے اور پھر اُن کا پیرو بنوں! ہیں!
آرزوئیں پیدا کروں اپنی زندگی میں رنگیں!
ارادے اُبھاروں اپنے دل میں مضبوط و مستحکم!
سپنے دیکھا کروں اپنے دنوں اور راتوں کو نت نئے!

وہ خواب جو مَیں نے دیکھا تھا بچپن میں،
وہ خواب جو میں نے دیکھا تھا جوانی میں،
اُسے اِس مضمحل عمر میں بھی پھر دیکھوں اور سمجھ لوں، جان پہچان لوں کہ
اضمحلال خیالات سے ہے نہ کہ زمانے سے!
زندگی تو نری جوانی ہی ہے اگر دل جوان ہے! اور
دنیا تو صرف خوبصورت ہی ہے اگر آنکھیں خوبصورت اور نگاہیں باریک بین ہوں!

نرے اصولوں کی پیروی نے زندگی کے چشمے کو بند کردیا خاک سے!
نرے علم نے، نری اُس کی معلومات نے اپنے مشاہدے اور تجربے کی دولتوں سے محروم کئے رکھا مدتوں!
نری عقل نے، نری اُس کی توجیہ و استنباط نے سچّی ذاتی معرفت کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے ہزاروں!
رسمی اخلاق کی خشک نصیحتوں نے رُوح کو پیاسا مار دیا۔
چشمہ دامنِ کوہ میں چھپا ہؤا تھا لیکن میری ہٹ دھرمی اُس سے دُور ہی دُور رہتی گئی!

میں سمجھا کہ میں نے سمجھ لیا حقیقت کو! ——— آہ غرور آہ نخوت!
میں نے جانا کہ میں حسین و قوی ہوگیا! ——— آہ خودنمائی و خودستائی!
میں علم سے عقل سے اور معرفت سے مخمور ہوگیا! ——— اور میرا نفس بے نُور اور حقیقت مجھ سے مستور ہوگئی!

ہاں! میں نے تجھ سے بے وفائی کی! مجھے معاف کر!

اے گذرے ہوئے میں نے تجھے قربان کردیا اپنے آنے والے کے قدموں پر اس حال میں کہ تیرا نام حسن اور تیرا کام ایثار ہی تھا!

اے محبت! اک نرم دل شفیق ماں کی طرح اپنے روٹھے ہوئے ضدی بچے کو پھر اپنی پیاری گود میں لے لے!

وفادار نہ بنوں؟ وفاداری بھولی ہوئی پھر یاد نہ کروں؟ زندگی نت نئی ضرور ہو لیکن کیا جدت مغائرت ہی ہو؟ کیوں کس لئے؟ کیا اصول دنیا کو ایک کارخانہ بنادیں؟ کیا غرض کیا معنی؟ اصولوں کو چھوڑ اور زندگی کا دامن پکڑ! تری عقل کے پیچھے نہ پڑ اور رُوکھے سُوکھے علم سے ذرا کنارہ ہی کر! ـــــ وقت قیمتی ہے اور زندگی کا بہاؤ تیز۔ گرداب کا سامنا ہے لیکن ان کا گھماؤ کشتی کے لئے پُرکیف و حیات بخش!

حال کی ہواؤں میں گذشتہ کا گیت گاؤں لیکن اس طرح کہ اس سے مستقبل کی ایک شاندار موسیقی مرتب ہو جائے!

پھیر لے مجھ سے منہ کو،
چیں بجبیں ہو جا میری بات پر،
غصے کے دو چار جملے بھی کہہ دے مجھ کو،
میں حاضر ہوں لیکن تو مجھے نہ ہی دیکھ،
مجھے اپنی نظرِ عنایت سے ابھی بچائے ہی رکھ اے دوست!

وہ باتیں نہیں نہ سہی
لیکن اے اس زمین و آسمان سے دُور کے دوست!
ابھی جب کہ زندگی باقی ہے باتیں اور بھی تو ہیں۔
میں بے وفا سہی بُرا سہی
لیکن آخر تیری محبت نرے اچھوں کے لئے بھی تو نہیں
اور اگر میرے دل کا پھول کچھ زیادہ خوشبودار نہیں تو
آخر یہ کس کے باغ کی پیداوار ہے اے چمن بند!

باغبان

جہاں نما

برقی سرزمین کی سیمابی عورتیں

انگلستان کی ایک معزز خاتون اخبار "گریفک" میں لکھتی ہیں:-

امریکا ایک برقی ملک ہے۔ اس کی فضا کے ذرّے ذرّے میں برق سمائی ہوئی ہے، وہاں برقی انسان رہتے ہیں اور بلاخوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ بجلی کا جتنا استعمال امریکا کی ریاستہائے متحدہ میں ہوتا ہے اتنا دنیا کے کسی خطّہ پر نہیں ہوتا۔

امریکا کی عورتیں ہم سے زیادہ طاقتور ہوتی ہیں۔ ان کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہؤا گویا وہ بیٹریاں ہیں جنہیں بے حساب اور لازوال طور پر بجلی کی طاقت سے بھر دیا گیا ہے اور ان کی رگوں میں خون کی بجائے پارہ دوڑتا پھرتا ہے۔ وہ کبھی تھکن محسوس نہیں کرتیں۔ ان کو ہاتھ لگاؤ تو ان میں سے شعلے نکلتے ہیں۔ ان کی گفتگو برقی چنگاریوں کا ایک سلسلہ ہوتا ہے۔

امریکا کی عورتوں میں ایک غیر معمولی دلکشی ہے اور اس دلکشی کا سب سے بڑا راز اُن کی طاقت اور قوت میں پوشیدہ ہے۔ زندہ دلی، علمیت اور ہر چیز سے دلچسپی لینا ان کی خصوصیّت ہے۔ جب تک وہ کسی موضوع یا کسی شخص کی تہ تک نہیں پہنچ جاتیں انہیں اطمینان نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ ہر چیز کی ماہیّت دریافت کرتی ہیں، ہر بات کا علم دریافت کرنے کی فکر میں رہتی ہیں اور کبھی تنگ نہیں آتیں۔ میرے ایک انگریز دوست نے مجھ سے کہا کہ مجھے ایک مرتبہ امریکن خواتین کے ساتھ کھانا کھانے کا اتفاق ہؤا۔ جب میں وہاں سے اٹھا تو مجھے اپنا آپ ایک چُوسے ہوئے سنگترے کی طرح معلوم ہونے لگا۔ انہوں نے میرے اُس علم کا قطرہ قطرہ نچوڑ لیا تھا جو میں نے عمر بھر میں حاصل کیا تھا۔

انہیں تقریروں سے بڑی دلچسپی ہے، اور امریکا کے سامعین سے زیادہ قدردان سامعین انسان کو دنیا میں نہیں مل سکتے۔ لیکن وہ مقرروں کو جاں بلب کر دیتے ہیں۔ جب وہ سمجھتے ہیں کہ تقریر اب ختم ہوگئی تو اُن میں سے ہر ایک فرداً فرداً مقرر سے ملنا چاہتا ہے اور اس طرح مقرر کو اپنے تمام سراہنے والوں کے لئے چھوٹی چھوٹی

تقریروں کا ایک اَور سلسلہ جاری کرنا پڑتا ہے۔

امریکن اپنی معاشرتی خرابیوں کی اصلاح اور اپنے بھائیوں کی امداد کے متعلق اپنے مطامحِ نظر اور اپنی کوششوں کے معاملہ میں بڑے سرگرم واقع ہوئے ہیں۔ تقریباً ہر مرفہ الحال عورت ایک پرائیویٹ سکرٹری رکھتی ہے جسے وہ ہر روز اپنی داد و دہش اور اپنی مصروفیات کے متعلق لاتعداد خطوط لکھواتی ہے۔

امریکن عورتوں کی جس بات سے میں بہت زیادہ متاثر ہوئی وہ اُن کی وضع داری ہے۔ میں نے جس عورت کو بھی دیکھا ——— خواہ وہ کسی طبقے سے تعلق رکھتی ہو ——— نہایت صاف اور شستہ حالت میں دیکھا۔ امیر عورتیں سر سے پیر تک نہایت نفیس لباس میں ملبوس ہوتی ہیں۔ اُن کے سنگار اور پوشاک کی ہر بات فردوسِ نظر ہوتی ہے۔

لیکن دوکانوں پر کام کرنے والی چھوٹی چھوٹی لڑکیوں نے بھی مجھ پر یہی اثر ڈالا۔ اُن کی صاف ستھری ٹانگیں بے شکن جرابوں میں ملفوف تھیں اور اُن کے پاؤں بے عیب جوتوں میں محفوظ تھے۔ اُن کے بال چمکدار، اُن کے ہاتھ پاکیزہ اور ان کے کپڑے بانکے اور خوش وضع تھے۔ نیویارک میں کوئی عورت بدوضع لباس پہنے نظر نہیں آتی۔

وہ اپنے گھروں کا انتظام نہایت اچھی طرح کرتی ہیں۔ اور اگرچہ وہاں محنت سے بچانے والی ایجادات نے اور مفت کی بجلی نے جو امیر غریب ہر ایک کو یکساں حاصل ہے ہزاروں سہولتیں بہم پہنچا دی ہیں، لیکن اس کے باوجود میرے خیال میں امریکن عورتیں بہترین خانہ دار ہیں۔ اُن کی نگرانی میں گھر کی مشینری نہایت امن سے جاری رہتی ہے، انجن کی کھٹ کھٹ آپ وہاں ہرگز نہ سنیں گے۔ وہ اکثر حد سے زیادہ مہماں نواز ہیں' اُن کی مدارات انسان کو قتل کر دیتی ہیں۔ یہاں میں اس کی دو مثالیں دیتی ہوں۔ پہلی مثال ایک خاتون مہمان کے لئے دانتوں کے برش، مختلف قسم کے منجن اور کئی قسم کے غازے مہیا کرنے کی ہے اور دوسری یہ کہ ایک تنک مزاج بوڑھے انگریز کے لئے نیویارک کے ایک سازندے کی خدمات اس غرض سے حاصل کی گئیں کہ جب مہمان غسل میں ہو تو وہ کلاسیکی موسیقی سے اس کی تواضع کیا کرے۔ کیا مہمان نوازی کی حد اس سے آگے بڑھ سکتی ہے؟

یہی نہیں بلکہ میزبان خاتون کی نظر ہر تفصیل پر ہوتی ہے جیسی کہ ہر خاتون کی ہونی چاہئے۔ مرد مہمانوں کی داڑھی مونڈنے کو ہمیشہ گرم پانی موجود رہتا ہے۔ لکھنے کا سامان ——— ایک قلم جس سے سچ مچ لکھا جا

سکے، بہت سی تازہ روشنائی، کئی قسم کے کاغذ، بلاٹنگ پیپر جو حقیقت میں روشنائی کو جذب کرنے والا ہو ہر خواب گاہ میں موجود ہوتا ہے اور ان اشیا کی کمی بالالتزام پوری ہوتی رہتی ہے۔ ایک ردی کی ٹوکری بھی وہاں ضرور ہوتی ہے۔ کھانے وقت پر اور عمدہ تیار ہوتے ہیں۔ گرم گرم رکابیاں آکر میز پر لگ جاتی ہیں ——— اور قہوہ نہایت نفیس ہوتا ہے۔

نیویارک میں نوجوانوں نے جونیر لیگ کے نام سے ایک انجمن قائم رکھی ہے، جس کے ذریعہ سے وہ ہر سال بعض خیراتی ادارات کی مدد کرتے ہیں۔ وہ بازاروں میں کھیل اور ناچ دکھاتے پھرتے ہیں اور اس طرح ان خیراتی کاموں کے لئے چندہ جمع کرتے ہیں۔ وہ اس کام کو اپنی پوری توجہ سے اور بالکل تجارتی طریق پر انجام دیتے ہیں۔ ایک کپتان چن لیا جاتا ہے اور اس کا حکم ہر بات میں قطعی سمجھا جاتا ہے۔ احکام کی پابندی نہایت شدت سے کی جاتی ہے اور جس کے سپرد جو کام کر دیا جاتا ہے اُسے اس سے انحراف کرنے کی مجال نہیں ہوتی امریکا کے نوجوان نہ صرف سریع الخیال ہیں بلکہ بجلی کی سی سرعت سے خیال کو عمل میں تبدیل کر لیتے ہیں +

چیستانِ ابوالہول

ہیئت اور ریاضی کے مشہور ماہر ایب موریو نے مصر کے ہرم عظیم اور پُراسرار ابوالہول کے متعلق ایک نیا نظریہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے اپنے قیاسات کو اُس مقام سے شروع کیا جہاں انگریز محقق پیازی سمتھ نے انہیں چھوڑا تھا۔ وہ اب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اہرام کی تعمیر میں دو مقصد مدنظر تھے۔ اول یہ کہ وہ بادشاہوں کے مقبرے تھے اور دوسرے وہ مصری حکما کے علم ہیئت و سائنس کا ایک دائمی نقش تھے۔

برطانی اسرائیلیوں کا عقیدہ ہے کہ پتھر کا یہ عظیم الشان تودہ جو یوں تنہا صحرا کی ریت میں سر اٹھائے کھڑا ہے دنیا کے انجام کار کا راز اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے جسے ریاضی کی کنجیوں سے کھولا جا سکتا ہے۔ فرانسیسی ہیئت دان کا خیال یہ نہیں ہے لیکن انہوں نے بعض عجیب انکشافات کئے ہیں جن سے آخر میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ قدیم مصریوں نے علم ریاضی میں اتنی ہی ترقی کی تھی جتنی آج ہم کر سکے ہیں۔

ایب موریو کہتے ہیں: "یہ سچ ہے کہ بہت سے اہرام سے بادشاہوں کے مدفن کا کام لیا گیا لیکن ان کی تعمیر کا یہی ایک مقصد نہ تھا۔ چنانچہ سب سے بڑا ہرم جو سنہ عیسوی سے اڑھائی ہزار سال قبل تعمیر ہوا اس خیال کی تردید کرتا ہے۔ اس دیو ہیکل یادگار پر پتھر کا کام نہایت نفیس ہوا ہے مگر وہ ماتمی کتبے جو دوسرے اہرام پر پائے جاتے ہیں

اس پر قطعاً نظر نہیں آتے۔

پھر اگر ہرمِ عظیم مقبرہ نہیں ہے تو اس کی تعمیر سے کیا غرض تھی؟ موریو کہتے ہیں کہ اس سے ریاضی کے اُن قاعدوں کی حفاظت مطلوب تھی جن کو مصری علماء نے دریافت کیا تھا۔ اپنے نظریہ کے ثبوت میں وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ وہ پیمانہ جو اس عظیم الشان تعمیری کام میں استعمال ہؤا زمین کے قطبی نصف قطر کا ٹھیک ایک کروڑواں حصہ ہے۔ اب یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو مصریات کے تمام طالب علموں کے لئے حد درجہ دلچسپ ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ مصریوں نے ایسا پیمانہ کیوں انتخاب کیا جس کی بنا زمین کے قطبی نصف قطر پر رکھی گئی تھی؟

دورِ حاضر کا ہیئت دان جواب دیتا ہے "اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ زمین کا قطبی نصف قطر ہی ایک ایسی بہبود ہے جس میں زمانہ ہائے دراز تک کوئی تغیر واقع نہیں ہوسکتا۔

یہاں تک تو ہرمِ عظیم کا ذکر تھا، اب ابوالہول کی نسبت سنئے جو ہرمِ عظیم سے تقریباً چوتھائی میل کے فاصلے پر جنوب مشرق کی طرف واقع ہے۔

ماہرینِ مصریات سالہا سال سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اس عظیم بت کا جو قدرتی چٹان کو تراش کر بنایا گیا ہے کیا مطلب ہے۔ لیکن وہ معمّا جس کو یہ پُراسرار اور ٹوٹا پھوٹا چہرہ پیش کر رہا ہے اب تک حل نہیں ہؤا تھا۔

اب ایب موریو کہتے ہیں کہ میں نے اس عقدے کو ہمیشہ کے لئے حل کر دیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ مصریوں نے ہرمِ عظیم کو اپنی سائنس اور ریاضی کی دائمی یادگار بنا کر ابوالہول کو اُن آنے والی ان گنت قوموں کے لئے ایک بتِ مضحک بنایا جو آئندہ ایک گزشتہ تہذیب کی اِن سرمدی یادگاروں کے بالمقابل آکر کھڑی ہونگی۔ اُن کا خیال ہے کہ قدیم مصریوں کو اپنی قوم کے انجام کا پہلے ہی سے علم تھا اور اس لئے وہ اپنی علمی اور فنّی ترقیات کا نقش پتھر میں ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئے۔

دل

خدا ہی جانتا ہے کہ انسانی دل کو حرکت کی یہ بے پایانی کہاں سے ملی ہے! اس چھوٹے سے سرخ

عضل کے مسلسل شرح وبسط سے زیادہ حیرت انگیز غالباً کائنات کی کوئی حرکت نہ ہوگی۔ حیات کی ابتدا سے لے کر اُس وقت تک جب موت کا سرد ہاتھ روح کو جسم سے الگ کر لیتا ہے دل بند ہوتا رہتا ہے اور کھلتا رہتا ہے، کھلتا رہتا ہے اور بند ہوتا رہتا ہے۔

ابھی اپنے وجود کو تسلیم کرانے کے لئے اسے خوردبین کی ضرورت ہوتی ہے کہ یہ اپنا کام شروع کر دیتا ہے ہاروے جنہوں نے دل کی کارگذاری کے متعلق بہت سی معلومات بہم پہنچائی ہیں، ایک چوزے کے مضغہ میں دل کی نوزائیدہ حرکت کی عجیب دلچسپ کیفیت بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: "مرغی کے انڈوں پر بیٹھنے کے چوتھے یا پانچویں دن میں۔ نے ایک انڈے کو شیر گرم پانی میں کھولا، اور اس ہیولی کو ایک بادل میں لپٹا ہوا پایا۔ اس بدلی کے بین درمیان ایک سرخ سا نقطہ تھا، اتنا چھوٹا کہ انقباض کے دوران میں وہ نگاہ سے اوجھل ہو گیا لیکن انشراح پر پھر اس کی سرخی ایک پن کی نوک کی طرح نظر آنے لگی۔ گویا عدم اور وجود کے درمیان وہ اس بسط وکشاد سے بتا رہا تھا کہ مجھ میں حیات کی ابتدا ہو گئی ہے"۔

اسے سنبھالنے کے لئے دماغ موجود نہیں، پھیپھڑے موجود نہیں جو خون کے لئے آکسیجن بہم پہنچائیں لیکن ننھا سا نقطہ جانتا ہے کہ اُسے کیا بننا ہے اور دھڑکنا شروع کر دیتا ہے۔

اندرونی کل پرزوں کی تصویر

ایکس رے کی حیرت انگیز ایجاد کے ساتھ اب جلد ہی ایک اور اسی قسم کی ایجاد کا اضافہ ہونے والا ہے جو غالباً اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہوگی اس کے ذریعہ سے معلوم ہو سکے گا کہ مریض کے جسم کے اندر کیا کچھ ہو رہا ہے۔

یہ ایک امریکن ایجاد ہے جس کا نام گیسٹرو فوٹو رکھا گیا ہے۔ اس میں ایک چھوٹا سا کیمرا ہوگا جسے تصویر اتارنے کے لئے آسانی سے پیٹ کے اندر اتارا جا سکے گا، اور اس کے ساتھ ایک بجلی کا لمپ لگا ہوگا جس کی روشنی بارہ ہزار بتیوں کے برابر ہوگی۔ یہ لمپ ایک سیکنڈ کے ایک سو بیسویں حصے کے لئے روشن ہوا کرے گا اور اسی وقفے میں اندرونی کیفیت کی آٹھ تصویریں اتر آیا کریں گی۔

موجودہ اُردو شاعری

کہا جاتا ہے کہ زمانۂ حال میں اردو شاعری نے نیا جنم لیا ہے۔ فرسودہ تشبیہات اب لطفِ بیان پیدا کرنے سے قاصر ہیں۔ قدیم محاورات قلمزد ہو چکے ہیں، زبان نکھر گئی ہے، الفاظ سنور گئے ہیں، استعارہ و کنایہ میں نزاکت، بیان میں سلیقہ اور مضامین میں بلندی، سنجیدگی اور متانت پیدا ہو گئی ہے۔ گزشتہ زمانہ کی "بیکار" "مصر" اور "دنیا نوسی" شاعری کی جگہ اب مفید و کارآمد مضامین نے حاصل کر لی ہے۔ قومی ضروریات پورا کرنے اور فطری جذبات کو برانگیختہ کرنے کی غرض سے شاعری کے حدود و قیود کو بھی زیادہ "آزاد" بنا لیا گیا ہے اور اب اردو زبان نے گویا صحیح معنوں میں ترقی کے میدان میں قدم اٹھایا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ادب و شعر پر جو اخباری تنقید اس زمانہ میں ہو رہی ہے اُس کی رَو میں ایسے جملوں کا قلم سے نکل جانا اور بڑے بڑے دعوے کر بیٹھنا زیادہ دشوار نہیں بلکہ موجودہ صحافت کا مذاق ہی ان تنقیدات کا طالب ہے اور یہی سبب ہے کہ بغیر کسی امتیاز و معیار کے ہر اخبار و رسالے میں شعر و سخن کی محفل گرم نظر آتی ہے اور یہ اس سے بھی زیادہ عجیب بات ہے کہ جس قدر جدت طرازی اور ایجاد پسندی نومشق شعرا کی طرف سے ظاہر ہوتی ہے کہنہ مشق اور پختہ قلم اساتذہ سے ظہور میں نہیں آتی بلکہ "طرزِ جدید" کے لکھنے والے بھی جدت کے "تازہ ترین" مظاہروں" سے بالعموم گریز ہی کرتے ہیں۔ با ایں ہمہ شعر و سخن کے عنوانات سے مختلف اخبارات و رسائل میں جس قدر کلام شائع ہوتا رہتا ہے وہ انقلاب انگیز ضرور ہے لیکن محض اس کا وجود یہ ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں کہ دورِ جدید کی اردو شاعری کو قدیم طرز کی شاعری پر وہ فوقیت حاصل ہے جس کا ہمارے مدعیانِ ادب و شعر دعویٰ کرتے ہیں۔

شاعری میں انقلاب پیدا ہو جانا کوئی عجیب بات نہیں اور نہ اس حقیقت سے انکار ممکن ہے۔ بیشک شاعری میں انقلاب ہوا اور ایسا انقلاب زبان و ادب ہی نہیں کارگاہِ ہستی کے ہر فعل و ہر آئین میں وقتِ موعود پر ہوتا ہے اور ہوتا رہے گا۔ لیکن یہ سمجھ لینا کہ اب جو تبدیلی ہوئی ہے وہ حقیقت ہے اور اس سے پہلے جو کچھ ہوتا تھا وہ مجاز تھا، یا آج سرگرمی عمل اور ترقی پائی جاتی ہے اور کل محض جمود، پستی اور نکبت تھی نہ صرف غلط ہے بلکہ اصل نقطہ سے دور ہٹ کر ایک دوسرے اصول پر تنقید ہے جو ممکن ہے کہ کسی خاص معنی میں صحیح ہو لیکن شاعری کے متعلق یقیناً درست

نہیں ہے۔

اردو شاعری کی تاریخ اگر حضرتِ امیر خسرو کے دور سے تسلیم کی جائے تو تیرھویں صدی عیسوی یا ساتویں صدی ہجری اُس کی ابتدا ہوگی۔ اس وقت تک خسرو کی شاعری، اردو شاعری نہ تھی بلکہ وہ تفننِ طبع یا عام مذاق کی خاطر کبھی کچھ بھاشا یا بول چال کی زبان میں بھی کہہ دیتے تھے۔ غزل کی وقعت قائم کرنے کے لئے فارسی کے مصرعے نکالنے پڑتے تھے۔ مثلاً۔

بحقِ روزِ وصالِ دلبر کہ داد ما را فریب خسرو
لبھائے راکھوں تو سُن لے ساجن جو کہنے پاؤں دو بول نیہاں

لیکن بعض غیر معروف شاعروں کو چھوڑ کر جن کا وجود بھی تاریخی حیثیت سے مختلف فیہ ہے سنہ ۱۱۴۵ھ میں پہلی تصنیف نثرِ اردو میں وہ مجلس شائع ہوئی اور ولی دکنی نے اردو شاعری کی دہلی میں بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد مرزا مظہر جان جاناں، مرزا رفیع سودا، میر تقی میر اور خواجہ میر درد نے اپنے زورِ قلم سے اردو شاعری کو اس قابل بنا دیا کہ صفحۂ ہستی پر اس کا اپنا وجود تسلیم کیا جائے اور رفتہ رفتہ اس نے اپنا سکّہ بھی دلوں پر جما لیا۔ جس قدر زبان صاف ہوتی گئی اردو شاعری کی ہر دلعزیزی بڑھتی گئی اور شعر و شاعری کا چرچا ہر طبقہ و ہر جماعت میں اُس کے اپنے مذاق کے مطابق ہونے لگا۔ لیکن یہ جو کچھ ہُوا وہ فارسی زبان کا تتبع تھا، عروض و قواعد موجود تھے۔ صرف زبان کا صاف اور رواں ہونا ایک کام تھا جس کو ان اساتذۂ فن نے اپنی قوتِ تخئیل اور زورِ قلم سے اس خوبی کے ساتھ انجام دیا کہ آج اُن کی بدولت اردو شاعری ہمارا سرمایۂ تفاخر قرار پائی۔ اگر خدانخواستہ میر و مرزا بھی ہمارے جدت پسند شعرا کی طرح بجائے زبان و شعر پر اپنی ہمت صرف کرنے کے "شاعری" ہی تصنیف کرنے لگتے تو معلوم نہیں آج اردو کے شعرا خوش ہوتے کہ اُن کو جدت طرازی کا میدان ہاتھ آیا، یا ماتم کرتے کہ اردو شاعری کا وجود ہی باقی رہا۔

زوالِ سلطنتِ مغلیہ کے بعد عروج و ترقی کا ہندوستان میں نام باقی نہ رہا، شیرازۂ حکومت کی پراگندگی نے افراد و اقوام کو منتشر و پامال کر دیا لیکن یہی وہ زمانہ تھا کہ شعر و سخن کا آفتاب اپنے نصف النہار پر تھا۔ مشاعروں کی گرم بازاری اور شعرا کی قدردانی نے اردو شاعری کے لئے غیر معمولی سہولت بہم پہنچائی۔ امرا اپنی شعر گوئی پر ناز کرنے لگے اور رند مشرب خوش باش طبقہ کو اپنی گرمئ محفل کے لئے غیر مترقبہ نعمت ہاتھ آئی اور رفتہ رفتہ یہ مذاق عوام تک پہنچ کر ایسا رچ گیا کہ امیر و داغ اور اُن کے ہزارہا شاگردوں تک پہنچتے پہنچتے شعرِ اردو زبان زدِ خلائق ہو گیا اور زبان و ادب کے لئے قابلِ فخر سرمایہ اپنی یادگار چھوڑ گیا۔

اسی دورِ آخر میں "اصلاحی" شاعری کی ابتدا ہوئی۔ محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی اور اس کے بعد مولوی محمد اسمٰعیل، شبلی و اکبر نے قدیم روش کو چھوڑ کر جدید طرز کی بنیاد ڈالی، ایجاد و اختراع کی ابتدا ہوئی اور مفید و کار آمد اصلاحوں سے شاعری کے محدود و قدیم دائرہ کو وسعت دی۔ لیکن اس وسعت پذیری نے ممکن ہے کہ عروض کو مجروح کیا ہو مگر زبان و شعر دونوں کو پہلے سے زیادہ دلچسپ، پُرلطف اور معنی خیز بنا دیا اسی لئے یہ جدّت طرازی باوجود شدید مخالفت اور طعن و تشنیع کے قابلِ پسند اور قابلِ تقلید قرار پائی اور بالآخر "دورِ جدید" کے وجود میں آنے کی باعث ہوئی۔

یہاں قواعدِ صرف و نحو اور فنِ عروض کے مقابلہ میں زبان و شعر کا استعمال کیا گیا ہے یعنی زبان و شعر کی خوبیاں اور محاسن جداگانہ چیزیں ہیں اور صرف و نحو و عروض کی پابندی اور ان حدود کے اندر رہ کر شعر گوئی بالکل دوسری چیز ہے۔ انقلاب جس حد تک ہوا ہے وہ صرف یہ ہے کہ قدیم اصولوں کے خلاف زبان اور شعر دونوں کو آزادی مل گئی اور ردیف و قافیہ اور بعض محاسن شعری سے (جو قدیم زمانہ میں قابلِ قدر خیال کئے جاتے تھے) موجودہ دور میں بے نیازی پیدا ہو گئی۔ زبان بھی قدیم طرز سے ہٹ کر دوسرے راستہ پر آ گئی اور زمینِ شعر بھی محدود راہوں سے گزر کر وسیع و کشادہ شاہراہ تلاش کرنے لگی لیکن زبان کی تبدیلی یا مضامینِ شعر کا تنوع ایسا نہ تھا کہ اس میں بے راہ روی یا کدورت محسوس ہو اس لئے انگریزی شعر و ادب کی تقلید یا جدید اسلوبِ بیان کا اختیار کر لینا خواہ طرزِ قدیم سے کتنا ہی غیر مانوس کیوں نہ ہو بہرحال ترقی کی رفتار تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ زبان میں وسعت پیدا ہو گئی بیان میں ندرت نظر آنے لگی اور فکر کے سامنے نئی نئی راہیں کھل گئیں۔

مثال کے طور پر مولوی محمد اسمٰعیل مرحوم کی مشہور نظم جو قافیہ و ردیف کی قیود سے آزاد ہے ملاحظہ ہو۔

اے چھوٹے چھوٹے تارو ‏ ‏ ‏ ‏ کہ چمک دمک رہے ہو
تمہیں دیکھ کر نہ ہووے ‏ ‏ ‏ ‏ مجھے کس طرح تحیّر
کہ تم اونچے آسماں پر ‏ ‏ ‏ ‏ جو ہے کل جہاں سے اعلیٰ
ہوئے روشن اس روش سے ‏ ‏ ‏ ‏ کہ کسی نے جڑ دیئے ہیں
گہر اور لعل گویا

یا مولوی محمد حسین آزاد مرحوم اپنی ایک نظم میں جدّت طرازی کا معیار پیش کرتے ہیں۔

ہنگامۂ ہستی کو ؛ گر غور سے دیکھو تم

ہر خشک و ترِ عالم — صنعت کے تلاطم میں
جو خاک کا ذرّہ ہے — یا پانی کا قطرہ ہے
حکمت کا مرقع ہے — جس پر قلمِ قدرت
انداز سے ہے جاری — اور کرتا ہے گلکاری
اک رنگ کہ آتا ہے — سو رنگ دکھاتا ہے
اور دیکھنے والوں کی — آنکھیں تو کھلی ہیں پر
خر مہرۂ رنگیں یا — بلور کے ٹکڑے ہیں
ہر لحظہ و ہر ساعت — قدرت کے تماشے ہیں
عالم میں پڑے ہوتے — پر اُن کو نہیں پروا
ہرگز کہ یہ سب کیا ہے — اور اس کا سبب کیا ہے

"بحر الفصاحت" میں ان دونوں نظموں کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ "اس قسم کے تمام کلام اصطلاح کی رو سے نثرِ مرجز میں داخل ہونے کے قابل ہیں ان کو نظم میں داخل کرنا فنِ انشاپردازی عربی، فارسی اردو کے خلاف ہے۔ یہاں انگریزی کا قاعدہ چلانا گویا ایک مقررہ اصطلاحِ فن کے گلے پر چھری چلانا ہے"، یہ تنبیہ بالکل درست ہے لیکن اُس شخص کی ہدایت کے لئے قطعًا بے سود جس کا اولین مقصد اصطلاحِ فن سے بغاوت کرنا ہے۔ مولانا حالی نے اپنے مقدمہ میں اس پر کافی بحث کی ہے اور اصطلاحِ شعر یا دورِ جدید کا خیر مقدم جہاں کہیں اور جب کہیں ہؤا وہ محض اس نظر سے کہ اصطلاحِ فن کی غلامی سے آزادی نصیب ہو جائے اور یہی اصل مقصد تھا لیکن اصلاح کرنے والوں کی اوّل صف میں جو ممتاز ہستیاں نظر آتی ہیں اُن کو چھوڑ کر ہمارے موجودہ علمبردارانِ اصلاح نے تہذیب و اصلاح کے نام سے جو کند چھری نفسِ شاعری پر پھیرنا شروع کی ہے اُس کی تباہ کاری کو دیکھتے ہوئے خوف آتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ کاش وہ اپنی دماغی نارسائی کے اعتراف میں حرکاتِ مذبوحی سے باز آتے کہ شیوۂ عاشقی یوں بدنام نہ ہوتا۔ اس زمانہ میں قیود و حدود کو بھی بعض اوقات چھوڑ دیا جاتا ہے لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے اور بالعموم ردیف و قافیہ کے حدود میں رہ کر وہ جدت طرازیاں کی جاتی ہیں جن کے بعد کسی کو شعر کہنے اور سمجھنے کی ہمت ہی نہیں ہو سکتی۔

مثال کے طور پر دو نظمیں اوپر نقل کی گئی ہیں جن کا طرزِ ادا اور مصرعوں کی نشست اردو شعر کے لئے بالکل غیر مانوس ہے اور اس لئے بیک نظر وہ ناقابلِ قبول نظر آتی ہیں۔ لیکن اس جدت کو قصدًا روا رکھا گیا ہے اور یہ توقع

ہے کہ اس کی اجنبیت دو چار مرتبہ روشناس ہونے کے بعد کم ہوجائے گی اور پھر کچھ زمانہ کے بعد مانوس و دلچسپ معلوم ہونے لگے گی۔ لیکن اس جدتِ خاص کے علاوہ زبان اور مضمونِ شعر میں جو وسعت نظر آتی ہے نیز تشبیہ و استعارہ کی خوبی، الفاظ اور معانی کا باہم پیوند، زبان اور اُس کی سلاست و روانی یہ ایسی خوبیاں ہیں جو طرزِ قدیم پر فوقیت رکھتی ہیں اور شاعر کے مقصد کو بہمہ وجوہ پورا کرتی ہیں، یعنی زبان میں قدرتِ اظہار اور روانی و سلاست وزن بڑھ جاتی ہیں ساتھ ہی شاعر کی قوتِ فکر وسعتِ طلب اور وسعت پذیر ہوتی ہے جو شعر و شاعری کا اصل کارنامہ اور حقیقی مقصد ہے۔ نظم کے علاوہ غزل میں بھی اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جاتا تھا۔ اور زبان و شعر کی جن خوبیوں کا ابھی تذکرہ ہوا اُن کی رعایت سے الفاظ و بندش کا خاص اہتمام ہوتا تھا چنانچہ مولانا حالی کے بعض سادہ اشعار اور زمانۂ حال کی اصطلاح کے مطابق "بے کیف مضامین" بھی (اس لطف نہیں)" اہتمام" سے خالی نہیں نظر آتے مثلاً

جھانکو میں جس بھوک کی بھوسے نہ تو — بھوک ہے وہ شیرِ مادر سے لذیذ
جو قناعت کے ہیں حالی میہماں — اُن کو فاقے ہیں مزعفر سے لذیذ

ایک دوسری زمین ملاحظہ ہو۔

گھر ہے وحشت خیز اور بستی اجاڑ — ہوگئی ایک اک گھڑی تجھ بن پہاڑ
کھیلنا آتا ہے ہم کو بھی شکار — پر نہیں زاہد کوئی ٹٹی کی آڑ
بات واعظ کی کوئی بگڑی گئی — اِن دنوں کثرت ہے کچھ ہم پر لتاڑ

غیبت ہو یا حضوری دونوں بُری ہیں تیری — جب بدگمانیاں تھیں اب بدزبانیاں ہیں
فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں — گر یہ نہیں تو بابا یہ سب کہانیاں ہیں

اِن اشعار میں بھی زبان کی خوبی، محاورات کا برمحل استعمال اور سبکِ عام فہم الفاظ سے بلند و معنی خیز مطالب کا اظہار جس خوبی سے کیا گیا ہے وہ "قدیم طرز" سے علیحدہ ہوجانے کے ننگ کو یقیناً چھپا لیتا ہے اور یہ توقع کہ اس روش میں آگے چل کر زیادہ صفائی اور لوچ پیدا ہوجائے گا اکثر شعرا کو باوجود اختلافِ طبع اس اصلاح کی طرف مائل کردے تو بعید نہیں۔ لیکن جب ہم زمانۂ حال کے اصلاحات و ایجادات بلکہ "اختراعات" پر غور کرتے ہیں تو ہم کو محسوس ہوتا ہے کہ اصطلاحِ فن و عروض کو تو دوسروں نے بھی چھوڑا تھا۔ اِن بزرگوں نے زبان، محاورہ، ترکیب، اور غیر زبانوں کے اتصال و تمسک کو بھی بے کار و مضر بنا کر چھوڑ دیا۔

"کیفیات" کے عنوان سے کسی رسالہ میں ایک غزل شائع ہوئی ہے جس کا ایک شعر قابلِ ملاحظہ ہے۔

مرا خیالِ تصور "خموش فطرت کا"

ترا جمال کہ غنچوں کو اک فسانہ ملا

خیالِ تصور کی ترکیب میں اگر اختراعِ عائقہ پنہاں ہو تو بعید نہیں کہ تصور و خیال ایک ہی مفہوم کو ادا کرتے ہیں پھر اُن کو اضافت سے وابستہ کر دینے میں گویا ایک ٹھوکر سے اعجازِ مسیحائی کا اظہار مقصود ہے لیکن "خیالِ تصور" کی لطافت و شگفتگی یا معنی آفرینی تسلیم بھی کر لی جائے تو اُس کے دوش بدوش "خموش فطرت" کا فارسی جامہ میں اردو ترکیب بدعت طرازی کی غیر معمولی مثال ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ پہلا مصرعہ "خموش فطرت" کے تصور میں مقید ہو گیا اور دوسرے الفاظ محض اس لئے کہ ان کا انتخاب صحیح نہ تھا یا نشست مناسب نہ تھی اپنے پورے زور اور اپنے کام سے قاصر رہے۔ رہا اگلا مصرعہ، ع ترا جمال کہ غنچوں کو اک فسانہ ملا ایک نہایت لبسیط و مدلل شرح کا محتاج ہے جس پر بطورِ حاشیہ ایک باب کا اس مقصد سے اضافہ کرنا چاہئے کہ وہ پہلے اور دوسرے مصرعہ میں ربط پیدا کر سکے۔

"جمہوریت" کے عنوان سے پانچ شعر کی ایک مختصر نظم کسی رسالہ میں شائع ہوئی ہے۔ ایک شعر قابلِ غور ہے:

اگرچہ وحدت پرستیاں علمِ ذات سے ہیں محیطِ عرفاں

مگر سوادِ صفات کو بھی تری نگاہوں کی جستجو ہے

اگر اس شعر کے فی الواقع کوئی معنی ہیں تو اس میں کلام نہیں کہ وہ معنی اردو خواں طبقہ سے پوشیدہ ہیں جس طرح دوسرے فارسی اشعار اردو داں کے لئے ترجمہ طلب ہیں یہ شعر بھی ایسا ہی ہے لیکن باوجود اس "قادر الکلامی" کے کاغذ پر مختلف دائرے کھینچنے کے بعد بھی وحدت پرستیاں، علمِ ذات، محیطِ عرفاں اور سوادِ صفات کو کسی ایک معنی میں محیط کرنا آسان کام نہیں۔

اسی رسالہ میں "شفق کی پیشینگوئی" کے عنوان سے دوسری نظم شائع ہوئی جس کو (خطبۂ فطرت کے سلسلہ کی دوسری نظم) قرار دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ عنوانات مضمون کے لئے فتحِ باب کا حکم رکھتے ہیں اور اُن کے ذریعے سے آیندہ پیش کئے جانے والے مطالب کا سراغ مل جاتا ہے۔ لیکن "خطبۂ فطرت" خود محتاجِ تشریح ہے خواہ مجہول و بے معنی نہ ہو اس لئے کہ اگر جدت و اختراع نے خطاب کو خطبہ کے قالب میں ڈھال دیا ہے تو سبحان اللہ، ورنہ شاعر کے ذہنِ رسا تک اس لئے پہنچنا دشوار ہے کہ "معجزاتِ شعری" تو ہر شخص کے حصہ میں نہیں آتے اور فیضِ روح القدس سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد اگر زیادہ ہو جائے تو غالباً موجودہ اختراعات بھی عام ہو کر جدید ترا سلوب

بیان کی ضرورت پیش آنے لگے۔ اس نظم کا ایک شعر ہے۔

وسعت نظروں میں ہو تو نظر آئے اپنا انجام تمہیں
تم حال پرستِ ماضی ہو، مستقبل سے کیا کام تمہیں

حال پرستِ ماضی اگر انگریزی الفاظ میں اور وہ بھی جسٹرٹن کے قلم سے کہیں نکل جاتے تو نہایت لطیف فقرہ ہوتا لیکن اردو شعر میں اس ترکیب کا کیا وزن ہے وہ اُسی وقت معلوم ہو سکتا ہے کہ اول ہم لکھنے والے کے مخصوص جولانِ طبیعت تک پہنچ سکیں جس کی بنا پر حال کو ایک خاص معنی میں استعمال کرنے کی جرأت کی گئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آج اردو شاعری پر سب سے بڑا ظلم اُس طبقہ کی طرف سے ہو رہا ہے جو جدت و اختراع کے شوق میں دماغی توازن کھو بیٹھا ہے۔ شعر کی اصل خوبی اور حقیقی تعریف اُس کی موزونیت میں ہے، موزونیت حسن ہے اور جس طرح تناسبِ اعضاء انسانی حسن کی بہترین تعریف تسلیم کی گئی ہے اسی طرح مضمون، الفاظ، بندش اور ترکیبوں کا صحیح تناسب شعر کی جان ہے۔ فنِ عروض و اصطلاحِ شعر کو پسِ پشت ڈال دینے میں چنداں قباحت نہیں لیکن لکھنے والے کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ کس مطلب کے لئے وہ کیا الفاظ استعمال کرنا چاہتا ہے اور کیسے مضمون کے لئے کن تشبیہوں اور استعاروں سے کام لینا چاہتا ہے۔ غزل میں فلسفہ و حکمت کے مضامین لکھنا اس قدر قبیح نہیں جس قدر ان مضامین کے لئے نامناسب الفاظ کا استعمال۔ اور اس اعتبار سے قدیم شاعری باوجود فرسودہ مضامین اور پامال زمینوں کے کہیں زیادہ دلفریب اور موثر تھی۔

خیالِ زلفِ بتاں میں نصیر پیٹا کر
گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

شاہ نصیر کا مشہور شعر ہے۔ مضمون اس قدر پامال اور اس درجہ مختصر ہے کہ اس سے زیادہ نہ اختصار ممکن ہے اور نہ اس سے زیادہ پرانا دقیانوسی تذکرہ مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ پھر یہ بھی نہیں کہ ایک محاورہ کا مکمل اور بے کم و کاست آجانا ہی شعر کا کمال ہے بلکہ الفاظ کی موزونیت محاورہ کے برمحل استعمال اور نشستِ الفاظ سے مصرعوں کی برجستگی سب مل کر ایک خاص کیفیت پیدا کر دیتے ہیں جو شعر کی مقبولیت کا حقیقی سبب ہے۔

مومن خاں کا ایک شعر ہے۔

اُس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

محض ایک تشبیہ اور ایک واقعہ کا بیان ہے لیکن جس انداز میں اس مضمون کو ادا کیا گیا ہے اُس نے شعر کو نشتر

بنا دیا جو دل میں جگہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی کے کلام سے زمانۂ حال کے لوگ نہایت بیزار ہیں اور اس میں وہ شاعرانہ کیفیت نہیں پاتے جو ذوقِ سلیم کے لئے باعثِ لطف ہو لیکن اگر بغیر انتخاب اُن کے چند اشعار پڑھئے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ فلاں مضمون اور فلاں مطالب کے اشعار ہیں، نہ وہ معما و چیستاں نظر آتے ہیں اور نہ اُن میں یہ سقم پایا جاتا ہے کہ ادنیٰ مضامین، روزمرہ یا معاملہ بندی میں فلسفہ و منطق کے اصطلاحات سے کام لیا گیا ہو یا خواہ مخواہ عربی و فارسی ترکیبوں سے مضامین کو وقیع ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ مثلاً

آمد و شدِ نفس چند کی باقی ہے فقط ۔۔۔ اپنے گھر مجھ کو بلاؤ کہ مرے گھر آؤ

نوجواں کوئی جو پیری میں نظر آتا ہے ۔۔۔ یاد آتی ہے بہت اپنی جوانی مجھ کو

فارسی ترکیبوں اور جدید اسالیبِ بیان کا اختیار کرنا اور اُن کے ذریعہ سے کلام میں حلاوت مضامین میں تنوع پیدا ہونا کچھ قابلِ اعتراض نہیں ہے لیکن شعر کو ترکیبوں اور جدت و اختراع کا دفینہ بنا دینا نہ صرف مضر ہے بلکہ مہلک ہے۔ شعر کا لطف اور زبان کی خوبی دونوں فنا ہو جاتی ہیں۔ قدما میں بھی فارسی ترکیبوں کا رواج عام تھا اور میر نے تو فارسی ترجموں میں بھی کمال کیا ہے اور ترجمہ کے ذریعہ سے فارسی محاورات پر اردو کا قبضہ کرا دیا اور دورِ آخر میں بھی فارسی ترکیبوں کی کثرت نمایاں تھی لیکن اس کا نتیجہ شعر کی خوبی تھی نہ کہ مضامین و بیان کی پراگندگی۔

میر درد کا ایک مقطع ہے۔

اے درد جا چکا ہے مرا کام ضبط سے
میں غمزدہ تو قطرۂ اشکِ چکیدہ ہوں

میر کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

میر گم کردہ چمن زمزمہ پرداز ہے ایک ۔۔۔ جس کی لے دام سے تا گوشِ گُل آواز ہی ایک

بہارِ رفتہ پھر آئی ترے تماشے کو ۔۔۔ چمن کو یمنِ قدم نے ترے نہال کیا

امیدوارِ وعدۂ دیدار مر چلے ۔۔۔ آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا

لیکن کہا جائے گا کہ رندانہ مضامین میں فارسی ترکیبوں کا استعمال جس قدر آسان ہے فلسفیانہ و حکیمانہ مضامین

کے لئے اتنا ہی مشکل اور دشوار ہے۔ یہ اعتراض اگر صحیح تسلیم بھی کیا جائے تب بھی ہمارا نظریہ قابلِ ترمیم نہیں اس لئے کہ غالب و مومن کو چھوڑ کر خود ہمارے زمانہ میں بھی حسرت موہانی موجود ہیں اور ان کے علاوہ لکھنؤ کے مشہور شعرا اور دوسرے نامور شعرا کی مثالیں موجود ہیں جنہوں نے فارسی و عربی الفاظ یا جدت و اختراع کے شوق میں شعر کو ہلاکت سے بچانے کی کوشش کی ہے۔

ایک دوسرا خطرہ اردو شاعری کو اور درپیش ہے جو محض ہمارے جدت پسند شعرا کی "زود فہمی" یا کم مشقی کا نتیجہ ہے اور وہ محذوفات اور مفروضات کے استعمال سے پیدا ہوتا ہے۔ فانی کا بے نظیر مطلع ہے۔

دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے
موت سے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

غالباً اسی غزل کا شعر ہے یا کسی دوسرے صاحب کی تصنیف

جگ سُونا ہے تیرے بغیر آنکھوں کا کیا حال کروں
جب بھی دنیا بستی تھی اب بھی دنیا بستی ہے

دونوں اشعار میں کچھ الفاظ و خیالات محذوف ہیں لیکن پہلا شعر بجائے خود مکمل اور ایک عجیب کیفیت کا شعر ہے۔ دوسرا شعر اپنے رنگ میں لاجواب ہے لیکن "آنکھوں کا کیا حال کروں" ایسا ٹکڑا ہے جس کی مطلق کوئی ضرورت نہ تھی، لیکن اگر اُن محذوفات کا لحاظ کیجئے جو مرکوزِ خاطرِ شاعر ہیں، تو خود یہ فقرہ کہ "آنکھوں کا کیا حال کروں" اگلے مصرعہ یعنی "جب بھی دنیا بستی تھی اب بھی دنیا بستی ہے" سے وابستہ اور متصل ہو کر عجیب چیز ہو جاتا ہے اور شعر کی کیفیت کو ہزاروں درجہ بڑھا دیتا ہے۔ فانی کے کلام میں یہ حذف و اشارہ حسن ہے لیکن یہی چیز کم مشق شعرا کے یہاں نقص بھی ہو جائے تو بعید نہیں، حقیقت یہ ہے کہ گو محذوفات سے مضامین کی وسعت ایک مختصر شعر میں بھی سما سکتی ہے لیکن اس کا استعمال نہایت خطرناک اور احتیاط طلب ہے۔ ہمارے خوش گو اور مشہور شاعر بھی اس خطرہ سے بے نیاز نہیں ہیں۔

ہم نے قصداً اس مضمون میں مثالیں کم دی ہیں اور شعرا کے نام ظاہر نہیں کئے تاکہ رد و قدح کی تلخی کے لئے کوئی اشتعال ہماری طرف سے نہ ہو،

نور الرحمٰن

غزل

جو بات کی، اُسے ترا افسانہ کردیا
جس سے ملے، اُسے ترا دیوانہ کردیا

تھا ہر زباں پہ نام ترا، بزمِ عشق میں
یہ کس نے ذکرِ کعبہ و بت خانہ کردیا

جس پر تری نگاہ پڑی ہوگیا ترا
عالم کو تُو نے آپ سے بیگانہ کردیا

نارِ کلیم حوصلہ جس کا نہ کر سکی
وہ کام تُو نے آتشِ پروانہ کردیا

واعظ کو اہلِ حال سے برسوں ہی کد رہی
رُسوا اُسے بھی عشق نے دیوانہ کردیا

حامد علی خاں

جماعتوں کی پراگندگی اور موت

"علم الاجتماع" کے متعلق یہ کہنا تو مشکل ہے کہ وہ بالکل ہی نو دریافت شدہ علم ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ اسے علوم جدیدہ میں شمار کرنا ناگزیر ہے۔ اس سے ہمارا یہ بھی مطلب نہیں کہ علمائے متقدمین اجتماعی علم سے بالکل ناواقف تھے یا انہوں نے احوالِ جماعات اور انقلاباتِ عالم کا بغور مطالعہ نہیں کیا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر فلسفۂ اجتماع اور اصولِ تاریخ میں اہلِ نظر اور اسبابِ عروج و زوالِ دول کے متعلق صائب الرائے تھے۔ لیکن یہ موتی مختلف کتابوں کے اوراق میں بکھرے ہوئے تھے اور "اجتماعیات" پر گزشتہ صدی سے پہلے "علم" کا اطلاق صحت کا سرمایہ دار نہیں ہے۔

علومِ قدیمہ میں "فلسفۂ تاریخ"، "علم الاجتماع" سے قریبی نسبت رکھتا ہے۔ بلکہ درحقیقت علم الاجتماع کو اس کا جانشین سمجھنا چاہئے۔ چنانچہ آج کل فلسفۂ تاریخ کے متعلق شاذونادر ہی کوئی تصنیف شائع ہوتی ہوگی مگر اس کے بالمقابل اجتماعیات پر آئے دن نئی تصانیف نکلتی رہتی ہیں۔

لیکن اپنی رفتارِ ترقی کی تیزی کے باوجود ابھی تک یہ علم پورے طور پر تکمیل کو نہیں پہنچا۔ اس کا سبب یہی ہے کہ اجتماعی جزئیات سے کلیات کا استخراج کوئی معمولی کام نہیں، کیونکہ بالعموم یہ جزئیات بے انتہا پیچ در پیچ، اور اُن کے اسباب نہایت کثرت سے شاخ در شاخ اور باہم مخلوط ہوتے ہیں۔ تاہم اِن دشواریوں کے باوجود اب تک کافی مواد جمع ہو چکا ہے اور اتنے قوانین و اصول دریافت ہو چکے ہیں جن کی بنیاد پر بحث و تحیص سے مفید نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے۔

علم الاجتماع جن مباحث کو اپنا موضوعِ فکر و نظر قرار دیتا ہے اُن میں اقوام و جماعات کے انحلال و اختلال کے اسباب اور تنزل و موت کے احوال پر تبصرہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

کیا یہ تنزل یقینی ہے؟ اس کے اسباب کیا ہوتے ہیں؟ اس پر کیا نتائج مرتب ہوتے ہیں؟ کیا اس کا علاج یا التوا ممکن ہے؟ افراد اور جماعت کی موت میں کیا فرق ہے؟ —— یہ چند سوالات ہیں جن کے جوابات سے ہم بطورِ ذیل میں بحث کرنا چاہتے ہیں۔

افراد کے انحطاط اور موت کی طرح جماعتوں کا انحلال اور موت بھی ایک امرِ طبعی ہے، اس لئے اصولِ اجتماع کے

ماتحت ایسے حادثات پر اظہارِ رنج و افسوس ایک بے معنی سی بات ہے۔ کیونکہ طبعی قوانین کی طرح اجتماعی قوانین بھی اٹل اور ناقابلِ تدارک ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اہلِ قلم اور اہلِ تاریخ ہمیشہ سے اقوام کی موت کو ایک حادثۂ فاجعہ تصور کرتے رہے ہیں، جس کا دفعیہ اُن کے خیال میں خارجی تدابیر سے ممکن تھا۔ اور علی العموم اس قسم کے حادثات کو اخلاق و عادات کی پستی یا اسی قسم کے دوسرے اسبابِ ظاہری کا نتیجہ تصوّر کیا جاتا ہے۔ وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ قومیں ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہنے کے لئے پیدا ہوتی ہیں اور اُن کی موت اصولِ فطرت کے ماتحت نہیں ہے۔ یہ غریب اتنا نہیں سوچتے کہ جماعتیں بھی افراد کی طرح زندگی رکھتی ہیں، اپنے نشو و نما کے دوران میں معینہ مدت تک قائم ہیں، اور آخر کار مرگِ طبعی پر ان کا خاتمہ ہو جانا غیر مشکوک ہے۔ پھر جماعتوں کے انقراض و اختلال کا خوف کیسا؟ اور جس امر کا وقوع یقینی ہے اُس سے ڈرنا کیا؟

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ "انحلالِ جماعات" سے کیا مقصود ہے؟ اور یہ الفاظ کن کن مفاہیم پر محتوی ہیں؟ ہم اس سے یہ مراد لیتے ہیں کہ وہ روابط، جو کسی جماعت کے افراد کو باہم مربوط رکھتے ہیں، ایک خاص وقت میں بعض داخلی یا خارجی اسباب کے تاثر سے بکھر کے رہ جاتے ہیں ——— جس طرح ایک کشتی کے تختے علیحدہ علیحدہ کر لئے جاتے ہیں اور اس کے عناصرِ ترکیبی منتشر ہو جاتے ہیں یا ایک نئی صورتِ جسمیہ قبول کر کے رونما ہوتے ہیں اسی طرح کبھی جماعت منتشر ہو کر جماعتی حیثیت سے فنا ہو جاتی ہے۔ مگر اس کے افراد باقی رہ جاتے ہیں بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر حصہ باقی رہ جاتا ہے۔ اُس وقت اُن کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اپنے سماج (Society) کے انحلال کے بعد مقتضائے حال کے مطابق کوئی کیفیت قبول کر لیں۔ لیکن جس طبقہ میں اس تاثر کے لئے کافی لوچ نہیں ہوتا وہ اپنے سماج کی بربادی کے ساتھ جو اس کی حفاظت کا ذمہ دار تھا، فنا ہو جاتا ہے۔

افراد کے انحطاط اور جماعتی حیثیت سے جماعت کے انحطاط میں تفریق کرنا ضروری ہے۔ جماعت کا انحطاط لازمی طور پر افراد کے انحطاط کا مقتضی نہیں ہوتا بلکہ کبھی انہیں انحطاط پذیر افراد میں سے بعض افراد نمایاں ہو جاتے ہیں اور صفاتِ عالیہ میں امتیازِ خاص پیدا کر لیتے ہیں۔

بہر صورت ہمیشہ تباہ شدہ جماعتوں کے کھنڈروں پر جدید جماعتوں کی تعمیر کی بنیاد پڑتی ہے اور یہ جدید جماعتیں اپنی پیشرو جماعتوں کی تاریخ دہراتی رہتی ہیں۔ مگر کسی قوم کی تباہی کے ساتھ اُس کی علمی، ادبی، اور صنعتی کاوشوں کے نتائج فنا نہیں ہوا کرتے بلکہ اُن افراد کے دماغوں میں محفوظ رہتے ہیں جو حالاتِ جدیدہ سے متاثر ہونے کی استعداد رکھتے ہیں۔ اور اُن کے توسط سے یہ امانت اُس نوزائیدہ جماعت کو سونپ دی جاتی ہے جو تباہ شدہ جماعتوں کے آثار پر تعمیر ہوتی ہو

اب ہمیں اُن اسباب سے بحث کرنا ہے جو سماج کے انتشار اور جماعتوں کے انحلال کا باعث ہُوا کرتے ہیں علمارِ اجتماعیات اس کے مختلف اسباب و رجحانات بیان کرتے ہیں جن میں زیادہ اہم حسبِ ذیل ہیں :-

(۱) نسلی و قومی رجحانات

(۲) حیاتی و جسمی رجحانات

(۳) اقتصادی رجحانات

(۴) نفسیاتی رجحانات

(۵) اجتماعی رجحانات

ہم سلسلہ وار اِن تمام رجحانات سے بحث کریں گے۔

۱۔ نسلی و قومی رجحانات۔ اس مذہب کے معتقدین کا قول ہے کہ جماعتوں کی پراگندگی نسلی خوبیوں کے فقدان اور قومی امتیازات کے ضائع ہو جانے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اقوام اختلاط و امتزاج کی وجہ سے انحطاط پذیر ہونے لگتی ہیں۔ کیونکہ اس کی وجہ سے اُن کی صفاتِ رئیسہ ـــ جن پر قوموں کا تمدن قائم ہوتا ہے ـــ مفقود ہو جاتی ہیں۔ مشہور جرمن فلسفی "نیٹشے"، بھی اسی مذہب کا موید ہے، اُس نے کہا ہے :-

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جماعتوں پر ابتدا سے انتہا تک انقباض و پستی کا احساس چھایا رہتا ہے .... یہ احساس مختلف اسباب سے پیدا ہوتا ہے، کبھی مختلف نسلوں کے اختلاط سے پیدا ہوتا ہے کبھی متباین طبقات کے ایک جماعت میں امتزاج .... کبھی اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ قوم ترکِ وطن کر کے کسی ایسی سرزمین میں جا کر آباد ہو جاتی ہے جو اس کے مناسبِ طبع نہیں ہوتی، یا قوم میں مقامی خصوصیات سے تاثر کا مادہ نہیں ہوتا، اور کبھی خرابیٔ صحت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جو بعض امراض مثلاً ملیریا اور انفلوانزا وغیرہ کی کثرت پر مبنی ہوتی ہے ...."

۱؎ ظاہر ہے کہ نیٹشے یورپ میں روحِ جمہوریت کی تعمیم اور اعلیٰ طبقات کے سایۂ عاطفت کے ارتفاع کا مخالف ہے اُس کی رائے میں طبقات کا تباین، نسل و وطن کے اختلاف پر مبنی ہے۔ اُس کا قول ہے کہ "انیسویں صدی میں یورپ پر جو تاریک بادل چھا گئے ہیں اور جو بدنصیبی وہاں عام ہو گئی ہے وہ دراصل متباین طبقات کے باہمی اختلاط و امتزاج کا نتیجہ ہے۔ یہ امتزاجِ باہمی اچانک اور عجیب و غریب تیزی کے ساتھ اتمام پذیر ہو گیا ـــ"

بالجملہ اس رائے کے مطابق قوموں کے انحطاط اور تنزل کا مرجع نسل اور اُس کے امتیازات ہیں۔ مگر نسلی امتیازات مبہم کو ماسوا سے جدا کر کے نمایاں کرنا ایک دشوار امر ہے۔ بلکہ بعض علمائے اجتماعیات کا تو یہ خیال ہے کہ ایسی نسلیں جن کی صفات متعین و مخصوص ہوں سرے سے مفقود ہیں کیونکہ نسلیں بھی ہر وقت مسلسل انقلابات کی آماج گاہ بنی رہتی ہیں۔

مگر مشہور ماہر اجتماعیات موسیو ٹارڈ (Tarde) نے تصریح کی ہے کہ نسلوں کا امتزاج تو الٹا ایجاد و اختراع کی قوتوں کی آبیاری کرتا ہے۔ لکھا ہے :-

"اقوام مغرب گزشتہ چند صدیوں میں بالعموم اختلاط و امتزاج کی زیادتی میں پیش پیش رہی ہیں اور کوئی شک نہیں کہ اس کی وجہ سے ان میں ایجاد و اختراع کی قوت کافی ترقی کر گئی۔ جب کوئی قوم ترقی کر جاتی ہے تو اس میں نسلی تعصب کمزور پڑ جاتا ہے۔ ماضی کی طرف نظر ڈالیے ـــــ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہر قوم اس تمدن کی حفاظت کر رہی ہے جو اس کی جانب منسوب تھا اور نسلی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ لیکن مستقبل کے تصور سے جو منظر سامنے آتا ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ مستقبل میں تمدن ـــــ اپنے وسیع ترین مفہوم کے ساتھ ـــــ قوموں کو متاثر کرتے ہوئے اور انہیں باہم رشتۂ اتحاد میں منسلک کرتے ہوئے نظر آتا ہے تاکہ جدید لوچدار اقوام پیدا ہو سکیں جو مادی و ادبی حالات کے انقلابات سے تاثر کی کافی صلاحیت رکھتی ہوں۔"

۲۔ **حیاتی و جسمی رجحانات**۔ اس ذیل میں وہ اسباب شامل ہیں جو اصولِ حیاتی کے عمل سے پیدا ہوتے ہیں۔ "اصولِ حیاتی" سے وہ اصول مراد ہیں جو ذی حیات کائنات پر منطبق ہوتے ہیں اور ان میں اصولِ وراثت کو خاص درجہ حاصل ہے۔

ایک ماہر اجتماعیات نے بعض ادنیٰ اقوام کو "طفیلیتِ اجتماعیہ" Parasitisme [illegible]ial کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ اور وہ پست اقوام میں فقر و فاقہ اور بد اخلاقی کی موروثیت اور آفات و مصائب کے تواتر و عمومیت سے پیدا ہوتی ہے۔ مگر خود یہ سبب اقتصادی حالات اور تقسیم دولت کے عدم تناسب کا نتیجہ ہے پس ہر طبقہ اپنے پیشرو سے صفاتِ رذیلہ میراث میں پاتا ہے اور اُن پر خود اُن صفاتِ قبیحہ کا اضافہ کرتا ہے جنہیں اُس نے اپنی حیات کے دوران میں اکتساب کیا ہو۔ اس طرح نسلاً بعد نسلٍ اُس کی پستی اور بدنصیبی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

یہ نظریہ ادنیٰ طبقات کے اعتبار سے ہے۔ لیکن اس قسم کا انحطاط صرف ادنیٰ طبقات کے ساتھ مخصوص نہیں

---

[1] "طفیلی" "مہمانِ ناخواندہ" کو کہتے ہیں۔ اکثر ضعف و انحطاط کی کثرت سے پسماندہ جماعتوں میں بعض ایسے طبقات پیدا ہو جاتے ہیں جو صرف دوسروں کے بھروسے پر زندگی کے دن پورے کر سکتے ہیں۔ اسی مفہوم کو پیشِ نظر رکھ کر یہ اصطلاح استعمال کی گئی۔

ہے۔ بلکہ اعلیٰ اور صاحبِ ثروت طبقات میں بھی اس کا اثر و نفوذ پوری طرح کام کرتا رہتا ہے۔ اور جیسے جیسے ان کی فارغ البالی اور بے فکری میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اسی تناسب سے وہ خواہشاتِ نفسانی اور عیش پرستی کے جذبات سے متاثر ہوتے چلے جاتے ہیں!

۳۔ **اقتصادی رجحانات** ۔ وہ اقتصادی اسباب جو جماعتوں کو مائل بہ انحطاط کر دیتے ہیں مختلف ہیں۔ ہم یہاں اُن میں سے صرف اسرافِ ثروت اور اوہامِ اقتصادی کا تذکرہ کریں گے جن کا اثر تمام ترجیحاتِ اجتماعی میں عام ہوتا ہے مثلاً اُن ممالک میں جو صنعتی و مادی ترقی کے اعتبار سے ہنوز عالمِ طفولیت میں ہیں، واضعینِ قانون کا آزاد۔ یعنی چنگی کے محصول سے مستثنےٰ۔ تجارت پر اعتقاد رکھنا بعض اوقات خطرناک نتائج کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح محصولات کی اس قدر زیادتی جسے عوام برداشت نہ کر سکیں، یا صنعتی نظام، اور اُس کا چند مخصوص طبقات میں موروثی انحصار (جس طرح قرونِ وسطیٰ میں یورپ کا حال تھا) یا اس کے علاوہ دوسرے اقتصادی اسباب بھی مخدوش نتائج کا بہانہ بن جاتے ہیں۔

۴۔ **نفسی رجحانات** ۔ وہ روابطِ معنویہ جو انسان کو ایک مخصوص ماحول کا پابند کر دیتے ہیں بے شمار اور مختلف الانواع ہیں۔ کیونکہ انسان ہر جانب سے غیر محسوس قیود میں جکڑا ہوا ہے —— جن کی تفسیر ضمیر، رسم و رواج، سماج اور حکومت وغیرہ کی قیود سے کی جا سکتی ہے —— بالفاظِ دیگر سماج میں تعاون اور ارتباطِ باہمی کی صورتیں متعدد اور مختلف ہیں۔ اس لئے جب یہ روابط و قیودِ معنویہ داخلی یا خارجی اسباب کی وجہ سے ضعیف ہو جاتے ہیں تو لازمی طور پر جماعت میں پراگندگی و انتشار کا نفوذ ہو کر بالآخر اس کا شیرازہ بکھر کے رہ جاتا ہے۔

یہ صحیح نہیں کہ قوتِ تعاون [illegible] طور پر افراد کی شخصیتوں کو ضائع کر دیتی ہے بلکہ ایجاد و اختراع اور استنباط کی قوتیں حیاتِ اقوام کے لئے اسبابِ ضروری میں شامل ہیں اور جب کوئی قوم محض قدامت پرستی پر جھک پڑے گی تو اُس کے اندر ایک ایسا جمود پیدا ہو جائے گا جسے انحطاط اور موت کا پیش خیمہ کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے شخصی آزادی اور انفرادی استقلال کا ضعف بھی حیاتِ امم کے لئے سخت ترین خطرے کی علامت ہے۔

قوم کی زندگی کے لئے اپنے نفس اور اپنی قوتوں پر اعتماد کا احساس اور اپنے اخلاق و عادات اور رسم و رواج پر اعتقادِ جازم لازمی ہے اگرچہ یہ حقیقی طور پر صحیح نہ ہو۔ اِس لئے جب یہ اعتقادات و احساسات ضعیف ہو جاتے ہیں —— خواہ مزعومہ عقائد کے زوال کی وجہ سے، خواہ غلط عقائد اور رسم و رواج کی کورانہ تقلید سے بیزاری کے سلسلہ میں (جب لوگوں کے عقیدے اور عمل میں غیر معمولی افتراق حائل ہو جائے) —— تو وجدانِ اجتماعی —— یعنی وہ رابطۂ معنویہ جو افراد

کو باہم مربوط رکھتا ہے ـــــ پراگندگی اور انتشار کی جانب مائل ہو جاتا ہے، اور افراد ایک "اضطرابِ نفسی" کی حالت میں مبتلا ہو جاتے ہیں جو ذاتی اعتقادات اور اُن اعمال کے تصادم کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جنہیں سماج میں اپنے وجود کی بنا پر قبول کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔

۵۔ اجتماعی رجحانات۔ جرمن ماہرِ اجتماعیات سائمل (Simmel) نے اس قبیل کے ایک سبب کا تذکرہ کیا ہے۔ لکھتا ہے:-

> "بسا اوقات طبقاتِ اجتماعی میں سے کوئی طبقہ نہایت سرعت کے ساتھ نشو و نما پاتا ہے اور دوسرے طبقات پر متسلط ہو کر کوس "انا و لاغیری" بجانے لگتا ہے۔ حالانکہ اُس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ ایک کثیر الاعضا جسم میں محض عضوِ واحد کی ہو سکتی ہے۔ جس طرح بعض اقوام میں اربابِ حکومت کا نظام اس قدر وسیع ہوا کہ وہ یہ سمجھنے لگے کہ حیاتِ اجتماعی کا دار و مدار صرف اُن پر ہے اور وہی مقصود بالذات ہیں۔ درآنحالیکہ حقیقتاً ان کی حیثیت حصولِ مقصود کے لئے ایک وسیلہ سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ یا مثلاً جس طرح کسی زمانے میں فوج کا یا مذہبی علماء کا دور دورہ رہا ہے .... وغیرہ وغیرہ۔

ایک دوسرے اجتماعی نے فتح و استعمار کی تاثیر کو اس کا سبب قرار دیا ہے۔ ایک قوم کے دوسری قوم پر تسلط سے عقائد، عادات، اور تمام مظاہرِ تمدن میں تنافر پیدا ہونا لازمی ہے۔ اس لئے کہ مفتوح قوم کو فاتح کا تمدن اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے گا تو بلاشبہ اُس کی معاشرت اور اُس کے حالات میں ایک شدید معنوی اضطراب برپا ہو جائیگا کیونکہ مدنیت ہر قوم میں بتدریج نشو و نما پاتی ہے اور وہ درحقیقت افرادِ قوم کے احساسات، معتقدات اور اعمال کا نچوڑ ہوتی ہے۔ لہذا جب اُسے میلانِ طبعی کے خلاف کسی راستہ پر ڈالا جائے گا تو اس میں اختلال کا نفوذ یقینی ہے۔

اس موقع پر ہم اجتماعی ترقی و تنزل کے متعلق چند اصول بیان کرنا چاہتے ہیں مگر اس سے پہلے ترقی و تنزل کی تعریف کر دینا لازمی ہے گو یہ تعریف اجمالی ہو گی کیونکہ ان کی تعریف اُن مسائل میں سے ہے جن میں علما شدید اختلاف رکھتے ہیں۔ چنانچہ کہا جا سکتا کہ "انقلابِ ارتقائی" کی تحت میں آگے بڑھنے، ابھرنے، خوبیاں حاصل کرنے، اور امتیاز پیدا کرنے کی دُھن، اور افراد اور ان کے فرائض میں مستقل تطبیق کو جگہ دے سکتے ہیں۔ رہا تنزل یا ترقیِ معکوس تو عملاً اُس کی یہ تعریف ہو سکتی ہے کہ رجعت پسندی، قدامت پرستی، انحطاط، ضعف، اور پراگندگی کے جذبات کے مجموعہ کو

"تنزل" کہتے ہیں۔ اس بحث میں پہلا کلیہ یہ ہے کہ:-

"ہر ترقی کے لئے ایک تنزل لازمی ہے"

اس کا یہ مطلب ہے کہ موجودہ نظاموں کا فنا ہوجانا لابدی ہے تاکہ ان کی بجائے دوسرے نئے نظام قائم ہوسکیں اس لئے ہر نئی اصلاح اور تبدیلی ایک "تنزلِ مقامی" کو چاہتی ہے۔

دوسرے کلیہ کو "اصولِ بقائِ اثری" کہہ سکتے ہیں۔ اس کا ماحصل یہ ہے کہ جس طرح ترقی، اُن افراد یا عادات میں جن کا تبدیل کرنا یا ترک کرنا مقصود ہوتا ہے، تنزلِ مقامی کا مطالبہ کرتی ہے اسی طرح ان افراد یا عادات کے قطعًا فنا ہوجانے سے کچھ پہلے تک اُن کے اثرات کا باقی رہنا ضروری ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ عمومًا ایک ہی زمانہ میں متعدد اضداد ملتے ہیں۔

یہ وہ اہم اسباب و رجحانات ہیں جنہیں مختلف ماہرین نے بیان کیا ہے۔ ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ بحث میں حتی الامکان اختصار کو ملحوظ رکھیں۔ کیونکہ اسے ایک ہی مضمون میں ختم کرنا تھا۔ اور خصوصًا اس وجہ سے کہ یہ موضوع اُردو کے لئے بالکل نیا ہے اور ہماری زبان کی علمی بے مائگی جہاں جہاں اظہارِ مافی الضمیر میں حایج ہوجاتی ہے وہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں۔

ہمارے خیال میں نفسی اور اجتماعی رجحانات باقی کے مقابلہ میں زیادہ قابلِ توجہ ہیں۔ کیونکہ غیر محسوس روابطِ اجتماعی ہی فی الحقیقت سماج کی حفاظت کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اور جماعتوں کی زندگی تمام تر انہیں کی رہینِ منت ہے۔

منظور سروش (بھوپالی)

غزل

تمہیں عذرِ جفا کی کیا ضرورت، تم ستم گر ہو
تمہیں خوفِ خدا سے کیا تعلّق، دل کے پتّھر ہو

تمنّائے ترحّم کیا کہوں، ہمّت نہیں پڑتی
تقاضائے توجّہ کیا کروں، غفلت کے خوگر ہو

ستم جائز، جفا جائز مگر انصاف نا جائز
نرالے عدل پرور ہو، انوکھے داد گستر ہو

معاذاللہ، تلوّن سا تلوّن ہے معاذ اللہ
ابھی فرشِ زمیں پر تھے، ابھی عرشِ بریں پر ہو

خوشا وہ دن کہ دل تشویشِ مرگ و زیست سے چھوٹے

رعنا کی ٹوپی

تواترات سے یہ حدیث پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ سید محمد ہاشم رعنا دہلوی اب سے بیس پچیس برس پہلے ریاست حیدرآباد دکن کے ایک منصب دار ضرور تھے۔ سید صاحب اپنی نوعیت یا خلقت کے اعتبار سے عجیب المخلوقات ہونے کا درجہ رکھتے تھے کیونکہ آپ کا بایاں ہاتھ دہنے ہاتھ سے بہت چھوٹا بلکہ بدنما معلوم ہوتا تھا جسے وہ ہمیشہ نہایت پابندی کے ساتھ اپنی اچکن کی جیب میں چھپائے رکھتے تھے۔ اس ہاتھ کی ہتھیلی انگوٹھا اور چاروں انگلیاں تھیں تو ضرور، مگر بالکل ننھی ننھی حقیر حقیر جیسے کسی چار برس کے بچے کی ہوں۔ اس لئے یہ ہاتھ اُن کے تمام جسم کے مقابلے میں بہت ہی کچھ نفرت انگیز تھا، جو پیدائشی گھنا گیا تھا۔

باقی تمام حلیہ شریف اُن مرحوم اور لاثانی طباع نوجوان کا بہت اچھا تھا۔ ماتھا اور پیشانی، نہایت ہی بلند بلکہ سر اتنا بڑا کہ بازار سے خریدی ہوئی ٹوپی بڑی تلاش کے بعد اُن کے فرقِ مبارک پر ٹھیک آتی۔ آپ حیدرآبادی اچکن یعنی شیروانی پہنتے تھے مگر بغیر کف اور کالر کے۔ پاجامے کی جگہ نہایت دبیز جین کی سفید پتلون ہوا کرتی تھی جس پر پیٹی یا گیلس کبھی نہیں لگاتے تھے۔ پاؤں میں بوٹ اور دہنے ہاتھ میں ایک بانکی چھڑی اور رومال۔ ہاں البتہ ان کی گھڑی کی زنجیر خالص سونے کی تھی، جسے بمبئی والے چھپڑا بولتے ہیں۔ آندھی جائے مینہ جائے مگر سونے کی زنجیر جیب سے باہر ضرور لٹکتی رہتی۔

چہرہ ان کا نہایت وجیہہ، شاندار، بانکی مونچھیں، بڑی بڑی سیاہ اور روشن آنکھیں، رنگ کسی قدر سانولا اور عمر زیادہ سے زیادہ تیس بتیس برس کے لگ بھگ۔ بلاخوفِ تردید کہا جاتا ہے حکیمانہ طبیعت کی براقی کا یہ عالم تھا کہ اگر رعنا یورپ میں پیدا ہوتے تو یقیناً وہ آج دنیائے علم کے مانے ہوئے موجد قرار پاتے۔ وہ اکثر خاموش رہتے اور فطرت کی صناعیاں انہیں گھنٹوں دوسری طرف متوجہ ہونے نہ دیتیں۔

ہاں البتہ جب سے انہیں شعر و شاعری کا چسکا پڑا اُس وقت سے وہ کچھ دوسرے آدمی معلوم ہونے لگے تھے۔ اُن کی شاعری کا درجہ اُن کا مختصر کلام بتا سکتا ہے۔ مگر اُس وقت بھی علامہ شبلی نعمانی مرحوم کا حاضر مشاعرہ اور ۲۲ نوعمر شعرا کے زمرے میں صرف اکیلے رعنا ہی کا سنہری تمغہ اور انعام حاصل کرنا صاف بتا رہا ہے کہ رعنا ایک منفرد روزگار

ہستی لے کر آئے تھے۔ مگر افسوس دنیا کی نظر کھا گئی اور ایسا یگانۂ روزگار جوہرِ قابل چند ہی سال بعد چپٹ پٹ ہو کر رہ گیا۔

بڑے آغا کا بیان ہے کہ ایک دن صبح ہی صبح رعنا میرے پاس نہایت خوش خوش آئے۔ آتے ہی ٹوپی اتار کر پھینک دی اور بڑی پاٹ دار آواز میں فرمانے لگے "لیجئے استاد! اب میں آپ کو امیر کبیر بنا دوں گا تمام دنیا کا زر دہیرا مال ہے۔ تمام دنیا کے زرد اور بے ڈول موتی اب میں سفید کر دوں گا۔ لائیے تو ر مے کا ہاتھ ———

واقعی اُن کے اِس دعوے کی صداقت چند ہی روز میں ظاہر ہو گئی اور حیدر آباد، بمبئی، کلکتے کے بڑے بڑے جوہری اُن کے دروازے پر بھکاریوں کی طرح آ کر پڑاؤ ڈالنے لگے۔ چند ہی روز میں رعنا ان سب کے استاد تھے اور رات دن دولت میں کھیلتے تھے۔

مگر افسوس اِس تمولِ غیر ضروری نے اُن کو شراب کی وحشت لگا دی، اور اسی نخنکاری نے آخر اُن کی جان لے لی

ایک روز کا ذکر ہے کہ رعنا نہایت پریشان حال بال بکھرے آنکھیں چڑھیں، جو کئی راتوں کی بے خوابی اور شراب نوشی کا نتیجہ تھا پھر تشریف لائے اور فرمانے لگے "استاد سنا آپ نے میں اک ایسا عجیب آلۂ پرواز بنانا چاہتا ہوں جس سے انسان آسمان پر اُڑنے لگے"

بڑے آغا بولے "کیا خوب ؎

تو کارِ زمیں را نکو ساختی ۔۔۔ کہ با آسمان نیز پرداختی

بھلے آدمی عقل سے ایک جگہ بیٹھ اور دوسروں کو بھی چین لینے دے"

رعنا نے کہا "واہ کیا خوب آپ نے داد دی ہے میرے ایجاد کی؟ اجی حضرت! میں آدمی کو ایک پرند کی طرح آسمان پر اُڑا دینے کی فکر میں ہوں"

بڑے آغا "سبحان اللہ! ابھی سچ مچ بڑی دور کی تی لائے۔ خدا بیان تو کیجے وہ کیونکر؟"

رعنا چلا کر کہنے لگے! "سنئے صاحب! کبھی آپ نے چیل کی پرواز پر بھی غور کیا ہے چیل ہی چیل جو آسمان پر اڑتی ہے؟ اس پر غور کیجئے۔ دیکھئے تو کیا بے تکان پرواز ہے؟ جس طرح کوئی سمندر میں تیرتا چلا جاتا ہے۔ ذرا ایک پر مارا اور دوسری شکل اختیار کر لی بس میں اسی چیل کی صورت کا ایک آلۂ پرواز بناؤں گا نہایت سبک اور ہلکا۔

بڑے آغا۔ میاں مجھے یہ خوف ہے کہ لوگ تم کو شرابی تو کہنے ہی لگے کہیں پاگل اور سودائی بھی مشہور نہ ہو جاؤ"

رعنا۔ بس یہی تو مصیبت ہے۔ اس ملک میں مجھ جیسے دماغ کے آدمی کا پیدا ہونا بھی بڑی بھاری مصیبت ہے۔

استاد میں آپ سے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ آدمی ہوا پر اڑ سکتا ہے اور میں اُس کو ضرور آسمان پر اڑا دوں گا!"

یہ واقعہ تقریباً تیس برس کا ہے جب کہ یہی مہاراجہ سرکشن پرشاد جواب حیدرآباد کے وزیر اعظم ہیں ہیں اُس زمانے میں بھی وزیر دکن تھے۔ انہیں مہاراجہ بہادر کے شاندار مشاعروں میں رعنا نے مرحوم مع اپنے استاد بڑے آغا کے بڑے ذوق شوق سے شریک ہوتے تھے۔ بلکہ اس قدر آپس میں دانت کاٹی روٹی ہوگئی تھی کہ اس زمانے میں رعنا مرحوم استاد ہی کے ہاں ہمہ وقت رہنے لگے تھے۔

یہ ایک ہاتھ کے آدمی تو ضرور تھے لیکن ان کی ہر بات ایک چٹکلہ اور کس اک دل خوش کن پھبتی ہوتی تھی، اس لئے استاد بھی انہیں بہت ہی عزیز رکھتے تھے اکثر راتوں کے دو دو بج گئے ہیں اور یہ بندۂ خدا اُن کے پاس سے اُٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ اب استاد ہیں کہ جز بز ہو رہے ہیں۔ انہیں دھکے دے رہیں مگر یہ ہیں کہ وہیں بیٹھے چہک رہے ہیں۔ خدا خدا کر کے دو بجے اُٹھ کر گھر گئے ـــــ تو ابھی صبح کے ۵ نہیں بجے کہ قضائے مبرم کی طرح پھر آدھمکے۔ اب استاد کا دروازہ معمور ہے۔ پھاٹک بند ہے مگر رعنا ہیں کہ برابر ادھر سے اُدھر ٹہل رہے ہیں اور یہ مصرع لہک لہک کر پڑھتے جاتے ہیں۔ ع

کب اُٹھے پیر مغاں کب میکدے کا در کھُلے

غرض یہ تھے استاد شاگرد دونوں کے اخلاص و محبت کے مدارج۔ مگر باایں یگانگت بڑے آغا میں بھی ایک سخت عیب تھا جس سے رعنا نے مرحوم بہت پریشاں اور نالاں رہتے تھے۔ وہ یہ کہ جب کبھی یہ پا پیادہ سیر کو نکلتے یا بازار میں کچھ خرید کرنے جاتے اور رستہ چلتے احباب میاں رعنا سے علیک سلیک کر کے اپنی راہ لگتے تو اُسی وقت اُن کے استاد انہیں آواز دے کر پاس بلاتے اور جب وہ پھر قریب آکھڑے ہوتے تو یہ میاں رعنا کا وہی لنجا ہاتھ جسے وہ زخم کی طرح اپنی اچکن کی بغلی جیب میں ہمیشہ چھپائے رکھتے تھے۔ زبردستی نکال کر انہیں دکھا دیتے اور اُن سے کہتے کہ صاحب ان کا یہ تحفہ بھی دیکھتے جائیے۔ اس پر وہ دوست تو خیر ہنستے مسکراتے چلے جاتے مگر میاں رعنا پھر دس دس منٹ تک اپنے اوسانوں میں نہ رہتے۔ بار بار بگڑ بگڑ کر نیچے میں آ آ کر استاد کی جان کو آجاتے۔ آپ نے یہ کیا ذلت خیز مذاق اختیار کیا ہے؟ آپ کو میری اس توہین سے کیا فائدہ ہوتا ہے؟ اس پر ان کے استاد ہنس کر فرماتے۔ نہیں بھئی حاشا وکلا جو اس مزاح سے تمہاری اہانت یا خدانخواستہ کسی قسم کی ذلت مجھے مقصود ہے۔ میں تو تمہارا حسن باطن لوگوں کو دکھانا چاہتا ہوں۔ مرد خدا اس میں تمہاری اہانت ہی کیا ہے؛ خدا نے جسے جیسا بنا دیا ویسا بنا دیا۔ غریب رعنا اپنی تمام طراری اُس وقت بھول جاتے اور خون

کا سا گھونٹ پی کر چار و ناچار یہی کہتے - اچھا حضرت! مجھ سے اگر عمر بھر میں کوئی غلطی ہوئی ہے تو یہی کہ میں آپ جیسے
مردم آزار کا شاگرد ہو گیا۔ رفتہ رفتہ بات آئی گئی ہوتی اور پھر وہ دونوں ایک دوسرے کے بدستور گرویدہ ہو جاتے -
دوسری شکایت انہیں رعنائے مرحوم کو اپنے استاد سے یہ تھی کہ میرے منہ اور پیٹھ پیچھے آپ میری اس قدر تعریف
کرتے ہیں تو پھر مجھے اپنے استاد بہادر فصیح الملک داغ دہلوی کی زیارت کیوں نہیں کراتے جس کے لئے میں بار بار
آپ سے استدعا کر چکا ہوں۔ اس شکایت کا ہمیشہ یہی حشر ہوتا کہ بڑے آغا پھر کسی دوسرے وقت پر ٹال دیتے۔
یعنی اگلی اتوار، اگلے جمعے، اگلی جمعرات کو تمہیں حضرت کی خدمت میں ضرور لے جاؤں گا۔ بھائی نواب فصیح الملک
داغ ایک سرکار ہیں سرکار - وہاں ہر وقت بڑے بڑے جنگ دولہ لکھے پڑھے آدمیوں کا مجمع رہتا ہے۔ وہاں ہم جیسے
بے سواد سطحی نظر سے دیکھنے والے کس شمار و قطار میں - رعنا جواب دیتے کیا خوب؟ گویا ہم بالکل جاہل محض، کندۂ
ناتراش، ذلیل، ناکارہ، لفنگے ہیں جن کی کوئی عزت ہی نہیں - بس جنگ دولہ ہم جب تک نہ ہوں جب تک
وہاں ہم جا بھی نہیں سکتے - اصل میں بات جس کی جتنی ہو اتنی ہی کہنی چاہئے - ہمارے خیال میں بڑے آغا کا یہ عذر
لنگ فی الحقیقت قابلِ قبول نہ تھا - ہو نہ ہو وہ بھی رعنائے مرحوم کے اسی لنیجے ہاتھ کی وجہ سے انہیں وہاں لے جاتے
ڈرتے ہونگے - نہیں تو رعنا جیسا بلبلِ ہزار داستان اگر ایک دفعہ بھی نواب فصیح الملک داغ دہلوی کی انجمن میں چلا
جاتا اور چند تعریفی جملے اُن کی شان میں کہہ دیتا تو وہ تو اُس کے سچ مچ دیوانے ہو جاتے - کیونکہ حضرت داغ مرحوم
پرانی وضع کے بزرگ تھے جو بالکل سیدھے سادھے اور بھولے بھالے تھے - ہم نے بچشم خود میر احسن لکھنوی کو اُن
کے سامنے بارہا بے پر کی اڑاتے دیکھا ہے - جہاں سرکار سرکار کہہ کر انہیں مخاطب کیا اور وہ بہشتی اُن کے سفید
سے سفید جھوٹ پر بھی آمنا صدقنا کرنے لگتے تھے - بات وہی تھی کہ بڑے آغا سید صاحب کے اُسی لنیجے ہاتھ سے
اس قدر خائف تھے کہ وہ انہیں وہاں لے جاتے ہوئے اپنا مضحکہ سمجھتے تھے - واقعات کی ان کڑیوں کو ملا لینے کے
بعد اب اُس امرِ عظیم اور واقعۂ کبریٰ کے دیکھنے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے جو اس کے بعد پیش آیا۔

چنانچہ ایک دن اتفاق سے سرِ شام رعنا اور اُن کے استاد بڑے آغا دونوں ایک حیدر آبادی ٹانگے میں
بیٹھے ہوئے افضل گنج کے پل پر سے گذرتے ہیں جسے وہاں جھٹکہ کہتے ہیں - شامتِ اعمال سے آج سید صاحب
کچھ ذوق شوق بھی منائے ہوئے تھے اور ٹھیک عالمِ سرمستی میں قہقہے لگاتے شہر سے دار الشفا اپنے مکان کی طرف
مراجعت فرما رہے تھے جو یکایک آغا صاحب کی زبان سے نکلا - دیکھو رعنا یہ ہے وہ افضل گنج کا پل یہ اسی ظالم
موسیٰ ندی پر بنا ہوا ہے جو ہر سال اس قدر چڑھتی ہے کہ بہت سی بے گناہ جانیں تلف

ہو جاتی ہیں۔

رعنا افضل گنج کے نام پر دفعتہً سرودِ مستاں یاد دہانیدن کی جھلک دکھاتے ہوئے "جی ہاں، افضل گنج وہی نا جہاں آپ کے استاد حضرتِ داغ بھی رہتے ہیں؛ بس جناب بہت دن وعدے وعید میں گذر گئے۔ سالہا سال آپ کی منتیں کرتے بیت گئے۔ خوب یاد دلایا آپ نے اب میں ایک انچ آگے نہیں بڑھوں گا۔

ٹانگے والے، او ٹانگے والے بس موڑ دے ٹانگا پیچھے" اب آغا صاحب کو اپنی غلطی محسوس ہوئی۔ ہر چند انھوں نے سمجھایا "رعنا بھائی یہ وقت استاد کے ہاں جانے کے لئے مناسب نہیں۔ تم دیکھتے نہیں جھٹ پٹا ہو چکا ہے شاموں شام نمازِ مغرب کا وقت ہے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں اس وقت استاد نماز میں مصروف ہونگے۔ اس وقت اُن سے ملنا نہ ملنا بے کار ہے" مگر پڑھے جن کب مانتے ہیں۔ وہ جھٹ ٹانگا روک اتر کھڑے ہوئے اور کہنے لگے "لیجئے آپ نہیں لے جاتے تو میں خود چلا جاتا ہوں۔ دیکھوں تو مجھے کون وہاں سے نکال دیتا ہے"۔ لاچار سنگ آمد سخت آمد اب تو بڑے آغا کو بھی اترنا پڑا اور دونوں آگے پیچھے آہستہ آہستہ نواب مرزا خاں داغ مرحوم کے دولتکدے پر جا پہنچے۔ یہ وقت شام کا تھا۔ چراغ جل چکے تھے۔ موسم گلابی جاڑوں کا تھا۔ اس لئے استاد داغ مرحوم اوڑھے لپٹے ـــــــ ایک چھوٹے سے کمرے میں گاؤ تکیے سے لگے بیٹھے تھے اُن کے سامنے پیچوان تھا۔ لمبی سٹک کی دستی اُن کے ہاتھ میں تھی۔ اور وہ آہستہ آہستہ کش لگا رہے تھے۔ چونکہ یہ کمرہ بہت چھوٹا تھا جس کا ایک حصہ ایک چھوٹی سی الماری نے بھی لے لیا تھا جس پر ایک بڑا انبار کتابوں کا لدا ہوا تھا۔ اس لئے صرف دو تین استاد کے قریب دو زانو تھے۔ کمرے کا دروازہ دالان میں کھلتا تھا۔ اس چھوٹے سے دروازے میں ایک سبز رنگ کی چلمن لپٹی ہوئی اس طرح رکھی تھی جیسے ہوا کا ایک جھونکا بھی نیچے گرا سکتا تھا۔ عین دروازے سے لگے ہوئے تین چار جنگ اور دولہ بیٹھے تھے۔ درباری پگڑیاں سروں پہ، شیروانیاں گلے میں، شیروانیوں پر سنہری پیٹیاں باندھے بڑے ادب قاعدے سے استاد کی باتیں سُن رہے تھے۔ اتنے میں بڑے آغا بھی میاں رعنا کو لئے سامنے جا پہنچے۔ دونوں نے جھک کر استاد کو سلام کیا۔

استاد نے نہایت اخلاق سے سلام کا جواب دے کر بڑے آغا کو اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ اشارے کے ساتھ ہی وہ اُس چھوٹے سے دروازے سے جھک کر گذرے اور عین استاد کے قدموں میں دو زانو جا بیٹھے پُر نشست اور جگہ لینا صرف ایک منٹ کا کام تھا۔ اب رعنا صاحب کی سنئے۔ وہ دروازے کے اندر تک تو اسی طرح سمٹے سمٹائے بڑے آغا کے ساتھ آئے لیکن جونہی کہ وہ سکڑ سکڑا کر نہایت ادب سے استاد کے قدموں

میں بیٹھ گئے۔ یہ چٹ اپنا ہاتھ اُن کی گرفت سے چھڑا بجلی کی طرح تڑپ کر اُسی شان سے اپنا دہنا رخ آگے کو نکال عین استاد کے روبرو دوزانو جا بیٹھے۔ ان کو یوں یکایک الگ ہوتے اور اچک کر ایک طرف جگہ لیتے ہوئے دیکھ کر لامحالہ استاد کو پوچھنا پڑا آپ کی تعریف؟

اب قابلِ غور معاملہ ہے۔ داغ صاحب جہاں استاد نواب فصیح الملک بہادر کی پیشی ہے، اردو زبان کا مسلم الثبوت استاد سامنے ہے، کئی رئیس زادے معززترین لوگ دست بستہ نگاہوں ہی نگاہوں میں ہر نقل و حرکت کو بھانپ رہے ہیں، استاد کی شاگردی اور پھر پرشاگردی کا معاملہ ہے، بے چارے بڑے آغا کی سٹی گم ہو گئی، اب کہیں تو کیا کہیں۔ چاروناچار انھوں نے دبی آواز سے کہنا شروع کیا۔ یہ سید صاحب میرے ایک عزیز دوست ہیں۔ آپ کو اک مدت سے حضور کی زیارت کا شوق تھا، آج اتفاقاً ادھر سے گزر رہے تھے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ انہیں آپ کی خدمت میں حاضر کردوں۔

اس کے جواب میں حضرتِ داغ ابھی کچھ کہنے بھی نہ پائے تھے جو رعنا صاحب فوراً بول اُٹھے۔ نہیں جناب! مجھے معاف کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں آپ کا ادنیٰ ترین شاگرد ہوں (آغا کی طرف اشارہ کرکے) ایک مدت مدید سے حضرت کا اشتیاقِ دیدار رکھتا تھا، بارہا استاد صاحب سے منتیں کیں مگر کبھی دعا قبول نہ ہوئی۔ آج حسنِ اتفاق سے اِدھر سے گزر رہے تھے جو مجھے یاد آگیا اور میں سواری سے اتر کر استاد صاحب کو بھی کشاں کشاں یہاں لے آیا ——— قہقہہ ———

استاد۔ اخاہ! ماشاء اللہ چشم بددور ع

سایۂ کہ کوست از بہارش پیدا

کیوں بڑے آغا! آخر مرثیہ خواں ہونا۔ بازو کو بھی ہر وقت ساتھ ہی رکھتے ہو؟

اِس تعریض پر بڑے آغا تو بیچارے ایسے لئے گئے کہ کاٹو تو خون نہیں۔ ساری سبھا میں تھڑی تھڑی ہوگئی کہ واہ کیسے لائق شاگرد اور کتنے کذبِ مجسم استاد ہیں؟ مگر اب ہو کیا سکتا تھا آخر غریب ایک روکھی سی ہنسی ہنس کر خاموش ہو رہے۔ اِس کے بعد کچھ اور اور تذکرے شروع ہو گئے۔

غلیل اور بھٹکلے کی تحقیق ہونے لگی۔ استاد داغ نے فرمایا غلیل بانس کی ایک لچکدار چیز کا نام ہے جس کا ہر حصہ جدا ہے جس مقام پر تانت بندھی ہوتی ہے اور تانت کی دونوں لڑیوں میں فصل قائم کرنے کے لئے ایک اور بانس کی پچر باندھ دی جاتی ہے۔ اس کا بھی نام ہے جسے نہ کہتے ہیں۔ جہاں کپڑا لگا ہے اور جس میں غلہ رکھ کر

چلایا جاتا ہے اُس کو بھٹکلہ بولتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی بچڑاور ہوتی ہے جو ہر حرکت پر متحرک رہتی ہے اس کو نرتُنا کہا جاتا ہے۔

تمام حاضرین کے ساتھ رعنا بھی اس گفتگو او تحقیق کو بڑی مسرت اور توجہ سے سنتے رہے لیکن اُن کے استاد کا دل ٹھکانے نہ تھا۔ وہ غریب رعنا کے اس بھوہڑپن اور گستاخی پر جل کر خاک ہو گئے تھے اور اب یہاں دم بھر بھی بیٹھنے کے روادار نہ تھے۔ آخر انہوں نے بار بار پہلو بدلنے شروع کئے۔ ادھر میاں رعنا استاد داغ کی گفتگو میں اتنے مشغول ہوئے کہ سرکتے سرکتے اس چھوٹی سی الماری میں جا ٹھسے جس پر منوں کتابیں چنی ہوئی تھیں ستم پر ستم یہ ہؤا کہ اُسی لیچے ہاتھ کے چھپانے اور جیب میں رکھنے کے لئے انہیں معمول کے موافق اپنا دہنا ہی رخ دیر تک سامنے رکھنا پڑا۔ اس لئے وہ پہلو اب بے حد درد کرنے لگا تھا اور یہ بھی اسی تاک میں تھے کہ اب کسی طرح یہاں سے رخصت ہی ہو جائیں۔ تا بہ کے۔ آخر اس فارس کا پہلا سین شروع ہو گیا۔ یعنی یکایک بڑے آغا اُٹھے اور استاد سے عرض کیا۔ پیرو مرشد اب میں اجازت چاہتا ہوں۔

اُستاد۔ ہیں کیا ابھی سے ؎

لیتے ہی دل جو عاشق دل سوز کا چلے
تم آگ لینے آئے تھے کیا آئے کیا چلے؟

بیں بیٹھ گئے۔ یہ جھٹ اپنا ہاتھ اُن کی گرفت سے چھڑا بجلی کی طرح تڑپ کر اُسی شان سے اپنا دہنا رخ آگے کو
کمال عین استاد کے روبرو دوزانو جا بیٹھے۔ ان کو یوں یکایک الگ ہوتے اور اچک کر ایک طرف جگہ لیتے ہوئے
دیکھ کر لامحالہ استاد کو پوچھنا پڑا آپ کی تعریف ؟

اب قابلِ غور معاملہ ہے۔ داغ صاحب جہاں استاد نواب فصیح الملک بہادر کی ہستی ہے، اردو زبان کا
مسلم الثبوت استاد سامنے ہے، کئی رئیس زادے معززترین لوگ دست بستہ نگاہوں ہی نگاہوں میں ہر نقل و
حرکت کو بھانپ رہے ہیں، استاد کی شاگردی اور پھر پرشاگردی کا معاملہ ہے، بے چارے بڑے آغا کی سٹی گم ہو
گئی، اب کہیں تو کیا کہیں۔ چاروناچار انھوں نے دبی آواز سے کہنا شروع کیا۔ یہ سید صاحب میرے ایک عزیز
دوست ہیں۔ آپ کو اک مدت سے حضور کی زیارت کا شوق تھا، آج اتفاقاً ادھر سے گذر رہے تھے میں نے
یہی مناسب سمجھا کہ انہیں آپ کی خدمت میں حاضر کردوں۔

اس کے جواب میں حضرتِ داغ ابھی کچھ کہنے بھی نہ پائے تھے جو رعنا صاحب فوراً بول اُٹھے۔ نہیں جناب!
مجھے معاف کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں آپ کا ادنیٰ ترین شاگرد ہوں (آغا کی طرف اشارہ کرکے) ایک مدت
مدید سے حضرت کا اشتیاقِ دیدار رکھتا تھا، بارہا استاد صاحب سے منتیں کیں مگر کبھی دعا قبول نہ ہوئی۔ آج حسنِ
اتفاق سے اِدھر سے گزر رہے تھے جو مجھے یاد آگیا اور میں سواری سے اتر کر استاد صاحب کو بھی کشاں کشاں یہاں
لے آیا ——— قہقہہ ———

استاد۔ اخاہ ! ماشاءاللہ چشم بددور ع

سایۂ کہ کوست از بہارش پیدا

کیوں بڑے آغا ؟ آخر مرثیہ خواں ہونا۔ بازو کو بھی ہر وقت ساتھ ہی رکھتے ہو ؟

اِس تعریض پر بڑے آغا تو بیچارے ایسے لٹے گئے کہ کاٹو تو خون نہیں۔ ساری سبھا میں تھڑی تھڑی ہوگئی
کہ واہ کیسے لائق شاگرد اور کتنے کذبِ مجسم استاد ہیں ؟ مگر اب ہو کیا سکتا تھا آخر غریب ایک روکھی سی ہنسی
ہنس کر خاموش ہو رہے۔ اِس کے بعد کچھ اور اور تذکرے شروع ہو گئے۔

غلیل اور بھٹکلے کی تحقیق ہونے لگی۔ استاد داغ نے فرمایا غلیل بانس کی ایک لچکدار چیز کا نام ہے جس کا
ہر حصہ جدا ہے جس مقام پر تانت بندھی ہوتی ہے اور تانت کی دونوں لڑیوں میں فصل قائم کرنے کے لئے ایک
اور بانس کی پچّر باندھ دی جاتی ہے۔ اس کا بھی نام ہے جسے نہ کہتے ہیں۔ جہاں کپڑا لگا ہے اور جس میں غلہ رکھ کر

چلایا جاتا ہے اُس کو ھپٹکلہ بولتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی بچڑ اَور ہوتی ہے جو ہر حرکت پر متحرک رہتی ہے اس کو نرکُنا کہا جاتا ہے۔

تمام حاضرین کے ساتھ رعنا بھی اس گفتگو اور تحقیق کو بڑی مسرت اور توجہ سے سنتے رہے لیکن اُن کے استاد کا دل ٹھکانے نہ تھا۔ وہ غریب رعنا کے اس پھوہڑپن اور گستاخی پر جل کر خاک ہو گئے تھے اور اب یہاں دم بھر بھی بیٹھنے کے روادار نہ تھے۔ آخر انہوں نے بار بار پہلو بدلنے شروع کئے۔ ادھر میاں رعنا استاد داغ کی گفتگو میں اتنے مشغول ہوئے کہ سرکتے سرکتے اس چھوٹی سی الماری میں جا ٹھسے جس پر منوں کتابیں چنی ہوئی تھیں ستم پر ستم یہ ہوا کہ اُسی لنجے ہاتھ کے چھپانے اور جیب میں رکھنے کے لئے انہیں معمول کے موافق اپنا دہنا ہی رخ دیر تک سامنے رکھنا پڑا۔ اس لئے وہ پہلو اب بے حد درد کرنے لگا تھا اور یہ بھی اسی تاک میں تھے کہ اب کسی طرح یہاں سے رخصت ہی ہو جائیں۔ تا بہ کے۔ آخر اس فارس کا پہلا سین شروع ہو گیا۔ یعنی یکا یک بڑے آغا اُٹھے اور استاد سے عرض کیا۔ پیر و مرشد اب میں اجازت چاہتا ہوں۔

اُستاد۔ ہیں کیا ابھی سے ؎

لیتے ہی دل جو عاشقِ دل سوز کا چلے
تم آگ لینے آئے تھے کیا آئے کیا چلے؟

وہی لنجا ہاتھ اِدھر اُدھر مارنا پڑا۔ اسی اضطراب میں الماری کو پھلانگ پھاند وہ دروازے میں سے نکل کر بھاگے۔ دروازہ میں سے نکلتے ہی ان کی لمبی ترکی ٹوپی اُس چلمن میں الجھ کر سر سے گری۔ ٹوپی کے ساتھ ہی چلمن جو بالکل الگ تھلگ رکھی تھی اوپر سے اُن شریف آدمیوں کے سر پر آ رہی جس سے اُن کی پگڑیاں بھی فرش زمین ہوگئیں۔

اس بوکھلاہٹ کا منظر قابلِ دید تھا۔ چار پانچ بھلے آدمی معزز صورت، ننگے سر، ننگے پاؤں گھپ اندھیرے میں ایک دوسرے کی ٹوپی یا پگڑی چھین جھپٹ رہے ہیں اور مارے غیظ و غضب کے نامعقول، ملعون، خبیث، کے جملے پے در پے نکل رہے ہیں مگر بدحواسی کے مارے کسی کی اصلی ٹوپی کسی کے ہاتھ میں نہیں آتی۔ سب کے سب رعنا سمیت فرش کو کھمن کی طرح متھ رہے ہیں اور ایک کی بات دوسرے کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اِدھر استاد داغ ہیں کہ نیم قد کھڑے ہو کر برابر کہے جاتے ہیں ہَیں ہَیں۔ خیر باشد۔ خیر باشد؛

اُدھر نوکر سب کے سب دست پاچہ اِدھر اُدھر روشنی لینے دوڑ رہے ہیں اور کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنے مردِ معقول یکایک کیوں اتنے پاگل ہوگئے ہیں۔ بہزار مشکل رعنا کا اصلی تنکار اُن کے لنجے ہاتھ میں آجاتا ہے اور وہ اپنی ترکی ٹوپی سر پر رکھ کر بدحواس بھاگتے ہیں ——— اور پیٹھ پھیر کر بھی نہیں دیکھتے کہ اُن پر لعنتوں اور نفرتوں کی کس قدر بوچھاڑ ہو رہی ہے۔

کوئل

کوئل پیاری کالی کالی — اُڑتی پھرتی ڈالی ڈالی
آم پہ کُو کُو کرنے والی — دیوانی ہے یا متوالی

برکھا رُت میں آنے والی — نغمۂ درد سنانے والی
اونچی تان اُڑانے والی — قلب وجگر برمانے والی

آموں کی شاخوں پر جھولا — تیرے لئے فطرت نے ڈالا
شور چمن میں ہے بلبل کا — لیکن تُو ہے باغ کی ملکہ

ابر ہے چھایا اُودا اُودا — موسم ہے کیا ٹھنڈا ٹھنڈا
شام کا منظر کیفیّت زا — اُف اُس وقت چہکنا تیرا

بولے جا ہاں بولے جا تُو — پیارے نغمے تولے جا تُو
کانوں میں رس گھولے جا تُو — دل کی گرہیں کھولے جا تُو

رقص کرتی ہیں۔ رقص لطیف اور مسرت افزا حرکات کا حامل ہوتا ہے۔ دو دو لڑکیاں اس مطابقت سے رقص کرتی ہیں کہ صرف برسوں کی تعلیم ہی سے ممکن ہوسکتی ہے لیکن جسے ہم رقص کہتے ہیں وہ عموماً ناٹک سے زیادہ مشابہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اُس میں آستینوں اور پنکھوں کی غیر معمولی حرکات کے ساتھ ساتھ آنکھوں اور چہرے کی شیریں لطیف اور نازک جنبشیں بھی شامل ہوتی ہیں جو تمامتر مشرقی ہوتی ہیں۔ گیشا لڑکیاں اس سے زیادہ عیاشانہ رقص بھی جانتی ہیں لیکن معمولی تقریبوں پر اور مہذب حلقوں میں وہ صرف قدیم مقدس جاپانی روایات کی نقلیں کرتی ہیں۔ اور درمیانی وقفوں میں وہ قدیم چینی گیت گاتی ہیں جن میں جذباتِ فطرت کی ترجمانی ہوتی ہے جنہیں چھوٹے چھوٹے خوبصورت الفاظ جگمگا رہے ہوتے ہیں۔ اور ہمہ وقت شراب انڈیلی جاتی ہیں ——— وہ گرم زرد اور خواب آسا شراب جسم و دل کو اطمینان سے بھردیتی ہے اور ایک ایسا لطیف احساسِ مسرت پیدا کردیتی ہے جس میں انسان اس طرح جیسے پوست کی مدہوشی میں معمولی چیزوں کو حیرت ناک اور مسرت افزا خیال کرنے لگتا ہے، اور گیشا لڑکیاں بہشت کی حوریں نظر آنے لگتی ہیں۔ اور دنیا اس قدر شیریں معلوم ہوتی ہے کہ اصلی حالات کے ماتحت نہیں ہوسکتی۔

وہ دعوت جو ابتدا میں اس قدر خاموش تھی اب آہستہ آہستہ ایک پُرمسرت شور میں تبدیل ہوتی جاتی ہے۔ حاضرین کی صفیں ٹوٹ کر ٹولیاں بن جاتی ہیں۔ اور لڑکیاں ایک ٹولی سے دوسری ٹولی کی طرف ہنستی بولتی اُن پیالوں میں "ساقی" ڈالتی جو پیہم آپس میں تبدیل ہوتے اور خالی کئے جاتے ہیں گزرتی جاتی ہیں۔ لوگ پرانے فوجی گیت اور قدیم چینی نظمیں گاتے ہیں۔ ایک دو اُٹھ کر ناچنے بھی لگتے ہیں۔ ایک گیشا اپنے کپڑے گھٹنوں سے اوپر اٹھا لیتی ہے اور سیمیسن سے ایک تیز نغمہ نکلتا ہے۔ موسیقی کی آواز کے ساتھ وہ نہایت سبک رفتاری اور تیزی سے دوڑنا شروع کرتی ہے اس طرح جیسے انگریزی میں آٹھ کا ہندسہ (8) ایک نوجوان اُٹھ کر "ساقی" کی ایک بوتل اور پیالہ لئے ہوئے اسی طرح اس کے پیچھے دوڑتا ہے۔ اگر دونوں ایک ہی لکیر پر مل جائیں تو جس کی غلطی سے ایسا ہوا ہو اُسے ساقی کا ایک پیالہ پینا پڑتا ہے۔ موسیقی تیز سے تیز تر ہوتی جاتی ہے اور اسی نسبت سے دوڑنے والے بھی تیز تر ہوتے جاتے ہیں۔ کیونکہ انہیں موسیقی کی سُر کے ساتھ دوڑنا ہوتا ہے۔ آخر گیشا جیت جاتی ہے۔

کمرے کے ایک دوسرے حصے میں مہمان اور گیشا "کن" کھیلتے ہیں۔ ایک دوسرے کی طرف منہ کئے ہوئے وہ کھیلتے جاتے ہیں، گاتے جاتے ہیں، اور تالیاں بجاتے جاتے ہیں۔ وہ ہلکی سی آواز کے ساتھ اپنی انگلیاں کھول دیتے ہیں اور سیمیسن ان کی ہمنوا ہوتی ہیں۔

اب گیشا کے ساتھ "کن" کھیلنے کے لئے ٹھنڈا دماغ، تیز آنکھ اور بہت مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ بچپن سے

اُسے تمام اقسام کے "کن" کھیلنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ کیونکہ "کن" کی بہت سی قسمیں ہیں۔ اگر وہ کبھی ہارتی ہے تو جان بُوجھ کر صرف آپ کو خوش کرنے کے لئے۔ عموماً "کن" کے تین نشان ہوتے ہیں۔ آدمی، لومڑی اور بندوق۔ اگر گیشا بندوق کا نشان بنائے تو آپ کو فوراً موسیقی کی سُر کے ساتھ ہی لومڑی کا نشان بنانا چاہیئے جو بندوق استعمال نہیں کرسکتی۔ اگر آپ غلطی سے آدمی کا نشان بنائیں گے تو وہ فوراً لومڑی کے نشان سے جواب دے گی جو آدمی کو دھوکا دے سکتی ہے۔ اور آپ ہار جائیں گے۔ اور اگر وہ لومڑی کا نشان بنائے تو آپ کو فوراً بندوق کا نشان بنانا چاہیئے جس سے لومڑی کو مارا جاسکتا ہے۔ لیکن اس تمام عرصے میں آپ کو چمکیلی آنکھوں اور نرم و نازک ہاتھوں پر نظر رکھنی پڑتی ہے کیونکہ اگر آپ کی توجہ ایک ثانیہ کے چھوٹے سے چھوٹے حصّہ کے لئے بھی اُن کے حسن کی طرف منعطف ہوگئی تو آپ مبہوت ہو کر رہ جائیں گے۔

لیکن اس تمام اختلاط اور انبساط کے باوجود جاپانی ضیافتوں میں مہمان اور گیشا کے درمیان شائستگی کی سختی کے ساتھ پابندی کی جاتی ہے۔ مہمان شراب کے نشے میں خواہ کتنا ہی مست ہو رہا ہو، آپ کبھی اُسے گیشا پر دست اندازی کرتے نہ دیکھیں گے۔ وہ کبھی فراموش نہ کرے گا کہ خوشی کی تقریبوں پر ظاہر ہونے والا یہ انسانی پھول صرف دیکھنے کے لئے ہے چھونے کے لئے نہیں۔ وہ بے تکلفیاں جو بیرونی سیاح جاپان میں گیشا یا خادمہ لڑکیوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں اگرچہ ہنستے ہوئے برداشت کرلی جاتی ہیں لیکن حقیقت میں سخت ناپسند کی جاتی ہیں، اور جاپانیوں کی نظروں میں وحشت و بربریت کا بدترین مظاہرہ سمجھی جاتی ہیں۔

کچھ دیر کے لئے دل لگی اور مسرت بڑھتی جاتی ہے لیکن جونہی آدھی رات کا وقت قریب آتا ہے، مہمان نامعلوم طریق پر ایک ایک کرکے رخصت ہوجاتے ہیں۔ شور و شغب آہستہ آہستہ ٹھنڈا پڑتا جاتا ہے۔ موسیقی بند ہوجاتی ہے اور آخر کار گیشا آخری مہمانوں کو "سایونارا" کے خوش آئند کلمہ کے ساتھ دروازے تک آکر رخصت کرتی ہے اور پھر سنسان کمرے میں تنہا بیٹھ کر کھانا کھاتی ہے۔

یہ ہیں گیشا کے فرائض۔ لیکن اُس کی ہستی کا راز کیا ہے؟ اس کے خیالات اور جذبات کیا ہیں؟ اس کا باطن کیا ہے؟ شبستانوں کی روشنی اور شراب کی مدہوشی کے دھندلے تصورات سے پرے اُس کی حقیقی زندگی کیا ہے؟ کیا وہ ہر وقت ایسی ہی شوخ ہوتی ہے جیسی اُس وقت جب وہ کسی چشمے کے سریلے نغمے کی طرح اپنی شیریں آواز سے قدیم گیت کے ان الفاظ کو ادا کرتی ہے

اُس کا وصال یا پانچ ہزار "کو کو" پیش کرتے ہو

مجھے "کوکو" کی کیا پروا ہے، مجھے اُس کا وصال چاہئے [۱]
یا کیا ہم یہ سمجھیں کہ وہ اُس پُر اشتیاق وعدے کو پورا کرے گی جسے وہ نہایت دلفریبی سے اس طرح ادا کرتی ہے؟

پیارے اگر تو مر جائے تو تُو قبر میں نہ رہے گا
میں تیری راکھ کو شراب میں ملا کر پی جاؤں گی۔

جس مکان میں چند گیشا مل کر رہتی ہیں اس میں ہمیشہ ایک کمانچے پر ایک عجیب وغریب بُت رکھا رہتا ہے، جو بعض اوقات مٹی کا، کہیں کہیں سونے کا اور اکثر چینی کا بنا ہوتا ہے۔ اسے متبرک سمجھا جاتا ہے اور اس پر مٹھائی چاول روٹی اور شراب کی نذریں چڑھائی جاتی ہیں۔ اس کے سامنے بخور جلایا جاتا ہے اور ایک دیا ہر وقت اس کے پاس جلتا رہتا ہے۔ یہ ایک بلی کے بچے کا مجسمہ ہوتا ہے جو ایک ہاتھ پھیلائے پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہوتا ہے۔ اسی لئے اس کا نام "مَنیکی نیکو" یا "بلانے والا بلی کا بچہ" ہے۔ یہ خوش قسمتی کا دیوتا ہے، امیروں کی سرپرستی کا ضامن اور دعوت دینے والوں کی نوازشات کا مجسمہ ہے۔ اب وہ لوگ جو گیشا کی فطرت کو جانتے ہیں کہتے ہیں کہ یہ گیشا کا اپنا مجسمہ ہے، شوخ اور حسین، لطیف اور نوخیز، ملائم اور پیارا اور ہولناک آگ کی طرح ظالم۔

گیشا کے متعلق لوگ اس سے بھی بُری باتیں کہتے ہیں۔ یعنی یہ کہ اُس کے سائے کے ساتھ مفلسی کا دیوتا چلتا ہے۔ وہ چالاکی اور فریب دہی میں لومڑی کی نسبتی بہن ہے۔ وہ نوجوانوں کی تباہ کرنے والی، دولت کو ضائع کرنے والی اور خاندانوں کو تباہ کرنے والی ہے۔ وہ محبت کو حماقتوں کا منبع سمجھتی ہے جس سے وہ فائدہ اٹھاتی ہے۔ وہ امرا کا خون چوستی ہے اور اُن کے لئے قبریں کھودتی ہے۔ وہ حسین ترین عیارہ ہے۔ وہ سب سے زیادہ خطرناک سازشی ہے وہ انتہا درجہ کی خودغرض اور حریص ہے۔ اور ظالم ترین داشتہ ہے۔

لیکن حقیقت میں گیشا اُس احمقانہ انسانی خواہش کا جواب ہے جو محبت کے لئے حسن وجوانی کو لازم قرار دیتی

---

[۱] قدیم زمانے میں شوگن کا ایک غلام ایڈاگیکی تھا۔ اس کی آمدنی پانچ ہزار کوکو (پیمانہ) چاول تھی جو اُن دنوں بہت زیادہ سمجھی جاتی تھی۔ لیکن اُسے یوشی وارا کی ایک لڑکی آیاگنو سے محبت ہوگئی۔ جب اُس نے اُس سے شادی کرنی چاہی تو اُس کے آقا نے کہا کہ اپنی آمدنی اور محبت میں سے ایک چیز منتخب کرلو۔ محبت کے دونوں پرستار خفیہ طور پر ایک کسان کے گھر بھاگ گئے اور وہاں انہوں نے خودکشی کرلی۔ یہ گیت انہیں کے متعلق بنا تھا جو اب تک گایا جاتا ہے۔

ہے، جس میں غم و افسوس اور ذمہ داریوں کی آمیزش نہیں ہے - اسی لئے "مکن" کے علاوہ اُسے دلوں سے کھیلنا بھی سکھایا گیا ہے۔

اب، ابدی قانون یہی ہے کہ انسان اس ناشاد دنیا میں نہایت بے پروائی سے ہر کھیل کھیل سکتا ہے سوائے اُن تین کھیلوں کے جنہیں زندگی محبت اور موت کہتے ہیں - یہ کھیل دیوتاؤں نے صرف اپنے لئے مخصوص کر رکھے ہیں - کیونکہ انسان بغیر فتنہ پردازی کے ان کا کھیلنا نہیں سیکھ سکتا - اس لئے گیشا کے ساتھ "مکن" کے علاوہ کوئی سنجیدہ تر کھیل کھیلنا دیوتاؤں کو ناراض کر دیتا ہے۔

گیشا اپنی زندگی غلامی سے شروع کرتی ہے - ایک خوبصورت بچہ افلاس زدہ والدین سے ٹھیکے پر لے لیا جاتا ہے - اُس کی خدمات اٹھارہ، بیس یا پچیس سال کے لئے حاصل کر لی جاتی ہیں - اسے خوراک اور لباس دیا جاتا ہے اور ایک گیشا کے گھر میں اس کی تربیت ہوتی ہے - وہ اپنا بچپن سخت ضابطہ میں گذارتی ہے - اُسے مدارات، تہذیب اور شیریں سخنی سکھائی جاتی ہے - اسے روزانہ رقص کی تعلیم دی جاتی ہے - اُسے مختلف سُروں میں کئی گیت حفظ کرائے جاتے ہیں - اُسے کھیلوں، دعوتوں اور شادی میں خدمات انجام دینے کے علاوہ خوبصورت اور حسین بننے کا فن بھی سکھایا جاتا ہے - اُس کی جسمانی خوبیوں کی نہایت توجہ سے نگہداشت کی جاتی ہے - اس کے بعد اسے آلاتِ موسیقی کا استعمال سکھایا جاتا ہے - سب سے پہلے وہ اُس تنبورہ کو بجاتی ہے جس میں سے بغیر کافی مشق کے آواز ہی نہیں نکلتی - پھر آہستہ آہستہ وہ ستار بجانا سیکھتی ہے جسے وہ کچھوے کی ہڈی یا ہاتھی دانت کے مضراب سے بجاتی ہے آٹھ یا نو سال کی عمر میں اسے دعوتوں میں تنبورہ بجانے کی اجازت مل جاتی ہے - اُس وقت وہ حسین ترین ہستی ہوتی ہے - وہ تنبورہ کی دو ضربوں کے درمیانی وقفے میں اور بوتل کے صرف ایک جھٹکے میں بغیر ایک قطرہ گرائے آپ کا پیالہ "ساقی" سے لبالب بھر سکتی ہے۔

اس کے بعد اس کی تربیت زیادہ کڑی ہو جاتی ہے - اس کی آواز خواہ کتنی ہی لچکیلی ہو لیکن اس میں حسب ضرورت قوت نہیں ہوتی - سرما کی برفانی راتوں میں اُسے مکان کی چھت پر یہاں تک گانا اور بجانا پڑتا ہے کہ اس کی نازک انگلیوں میں سے خون بہہ نکلتا ہے اور آواز گلے میں بند ہو جاتی ہے - کچھ عرصہ وہ صرف سرگوشیوں ہی میں گفتگو کر سکتی ہے، لیکن آہستہ آہستہ گلا کھل جاتا ہے اور آواز قوی ہو جاتی ہے - اب وہ مجلسوں میں گانے بجانے کے لئے تیار سمجھی جاتی ہے۔

وہ بارہ یا تیرہ سال کی عمر میں ان اوصاف کے ساتھ پہلی مرتبہ لوگوں کے سامنے آتی ہے - اگر وہ خوبصورت

اور ہوشیار رہے تو اس کی خدمات کی ہر جگہ ضرورت ہوگی اور اس کی اجرت بیس سے پچیس "سن" فی گھنٹہ کے حساب سے ادا کی جائے گی۔ اب اس کے اجارہ داروں کے لئے اپنے وقت، روپے اور محنت کے ثمرات لینے کا زمانہ ہوتا ہے۔ لیکن وہ کبھی فیاضی کا برتاؤ نہیں کرتے۔ کئی سال تک جو کچھ وہ کماتی ہے انہیں کے ہاتھوں میں جاتا ہے، گیشا کسی چیز کی مالک نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ اُس کا لباس بھی اجارہ داروں کی ملکیت تصوّر ہوتا ہے۔

سترہ یا اٹھارہ سال کی عمر میں وہ اپنے فن میں شہرت حاصل کر لیتی ہے۔ اپنے شہر کے تمام ممتاز افراد سے روشناس ہو جاتی ہے۔ ہر ایک کے چال چلن اور حالات سے باخبر ہوتی ہے۔ اب اس کی زندگی صرف رات کی زندگی ہے۔ جب سے وہ رقاصہ بنی ہے اُس نے طلوعِ آفتاب نہیں دیکھا۔ وہ حواس کھونے کے بغیر شراب پینا جانتی ہے، اور تکلیف محسوس کئے بغیر سات آٹھ گھنٹے تک بھوکی اور پیاسی رہ سکتی ہے۔ اس کے کئی شیدا ہوتے ہیں۔ اور اُسے اظہارِ محبت کے لئے کسی حد تک آزادی بھی حاصل ہوتی ہے، لیکن وہ جانتی ہے کہ سب سے مقدم اپنے فائدے کے لئے دوسروں کو مسحور کرنا ہے۔ اُسے امید ہوتی ہے کہ کوئی شخص ایسا ضرور ملے گا جو اسے خرید کر آزاد کر دے گا۔ لیکن وہ کوئی "مہاتما بدھ کی کتابوں میں سے ضرور ایسے الفاظ ڈھونڈ نکالتا ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ محبت ایک احمقانہ فعل ہے اور انسانی تعلقات بے ثبات ہیں۔

لیکن قدیم زمانے کی رقاصہ لڑکیاں آج کل کی گیشا جیسی نہ تھیں۔ اُن میں سے بعض "شرابیوشی" کہلاتی تھیں۔ اور عجیب وضع کی طلاکار ٹوپیاں پہنتی تھیں وہ بھڑکیلے اور زرق برق لباس پہنتی اور شاہزادوں کے محلوں میں تلوار کے ساتھ رقص کرتی تھیں۔ انہیں میں سے ایک کے متعلق ایک پرانی کہانی مشہور ہے جو سنانے کے قابل ہے۔

۱

قدیم زمانے میں دستور تھا، اور اب بھی ہے کہ نوجوان جاپانی مصوّر ملک کے مختلف حصوں کا پاپیادہ سفر کیا کرتے تھے، تاکہ مشہور دلفریب نظاروں اور مصوّری کے اُن شاہکاروں کو دیکھیں جو بدھ مندروں میں محفوظ چلے آتے ہیں، اور جن میں سے اکثر غیر معمولی حسن و خوبی کے سرمایہ دار ہیں۔ ہم ان گراں مایہ کتابوں کے لئے جو ملکی نظاروں اور مطالعۂ زندگی کے عجیب اور نادر رزرنگار مرقعوں کو پیش کرتی ہیں زیادہ تر انہیں آوارہ گردیوں کے مرہونِ منت ہیں، اور یہی ہمیں بتاتی ہیں کہ جاپانی نظاروں کو صرف جاپانی مصوّر ہی بنا سکتا ہے۔ جب آپ اُن طریقوں سے واقف ہو جائیں جو وہ اپنی فطرت کے اظہار کے لئے استعمال کرتے ہیں تو آپ کو ان کی تقلید میں اجنبیوں کی تمام کوششیں عبث اور بے جان نظر آئیں گی۔ غیر ملکی مصور آپ کو صرف وہی ٹھوس نقوش دکھائے گا جو اُسے خود نظر آتے ہیں اور اس

کے علاوہ کچھ بھی نہ دکھا سکے گا۔ جاپانی مصوّر آپ کو وہ بھی دکھائے گا جو وہ محسوس کر رہا ہے۔۔۔۔۔ موسم کی حالت، وقت اور جگہ کا حقیقی احساس ۔۔۔۔ اس کے کام میں ایسی قوتِ بیانیہ ہوگی جو آپ کو مغربی مصوّری میں ڈھونڈے نہ ملے گی۔ مغربی مصوّر آپ کو ذرا ذرا سی تفصیل دکھا دیتا ہے اور جو تصوّر وہ پیدا کرتا ہے اُس کی تسکین کا پورا سامان مہیا کر دیتا ہے۔ لیکن اس کا مشرقی بھائی تفصیل کو یا تو دبا دیتا ہے یا اُسے بہترین صورت میں پیش کرتا ہے ۔۔۔ وہ اپنی دوریوں کو دھند لکے میں چھپا دیتا ہے، افق کو بادلوں سے آراستہ کرتا ہے۔ اپنے مشاہدات اور تصورات سے ایک ایسی تخئیل پیدا کرتا ہے جہاں صرف حسین اور خوبصورت چیزیں ہی اپنی حیرت کاریوں کے ساتھ زندہ رہ سکتی ہیں۔ وہ تصوّر کی حد سے گذر کر تصوّر کو بیدار کرتا ہے اور پھر اُسے تشنگی کے عالم میں چھوڑ دیتا ہے، ایک ایسی سحر انگیز تشنگی جو صرف حسن کی جھلکیوں سے پیدا ہو سکتی ہے۔ بہرحال ایسی ہی جھلکیوں میں وہ وقت کا احساس اور مقام کی کیفیت ایک ساحرانہ انداز میں دکھا جاتا ہے۔ وہ تراشیدہ حقیقتوں کے بجائے مشاہدات اور احساسات کا مصوّر ہوتا ہے۔ اور اِسی میں اس کی حیرت انگیز طاقت کا راز پوشیدہ ہے ۔۔۔ ایسی طاقت جس کی داد دینا اُن لوگوں کے بس میں نہیں ہے جنہوں نے اُس کے الہامی نظاروں کو نہ دیکھا ہو۔ وہ ذاتیات سے بلند ہے۔ اُس کی انسانی تصاویر کا افراد سے کوئی تعلّق نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود اُن میں ایک یکتا وصف ہوتا ہے جو ہر طبقے کی خصوصیات کو ظاہر کرتا ہے، مثلاً دہقان کی طفلانہ حیرت، عورت کی شرم و حیا، "جارو" کی دلفریبی، فوجی افسر کی تمکنت، بچے کا شوخ اور بھولا حسن اور بڑھاپے کی مطمئن قناعت۔ اِس مصوری کو ترقی دینے والے تصویر خانے نہ ہوا کرتے تھے بلکہ سفر اور مشاہدات ہوتے تھے۔

کئی سال گذرے ایک نوجوان مصوّر کیوٹو سے ایڈو کی طرف پہاڑیوں پر سے پاپیادہ سفر کر رہا تھا۔ اُن دنوں سڑکیں بہت کم اور خراب و خستہ حالت میں تھیں اور سفر آج کل کے مقابلہ میں اس قدر دشوار تھا کہ ضرب المثل مشہور تھی "لاڈلے بچّے کو سفر پر بھیجو"۔ لیکن زمین یہی تھی جو اس وقت ہے دیودار اور صنوبر کے یہی جنگل تھے، بانسوں کے یہی جھنڈ تھے، یہی پھونس کے نوکدار چھتوں والے جھونپڑے تھے، چاولوں کے ایسے ہی کھُلے کھُلے کھیت تھے، جن میں دہقان تیلیوں کی زرد ٹوپیاں پہنے جھکے رہتے تھے۔ راستوں کے کنارے "جیزو" کے یہی بُت اِنہیں مندروں کے ایسے ہی زائروں پر مسکراتے تھے۔ اور اس وقت بھی آج کی طرح تمام پایاب دریاؤں میں زرد زرد بچے اسی طرح ہنستے نظر آتے تھے اور تمام دریا سورج کو دیکھ کر اسی طرح مسکراتے تھے۔

لیکن مصوّری کا یہ نوجوان طالب علم "لاڈلا بچّہ" نہ تھا۔ وہ اب تک کئی سفر کر چکا تھا۔ وہ غریبانہ خوراک اور بُری

رہائش کا عادی ہو چکا تھا اور ہر حال میں قانع ہونا جانتا تھا۔ لیکن اس سفر میں ایک شام غروب آفتاب کے بعد اُس نے اپنے آپ کو ایک ایسی جگہ پایا جہاں خوراک یا رات کے لئے بسیرا حاصل کرنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ وہ آباد علاقوں سے دور تھا۔ اختصارِ سفر کے لئے اُس نے راستہ چھوڑ کر کسی گاؤں میں پہنچنا چاہا تھا کہ بھٹک کر رہ گیا۔

رات چاندنی نہ تھی اور صنوبر کے درختوں نے اُس کے گرد تاریکی پھیلا دی تھی۔ جس علاقے میں وہ گھوم رہا تھا بالکل غیر آباد تھا۔ ہوا صنوبر کی ٹہنیوں میں سے گذر کر سائیں سائیں کر رہی تھی اور ایک طرف سے جھینگر کی مسلسل آواز آرہی تھی۔ اس کے سوا کہیں سے کوئی آواز نہ آتی تھی۔ وہ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے کسی آبجو کی تلاش میں جا رہا تھا۔ اُسے امید تھی کہ اس کے کنارے کنارے چلنے سے وہ ضرور کسی آبادی تک پہنچ جائے گا۔ آخر وہ ایک ندی پر آپہنچا، لیکن کچھ دور جا کر ندی یکدم دو دشوار گذار گھاٹیوں کے درمیان غائب ہوگئی اور وہ واپسی پر مجبور ہوگیا تاکہ نزدیک ترین ٹیلے پر چڑھ کر کسی انسانی بستی کا سراغ لگائے لیکن وہاں پہنچ کر بھی اُسے سوائے ٹیلوں کے کچھ نظر نہ آیا۔

وہ تاروں کی چھاؤں میں رات گذارنے کا ارادہ کرنے ہی والا تھا کہ کچھ فاصلے پر اسی پہاڑی کے دوسری طرف اُسے زرد روشنی کی ایک ہلکی سی کرن نظر پڑی جو کسی گھر سے نکل رہی تھی۔ وہ اس کی طرف ہو لیا اور اسے جلد ہی ایک کٹی نظر آئی جو بظاہر کسی دہقان کا مسکن معلوم ہوتی تھی۔ روشنی بند کواڑوں کی ایک درز سے اب تک نکل رہی تھی۔ اُس نے جلدی سے بڑھ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔

۲

کئی مرتبہ آوازیں دینے اور دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی اور زنانہ آواز میں کسی نے پوچھا کہ وہ کیا چاہتا ہے؟ آواز نہایت شیریں تھی۔ عورت کے حسنِ کلام نے اُسے حیران کر دیا کیونکہ وہ شہر کی شستہ اور بامحاورہ زبان میں گفتگو کر رہی تھی۔ اُس نے جواب دیا "میں ایک طالب علم ہوں۔ پہاڑیوں میں راستہ بھول گیا ہوں۔ اور چاہتا ہوں کہ اگر ممکن ہو تو کھانا مل جائے اور رات کا بسیرا لے سکوں، اور اگر یہ نہ ہو سکے تو ممنون ہوں گا۔ اگر مجھے نزدیک ترین گاؤں کا راستہ بتا دیا جائے اور اگر کوئی راہبر میرے ساتھ جا سکے تو میں اُس کی محنت کا معاوضہ بھی دے سکتا ہوں۔" اس کے بعد کئی اور سوالات کئے گئے لیکن جب وہ ان کے جواب سے مطمئن ہوگئی تو بولی "ٹھہرو۔ میں لمحہ بھر میں آتی ہوں۔ آج رات تمہارا گاؤں میں پہنچنا دشوار ہے کیونکہ راستہ سخت خطرناک ہے"۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک عورت کاغذی فانوس لئے برآمد ہوئی۔ فانوس اُس نے ایسی طرح پکڑ رکھا تھا کہ روشنی صرف اجنبی کے چہرے پر پڑتی تھی لیکن اس کا اپنا چہرہ سائے میں رہتا تھا۔ وہ خاموشی کے ساتھ

اسے غور سے دیکھتی رہی اور پھر مختصراً کہا "ٹھہرو، میں پانی لے آؤں"۔ اُس نے پانی کا لوٹا لاکر دروازے کی سیڑھیوں پر رکھ دیا اور مہمان کو ایک تولیہ دے دیا۔ مہمان نے اپنی جوتیاں اتار کر سفر کی گرد دھو ڈالی اور پھر وہ اسے ایک صاف ستھرے کمرے میں لے گئی جس پر یہ تمام مکان مشتمل معلوم ہوتا تھا۔ اس کے عقب میں تختہ بندی کر کے ایک اور جگہ بنائی گئی تھی جو نعمت خانے کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ مہمان کے لئے ایک سوتی دری بچھا دی گئی اور اس کے سامنے ایک آتشدان رکھ دیا گیا۔

اب اُسے اپنی میزبان کے دیکھنے کا موقع ملا اور وہ اس کے نازک اور حسین چہرے کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ وہ اس سے تین چار سال بڑی ہوگی لیکن ابھی تک اس کی جوانی پُوری بہار پر تھی، وہ یقیناً کوئی دہقان لڑکی نہ تھی۔ وہ پھر اس شیریں آواز میں بولی "میں اب تنہا ہوں اور یہاں مہمانوں کو نہیں رکھتی لیکن مجھے یقین ہے کہ آج تمہارا مزید سفر کرنا خطرناک ہوگا۔ یہاں سے نزدیک ہی چند کسانوں کے جھونپڑے ہیں لیکن اس تاریکی میں بغیر رہبر کے تم وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس لئے صبح تک یہیں ٹھہرو۔ تمہیں آرام تو میسر نہ ہوگا لیکن میں تمہیں ایک بستر دے سکتی ہوں اور میرا خیال ہے کہ تم بھوکے بھی ہو۔ میرے پاس تھوڑا سا کھانا بھی ہے جو اگرچہ لذیذ نہیں تاہم میں پیش کئے دیتی ہوں"۔

مسافر بہت بھوکا تھا اس لئے نہایت مسرور ہوا۔ عورت نے تھوڑی سی آگ جلائی اور خاموشی سے چند کھانے تیار کر لئے اور معذرت کرتے ہوئے جلدی سے مہمان کے سامنے رکھ دیئے۔ کھانے کے دوران میں وہ بالکل خاموش رہی۔ مہمان اس کے سکوت سے گھبرا رہا تھا۔ وہ مہمان کے سوالوں کا جواب اشارہ سے یا صرف ایک لفظ سے دیتی رہی۔ اس لئے وہ اسے گفتگو کرنے پر مجبور بھی نہ کر سکا۔

اس دوران میں مہمان نے دیکھا کہ مکان نہایت ستھرا ہے۔ کھانے کے برتن بھی صاف ہیں۔ چند غریبانہ چیزیں ہیں لیکن اُن میں بھی ایک حسن ہے۔ نوشہ خانے اور برتنوں کی الماری پر سفید کاغذ منڈھا ہوا ہے جس پر نہایت خوشنما چینی تصاویر بنی ہیں۔ ان تصاویر میں وہ شاعرانہ نظارے تھے جو عموماً ایسی آرائشوں میں استعمال کئے جاتے ہیں مثلاً بہار اور پھول، پہاڑ اور سمندر، برسات، آسمان اور ستارے، خزاں کی چاندنی، آبِ رواں، خزاں کی ہوا، وغیرہ۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک چھوٹی سی عبادت گاہ تھی اس کے کھلے دروازوں میں سے ایک لوح نظر آ رہی تھی جس کے سامنے دیا جل رہا تھا۔ اور چند جنگلی پھول پڑے تھے۔ اس گھریلو خانقاہ کے اُوپر غیر معمولی اوصاف کی ایک تصویر آویزاں تھی جس میں رحم کی دیوی دکھائی گئی تھی اور اس کے پیچھے ماہتاب کا حلقہ تھا۔

جب طالب علم کھانا ختم کر چکا تو عورت نے کہا افسوس ہے میرے پاس کوئی اچھا بستر نہیں ہے اور مسہری بھی کاغذ کی ہے۔ یہ بستر اور مسہری میری ہے لیکن آج رات مجھے بہت سے کام کرنے ہیں۔ اس لئے سو نہ سکوں گی میں چاہتی ہوں کہ تم اب سو رہو۔ اگرچہ میں تمہاری راحت کے لئے کچھ بھی مہیا نہیں کر سکتی"۔

مہمان جان گیا کہ یہ کسی خاص وجہ سے تنہا رہتی ہے۔ اور کام کے بہانے سے اُسے اپنا بستر پیش کر رہی ہے۔ اُس نے اِس حد سے بڑھی ہوئی مہمان نوازی پر سچے دل سے احتجاج کیا اور کہا "تم یقین رکھو میں زمین پر بھی میٹھی نیند سو سکتا ہوں اور مچھروں کی مجھے مطلق پروا نہیں ہے"۔ عورت ایک بڑی بہن کی طرح بولی "میری خواہش یہی ہے اور تمہیں ضرور اس کی تعمیل کرنی ہوگی۔ مجھے واقعی کچھ کام کرنا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ مجھے جلد سے جلد تنہا چھوڑ دیا جائے۔ آپ سے شریف آدمی سے مجھے یہی توقع ہے کہ معاملات کو میری مرضی کے مطابق سرانجام ہونے دیں"۔ اس پر وہ کوئی اعتراض نہ کر سکا، کیونکہ کمرہ ایک ہی تھا۔ اُس نے چٹائی زمین پر بچھا دی، ایک چوبی تکیہ لے آئی اور مسہری کھڑی کر دی، ایک بڑا سا پردہ خانقاہ کی طرف لٹکا دیا اور اس انداز سے اُسے الوداعی سلام کیا کہ وہ فوراً لیٹ جائے۔ مہمان بے دلی کے ساتھ لیٹ گیا۔ اُسے رہ رہ کر یہ خیال ستا رہا تھا کہ وہ خواہ مخواہ اس قدر تکلیف کا باعث ہوا۔

۳

باوجودیکہ وہ اس تواضع کو قبول نہ کرنا چاہتا تھا جس کے لئے اُس کی محسنہ نے اپنا آرام قربان کر دیا۔ لیکن بستر اُسے بے انتہا آرام دہ معلوم ہوا۔ وہ تکان سے چُور ہو رہا تھا۔ جونہی اُس نے اپنا سر چوبی تکیہ پر رکھا اُسے میٹھی نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا اور وہ سب کچھ بھول گیا۔

اُسے سوئے شاید ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک عجیب سی آواز نے اس کی نیند اچاٹ کر دی۔ یہ پاؤں کی آواز تو ضرور تھی لیکن نرمی سے چلنے کی نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عالم اضطراب میں کوئی جلد جلد حرکت کر رہا ہے۔ اُسے خیال ہوا کہ شاید ڈاکو مکان میں گھس آئے ہیں۔ اُسے اپنا فکر نہ تھا کیونکہ اُس کے پاس تھا ہی کیا۔ لیکن وہ اُس نیک ہستی کے لئے مشوش تھا جس نے اس کے ساتھ بے انتہا نیکی کا برتاؤ کیا تھا۔ کاغذ کی مسہری کے دونوں طرف جالی کا ایک ایک چوکور ٹکڑا لگا ہوا تھا جس سے چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں بن گئی تھیں۔ اُس نے ایک میں سے جھانکنے کی کوشش کی لیکن اُس کے آگے پردہ حائل تھا۔ اُسے آواز دینے کا خیال آیا لیکن وہ فوراً ہی رک گیا۔ کیونکہ اگر واقعی خطرہ تھا تو صورتِ حال کو سمجھنے سے پہلے آواز دے کر اپنی موجودگی کا اظہار ایک عبث اور ناعاقبت اندیشانہ فعل

تھا۔ وہ آواز جس نے اُسے مضطرب کر رکھا تھا جاری رہی اور زیادہ پُراسرار ہوتی گئی۔ آخر اُس نے بدترین صورتِ حال کا مقابلہ کرنے اور اپنی نوجوان میزبان کو بچانے کا تہیّہ کر لیا، خواہ اس میں اسے جان ہی لڑا دینی پڑے۔ اُس نے جلدی سے کپڑے پہنے، خاموشی کے ساتھ رینگتا ہؤا مسہری سے نکل کر پردے کے سرے پر پہنچ گیا اور جھانک کر دیکھا۔ اس عجیب نظارے نے اُسے ششدر کر دیا۔

خانقاہ کے سامنے نوجوان عورت زرق برق لباس پہنے اکیلی رقص کر رہی تھی۔ اُس نے پہچان لیا کہ اس کا لباس "شرابیوشی" کا لباس ہے۔ لیکن ایسا بیش بہا لباس اُس نے آج تک کسی رقاصہ کو پہنے نہ دیکھا تھا۔ اس سے اس کا حسن دوبالا ہو رہا تھا۔ اور اس پر فضا اور مکان کا سکوت ایک اعجاز معلوم ہوتا تھا لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز اس کا رقص تھا۔ ایک لمحہ کے لئے اُسے شبہات نے آن گھیرا۔ گنواروں کے اوہام اور ڈائنوں کے قصّے اُس کے دماغ میں چکّر لگانے لگے۔ لیکن عبادت گاہ اور متبرک تصاویر نے وہم کو دور کر دیا اور اُسے اپنی نادانی پر شرم آ گئی۔ معاً اُسے خیال آیا کہ وہ ایسی بات دیکھ رہا ہے جسے وہ دکھانا نہ چاہتی تھی۔ اور اس کا مہمان ہونے کی حیثیت سے اس کا فرض ہے کہ فوراً پردے میں ہو جائے۔ لیکن اس دلفریب نظارے نے اُسے مسحور کر رکھا تھا۔ حیرت سے کہیں بڑھ کر اسے اس بات کی مسترّت تھی کہ وہ پہلی مرتبہ اتنا اچھا رقص دیکھ رہا ہے۔ اور جوں جوں وہ اسے دیکھتا جاتا اُس کی لطافت کا سحر غالب ہوتا جاتا۔ یکایک وہ ہانپتی ہوئی رُکی، اپنا کمربند کھول دیا اور بیرونی کپڑا اتارنے کے لئے مڑی ہی تھی کہ مہمان کی طرف دیکھ کر چونک اُٹھی۔

مسافر نے معذرت کے انداز میں کہا "تمہارے قدموں کی آواز نے مجھے بیدار کر کے پریشان کر دیا۔ اور اس سنسان جگہ اور اندھیری رات میں تمہاری طرف سے مجھے تشویش پیدا ہو گئی تھی، لیکن جب میں نے دیکھا تو اس نظارے نے مجھے حیرت زدہ کر دیا اور میں مسحور ہو کر رہ گیا۔ میری جسارت کو معاف کرنا لیکن میں حیران ہوں کہ تم کون ہو۔ اور ایسی یکتا رقاصہ کس طرح بن گئیں۔ میں نے سائکیو کی تمام رقاصاؤں کو دیکھا ہے لیکن ان میں سے بہترین لڑکی بھی تمہارے جیسا رقص نہیں کر سکتی۔ اور جب ایک دفعہ میں نے دیکھنا شروع کر دیا تو پھر آنکھیں نہ پھیر سکا"۔

پہلے تو وہ کچھ ناراض سی معلوم ہوئی لیکن ابھی اُس نے سلسلۂ کلام ختم نہ کیا تھا کہ اس کا چہرہ بدل گیا۔ وہ مسکرا کر اس کے سامنے بیٹھ گئی اور بولی "نہیں، میں تم سے ناراض نہیں۔ مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ تم مجھے یوں دیکھتے رہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم نے مجھے یوں تنہا رقص کرتے ہوئے دیکھ کر دیوانہ سمجھا ہو گا۔ اب ضروری ہے کہ میں تمہیں اس کا مطلب ذرا وضاحت سے بتاؤں"۔

تب اُس نے اپنا قصّہ بیان کیا۔ نوجوان مسافر کو یاد آگیا کہ اُس کا نام مدّتیں گذریں اُس نے بچپن میں سنا تھا ۔۔۔۔ اس کا پیشہ ورانہ نام مشہور ترین "شرابوشی" دار الخلافہ کی محبوبہ کا نام جس کے حسن اور شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا کہ وہ یکا یک غائب ہوگئی۔ کسی کو معلوم نہ ہوسکا کہ کہاں گئی اور کیوں گئی۔ وہ اپنے مال و دولت کو چھوڑ کر اپنے نوجوان محبوب کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ وہ مفلس تھا لیکن ان دونوں کے پاس اس قدر ذرائع ضرور تھے کہ وہ دیہات میں سادگی اور خوشی سے اپنے دن گذار سکیں۔ انہوں نے پہاڑیوں میں ایک چھوٹا سا گھر بنا لیا اور چند سال صرف ایک دوسرے کے لئے زندہ رہے۔ نوجوان کو اس کے ساتھ سچا عشق تھا۔ اس کی سب سے بڑی مسرت یہ تھی کہ اُسے رقص کرتے ہوئے دیکھے۔ ہر رات وہ کوئی مرغوب راگ بجاتا اور وہ اس کے لئے رقص کرتی۔ لیکن سردیوں کے ایک طویل موسم میں وہ بیمار ہوگیا اور اپنی محبوبہ کی دردمندانہ تیمارداری کے باوجود مر گیا۔ اس وقت سے وہ صرف اس کی یاد کے ساتھ تنہا رہنے لگی۔ وہ ہر رات اس کی قبر کے سامنے اسی طرح رقص کرتی تھی جیسا کہ اُس کی زندگی میں کیا کرتی تھی۔ یہ تھی اس نظارے کی تفصیل جو نوجوان مسافر نے دیکھا تھا۔ عورت نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا "واقعی یہ غیر مناسب بات تھی کہ میں نے اپنے تھکے ماندے مہمان کے آرام میں خلل ڈال دیا لیکن بہت انتظار کے بعد میں نے خیال کیا کہ تم اب گہری نیند سو رہے ہوگے، اور اس کے علاوہ میں نے آہستہ آہستہ رقص کرنے کی کوشش کی تھی، اب مجھے امید ہے کہ تم اس غیر ارادی طور پر بے آرام کرنے کے لئے مجھے معاف کردوگے"۔

جب وہ سب کچھ بتا چکی تو اُس نے تھوڑی سی چائے تیار کی جسے دونوں نے مل کر پیا۔ اور پھر اس سوز و گداز سے اُسے دوبارہ سونے کے لئے کہا کہ مسافر بہت سی معذرتوں کے باوجود کاغذی پردے میں داخل ہونے پر مجبور ہوگیا۔

وہ خوب گہری نیند سویا اور جب بیدار ہوا تو آفتاب بلند ہوچکا تھا۔ اُس کے لئے رات جیسا ہی سادہ کھانا تیار تھا۔ اُسے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی لیکن اُس نے اِس خیال سے کم کھایا کہ شاید اس کی محسنہ اسے خوراک مہیا کرنے میں اپنے آپ کو محروم کر رہی ہے اور پھر چلنے کے لئے تیار ہوگیا۔ لیکن جب اُس نے خوراک اور اس کی تکلیف کا کچھ معاوضہ دینا چاہا تو عورت نے لینے سے انکار کردیا اور کہا "جو کچھ میں تمہارے لئے مہیا کرسکی ہوں وہ قیمت کے قابل نہ تھا اور جو کچھ میں نے کیا وہ صرف انسانیت کا تقاضا تھا۔ میں امید کرتی ہوں کہ جو بے آرامی تمہیں یہاں برداشت کرنی پڑی ہے تم اُسے بھلادوگے اور صرف اُس کا خلوص یاد رکھوگے جس کے پاس

تمہیں پیش کرنے کے لئے کچھ نہ تھا!"

وہ پھر بھی اُسے کچھ نہ کچھ قبول کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے کوشش کرتا رہا لیکن آخر یہ دیکھ کر کہ اس کا اصرار اُسے اذیت دے رہا ہے اُس نے ممنونیت کے انداز میں رخصت چاہی لیکن ایک قلبی حسرت کے ساتھ۔ کیونکہ عورت کے حسنِ صورت اور حسنِ سیرت نے اُسے گرویدہ کر لیا تھا۔ اُس کے سینے میں جذبات کا ایک طوفان برپا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ عشق و محبت کی بہار کے اِن اولیں پھولوں کو اس دیوی کے قدموں میں ڈال دے، لیکن اُسے جرأت نہ ہوتی تھی۔ عورت نے اُسے وہ راستہ بتا دیا جس پر اُسے جانا تھا اور پھر اُسے پہاڑی سے اترتے ہوئے دیکھتی رہی یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ شاہراہ پر پہنچ گیا جسے وہ اچھی طرح پہچانتا تھا۔ پھر یکایک اُس پر تاسف چھا گیا۔ وہ اُسے اپنا نام بتانا بھول گیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے وہ رکا اور پھر آپ ہی آپ کہا "کیا ہوا! میں ہمیشہ غریب ہی رہوں گا" اور پھر چل پڑا۔

۴

کئی سال گذر گئے اور کئی فیشن بدل گئے، اور مصور بوڑھا ہو گیا۔ لیکن بڑھاپے سے پہلے وہ شہرت حاصل کر چکا تھا۔ شاہزادے اس کے کام کے دلدادہ تھے اور ایک دوسرے سے بڑھ کر اُس کی سرپرستی کرتے تھے وہ امیر ہو گیا اور شہنشاہوں کے شہر میں اُس نے ایک عالی شان محل بنوایا۔ کئی صوبوں کے نوجوان مصور اس کے شاگرد تھے جو اسی کے پاس رہتے اور اس کی خدمت کرنا باعث سعادت سمجھتے تھے۔

ایک روز کا ذکر ہے ایک بوڑھی عورت اس کے محل کے دروازے پر آئی اور اس نے ملنے کی اجازت مانگی ملازموں نے اس کا غریبانہ لباس اور شکستہ حالت دیکھ کر اُسے فقیر سمجھا اور درشتی کے ساتھ اس سے سوال کرتے رہے لیکن جب اُس نے کہا کہ "سوائے تمہارے آقا کے اپنے آنے کی غرض کسی سے نہ کہوں گی"، تو انہوں نے اسے دیوانہ سمجھا اور یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "وہ سائکیو میں نہیں ہے اور نہ معلوم کب تک آئے گا"

لیکن بڑھیا بار بار آتی رہی۔ روز بروز اور ہفتہ بہ ہفتہ۔ ہر مرتبہ اس سے کوئی نہ کوئی جھوٹی بات کہہ دی جاتی "آج ان کی طبیعت ناساز ہے" یا "آج وہ بہت مشغول ہیں" یا "آج اُن کے پاس بہت سے آدمی ہیں اور وہ تمہیں نہیں مل سکتے"۔ لیکن بڑھیا نے آنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ہر مرتبہ وہ ایک مقررہ وقت پر آتی اور ہمیشہ چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی ایک گٹھڑی اس کی بغل میں ہوتی۔ آخر ملازموں نے تنگ آ کر ایک روز اس کا ذکر اپنے آقا سے کر ہی دیا اور کہا "حضور کے دروازے پر ایک بہت بوڑھی عورت ہے جو شاید فقیرنی ہے۔ قریباً پچاس سے

زیادہ مرتبہ وہ حضور سے ملنے کے لئے آچکی ہے اور کہتی ہے کہ سوائے حضور کے کسی سے آنے کی غرض نہ بتائے گی ہم نے اس دیوانی کی ہمت توڑنے کی بہتیری کوشش کی لیکن وہ پھر آجاتی ہے۔ حضور کے سامنے اس کا ذکر کرنے کی جرأت اس لئے کی گئی ہے کہ آئندہ کے لئے احکام حاصل ہو جائیں اور آئندہ اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا جائے"۔

آقا نے سختی سے کہا "تم میں سے کسی نے اس سے پہلے مجھے کیوں اطلاع نہ دی" وہ خود دروازے پر گیا اور نہایت نرمی سے اس کے ساتھ بولا، وہ اپنی غربت کا زمانہ نہ بھولا تھا۔ اُس نے پُوچھا کہ کیا وہ خیرات چاہتی ہے؟

لیکن اُس نے جواب دیا "مجھے پیسے یا روٹی کی ضرورت نہیں ہے۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ آقا میرے لئے ایک تصویر بنا دے"۔ مصوّر اُس کی خواہش سُن کر حیران رہ گیا۔ اور اُسے مکان کے اندر آنے کو کہا۔ بڑھیا ڈیوڑھی میں داخل ہوگئی اور جُھک کر اُس نے اپنی گٹھڑی کی گرہیں کھولنی شروع کردیں۔ جب وہ کھول چکی تو مصوّر نے ایک عجیب بیش قیمت پرانا طلاکار ریشمی لباس دیکھا جس کا رنگ استعمال اور کہنگی کے باعث بگڑ چکا تھا ۔۔۔ پرانے زمانے کا ایک حیرت انگیز برباد شدہ کپڑا ۔۔۔ شرابیوشی کا لباس۔

اس اثنا میں کہ بڑھیا کپڑوں کو ایک ایک کرکے پھیلا رہی تھی اور اپنی رعشہ زدہ انگلیوں سے ان کی سلوٹیں نکالنے کی کوشش کر رہی تھی آقا کے دماغ میں ایک دھندلی سی یاد پیدا ہوئی اور پھر یکایک روشن ہوگئی۔ یادداشت کی اس ہلکی سی جھلک میں اسے پہاڑیوں میں گھرا ہوا وہ ننھا مکان یاد آگیا۔ جہاں اس کی بے غرضانہ مہمانداری کی گئی تھی ۔۔۔ وہ چھوٹا سا کمرہ جہاں اُس نے رات بسر کی تھی، کاغذ کی مسہری، خانقاہ کے سامنے مدھم ساد یا، آدھی رات کے وقت ایک عجیب حسینہ کا رقص۔ بڑھیا حیران رہ گئی جب شاہزادوں کا مخدوم اس کے سامنے ادب سے جُھک گیا اور بولا "میری بدخلقی کو معاف کرنا کہ میں تھوڑی دیر کے لئے تمہیں پہچان نہ سکا۔ لیکن چالیس سال سے زیادہ ہی کا عرصہ ہوا ہے کہ ہم آخری مرتبہ ملے تھے۔ تم نے مجھے اپنے گھر میں رات بسر کرنے کی اجازت دی تھی اور میرے آرام کے لئے اپنا ایک ہی بستر مجھے دے ڈالا تھا۔ میں نے تمہیں رات کے وقت رقص کرتے ہوئے دیکھا تھا اور تم نے مجھے اپنی سرگذشت سنائی تھی۔ تم ایک شرابیوشی تھیں اور میں تمہارا نام اب تک نہیں بھولا"۔ بڑھیا حیرت سے اس کا منہ تکنے لگی۔ اُسے کچھ یاد نہ آتا تھا۔ بڑھاپے اور مصائب و آلام نے اُس کا حافظہ کمزور کر دیا تھا۔ مصوّر نے اُسے محبت سے اپنے

پاس بٹھا لیا۔ اس کی گفتگو میں اَور زیادہ نرمی آگئی۔ اُس نے اس جھونپڑے کا پورا پورا نقشہ کھینچ دیا۔ آہستہ آہستہ بڑھیا کا چہرہ چمک اٹھا اور اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھر آئے اور وہ بولی "یقیناً اُس خدا نے جو ہماری دعاؤں کو سنتا ہے میری رہبری کی ہے۔ لیکن جس وقت میرے غریبانہ جھونپڑے کو معزز آقا نے شرف بخشا تھا تو میں ایسی نہ تھی جیسی کہ اب ہوں۔ اور یہ مجھے مہاتما کا معجزہ معلوم ہوتا ہے کہ آقا کو میں اب تک یاد ہوں"

پھر اُس نے اپنی بقیہ سادہ کہانی سنائی۔ چند سال بعد وہ مفلسی کے ہاتھوں تنگ آکر اپنا جھونپڑا بیچنے پر مجبور ہوگئی تھی اور وہ اپنی آخری عمر میں تنہا اس بڑے شہر میں واپس آگئی تھی جہاں مدتوں سے اُس کا نام فراموش ہو چکا تھا۔ "مجھے اس مکان سے جدا ہونے کا بے انتہا رنج ہوا جس میں میں نے اپنی زندگی کے بہترین ایام اپنے محبوب کے ساتھ بسر کئے تھے لیکن اس سے زیادہ رنج مجھے اس بات کا ہے کہ اب بڑھاپے اور نقاہت کی وجہ سے میں لوح کے سامنے اپنے مرحوم کی روح کو خوش کرنے کے لئے ہر رات رقص نہیں کر سکتی۔ میں چاہتی ہوں کہ اسی لباس کے ساتھ رقص کی حالت میں میری تصویر بنا دی جائے تاکہ میں اسے لوح کے اوپر لٹکا دوں۔ اپنی اس آخری آرزو کے لئے میں کوتان کے حضور میں عاجزانہ دعائیں کرتی رہی ہوں۔ اور اب حضور کے مصورانہ کمالات کا شہرہ سُن کر حاضر ہوئی ہوں کیونکہ میں اپنے محبوب کے لئے کوئی معمولی کام نہیں چاہتی بلکہ ایک ایسا کام جو آپ جیسے استاد کا شاہکار ہو۔

مصوّر نے ایک مسترحمانہ مسکراہٹ کے ساتھ سب کچھ سُن لیا اور پھر بولا "میں بخوشی تمہاری خواہش کے مطابق تصویر بنا دوں گا، لیکن آج مجھے ایک ایسا کام ختم کرنا ہے جسے میں ملتوی نہیں کر سکتا، اگر تم کل آ جاؤ تو میں تمہیں ایک بالکل ایسی تصویر بنا دوں گا جیسی تم چاہتی ہو اور اُس کے بنانے میں اپنی پُوری قابلیت صرف کر دوں گا"

بڑھیا نے کہا "لیکن میں نے آقا کو وہ بات نہیں بتائی جو مجھے سب سے زیادہ رنج دے رہی ہے اور وہ یہ ہے کہ میں حضور کی اس نوازش کے صلے میں سوائے ان بوسیدہ کپڑوں کے کچھ نہ دے سکوں گی۔ یہ اگرچہ اب کسی کام کے نہیں تاہم مجھے امید ہے کہ حضور انہیں قبول فرمالیں گے کیونکہ یہ اب نادرات میں سے ہیں۔ شرابیوشی اب ختم ہو چکی ہیں اور آج کل کی لڑکیاں ایسا لباس نہیں پہنتیں"

نیک دل مصوّر نے کہا "اس کے متعلق تم خیال بھی نہ کرو۔ میں خوش ہوں کہ اپنے پرانے قرضے کا کچھ حصہ ادا کرنے کے لئے مجھے موقع مل گیا ہے"

وہ شکریہ کے لئے تین مرتبہ جُھکی اور بولی "حضور مجھے معاف فرمائیں۔ اگر میں کچھ اور بھی کہنے کی جسارت کروں۔ وہ یہ ہے کہ حضور مجھے اس طرح نہ بنائیں جس طرح میں اب ہوں۔ بلکہ ایسی جیسی میں جوانی میں تھی، جس حالت میں حضور نے مجھے دیکھا تھا"

اس نے کہا "مجھے خوب یاد ہے تم بہت خوبصورت تھیں"

ان الفاظ کو سُن کر عورت کا مرجھایا ہوا چہرہ مسرت سے چمک اٹھا اور وہ بولی "تو یقیناً میری تمام آرزوئیں پُوری ہو جائیں گی۔ جب حضور کو میری جوانی یاد ہے تو میں التجا کرتی ہوں کہ میری تصویر ایسی نہ بنائی جائے جیسی میں اب ہوں بلکہ ایسی جیسے میں پہلے تھی۔ اور جیسا کہ حضور نے کمال مہربانی سے فرمایا ہے بدصورت نہ ہو۔ اے آقا! مجھے پھر جوان بنا دے، مجھے خوبصورت بنا دے تاکہ میں اپنے محبوب کی روح کو حسین نظر آؤں۔ وہ میرے آقا کا کام دیکھے گا اور مجھے معاف کر دے گا کہ اب میں اس کے لئے رقص نہیں کر سکتی"

ایک دفعہ اور آقا نے اُسے یقین دلایا اور کہا "میں تمہاری تصویر ایسی ہی بناؤں گا جیسی تم اس وقت تھیں جب میں نے تمہیں دیکھا تھا۔ ایک جوان اور حسین شرابیوشی۔ اور میں اسے ایسی توجہ اور محنت سے بناؤں گا جیسے ملک کے کسی امیرالامرا کے لئے بنا رہا ہوں"

۵

دوسرے روز بوڑھی رقاصہ مقررہ وقت پر آ گئی اور نرم سفید ریشم پر مصور نے اس کی تصویر تیار کر دی۔ لیکن یہ تصویر اُس بُوڑھی عورت کی نہ تھی جسے آقا کے شاگرد سامنے بیٹھے دیکھ رہے تھے بلکہ یہ اُس نوجوان حسینہ کی تصویر تھی جسے اُن کے آقا کی باطنی آنکھیں دور پہاڑیوں سے گھرے ہوئے ایک تنہا جھونپڑے میں رقص کرتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ پرندے کی سی روشن آنکھیں بید کی طرح لچکدار اور حور کی طرح تابان و درخشاں جسم، اُسی ریشمی طلاکار لباس میں۔ آقا کا معجز نگار مو قلم گم گشتہ لطافت کو پھر لوٹا لایا اور پژمردہ حسن چمک اٹھا۔ جب تصویر مکمل ہو چکی اور آقا کی مہر اس پر لگ چکی تو اسے ایک گراں قیمت ریشمی کپڑے پر چسپاں کر دیا گیا، دونوں جانب دیودار کے رول لگائے گئے جن کے سروں پر ہاتھی دانت لگا تھا اور ریشمی دھاگا اُسے لٹکانے کے لئے باندھا گیا۔ پھر اسے ایک چھوٹے سفید لکڑی کے ڈبے میں رکھ کر شرابیوشی کو دے دیا گیا۔ مصوّر اُسے کچھ نقدی بھی دینا چاہتا تھا لیکن بڑھیا نے انکار کر دیا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی "نہیں، یقین جانو مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہیں صرف تصویر چاہتی تھی، اسی کے لئے

یں دعائیں مانگتی تھی اور اب میری دعا قبول ہو چکی ہے۔ اب میرے دل میں کسی چیز کی خواہش نہیں ہے اور میں جانتی ہوں کہ اگر میں بغیر کسی خواہش کے مرگئی تو مہاتما کے حضور میں پہنچنے کے لئے مجھے کوئی دشواری پیش نہ آئے گی صرف ایک خیال مجھے اذیت دے رہا ہے اور وہ یہ کہ میرے پاس آقا کو نذر کرنے کے لئے سوائے ان کپڑوں کے کچھ بھی نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ کسی کام کی چیز نہیں لیکن حضور انہیں ضرور قبول فرمالیں۔ میں روزانہ دعا کیا کروں گی کہ حضور کی آئندہ زندگی پُرمسرت ہو کیونکہ حضور نے میرے ساتھ بے انتہا رحم دلی کا برتاؤ کیا ہے"۔

مصوّر نے مسکراتے ہوئے کہا "یہ کام ہی کیا ہے جو میں نے تمہارے لئے کیا ہے۔ لیکن اگر یہ کپڑے دینے سے تمہاری خوشی میں اضافہ ہو سکتا ہے تو میں لے لیتا ہوں۔ ان سے اُس رات کی یاد تازہ رہے گی جو میں نے تمہارے گھر میں گذاری تھی۔ جب تم نے میری خاطر اپنے تمام آرام قربان کر دیئے تھے اور پھر مجھ سے ان کا معاوضہ بھی نہ لیا تھا۔ اُس نوازش کے لئے میں اب بھی تمہارا زیر بار احسان ہوں۔ اب مجھے بتاؤ کہ تم کہاں رہتی ہو تاکہ میں تصویر کو اس کی اصلی جگہ پر دیکھ سکوں"۔

لیکن اُس نے عاجزانہ الفاظ میں معذرت کی اور پتہ نہ بتایا۔ "میں ایسی جگہ رہتی ہوں جہاں حضور کا آنا مناسب نہیں ہے"۔ اور پھر کئی مرتبہ جھک جھک کر اور بار بار شکریہ ادا کرنے کے بعد وہ خوشی کے آنسو بہاتی ہوئی اپنے گنج گراں مایہ کو لے کر رخصت ہوگئی۔

آقا نے اپنے شاگرد کو بلا کر کہا "جلدی سے اس عورت کے پیچھے جاؤ لیکن اس طرح کہ اسے معلوم نہ ہو کہ کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے اور پھر آکر مجھے بتاؤ کہ وہ کہاں رہتی ہے"۔

بہت دیر کے بعد نوجوان شاگرد واپس آیا اور ہنستا ہوا بولا "آقا! میں اس عورت کے تعاقب میں گیا۔ شہر سے باہر سوکھے ہوئے دریا کے پاس جہاں مجرموں کو پھانسی دی جاتی ہے ایک جھونپڑی ہے جہاں شاید "ایٹا" ہی رہ سکے۔ اسی میں وہ بڑھیا رہتی ہے۔ آقا! ایسی ویران اور غلیظ جگہ میں نے آج تک نہ دیکھی تھی"۔

مصوّر نے جواب دیا "بہرحال تم کل مجھے اسی ویران اور غلیظ جگہ پر لے جانا۔ جب تک میں زندہ ہوں وہ خوراک یا کپڑے کے لئے تنگ نہ ہوگی"۔

۶

اگلے دن صبح کو طلوع آفتاب سے ایک گھنٹہ بعد آقا اور اُس کا شاگرد خشک دریا کے راستے پر ہولئے، شہر کی حدود سے باہر مردود اچھوتوں کے مسکن کی طرف۔

اس چھوٹی سی جھونپڑی کا دروازہ بند تھا۔ آقا نے کئی مرتبہ دستک دی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ کھٹکا اندر سے کھلا پاکر اُس نے تھوڑا سا دروازہ کھول لیا اور پھر آواز دی۔ کسی نے جواب نہ دیا۔ اب اُس نے اندر داخل ہونے کا ارادہ کرلیا۔ معاً چالیس سال کا بھاری پردہ اس کی نظروں سے اٹھ گیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ پھر نوجوان ہو گیا ہے اور تکان سے چُور ہوکر پہاڑیوں سے گھرے ہوئے ایک چھوٹے سے جھونپڑے میں داخل ہونے کی اجازت مانگ رہا ہے۔

وہ آہستہ سے اندر داخل ہوگیا۔ اس نے دیکھا کہ بڑھیا ایک بوسیدہ چادر میں لپٹی ہوئی لیٹی ہے اور شاید سو رہی ہے۔ ایک ٹوٹی ہوئی الماری پر اُس نے وہی "بٹسوڈن" اُسی لوح کے ساتھ رکھا ہوا پہچان لیا جو آج سے چالیس برس پیشتر اُس نے دیکھا تھا۔ آج بھی اُس دن کی طرح ایک چھوٹا سا دیا اُس کے سامنے جل رہا تھا رحم کی دیوی کا مجسمہ اپنے ماہتابی حلقہ کے ساتھ وہاں موجود نہ تھا لیکن خانقاہ کے مقابل والی دیوار پر اس کا اپنا خوبصورت تحفہ آویزاں تھا۔ اس کے نیچے ایک اور مجسمہ تھا ـــــ "ہٹو کوٹو کوتان" کا مجسمہ ـــــ وہ کوتان جس کے آگے صرف ایک مرتبہ دعا کی جاتی ہے کیونکہ وہ زندگی بھر میں صرف ایک دعا کو قبول کرتا ہے۔ اس سونے گھر میں اَور کچھ نہ تھا صرف ایک زائرہ کا لباس اور ایک فقیرانہ ڈنڈا اور پیالہ۔

آقا ان چیزوں کو دیکھنے میں زیادہ دیر محو نہ رہا۔ وہ اسے جگا کر اپنی موجودگی سے مسرور کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے تین مرتبہ نام لے کر اُسے پکارا۔ لیکن وہ بیدار نہ ہوئی۔

معاً اُس نے محسوس کیا کہ وہ مرچکی ہے۔ آقا اس کا چہرہ دیکھ کر حیران رہ گیا کیونکہ وہ کم بُوڑھی نظر آرہی تھی۔ جوانی کی ایک مبہم سی لطافت واپس آچکی تھی، مصائب و آلام کے نشانات رفع ہوچکے تھے، چہرے کی جھریاں صاف ہوچکی تھیں۔ اور یہ ایک اُس سے بھی زیادہ زبردست آقا کے موقلم کا اشارہ تھا۔

(لفکاڈیو ہرن)

میرے پیارے دوست!

دوست دوست! ــــــ پیارے میرے! میرے پیارے دوست!

سُن لے میرے دل کی پیارے　　میرے اچھّے راج دُلارے

دُنیا میں دل بھٹکا میرا　　غیروں سے دل اٹکا میرا

دوست دوست! ــــــ پیارے میرے! میرے پیارے دوست!

تجھ کو پاکر میَں نے کھویا　　کیسا گوہر میں نے کھویا

کیسا اختر میں نے کھویا　　کیسا دلبر میں نے کھویا

دوست دوست! ــــــ پیارے میرے! میرے پیارے دوست!

تجھ کو یاد اب کرتا ہوں پھر　　تیرا ہی دم بھرتا ہوں پھر

دُنیا میں پھر تُو ہی تُو ہے　　صُورت تیری ہی ہر سُو ہے

دوست دوست! ——— پیارے میرے! میرے پیارے دوست!

مانا تجھ کو بھولا تھا میں — اپنے آپ پہ بھولا تھا میں

پھولا تھا مرجھایا ہوں میں — تیرے پاس پھر آیا ہوں میں

دوست دوست! ——— پیارے میرے! میرے پیارے دوست!

مجھ کو اپنی گود میں لے لے — پھر دل لے لے پھر دل دے دے

پھر تُو پیارا اُبھرے میں پیارا — پھر میں موتی پھر تُو تارا

دوست دوست! ——— پیارے میرے! میرے پیارے دوست!

آ جا مل جل کر پھر گائیں — جگ ہے آئیں بائیں شائیں

آ جا ڈھونڈیں آ جا پائیں — آ جا کچھ سے کچھ ہو جائیں

دوست دوست! ——— پیارے میرے! میرے پیارے دوست!

ل ب

علاج

بمیلا نے ہار نیرو کے ہاتھ میں دے دیا اور بچوں کی طرح اُس کی ستائش میں اچھے اچھے الفاظ سننے کے انتظار میں اُس کا منہ دیکھنے لگی۔ آج وہ بہت مسرور نظر آرہی تھی۔ نیرو نے ایک عرصہ سے اس کے حسین چہرے پر مسرت کے آثار نہیں دیکھے تھے۔ وہ ہار کو دیکھ کر نہیں بلکہ مسرور بمیلا کو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

نوجوان شوہر اپنی دائم المرض بیوی سے آخر تنگ آ ہی جاتا ہے۔ نیرو بھی بمیلا کی مسلسل علالت سے تنگ آ گیا تھا آج وہ خوش و خرم نظر آ رہی تھی تو وہ بھی اپنی بہت سی مسرتوں کے پھر زندہ ہو جانے کی توقع کرنے لگا تھا۔ ایک سال سے بمیلا بیمار تھی۔ مرض روز بروز ترقی کر رہا تھا۔ کئی ڈاکٹر آئے مگر تشخیصِ مرض میں کسی کو بھی کامیابی نہ ہوئی۔ غریب نیرو نے اپنے قیمتی وقت کے علاوہ علاج میں بہت روپیہ بھی برباد کیا مگر بیماری نہ جانی تھی نہ گئی۔ آخر مایوس ہو کر بیٹھ رہا۔ شادی کو زیادہ زمانہ بھی تو نہیں گذرا تھا۔ صرف دو برس۔ اور اس قلیل زمانہ میں وہ ازدواجی زندگی کی حقیقی مسرت سے اچھی طرح آشنا بھی نہیں ہوا تھا۔ بمیلا تھی کہ روز بروز گرتی جاتی تھی۔

نہ تو نیرو کو فرصت تھی نہ اُس کے پاس اس قدر پیسہ تھا کہ اپنی بیوی کو کہیں علاج کے لئے لے جاتے نہیں دو نوجوان زندگیاں ختم ہوتی جا رہی تھیں۔ بمیلا کی عمر صرف ۱۷ سال کی تھی اور نیرو پچیس برس کا ہوگا۔ بمیلا کوئی بدپرہیز عورت بھی نہ تھی۔ کھانے پینے میں کافی محتاط تھی۔ بس اس کو ایک شے کا بے انتہا شوق تھا۔ جواہرات۔ یہ اُس کی جان تھے۔ محبت پرور نیرو کی حیثیت ایک متوسط الحال شخص سے زیادہ نہ تھی۔ اُس جیسے شخص کی آمدنی بہت سی ضروریات کا گلا گھونٹ کر بھی اُس کو جواہرات خریدنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ بمیلا کو اپنے شوہر کے بعد کسی شے کا عشق تھا تو بس جواہرات کا۔ وہ موتیوں کی دیوانی اور سچے پتھروں کی شیدا تھی۔ اس کو حرص سمجھئے یا شوق۔ بظاہر اس کا اس کی علالت سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کے پاس موتی وغیرہ تھے تو سہی مگر بہت کم۔ شاید صرف بندے کی ایک جوڑی تھی جو اُس کے شوق کی تسکین کے لئے تو نہیں صبر کر لینے کے لئے کافی تھے۔ نقلی پتھر یا فیروزہ وغیرہ سے تو اس کو سخت نفرت تھی۔ اس سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ وہ حریص نہ تھی بلکہ قدرتی طور پر اُس کو سچے پتھروں سے بے حد رغبت تھی لیکن وہ نیرو کے کفایت شعارانہ

اصول کو اپنے اس بے ہنگام شوق پر قربان کر دینے کی روادار نہ تھی - وہ ان کے بغیر گذارا کر سکتی تھی - رہی ناقابلِ فرو رغبت تو وہ اس سے مجبور تھی۔ اِس کا علم اُسی کو اچھی طرح ہوگا کہ اپنی طبیعت مارنے پر اس کو کس قدر باطنی صدمہ محسوس ہوتا ہو گا - نیرو بھی اس کے اس جذبۂ خود کام، سے واقف تھا - آخر ایک روز اُس نے موتیوں کا ایک نہایت نفیس ہار بمبیلا کو لا کر دے ہی دیا - معمولاً شام کو اپنے کاروبار سے فارغ ہو کر آیا اور بے پروائی سے ڈبا اُس کے پلنگ پر ڈال دیا - بمبیلا نے جو کھول کر دیکھا تو خوشی سے اچھل پڑی - بے اختیار جذباتِ مسرت کو ضبط کر کے بولی "کیسے شریر ہو - مجھ سے کہا بھی نہیں - لیکن یہ فضول خرچی؟ دیوالیہ نہ بن جانا"

نیرو "اگر تمہاری خاطر یہ بھی ہو جائے تو کیا ہرج ہے" بمبیلا نے اس کا ہاتھ محبت سے بھینچ کر کہا "تم — تم — کیا کہوں میں تو سب کچھ بھول گئی ——" اور ایسی مسرت پاش نظروں سے اُس نے نیرو کو دیکھا جس کا اندازہ وہی شخص بخوبی کر سکتا ہے جس کی کوئی غیر متوقع تمنا دفعتہً بر آئی ہو -

بمبیلا "کیا ضرورت تھی اس کی؟"

نیرو "تاکہ تم خوش ہو جاؤ"

بمبیلا "تو اِس فضول خرچی کا باعث میں ہوئی"

نیرو "ہرگز نہیں - اچھا یہ بتاؤ کہ تم کو پسند بھی ہے یا نہیں؟"

بمبیلا "بیحد" یہ لفظ مگر اُس کے جذباتِ پسندیدگی کے اظہار کے لئے ناکافی تھا - اُس نے پھر دریافت کیا "بتاؤ تمہیں قسم ہے اِس کو میرے لئے کیوں خریدا آخر؟"

نیرو "کیونکہ مجھے تم سے محبت ہے"

اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد ہی بمبیلا کی علالت میں بہت تخفیف ہو گئی - یہ معلوم نہیں کہ یہ ہار کی برکت تھی یا موسمِ بہار کی - لیکن وہ اُسی زور سے رُو بصحت ہونے لگی تھی جس دن سے اُس نے ہار پہننا شروع کیا تھا - ہار میں جادو کی تاثیر تھی - چند روز پیشتر بمبیلا موت کے بھیانک خواب دیکھا کرتی تھی اب اس کے بشرے سے آثارِ زندگی نمایاں تھے - اُس کے دل میں بعض وقت امنگ اٹھتی تھی کہ اپنا ہار پہن کر نیرو کے ساتھ سیر کرنے جائے - اس اشتیاق نے اس قدر پختگی حاصل کی کہ وہ اپنی آرزو کی تکمیل کے لئے روز بروز تندرست ہونے لگی - نیرو اس عرصہ میں برابر اُس کی اس کایا پلٹ کو دیکھتا رہا - وہ دل میں فخر کر رہا تھا کہ کیا تدبیر

ہمیلا کے دفعیۂ علالت کے لئے اس کے ذہن میں آئی ہے۔ اس سے بہتر علاج ناممکن تھا۔ ایک شوہر ہی اپنی بیوی کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔

ایک روز ہمیلا نے نیرو سے ہار کی قیمت دریافت کی۔ یہ سوال کئی بار اس کی زبان پر آ آ کر رہ جاتا تھا۔ نیرو نے مسکرا کر فقط اتنا کہا "اگر یہ تمہارے لئے باعثِ مسرت ثابت ہوا تو انمول ہے ورنہ دس ہزار روپیہ کا بھی ہے تو بے کار ہے۔" الغرض ایک ماہ کے اندر ہی ہمیلا بھلی چنگی ہو گئی۔

دو ماہ بعد ایک تازہ مصیبت نازل ہوئی۔ اس کے ہاں چوری ہو گئی جس میں ہار بھی جاتا رہا۔ ہمیلا کے صدمہ کی انتہا نہ تھی۔ تمام اشیا میں وہی اس کے لئے زیادہ قیمتی تھا۔ اس کی مایوسی و شکستہ دلی کا اندازہ نہ ہو سکتا تھا۔ چوری جانے کے بعد کسی شئے کی بازیافت کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔

اُس کو حسرت کے ساتھ اُن مسرت بخش لمحات کا خیال آتا تھا جن میں ہار پہن کر وہ بڑے فخر و مباہات کے ساتھ اپنی خالہ کے ہاں گئی تھی جس نے پہلے ہار کو پھر پہننے والی کو تعریف کی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا "ہمیلا یہ ہار تمہارے گلے میں بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔" ہائے کیا خوبصورت چیز تھی افسوس چوری چلی گئی۔ اس کے خیال میں اکثر وہ چپکے چپکے رویا کرتی تھی۔ نیرو کو ہار کا ملال نہ تھا۔ اس کو یہ رنج تھا کہ ہمیلا پھر بیمار ہوتی جا رہی تھی۔ چوری تو بہت سی چیزیں گئی تھیں مگر ہمیلا کو ان کی پروا نہ تھی کیونکہ تمام اثاث البیت کا بیمہ نیرو کرا چکا تھا۔ گم شدہ اشیا کی قیمت کمپنی سے وصول ہو جانے کی توقع تھی۔ ہار تو قیمت وصول ہو جانے کے بعد بھی اپنی گم گشتگی کی تلافی نہیں کر سکتا تھا۔ شام کو نیرو آیا تو ہمیلا نے پژمردہ آواز میں کہا "بیمہ کمپنی کا گماشتہ آیا تھا نیرو۔"

نیرو۔ "پھر؟"

ہمیلا۔ "میں نے گم شدہ اشیا کی فہرست مع قیمت کے اُس کو دے دی ہے۔ لیکن ——— ہار ——— اس کی قیمت تم نے مجھے ———"

نیرو۔ "اُس کی قیمت لکھوانے کی ضرورت بھی نہیں۔ میں نے اس کا بیمہ نہیں کرایا تھا۔"

ہمیلا۔ "مگر نیرو کیا تم اس قیمتی شئے کو بالکل مفت چلا جانے دو گے؟"

نیرو۔ "جو چیز چلی گئی اس کا ماتم کرنا بے فائدہ ہے ——— میں پھر کبھی تمہارے لئے دوسرا لا دوں گا۔"

ہمیلا۔ "بس میں تم کو اب زیادہ فضول خرچی نہیں کرنے دوں گی۔ کہو تو میں گماشتے کو اس کی قیمت ہزار روپیہ بتا دوں؟"

دفعتہً دروازہ کھلا اور ملازمہ اندر آ کر بولی "بیمہ کمپنی سے ایک شخص آیا ہے۔"

بمیلا (جلدی سے) "بلالو اندر۔ میں نے تمہاری موجودگی میں اُس سے آنے کو کہہ دیا تھا تاکہ تم ہار کی قیمت اُس کو بتا سکو۔"

نیرو۔ "سخت غلطی کی تم نے۔ مجھ سے دریافت بھی نہیں کیا!"

بمیلا۔ "آخر اس میں ہمارا حرج ہی کیا ہے ———" گماشتہ اندر آگیا اور نیرو کو آداب کر کے بولا "منیجر صاحب دریافت کرتے ہیں کہ آپ کا ہار ———"

نیرو۔ (قطع کلام کرتے ہوئے) "جانے دو اُس کو۔ مجھے اس کی قیمت مطلوب نہیں۔"

گماشتہ (حیرت سے) "جی؟"

بمیلا (گماشتے سے) "تو کیا آپ اس کے لئے بھی ہم کو کچھ رقم دے سکتے ہیں؟"

نیرو (چیں بجبیں ہو کر) "کیا ضرورت ہے جی!"

بمیلا (گماشتے سے) "بھئی مجھے تو اپنا ہار سب سے زیادہ عزیز تھا۔ اور دراصل وہ تھا بھی سب سے زیادہ قیمتی۔"

گماشتہ۔ "اس کی کیا قیمت ہوگی؟" بمیلا نے نیرو کی جانب دیکھا جس نے ترشروئی سے جواب دیا "مجھے کچھ یاد نہیں رسید میرے پاس سے کھو گئی۔"

بمیلا۔ "لیکن وہ ———" نیرو کمرے میں سے جانے لگا اور گماشتے سے بولا "اچھا بھئی اب تم جا سکتے ہو۔ وہ فہرست جو تم کو صبح دی گئی ہے بالکل درست ہے۔ بس تم اُس کی تعمیل کرو۔" گماشتہ سلام کر کے رخصت ہوا۔ اُس کے جاتے ہی بمیلا غصہ سے بولی "یہ تم کو بعض وقت کیا ہو جاتا ہے۔ لو ہار مفت کھوئے دے رہے ہیں!"

نیرو۔ "میں کہہ تو چکا کہ مجھے اس کی قیمت یاد نہیں رہی نہ میں نے اس کا بیمہ کرایا تھا پھر کیا ———"

بمیلا۔ "نہیں تمہارا بیان قابلِ اطمینان نہیں ہے۔ مجھے بوضاحت سمجھاؤ۔ میں تمہارے رویہ میں ایک عجیب بات دیکھ رہی ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ تم نے اس کو کتنے میں خریدا تھا۔ بیش بہا اشیا کی قیمت انسان اس قدر جلد فراموش نہیں کر سکتا۔"

نیرو۔ "میں تم کو اس کی قیمت تو نہیں بتا سکتا۔"

بمیلا۔ (اپنے ہنسی مذاق کو جلنے دو میں قسم دے کر تم سے اس کی قیمت دریافت کرتی ہوں ———"

نیرو۔ "اور میں تم سے قسم لے کر انکار کرتا ہوں۔" چند منٹ بمیلا ضبط کئے نیرو کو تیز نظروں سے دیکھتی رہی اس کے بعد اپنی فطری کمزوری کی بنا پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پلنگ پر گر پڑی اور دیر تک زور زور سے

سسکیاں لیتی رہی۔ نیرو قریب آیا اس کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر بولا "لو اٹھو ـــــــ اٹھو تمہیں قسم ہے۔ رونا دھونا موقوف کرو" تھوڑی سی اکڑ اور کچھ خفگی کے بعد وہ سیدھی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اب بھی تھے کپکپاتے لبوں سے سسکیوں کے درمیان بولی "اچھا تو ـــــــ بتاؤ ـــــــ بتاؤ اس کی قیمت" نیرو بغلوں میں ہاتھ دیئے چپ چاپ کھڑا رہا۔ بمیلا نے اسی حالت میں گردن موڑ کر آنسوؤں کے نئے امنڈ آنے والے طوفان کو ضبط کرتے ہوئے کہا "بس معلوم ہوگیا تم کو مجھ سے محبت خاک بھی نہیں ہے"

نیرو کشمکش کی حالت میں کھڑا رہا۔ اس کے چہرے پر مغلوبانہ مسکراہٹ کے آثار تھے۔ آخر بمیلا کی پُرنم آنکھوں پر انگلیاں رکھ کر بولا "اچھا لو۔ ان کو خشک کر ڈالو۔ کہتا ہوں۔ بڑی وہ ہو"

بمیلا نے جھٹ پٹ آنسو پونچھ ڈالے۔ چند منٹ تک دونوں خاموش رہے۔ آخر وہ بولی "لو کہتے ہو یا نہیں"

نیرو "کہتا ہوں ـــــــ وہ ـــــــ وہ صرف تین روپیہ کا ہار تھا"

بمیلا "کیا؟ تین روپیہ کا؟"

نیرو "جی تین روپیہ کا"

بمیلا "جھوٹ۔ وہ سچے موتی تھے"

نیرو "ہرگز نہیں۔ بنانے والے کا دعوےٰ ہے کہ ان کے نقلی ہونے کی تمیز کوئی شخص کر ہی نہیں سکتا ہے۔ وہ بنائے گئے اس کاریگری سے تھے" بمیلا زرد پڑ گئی اور ایک بار پھر پلنگ پر گر پڑی "نقلی! مصنوعی موتی!! آہ" دھیمے لہجہ میں یہ الفاظ اس کی زبان سے نکلے۔ چند لمحہ بعد سر اُٹھا کر نیرو کی جانب خشمگیں نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی "تم نے مجھے بڑا فریب دیا۔ اور مجھ سے دوسروں کو فریب دلوایا"

نیرو۔ (بہ آہستگی) "ایسے الفاظ منہ سے مت نکالو۔ تمہاری قسم تمہیں فریب دینا ہرگز میرا مقصد نہ تھا میں تو تم کو صرف خوش کرنا چاہتا تھا۔ میری تمنا تھی کہ تم کو پھر تندرست دیکھوں میں تمہاری علالت کے زمانہ میں محسوس کر رہا تھا کہ کوئی مسرت بخش و خوش آئند ذریعہ تمہارے رفع اضمحلال کے لئے تلاش کروں۔ سخت ضرورت تھی کہ تمہارے ذہن میں کسی ایسی جاذبِ توجہ شئے کا خیال پیدا کر دیا جائے جو تم کو وقفہ وقفہ سے مسرت بخشتی رہے چنانچہ میں نے وہ ہار تجویز کیا اور وہ بہترین علاج ثابت ہوا۔ وہ گو خود نقلی تھا مگر اس نے جو مسرت تم کو بخشی وہ نقلی نہ تھی۔ اپنی بشاشت و شادمانی کا خیال کرو وہ کس قدر حقیقی تھی حالانکہ اس کا مبدار بجز ایک نقلی ہار کے اور کوئی نہ تھا۔ اگر تم ایک شئے میں مسرت بخش قوتیں تسلیم کر کے اس سے حقیقی اطمینان حاصل کرنے

کی عادی ہو سکتی ہو تو دنیا کی تمام قیمتی اشیا تمہارے سامنے سرنگوں ہو جائیں گی۔ افلاس وعسرت، ثروت وامارت اطمینان واضطرار سب کچھ تمہاری ذہنیت کا کرشمہ ہے۔ وہی ہار جس نے اپنی انبساط خیز قدرت سے تمہاری جسمانی کلفتوں کا ازالہ کیا ہے کیا اب تمہاری نظروں میں بے وقعت ہو جانا چاہئے۔ حالانکہ تم اعتراف کرتی ہو کہ اس کی بخشی ہوئی خوشیاں تمہارے لئے بہت قیمتی تھیں ———"

بمیلا جو اُس کی جانب دیکھ رہی تھی کچھ نہ بولی۔ نیرو نے اس کا ہاتھ محبت سے تھام کر دریافت کیا، بمیلا فرض کرو کہ تم کو کسی ذریعہ سے یہ یقین ہو جائے کہ میں بھی ایک جنسِ ناقص ہوں تو کیا تم مجھ سے بھی نفرت کرنے لگو گی؟ مجھ کو بھی حقیر سمجھنے لگو گی؟"

بمیلا "آہ نیرو ہرگز نہیں"

نیرو "مگر میں جو کچھ تم کو نظر آتا ہوں اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہوں"

بمیلا "مگر تم میرے لئے ———" دفعتہً دروازہ کھلا اور ملازمہ بے تحاشا یہ کہتی ہوئی اندر داخل ہوئی:

"لو بیوی! دیکھو یہ کیا ہے؟ تمہارا ہار! شکر ہے چور آخر اس کو نہ لے جا سکے غسل میں مجھ کو پڑا ہوا ملا ہے" بمیلا نے ایک مسرت کی چیخ ماری اور اُس کے ہاتھ میں سے اپنا ہار جھپٹ لیا۔ جب وہ تنہا ہوئے تو نیرو بولا "کیوں بمیلا اب اس کا کیا کرو گی؟ پھینک دو گی؟"

بمیلا "واہ کیوں؟ کیا وہ تمہارا دیا ہوا نہیں ہے؟ میرے لئے تو یہ سچے موتی ہیں۔

قیسی

رباعی

یارب مقصود خلق یک بس میں ہی تھا
ایسا تجھ بن عالم میں بس میں ہی تھا
سمجھے کام ظہور میں نہ آیا مجھ سے
سب تجھ کو یہ مجھ سے مدعا بس میں ہی تھا

درد

غزلیات

۱

مرے وہاں کے لئے یا جنے یہاں کے لئے
اکیلا دم کرے کیا کیا کہاں کہاں کے لئے

یہ ایک سلسلۂ درس ہے جہاں کے لئے
کہ گل چمن کے لئے ہیں چمن خزاں کے لئے

نہ جینے جی جسے موقع دیا بیاں کے لئے
اب اُس کی یاد سے ایما ہی داستاں کے لئے

کہیں کا حکم تو ہو جائے نیم جاں کے لئے
یہ اِس جہاں کے لئے ہی نہ اُس جہاں کے لئے

چمن میں خار ملے ہم کو آشیاں کے لئے
بہار نذر ہے اس حسنِ امتحاں کے لئے

سبب نہ پُوچھ کہ یہ ابتدا کی باتیں ہیں
فغاں ہی اب تو سبب ہے مری فغاں کے لئے

ہمیشہ رہتا ہوں اک بے خودی کے عالم میں
جہاں نہ میرے لئے ہی نہ میں جہاں کے لئے

چلی تھی لے کے ازل سی کہاں کی بے تابی
کہ موت سے بھی ہوا کچھ سکون جاں کے لئے

بہار کے لئے ہم ہیں کہ ہم ہیں اہلِ خزاں
ہنسیں نہ اہلِ بہار آپ ہیں خزاں کے لئے

نہ سمجھو بڑا اسے مجذوب کی بغور سنو
یہ ایک گنجِ معانی ہے نکتہ داں کے لئے

مجذوب لکھنوی

۲

کیا کروں ہنگامہ ہائے روح پرور دیکھ کر
بجھ گیا دل سانحاتِ غم کے منظر دیکھ کر

دیکھئے کیا رنگ لائے احتیاطِ ضبطِ غم
ڈر رہا ہوں میں سکونِ قلبِ مضطر دیکھ کر

کیا کوئی آسان ہے اِس سوزشِ غم کا علاج
چارہ گر دیتا ہے کیا رگ رگ میں نشتر دیکھ کر

کیا تمہیں اندازۂ ضبطِ جنونِ عشق ہے
مسکرا دیتے ہو کیوں تم مجھ کو اکثر دیکھ کر

کاظمی یہ زندگی وہ ہے کہ جس میں عمر بھر
داغ دیتا ہے فلک بہتر سے بہتر دیکھ کر

محمد عبدالحی کاظمی

بچّوں کی تعلیم اور ہماری ذمّہ داری

ایک زمانہ تھا جب رہنمایانِ تعلیم خیال کرتے تھے کہ بچوں کی تعلیم اور تربیت کا مطلب صرف یہ ہے کہ جو علم اور خبر ہم نے، ہمارے باپ دادا نے اور تمام دنیا نے اپنے تجربے سے پائی ہے وہ استاد یا والدین اپنے بچوں کو سکھا دیں تاکہ جوان ہو کر وہ اس علم سے فائدہ اٹھائیں اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے ٹھوکر نہ کھائیں سب سے بڑی بات جو بچے کو سکھائی جاتی تھی یہ تھی کہ بچّہ خوب دھیان لگا کر استاد کی باتیں سنے اور ہمیشہ یاد رکھے یعنی یہ خیال کیا جاتا تھا کہ بچّے کا دماغ ایک کھلے ڈبّے کی طرح ہے جس میں استاد جو چاہے بھر دے۔ لیکن اِس زمانے میں یہ خیال بدل گیا ہے۔ اب ماہرینِ تعلیم یہ کہتے ہیں کہ بچے کا دماغ دنیا کے علم سے بھرنا تعلیم کا صرف ایک ہی پہلو ہے۔ اس سے زیادہ اہم پہلو ایک اَور ہے جو تعلیم کا اصل مقصد پورا کرتا ہے۔ ہمیں طلبہ کو نہ صرف دھیان لگا کر استاد کی باتیں یاد کرنی سکھانی ہیں بلکہ اس کے علاوہ یہ سکھانا ہے کہ بچّہ خود بخود اپنے شوق اور خواہش کا اظہار کر کے اپنی طبیعت کا رجحان بتا دے۔ پھر ہمیں اِس طرح اُس کی تربیت کرنی ہے کہ اس کی خداداد قابلیتیں اور اُس کا حسنِ طبیعت معیارِ کمال پر پورا اُترے۔ ہم کو یاد رکھنا ہے کہ ہر بچے کا دماغ مختلف اور اُس کی طبیعت نرالی ہے۔ اگر ہم سچے دل سے بچے کی خداداد عقل اور شعور کو ترقی دینا چاہتے ہیں تو پہلے ہمیں معلوم کرنا ہے کہ وہ عقل اور شعور ہیں کس قسم کے۔ آپ باغ کی طرف نظر کیجئے۔ باغبان ہر ایک قسم کے پھول ایک جگہ نہیں اکٹھے کرتا اور نہ ہر ایک سے ایک سا برتاؤ کرتا ہے۔ کوئی پودے چھاؤں میں کھڑے ہیں کوئی دھوپ میں لہلہا رہے ہیں۔ کسی کو خوب پانی دیتا ہے کسی پر آہستہ آہستہ فوارے سے تھوڑا سا پانی چھڑک دیتا ہے۔ وہ ہر ایک پھول کی طبیعت سے خوب واقف ہے اور ہر ایک کی طبیعت کی ضروریات کے مطابق ان سے سلوک کرتا ہے تاکہ ہر ایک پھول اپنے حسنِ طبیعت کے کمال کو پہنچے۔

کیا ہمارے بچوں کا یہ حق نہیں؟ ہم کون ہیں جو ہر بات میں اُن پر زبردستی کریں اور ہر موقع پر اُن سے اپنی مرضی کرائیں۔ قدرت نے ہر ایک بچّے کو انوکھی طبیعت دی ہے۔ کسی کو کوئی قابلیت دی ہے کسی کو کوئی کسی کو کسی علم سے خاص دلچسپی ہے کسی کو کسی فن کا خاص شوق ہے۔ ہر ملک کو ایسے شخصوں کی ضرورت ہے

جو اپنے فن میں ماہر اور اپنی لیاقت میں کمال تک پہنچے ہوئے ہوں۔

استاد اور ماں باپ کو بعض اوقات رعب کا جھوٹا اور فضول خیال ہوتا ہے۔ وہ بہت کوشش کرتے ہیں کہ بچّے کو اپنی مرضی کے زور سے مشغول کریں بجائے اس کے کہ اُس کے دل میں شوق پیدا کر کے اُس شوق کے زور سے اس کو وہ علم سکھائیں۔ نفسیات کے ماہرین نے ثابت کر دیا ہے کہ جو علم زبردستی بچے کے دماغ میں بھرا جاتا ہے وہ بہت حد تک ناپائیدار ہوتا ہے مگر جو کچھ وہ اپنی خوشی اور شوق سے سیکھے بہت کم بھولتا ہے۔

جن کے سپرد بچوں کی تعلیم اور تربیت ہے اُن کی ذمہ داری بہت بڑی ہے۔ دنیا کی امید اِن ہی سے وابستہ ہے۔ قدرت کو معلوم ہے کہ ایک خاص وقت اور ایک خاص موقع پر کسی ملک کو اور دنیا کو کس قسم کے اشخاص کی ضرورت ہے۔ وہ تو اپنے ارادے کے مطابق ایسے بچّے پیدا کرتی ہے لیکن ان بچوں کو انسان کی تعلیم اور تربیت کا محتاج بناتی ہے۔ ان میں سے بعض بدقسمتوں کو ایسی تعلیم دی جاتی ہے کہ اُن کی شخصیّت مر جاتی ہے اور ان کی خداداد قابلیت کی کسی کو خبر تک نہیں ہوتی۔ وہ نہایت معمولی آدمیوں کی طرح دنیا میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ مگر بعض خوش قسمت ایسے ہیں کہ بچپن سے اُن کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔ اُن کی طبیعت میں بہادری ہوتی ہے۔ وہ بلا اندیشہ اور بلا خطرہ میدان میں نکل کر دنیا پر اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں۔ وہ اپنے فن میں ماہر اور اپنی لیاقت میں کمال تک پہنچ کر اپنے ملک کو رشکِ جنت بنا دیتے ہیں۔

مسٹر پی فلپز

رباعی

مقصود ہے تو بس جستجو سے باہر
وہ دل ہے کہ ہے رنگ و بو سے باہر
اندازہ کا سب تعیّن ہے غلط
مطلب ہے کلام و گفتگو سے باہر

اسمٰعیل

پارس پتھّر

ایک صحرانورد دیوانہ پارس پتھر کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اُس کے بال غبار آلود تھے اور جسم لاغر ہوتے ہوتے محض ایک سایہ رہ گیا تھا۔ اُس کے بے رنگ ہونٹ اُس کے دل کے دروازوں کی طرح سختی سے بند تھے۔ اُس کی آنکھیں انگاروں کی طرح روشن تھیں ـــــ اس کے سامنے ایک غیر متناہی سمندر لہریں مار رہا تھا۔

شوریدہ موجیں آتیں، مخفی خزانوں کا راز افشا کرتیں اور جاہلوں کی نادانی پر ایک تمسخر آمیز قہقہہ لگا کر لوٹ جاتیں۔

وہ نا امید ہو چکا تھا، مگر پھر بھی جستجو نہ چھوڑ سکتا تھا کیونکہ وہ اس کی حیات بن کر رہ گئی تھی؛ وہ اس کی رگوں میں خون بن کر دوڑ رہی تھی؛ اس کی آنکھوں میں نور بن کر چمک رہی تھی، جس طرح محیطِ اعظم ایک ناقابلِ حصول شے کی تمنا میں، اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے ہے، جس طرح سیارے ایک ایسی منزل کے تعاقب میں مصروف ہیں جو اُن کے سامنے پر لگائے اڑ رہی ہے؛ اسی طرح سمندر کے غیر آباد ساحلوں پر، وہ درماندہ شخص پارس پتھر کی تلاش میں آوارہ پھرتا تھا۔

ایک دن گاؤں کا ایک لڑکا اُس کے پاس آیا۔ اور تعجب سے بھری آواز میں کہنے لگا "اے خانہ بدوش مسافر! تیرے گلے میں کس قدر خوبصورت سنہری زنجیر لٹک رہی ہے!!"

دیوانہ چونک اُٹھا اُس کے جسم کا تمام خون اُس کے چہرے میں منجمد ہو گیا۔ وہی زنجیر جو کبھی لوہے کی تھی اب بلا شبہ خالص سونے کی بن گئی تھی۔ یہ ایک خواب نہ تھا، بلکہ سورج کی نظر سوز روشنی کی طرح ایک جیتی جاگتی حقیقت تھی۔ اس نے دیوانہ وار اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا اور بے اختیار ایک آہ اُس کے لبوں سے نکل گئی جو اُس کی مایوسی کا پہلا اور آخری اظہار تھا۔

وہ عادی ہو گیا تھا، کہ پتھر اُٹھاتا، اُسے اپنی زنجیر سے مس کرتا، اور بغیر کسی تبدیلی کی امید کئے پھینک دیتا۔ اس طرح اُس نے پارس پتھر پا بھی لیا اور کھو بھی دیا۔

سورج غارِ مغرب میں چھپ رہا تھا؛ آسمان دیوانہ شخص کے خوابوں کی مانند سنہری ہو گیا تھا جب وہ پاشکستہ شخص اپنے خزانہ کی تلاش میں واپس لوٹا، مگر اس کی قوت ختم ہو چکی تھی۔ اُس کا جسم خمیدہ ہو گیا تھا؛ اور اس کا قلب مایوسی میں دفن ہو چکا تھا۔

(ماخوذ)

معین الحق حقی دہلوی

محفلِ ادب

روسی ادب

انسان کو عام زندگی سے وابستہ اس کی آرزوئیں رکھتی ہیں اور اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ آرزو کرے اور اپنی زندگی کو اپنے ماحول سے وابستہ رکھے۔ جو شخص روحانی تنہائی اختیار کرتا ہے اُسے اپنی روحانی ضروریات اور فرائض سے رہائی نہیں ملتی، بلکہ وہ قوت جسے سماجی فرائض کی ادائگی میں صرف کرنا اُس کی فطرت کا تقاضا ہے اور کیفیتیں پیدا کرتی ہے جو اس کے لئے ایک مصیبت ہو جاتی ہیں۔ روسی طبیعت میں اپنی ذات کا احساس بہت ہے۔ فطرتاً تنہائی پسند ہونے کی وجہ سے وہ اُن روحانی تکلیفوں کو بخوبی برداشت کر سکتی ہے جو تنہائی کی شدت کا لازمی نتیجہ ہیں لیکن تنہائی کی شدت نے اُس کے اجزا کی ہم آہنگی اور توازن میں فرق ضرور ڈالا ہے، جو اس کے لئے کسی طرح سے فائدہ مند نہیں ثابت ہوا۔ انسان کو اپنی ذات کا احساس ضرور ہونا چاہئے، لیکن اگر یہ احساس اُسے عملی زندگی کی طرف مائل نہ کرے، یا عملی زندگی میں اُس کی مدد نہ کرے تو وہ طبیعت کی خامی یا ذہن کی بیماری ہے محض قوتِ مشاہدہ کی معجز نگاری نہیں۔ روسی ذہنیت میں اس بیماری نے بہت خطرناک صورت اختیار کر لی تھی، اور جس اخلاقی اور سیاسی پستی سے ملک کو بولشویک انقلاب نے نجات دلائی وہ سب سے زیادہ اس ذہنی مرض کا نتیجہ تھی۔ روسی انشاپردازوں نے اس خصوصیت کو بہت خوبی اور سچائی سے ظاہر کیا ہے، لیکن کبھی کبھی اُن کی حقیقت نگاری بھی کھلنے لگتی ہے۔ جو بیان روسی طبیعت کے لئے صحیح ہے اور روسیوں کو اپنی فطرت کی حقیقی تصویر دکھاتا ہے، وہ ہمیشہ اُن طبیعتوں کے متعلق صحیح اور حقیقت نما نہیں ہو سکتا، جنہوں نے مختلف ماحول میں تربیت اور نشو و نما پائی ہے، یا جن کی ساخت اور افتاد دوسری قسم کی ہے، اور انسانی فطرت کے بھید بوجھنے والوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے ماحول کے محدود دائرے سے گذر کر تمام بنی نوع انسان کو اپنا مخاطب اور اپنا موضوع بنائیں۔ اس نقطۂ نظر سے تقریباً تمام روسی انشاپردازوں پر کسی نہ کسی حد تک یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے انسان کی صحت سے زیادہ ان کی بیماریوں کی طرف توجہ کی ہے، اُن کی نگاہ کا رجحان انسانی پستی کی طرف ہے، بلندی کی طرف نہیں یعنی انہیں پڑھ کر ہم اُس پستی سے زیادہ واقف ہو جاتے ہیں جس میں نادانی اور قسمت کی خرابی انسان کو گرفتار کر سکتی ہے بہ نسبت اُس بلندی کے

جس پر اُس کی فطرت کی پوشیدہ قوتیں اُسے پہنچا سکتی ہیں، اور حقیقت میں اگر انسان پست بھی ہے تو اس کا بلندی اور بزرگی حاصل کرنا حقیقت سے بعید نہیں۔ مگر یہ ضرور ہے کہ جن مصنفوں نے پستی کے غار کو سب سے زیادہ تاریک دکھایا ہے اور اس کی سیر کے لئے ان کا ذوقِ جفاکشی بڑی کثرت اور بڑے انہماک سے انہیں لے جاتا ہے وہ بلندی کے خواب بھی اکثر دیکھتے ہیں، اور ان خوابوں میں اصلیت اور یقین کی ایسی تاثیر ہوتی ہے جو اعتدال پسند مصنفوں کے امکان اور تصور سے باہر اور برتر ہوتی ہے۔ ذہن اور دل کی بیماریاں، مایوسی اور بےکسی کی وہ فضا جس میں مثلاً معلوم ہوتا ہے کہ دستئفسکی کا تصور ایک زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہا ہے دراصل امید اور کامیابی اور فلک پیما بلند پروازی کی تمہید ہے، یہ ایک ایسی منزل ہے جس سے گذرنا ہر ذی حس انسان کے لئے لازم ہے اور جس سے گذر کر ہم انسانیت کا جلوہ دیکھ سکتے ہیں، اس جلوے کا عکس ہمارے دلوں میں محفوظ رہ سکتا ہے، اور اگر ہم چاہیں تو انسانی زندگی کو اس سے روشن بھی کر سکتے ہیں۔ میکسم گورکی جن مفلس، مصیبت زدہ اور بدچلن روسیوں کا ہم سے تعارف کراتا ہے ان کی فطرت غربت اور بری عادتوں کی زنجیروں میں ایسی بری طرح جکڑی ہوئی ہے، ان کے دلوں کو برے اعمال اور ارادوں نے ایسا سیاہ کر رکھا ہے، ان کے ماحول میں راہِ راست پر چلنے کی ترغیب دلانے والے اثرات اتنے کم اور کمزور ہیں کہ ہمیں ان کے انسان ہونے کیا زندہ رہنے پر تعجب ہوتا ہے، لیکن انسانیت کی اس عبرت انگیز بربادی میں بھی ایک روشنی کبھی کبھی نظر آجاتی ہے جس پر اگر اپنی نظر قائم رکھ سکیں تو گورکی کے تمام ویرانے آباد معلوم ہونے لگتے ہیں، اس کے بیماروں میں صحت کے وہ آثار، مردوں میں زندگی کی وہ علامات ظاہر ہونے لگتی ہیں جو ہم کو یقین دلا دیتی ہیں کہ انسانیت کا جوہر کبھی کم نہیں ہو سکتا۔ اس کے دشمن اسے چاہے جتنا چھپائیں وہ ہماری نظروں سے بالکل غائب نہیں ہو سکتا، اور جب کبھی وہ نظر آئے گا تو اس شان سے کہ ہم صرف دوسروں کی نہیں بلکہ اپنی زندگی بھی اس سے روشن پائیں گے۔ گورکی نے انسانیت کا جو جوہر دریافت کیا ہے وہ انسانی ہمدردی ہے، ایک جذبہ جو پست حیوانی زندگی کی تاریکی کو اُسی طرح سے ریزہ ریزہ کر دیتا ہے جیسے بجلی کالی گھٹاؤں کے اندھیرے کو۔

روسی ادب دراصل محض مایوسی اور حزن کا خزانہ نہیں، جیسا کہ اس کے چند نقادوں کا دعویٰ ہے، مگر روسی انشاپردازوں نے زندگی کو زیادہ شوخ رنگوں میں دکھا کر اکثر خود اپنی امیدوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ وہ ہمارے دلوں میں وہ کیفیت پیدا کرنا چاہتے ہیں جو ان کے دلوں پر گذر چکی ہے، اور اس کا مطلق لحاظ نہیں رکھتے کہ ہم یہ بار برداشت کر سکتے ہیں یا نہیں، وہ ہمیں دوزخ کی سیر کراتے ہیں اور بغیر جنت کا راستہ بتلائے ہوئے ہمارا ساتھ چھوڑ دیتے

ہیں۔ اس طرزِ عمل سے شکایت ہے مگر زیادہ تر اُن لوگوں کو جن کے خیال میں ادبی تصنیفات کا اصل مقصد دلچسپ ہونا، جذبات میں گدگدی پیدا کرنا، اور جب فرصت یا بےکاری کا وقت ختم ہو جائے تو یاد سے محو ہو جانا ہے۔ سنجیدہ ناول نویسوں کا نصب العین کبھی اور کہیں بھی ایسا حقیر نہیں ہوا ہے کہ وہ اس مذاق کا لحاظ کریں، لیکن روسی انشا پرداز اکثر ایک قدم آگے بڑھ گئے ہیں اور ناولوں اور افسانوں سے حتی الامکان خالص دلچسپی کا عنصر بالکل نکال دیا ہے روسی ناول وغیرہ عبرت اور تعلیم کا ذریعہ ہیں، اور صرف اس عبرت کا نہیں جو ہمارے سامنے دوسروں کی حماقتیں ایک غیبی تنبیہ کی شکل میں پیش کرتی ہے، بلکہ اُس عبرت کا جو ہمارے دلوں کو انسانی ہمدردی کی جولاں گاہ، محبت اور ایثار کا سرچشمہ بننے کا حوصلہ دلاتی ہے، اور صرف اس تعلیم کا نہیں جو ہمیں "آسائش دوگیتی" حاصل کرنے کی ترکیبیں سکھاتی ہے، بلکہ اُس تعلیم کا جو خود غرضی اور ذاتی کامیابی کی ذلیل خواہشوں کے پنجے سے رہا کرکے دل کو زندگی اور جذبات کا مرکز بناتی ہے۔ اس میں اتنی ہمت پیدا کرتی ہے کہ وہ روح کو نفس پر ترجیح دے سکے، اور اپنے سکون اور آسودگی کو ہمیشہ قربان کرنے پر تیار رہے۔ بہترین روسی ناولوں کا مقصد زندگی کی صحیح اور سچی تصویریں پیش کرنا ہے، جن میں ایک صحیح اور سچا فلسفہ بھی مضمر ہو، جن سے ذہن میں وسعت دل میں درد، اخلاق میں محبت اور ہمدردی پیدا ہو۔ اس بلند حوصلے کے ساتھ ناممکن تھا کہ وہ ہر بوالہوس کے مذاق کو اپنا معیار بنائیں اور محض لطف اور دلچسپی کا سامان پیدا کریں۔

روسی ادب میں تشکیلِ زندگی کی کوششیں بہت نایاب ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی ایک فلسفۂ زندگی اور فلسفۂ کائنات ضرور ہے جو بالکل نرالا، بہت معیّن اور بہت بااثر ہے۔ اگر ہم اسے اپنے یا کسی اور قوم کے معیار سے جانچیں تو ہر طرف مبالغہ، کج طبعی، خود بینی اور جہاں فراموشی کا گمان ہوتا ہے۔ انفرادیت، اور اس سے زیادہ ذات کا مشاہدہ، اور ذاتی نفسی مسائل میں غرق رہنا ایک خبط سا معلوم ہوتا ہے جس سے کوئی طبیعت (جو زیرِ بحث ہو) پاک نہیں نظر آتی۔ لیکن اگر ہم زیادہ غور کریں تو ہمیں یقین ہو جائے گا کہ یہ کوئی دیدہ و دانستہ کج روی نہیں ہے، نہ جدّت پسندی جو حد سے اس قدر تجاوز کر گئی ہے کہ مہمل یا ناگوار ہو جائے۔ روسی انشا پردازوں کا نصب العین انسان اور انسان کی ہستی کو کائنات میں ایک نیا درجہ، نئی اہمیت دینا، خالق اور مخلوق میں ایسی آشنائی اور بےحجابی کی رسم قائم کرنا ہے کہ کسی توسط کی حاجت نہ رہے۔ انسان کی موجودہ بےکسی اور روحانی بےمائگی دیکھتے ہوئے یہ تمنا کرنا ہمت کا کام ہے۔ اگر روسی انشا پرداز اپنی کوششوں میں کامیاب ہوئے ہوتے تو وہ "اہلِ کتاب" ہونے کا دعویٰ کر سکتے تھے، اور کوئی انصاف پسند اور حق پرست انسان اُن کے دعوے کو باطل قرار دیتا۔ وہ ناکامیاب رہے لیکن

انسانیت کی تعمیر صرف کامیاب روحانی اور اخلاقی تجربوں پر نہیں ہوتی۔ عظمت صرف انہیں کا حصہ نہیں اور نہیں ہونا چاہئے جو اپنی تمنائیں پوری کر لیتے ہیں، اس لئے کہ تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ کامیابی تمناؤں اور آرزوؤں کو محدود کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ ہم اگر صرف کامیابی ہی کے قائل ہوں تب بھی اُن حوصلوں کی داد دینا ہمارا فرض ہے جنھوں نے بلند پردازی کا بیڑا اٹھایا اور ناکامیابی یا شکست کی پروا نہ کی۔

انسان جب کوئی مشکل ارادہ کرے تو اُسے چاہئے کہ اپنی قوت اور امکان کا صحیح اندازہ کر لے۔ روسی انفرادیت، خودی کا مشاہدہ، ذات سے گہری وابستگی دراصل انسان اور انسانیت کی ایک سخت آزمائش ہیں، اور اس آزمائش کے کل لوازمات پورے کرنے کے لئے روسی نظر نے اپنی تحلیل میں انسانی ہستی کے کسی پہلو، انسانی فطرت کے کسی راز کو نہیں چھوڑا ہے۔ جستجو کے سلسلے میں بہت سی ناگوار باتیں دریافت ہوئیں جن کے اعلان کرنے میں روسی انشا پردازوں نے مطلق تکلف نہیں کیا ہے، بغیر اس کا خیال کئے ہوئے کہ دنیا کیا کہے گی اور کیا سمجھے گی، بہت سے راز فاش کر دیئے جنہیں چھپانا ابھی تک ہر جگہ کا معمول تھا۔ ان پوشیدہ رازوں کے معلوم کرنے سے ہم اپنی فطرت کی اندرونی کیفیات بہت بہتر سمجھ سکتے ہیں، اور کیرکٹر اور اخلاق اور اعمال کے پیچیدہ معمے بہت آسانی سے حل ہو جاتے ہیں۔ روسی طبیعت میں جتنا ذوقِ جستجو سرگرم ہے اسی قدر خامیوں اور خرابیوں کا اعتراف کرنے کی ہمت بلند، اور اسی وجہ سے روسی انشا پردازوں کی صاف گوئی پر ہم کو اکثر تعجب ہوتا ہے اور کبھی کبھی تکلیف بھی۔ یہ تکلیف اور معنی و مطلب سمجھنے کی دشواریاں جو اکثر روسی ادب کے مطالعے میں پیش آتی ہیں، ہمیں خوشی سے برداشت کرنا چاہئیں۔ ان کی بنا محض طرز اور اسلوب اور تخیل کی جدت پسندی نہیں! ان سے ہم کو وہ ذہنی تجربہ اور دل کی وسعت حاصل ہوتی ہے جو انسانیت کا طغرائے امتیاز ہے۔ اگر ہم اس نیت سے روسی ادب کا مطالعہ کریں کہ اپنی انسانیت کو فروغ دیں تو اس کی عظمت کا ہم کو صحیح اندازہ ہوگا اور اس کے جوہر پرکھنے کی ہم میں صلاحیت بھی بہت زیادہ ہو جائے گی۔

"اردو"

تتلی

پر کھول کے تتلیوں کی پرواز	پر جوڑ کے بیٹھنے کا انداز
اس پھول سے اڑ کے اُس پہ بیٹھیں	رس لے کے اڑیں وہ جس پہ بیٹھیں
نازک نازک وہ خوشنما پر	اڑتی ہوئی پتیاں ہوا پر

وہ نقش و نگار اور بوٹے
پر اُن کے چھوؤ تو رنگ چھوٹے

ہیں رنگ کئی ہر ایک پر پر
چھوٹا سا چمن ہے اُن کا ہر پَر

ہر خال ہے پر پہ اک نگینہ
سونے چاندی پہ یا ہے مینا

جو نقش و نگار سے ہے خالی
وہ بھی دل کی لبھانے والی

ہے رنگ کسی کا زرد گہرا
اتنا گہرا کہ بس سُنہرا

کوئی جس کے سپید ہیں پَر
جیسے چاندی کے صاف پتّر

طاؤسی ۔ صندلی ۔ گلابی
دھانی ۔ کاہی ۔ سیاہ آبی

نیلے ۔ اودے ۔ زمردیں ۔ لال
ہر رنگ کے پَر ہیں ۔ بے خط و خال

(شوق قدوائی)
"ساقی"

جاپانی شاعری کے چند نمونے

بانس اور طوفان۔ بانس زمین کے ساتھ لگ گیا ہے! نازک و لطیف بانس۔ برف کے ظالم بوجھ کے نیچے یہ آسمانی پودا زمین کے ساتھ لگ گیا ہے۔

آہ ظالم، سرد مہر، برف!

طوفان فرو ہو چکا ۔ اور دیکھو بانس کس طرح بلند، تنا ہؤا، مغرور قائم ہے۔ فطرت پھر مسکرا رہی ہے۔ سورج چمک رہا ہے۔ کہاں ہے وہ برف جو بانس کو پیغام موت دینا چاہتی ہے۔

بلبل۔ میں چاہتی ہوں کہ پردے ہٹا کر بلبل کو دیکھ لوں۔ لیکن ڈرتی ہوں کہ وہ ڈر جائے گی اور اُڑ جائے گی۔ اور اس لئے میں خود ڈرتی ہوں۔ کانپتی ہوئی پردے کے پیچھے کھڑی ہوئی جذبات کے اُس سیل کے ساتھ بہی جا رہی ہوں جو اس کے نغموں سے پیدا ہے۔

بہار۔ آہ! لطیف و سبک بہار! ہر زندہ شے سے ناقابل بیان حسن کے سانس نکل رہے ہیں۔ پھول محو پرواز ہیں اور تیتریاں پھولوں کی طرح ہوا کو معطّر کر رکھی ہیں۔ ان میں سے پھول کون سا ہے، اور تیتری کون سی، میں یہ نہیں سمجھ سکا!

"ادبی دنیا"

مطبوعاتِ جدیدہ

انسدادِ گداگری۔ مصنفہ میاں سلطان احمد صاحب وجودی۔ اس کتاب میں آیاتِ قرآنی، احادیثِ نبوی، علما وحکما و مشاہیر کے اقوال اور تاریخی واقعات سے بھیک مانگنے کی برائیاں ظاہر کی گئی ہیں۔ ہندوستان اور دوسرے ممالک میں بھیک مانگنے والوں کے حالات درج کئے گئے ہیں اور اس کے انسداد کے طریقے بتائے گئے ہیں حجم ۴۰ صفحات قیمت ایک روپیہ۔ مینجر نظامیہ بک ڈپو پٹیالہ سے طلب فرمائیے۔

ظہورِ رحمت۔ مسدس کی صورت میں میلاد نامہ ہے جسے اس دور کے مسلّم الثبوت استاد حضرتِ شاد عظیم آبادی مرحوم نے لکھا ہے۔ یہ وہی میلاد نامہ ہے جسے شاد نے علی گڈھ جاکر پڑھا تھا اور حالی، شبلی اور سید کو مشتاق بنایا تھا۔ زبان شیریں اور طرزِ ادا پاکیزہ ہے۔ حجم چھوٹی تقطیع کے ۴۰ صفحات، قیمت آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ، دار الاشاعتِ رحمانی، مھندرو، پٹنہ۔

"تاریخ"۔ یہ سہ ماہی رسالہ تاریخ اور آثارِ قدیمہ کے مشہور ماہر حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری اور اُن کے ہونہار فرزند سید احمد اللہ صاحب قادری کی ادارت میں تقریبًا ایک سال سے جاری ہے اس میں تاریخ و آثار کے متعلق بلند پایہ اور محققانہ مضامین درج ہوتے ہیں۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس کی قدر کرنی چاہئے۔ قیمت سالانہ پانچ روپے۔ مینجر رسالہ "تاریخ" کوٹلہ اکبر جاہ حیدر آباد دکن سے طلب فرمائیے۔

"بصیرت"۔ یہ رسالہ مولوی عبد الحق صاحب ودیارتھی اور مولوی محمد عصمت اللہ صاحب کی ادارت میں لاہور سے ماہوار شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ اس کا اولین مقصد لوگوں کو حقیقی نیکی اور فلاح کی طرف بلانا اور ہندوستان کی اقوام کو باہمی غلط فہمیوں سے آگاہ کرکے اُن کے درمیان محبت و رافت کے جذبات پیدا کرنا ہے۔ اس اہم مقصد کے علاوہ علم و ادب کی خدمت بھی اس کے مقاصد میں شامل ہے۔ اب تک اس رسالے کے تین پرچے شائع ہو چکے ہیں جن کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہیں بڑی محنت اور سلیقے سے ترتیب دیا گیا ہے۔ مضامین دلچسپ ہیں اور اپنے مقاصد کو نہایت اچھی طرح پورا کر رہے ہیں۔ سالانہ چندہ چار روپے چھ آنے معہ محصول۔ پتہ، مینجر رسالہ "بصیرت" احمدیہ بلڈنگ، لاہور۔

"ہونہار" یہ بچوں کا ایک خوبصورت ہفتہ وار رسالہ ہے جس میں جدید معلومات، اخلاقی مضامین، دلچسپ افسانے، دلکش نظمیں اور چھوٹی چھوٹی خبریں شائع ہوتی ہیں۔ زبان سادہ اور آسان ہوتی ہے۔ بچوں کی علمیت میں یہ رسالہ نہایت مفید اضافہ کرنے والا ہے۔ سالانہ قیمت پانچ روپے۔ مینجر رسالہ "ہونہار" ریلوے روڈ لاہور سے طلب فرمائیے۔





چاند "اردو" میں

الہ آباد کے ہردل عزیز ہندی "چاند" کی چاندنی تو بہت سے
لوگ دیکھتے ہیں۔ مگر اردو داں پبلک اس سے کیا نفع پا سکتی تھی۔

اردو داں پبلک کے واسطے یہ نعمت غیر مترقبہ کا سامان کر دیا گیا۔ اور "چاند" اردو بھی نکل آیا۔ اردو چاند علمی، ادبی، اخلاقی، تاریخی اور اصلاحی پرچہ ہے ملکی اتحاد و اتفاق کی ترجمانی کرتا ہے۔

چاند اعلیٰ درجہ کے کاغذ دیدہ زیب لکھائی اور اعلیٰ درجہ کی چھپائی کے سوا ۱۲۰ صفحوں سے زائد پر مشتمل ہوتا ہے

چاند ملک کے تمام موجودہ ادبی اور اصلاحی رسالوں سے بہت زیادہ رنگین و سادہ عکسی تصاویر اور دلچسپ و مفید کارٹون دیا کرتا ہے۔

چاند جنس لطیف کا حامی اور دلگیر ہے۔ ملک و قوم کو بری رسموں اور قبیح عادتوں سے پاک کرنے کا سب سے بہتر وسیلہ ہے اس کی تمام تر کوشش مجلس مستعد حارا اور ملک کی ہر گونہ ترقی پر مرکوز رہتی ہے

چاند ملکی تفریق مٹانے میں سرگرم ہے اس کی زبان بھی عام ملکی اردو زبان ہے یعنی خاص وہ زبان رکھتا ہے جس کو ہر قوم کے خاص و عام بخوبی سمجھتے اور بولتے ہیں

چاند نظم ادب کی دونوں شاخوں نثر و نظم سے آراستہ رہتا ہے۔ وہ قدیم و جدید شاعری اور انشاپردازی کے گلہائے رنگارنگ سے اپنے دامن کو پُر کرتا ہے نکتہ چینی اور عیب بینی اس کی عادت نہیں۔ ضروری تنقید لٹریری خدمت سمجھ کر کی جا سکتی ہے مگر مدح سرائی، ذاتی حملے اور مناظرہ کی اس میں گنجائش نہیں۔ صرف مفید عام باتیں درج ہوتی ہیں مذہبی اقوال اور مذہب کی خوبیاں تو بیان کرتا ہے لیکن مذہبی مباحثات سے کنارہ کش رہتا ہے۔ اس کی پالیسی صلح کل ہے۔

چاند ظرافت کی پُر لطف چاشنی اس حد تک رکھتا ہے جس قدر کھانے میں نمک۔ فحش و رکیک اور طعن و تشنیع شیوہ نہیں

"چاند" اردو ہر مہینہ کی پندرہویں تاریخ سے قبل شائع ہو جاتا ہے گویا یہ چاند کامل بن کر نکلتا ہے

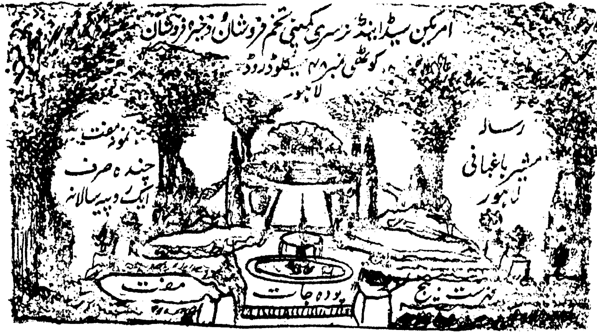
ملک کے نامور اخبارات و رسائل اور مقتدر اصحاب نے چاند اردو کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا ہے اور اس سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ فرمائی ہیں اس شمع چاند کی سرپرستی اور کثرت اشاعت ہی سے اس کے فوائد کی عام اشاعت ہو سکتی ہے علم و عمل کے شائق اصحاب کو بہت جلد اس رسالہ کی خریداری میں حصہ لینا چاہیے۔ نام نامی بلا توقف فہرست خریداران میں درج کرا لیجئے ایڈیٹر منشی کنہیا لال ایم اے ایل ایل بی ایڈوکیٹ الہ آباد

چاند اردو میں اشتہارات دینا کامیابی کا معقول وسیلہ ہے مفصل کیفیت مینیجر دفتر چاند اردو ایڈیشن چندرلوک الہ آباد سے دریافت کیجئے۔

چندہ سالانہ	آٹھ روپیہ	نمونہ بلا قیمت نہ ملیگا۔
ششماہی	پانچ روپیہ	
فی پرچہ	ایک روپیہ	

ٹیلیفون نمبر ۲۰۷ تار کا پتہ:- چاند

خاص نوٹ رسالہ کیلئے ہر قسم کے مضامین بھیجئے — کا پتہ۔ ایڈیٹر چاند (اردو) الہ آباد ہے۔


امریکن سیڈ اینڈ نرسری کمپنی تخم فروشان و ذخیرہ فروشان
کوٹھی نمبر ۴۸
لاہور
رسالہ
مشیر باغبانی
لاہور
نمونہ مفت
چندہ صرف
ایک روپیہ سالانہ
فہرست بیج
پودہ جات
مفت



چاند آسمان ادب کا چاند ہے۔ چاند اصلاح مجلس کے فلک کا قمر ہے۔
چاند علوم وفنون کی ضیا باری کرتا ہے۔ چاند قوم کا دلسوز مشیر ہے۔ چاند رہنمائے ترقی ہے۔
چاند ایک سچا ناصح ہے۔ چاند کی نصیحت میں شکر سے لپٹی ہوئی تلخی ناگوار نہیں گذرتی۔ چاند راستی
کا حامی اور راست گوئی کا بیش بہا نمونہ ہے۔ چاند کسی کی دل آزاری سے دور ہے۔ چاند صلح کل کا
منادی ہے۔ چاند دلچسپی اور سبق آموزی کا بیش بہا مجموعہ ہے۔ چاند کے ناظرین اسکی خوشگوار روشنی
سے لبریز مسرت ہوتے ہیں۔ چاند محض مدعی نہیں بلکہ عامل کامل ہے۔ چاند وہی کہتا ہے جو خود کرتا ہے
چاند کی باتیں یا رتی یا دن تولہ کھری ہوتی ہیں۔ چاند قوم کی سدھار کا بھوکا ہے۔ چاند قوم و
ملک سے اس کی چاندنی کا لطف اٹھانیکا دان مانگتا ہے۔

اتنی خوبیوں کے ساتھ چندر لوک۔ الہ آباد سے نکلتا ہے۔ خریدار چاند پر ٹوٹے پڑتے
ہیں۔ آپ بھی دیر نہ کریں۔ نمونہ منگا کر دیکھیں۔ اور مستقل معاون بنجائیں۔ ہمیں امید ہے کہ
آپ نمونہ دیکھتے ہی تامل نہ کرینگے۔ اور درخواست خریداری کر دینگے۔

ایڈیٹر۔ منشی کنھیا لال۔ ایم، اے، ایل، ایل، بی ایڈوکیٹ۔

چندہ سالانہ آٹھ روپیہ ششماہی پانچ روپیہ۔ فی جلد ایک روپیہ کاپی نمونہ بلا قیمت روانہ ہوگی
نام نامی بلا توقف مندرج فہرست خریداران کرا لیجئے

چاند اردو میں اشتہارات دینا کامیابی کا وسیلہ معقول ہے۔ مفصل کیفیت منیجر دفتر "چاند"
دار دو ایڈیشن چندر لوک، الہ آباد سے دریافت کیجئے۔ ٹیلیفون نمبر ۲۰۵ تار کا پتہ: "چاند"

خاص نوٹ مضامین نظم و نثر و دیگر ایڈیٹوریل مضامین کے بابت مراسلات بنام ایڈیٹر چاند اردو ہونا چاہئیے

عالیجناب سر عبد القادر صاحب جج ہائیکورٹ۔ لاہور "میں آپ کے قابل تعریف کام میں کامیابی کا متمنی ہوں"

مسٹر ایف، ڈبلیو، ولسن "میں تہ دل سے اس کی پوری کامیابی کی خواہش کرتا ہوں"

جناب پنڈت موتی لال صاحب نہرو "چاند ایک حقیقی ضرورت کو پورا کرتا ہے"

جدید فہرست کارخانہ مفت طلب فرمائیے

اعلیٰ حضرت حضور نظام سلطان العلوم نے اس کارخانہ کا عطر پسند کیا اور عطر ہر جگہ مقبول ہے

اعلیٰ طبقہ کی خواتین میں سے بیشتر اس کارخانہ کا تیار کردہ بالوں کا تیل استعمال کرتی ہیں

یہ کارخانہ ۱۸۳۹ء سے نیک نامی کے ساتھ جاری ہے

قواعد

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور ساڑھے نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ۱ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیئے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے، ششماہی تین روپے (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ر نمونہ ۶ر۔

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجیئے۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۳۔ لارنس روڈ لاہور

سید عبد اللطیف مینیجر رسالہ ہمایوں نے مسلم پرنٹنگ پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

موصولہ ۱۰ آبان سنہ ۱۳۴۶ف

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۶۳

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگار علامۂ فضیلت آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہُمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے، بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: منصور احمد

فہرست مضامین

جلد ۱۶ — نمبر ۲

بابت ماہ اگست سنہ ۱۹۳۰ء

تصویر:- آواز

پھول

وہ چمن جس کی بہاروں میں ہے منظر حُسن کا

وہ چمن ہے ذرّہ ذرّہ جس کا مظہر حُسن کا

جس کی زرّیں پتّیوں پر نقش ہیں رعنائیاں

جس کے رنگیں طائروں کو گیت ازبر حُسن کا

کھیلتی ہیں جس میں دن بھر خُوبیاں محبُوبیاں

نُور افگن ہے جہاں راتوں کو اختر حُسن کا

مل گیا قسمت سے مجھ کو اُس چمن کا ایک پھُول

جس کی اک اک پنکھڑی دل کو ہے ساغر حُسن کا

زندگانی اُس کی خوشبو سے ہے نکہت سر بسر

اُس کے جلووں سے ہے دنیا مجھ کو جنّت سر بسر

ل ب

کلیاں

مایوس ہو جا، ہمت نہ کر سک، دل شکستہ بھی ہو!
سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ جا، لیٹ جا، بے چین ہو جا، کروٹ بدل، کانپنے لگ جا!
بدن کے تابع ہو جا، دل کو ڈھونڈ کہ کہاں ہے، روح میں یقین نہ کر! یہ سب کچھ ———
لیکن دو چار گھنٹے کے بعد، دو چار دن کے بعد، بیسیوں راتوں کے بعد ایک صبح اُٹھ اور ان سب پر مسکرا دے، پھر دن اور رات کمزوریوں کا تماشا دکھا اپنے آپ کو اور اوروں کو بھی، کچھ دن، دنوں کی ساعتیں، ساعتوں کے ثانیے پھر اُسی طرح گذار، ہمت ہار دے، دل توڑ لے، سرگریباں ہو جا، کمزوری کے ہاتھ جوڑ دے ———
لیکن دوبارہ اس سب کچھ کے بعد ایک شام پھر ڈوبتے سورج سے مسکرا کر یہ کہہ دے کہ میں بھی ڈوبوں گا تو تیری سی شان و شوکت کے ساتھ اور پھر جس طرح تو کل کو نمودار ہو گا اُسی طرح میں بھی اس مصیبت بھری دنیا میں اپنے لئے مزید قوت اور مسلسل محنت اور مطمئن خوشی کا پیام لے کر پھر اٹھوں گا اور پکاروں گا کہ میں ہوں ایک سچا انسان اپنے خدا کا بندہ اور اپنی آزادی کا سرتاج!

سزا دے ہاں مجھے ضرور سزا دے لیکن سمجھے کیا معلوم سزا دینے والے! کہ اب تیری سزائیں میری جزائیں ہونگی! تو برحق میں قصوروار لیکن یہ قصور کتنے پُر سرور ہیں جنہیں تُو نے قصور پکارا! ——— محض یہ تیری پکار ہی میرے لئے پیار ہے تیرا، ورنہ میں تو سزاوار تھا صرف تیری خاموشی کا میرے اچھے سزا دینے والے!

میں نے مانا میں جھوٹا تو سچا!
لیکن پھر اِس سے حاصل؟
میں نے مانا وفاداری ہی اچھی تھی اور میں نے نہ کی
لیکن اب اِس سے حاصل؟
میں نے مانا میں کبھی اچھا تھا اور پھر بُرا ہو گیا۔
لیکن کیا عجب کہ جو کبھی اچھا تھا وہ پھر بھی کبھی اچھا ہی ہو جائے
تیری اچھائی سے میرے اچھے!

باغبان

جہاں نما

حاجی ترنگ زئی

حاجی ترنگ زئی کے متعلق جن کے قبیلے کے لوگ پچھلے دنوں پشاور کی تسخیر کے ارادے سے انگریزی افواج کے ساتھ جنگ کر رہے تھے لنڈن "سٹار" کا ایک نامہ نگار لکھتا ہے:-

حاجی صاحب ایک مقدس شخصیت ہیں، اور درۂ خیبر کے پیر پرست لوگ اُن کے احکام کو کلامِ الٰہی کی طرح مانتے ہیں۔ وہ کوئی معمولی طاقت کے آدمی نہیں، بلکہ اُن کے ایک اشارے پر اُن کے مریدوں میں سے بیس ہزار مسلّح آدمی جنگ کے لئے تیار ہو سکتے ہیں اور یہ تعداد اس سے دس گنی ہو سکتی ہے اگر آس پاس کے قبیلوں کو معلوم ہو جائے کہ پشاور پر مدافعت کرنے والا کوئی نہیں۔

میں نے پہلے پہل انہیں ایک پہاڑی گاؤں میں دیکھا۔ میں ایک بلند ٹیلے پر بیٹھا پٹھان عورتوں کو سروں پر پانی کے گھڑے اٹھائے ہوئے تیز تیز اپنے گھروں کو جاتا دیکھ رہا تھا کہ میں نے محسوس کیا کہ مجھے اُس جگہ پہنچنے میں کچھ دیر ہو گئی ہے جہاں گاؤں کے رئیس حاجی صاحب کے استقبال کا انتظار کر رہے ہیں۔

رات ہو چکی تھی کہ دور پہاڑوں کے پرے ایک روشنی نظر آئی۔ اس کے بعد ہمارے قریب ہی ایک الاؤ روشن کر کے اِس اشارے کا جواب دیا گیا۔ پھر ایک تیسری اور اس کے بعد آخری روشنی اُس چٹان کی چوٹی پر نمودار ہوئی جہاں گاؤں میں داخل ہونے کا راستہ تھا۔ حاجی صاحب اپنے رفقا کے ساتھ چلے آ رہے تھے۔ گاؤں والے کہتے تھے کہ وہ بہت سا مالِ غنیمت اپنے ساتھ لائیں گے اور اُن کے خنجر سے لہو کے قطرے ابھی ٹپک رہے ہونگے لیکن سرحد کے دوسرے مقامات کے لوگ اس انتظار میں تھے کہ دیکھئے آزاد سرزمین کا یہ بے تاج بادشاہ جہاد کا اعلان بھی کرتا ہے یا نہیں۔ مُلّا بھی یہی چاہتے تھے۔

کچھ دیر کے بعد بندوقوں کی گونج پہاڑی کے اس سرے سے اُس سرے تک پہنچنے لگی۔ اس کا جواب باصواب حاجی صاحب کے آدمیوں کی طرف سے جلد جلد تین خالی فائروں میں دیا گیا۔ گاؤں والوں کے دل جوش سے بھر گئے۔ بڑے بوڑھے لوگ چوک میں آگ کے ایک بڑے الاؤ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے، نوجوان اپنی لمبی لمبی جزائلیں تھامے پُر شوق انداز میں کھڑے تھے۔ ورمُلّا نیم بے خودی کی حالت میں اپنی تسبیح پھیر رہا تھا کہ یکایک استقبالی نعرے گونجے اور کوئی دو سو آدمیوں کے آگے آگے اُس گلی میں سے جو چوک کو بلند پہاڑی گھاٹیوں سے جدا کرتی ہے ایک دیو قامت انسان نمودار ہوا۔

اِس بڈھے مجاہد کا پہلا نقش میرے دل پر یہ ہُوا کہ مجھے وہ ایک چلتا پھرتا سلح خانہ معلوم ہونے لگا۔ ایک جدید قسم کی بندوق اُس نے اس طرح اٹھا رکھی تھی جیسے یہ کوئی پتلی چھڑی تھی۔ دو پستول اس کے پہلوؤں میں لٹک رہے تھے۔ سرحدی لوگوں کی طرح اُس نے اپنی پگڑی جھکا کر باندھی ہوئی تھی جیسی اکثر وہ کسی مہم پر روانہ ہوتے وقت باندھتے ہیں اور اس کا ایک پیچ منہ کے اوپر سے ہو کر گیا تھا۔

حاجی صاحب پہلے مُلّا کی طرف بڑھے اور اُس سے مصافحہ کیا۔ مُلّا نے ان کی پیشانی کو چوما اور ان کی بندوق کو اپنی تسبیح سے چھُوا۔ پھر حاجی صاحب گاؤں کے سربرآوردہ لوگوں سے بغل گیر ہوتے رہے۔ نوجوان پُراحترام نظروں سے اُن کی طرف دیکھ رہے تھے اور عورتیں پردہ دار کھڑکیوں میں سے جھانکنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

دعوت کے بعد جرگہ بلایا گیا جس میں رئیس لشکر کو تقریر کرنی تھی۔ پہلے وہ مُلّا اور رؤسا کے ساتھ آہستہ آہستہ کچھ باتیں کرتے رہے۔ قبائل کے نمائندوں نے جو آگ کے سامنے بیٹھے حقہ نوشی کر رہے تھے اپنے حقّے ایک طرف رکھ دیئے۔ ملا نے ہاتھ اٹھا کر مومنین کی کامیابی کے لئے دعا مانگی اور پھر حاجی صاحب نے اٹھ کر کہا "ہم میں سے کافر کون ہے؟ کیا ہم تلوار اور بندوق کے مالک نہیں ہیں اور کیا میں اُس کو قتل نہ کر ڈالوں جو کفار کے خادم، دشمنانِ دین — دینِ خدا — کے خلاف جہاد سے جی چرائے"۔

لوگوں نے جہاد کی تجویز کے متعلق پسندیدگی کے طور پر آہستہ آہستہ باتیں شروع کر دیں۔ نوجوانوں کی آنکھوں میں جنگ کی خواہش آگ کی طرح چمکنے لگی۔ مُلّا نے اپنی حنا آلود داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ رؤسا نے بھی رضامندی کے طور پر اپنے سر ہلائے لیکن ایک نحیف و نزار آدمی اُٹھا اور کہنے لگا "مجھے کچھ کہنے کے لئے ذرا سا موقع دیجئے۔ اے حاجی، میری ٹانگ اور میری پسلیوں اور میرے بازوؤں کو دیکھ جو ٹوٹ چکے ہیں۔ یہ ہے جنگ میں جلد بازی کا نتیجہ۔ کیا تو سمجھتا ہے کہ یہ زخم مجھے فرنگی کی محبت میں آئے ہیں؟ نہیں میرا خون بھی اُس کے خلاف جوش مارتا تھا، اور میں اُس کے خلاف لڑا، لیکن مجھے اس سے کیا حاصل ہُوا؟ میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ سوچ سمجھ کر جنگ کرو"۔

حاجی نے گرج کر کہا "بیٹھ جا، او پاجی، ورنہ میں تیری زبان کاٹ ڈالوں گا۔ تو ہمیں بزدل اور نامرد بنانے آیا ہے؟"

مُلّا نے نسوار کی ایک چٹکی حاجی صاحب کو پیش کرتے ہوئے آہستہ سے کچھ کہہ کر خاموش کر دیا۔

حاجی صاحب نے کہا "کل جب سورج کی پہلی کرن مسجد کے اُس مینار کو چھوئے گی میں اگر تم میں سے جتنے آدمی بھی قانونِ قبائل کے پابند ہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ اور ہم لڑ کر اُن کفار کا صفایا کر دیں گے جو ہم پر بڑھے چلے آ رہے ہیں۔ مُلّا صاحب بھی اس معاملہ میں مجھ سے متفق ہیں۔ فوج کی کمان میرے ہاتھ میں ہو گی"۔

اس دعوت پر سب نے لبیک کہی۔ اپنی انگلیوں کو اپنے بالوں میں سے گزارتے ہوئے اور کچھ مسکراتے ہوئے کہ اچھے دنوں کا

خیال کرتے وقت وہ ایسا ہی کیا کرتے ہیں انہوں نے کہا "ہاں، اور کون جانتا ہے کہ اس لڑائی میں ہمیں کتنی دولت ہاتھ آئے، اور پھر جہاد کا ثواب بھی ہے۔"

اس کے پورے تین ہفتے بعد حاجی صاحب اور اُن کے کوئی سات سو کے قریب پیرو شمال کی طرف بڑھ رہے تھے انہوں نے مجھے بتایا کہ ایک دفعہ جب دور سے انہوں نے بھنبھناہٹ کی سی آواز سنی تو وہ ایک بڑے سے پتھر کے پیچھے چھپ گئے۔ پھر یہ آواز لحظہ بلحظہ زیادہ بلند ہوتی گئی خبر نہیں یہ کوئی جادو تھا یا شاید کوئی جن تھا جو غرّا رہا تھا۔ جلد ہی یہ سر پر آ گیا اور اس نے اُن کے آدمیوں کو لوہا برسا برسا کر ہلاک کرنا شروع کر دیا۔ یہ چکر کاٹ کاٹ کر پہاڑی چوٹی کے بہت قریب آ رہا تھا۔ ایک شخص نے جو دو زانو بیٹھا نماز پڑھ رہا تھا بندوق سیدھی کی اور داغ دی۔ گولی "عفریت" کو جا لگی۔ وہ ایک شعلے کی طرح بھڑکا اور تڑپتا ہوا نیچے چٹانوں پر آ گرا ——— کیا؟ جلے ہوئے لوہے کا ایک انبار!

یہ ہیں حاجی ترنگ زئی جن کے الفاظ وہاں بھی قانون کا حکم رکھتے ہیں جہاں کسی کی حکومت نہیں اور جہاں کوئی قانون نہیں چلتا۔

جدید ٹوکیو

سر پرسیول فلپس جو کچھ عرصہ ہوا جاپان کی سیاحت کر رہے تھے لنڈن "ڈیلی میل" میں لکھتے ہیں:۔

قدیم جاپان کے مناظر دیکھنے کی توقع میں ہم ٹوکیو جاتے ہیں تو ہمیں ایک عجیب نظارہ دکھائی دیتا ہے۔ تمام بازار پرانے مغربی محاذات کی خندقوں کی شکل بن رہے ہیں، زمین پر جا بجا گڑھے اور سوراخ پڑے ہوئے ہیں اینٹ پتھر اور لکڑی کے انبار ادھر اُدھر سڑکوں پر اس طرح پھیلے ہوئے ہیں جیسے یہ کان کنوں کے کیمپ کی ابتدائی کچی سڑکیں ہوں، راج مزدور اونچی اونچی عمارتوں پر ہزاروں کی تعداد میں کام کر رہے ہیں۔ گویا یہ جگہ آج کل معماروں کی ایک حقیقی جنت بنی ہوئی ہے۔

ٹوکیو تمام کا تمام دوبارہ تعمیر ہو رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے جاپان کے دار الحکومت کو یک دم یورپی لباس تبدیل کرنے کا حکم دے دیا ہے، اور سارے کام کو رات کی رات میں ختم ہونا ہے۔ انگورہ کی تعمیر کے متعلق کمال پاشا کے منصوبے اور نئی دہلی کی محنت طلب تو سیع اس کے آگے ہیچ معلوم ہوتے ہیں۔ جاپانیوں نے قدیم ٹوکیو کو جڑوں سے اکھاڑ ڈالا ہے اور اس کی بجائے وہ ایک جدید دار السلطنت کی بنیادیں استوار کر رہے ہیں جس کا نقشہ تمام تر ریاست ہائے متحدہ سے لیا گیا ہے۔

ٹوکیو کا نیا وسطی حصہ امریکی تجارت کا ہو بہو چربہ ہے کھلے کھلے بازار ہیں اور اُن میں سادہ اور شاندار عمارتیں کھڑی ہیں۔

ماروناوچی بلڈنگ کی نچلی منزل میں جاؤ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم لندن کا گویا نیو پارک میں پھر رہے ہیں۔
اوپر کی منزلوں میں جانے کے لئے "لفٹ" لگے ہوئے ہیں۔ دفاتر کے طویل برآمدوں میں جاپانی ٹائپ رائٹروں کی کھٹ کھٹ گونجتی ہے۔ ٹائپسٹ لڑکیاں چھوٹے لہنگے اور مرد کلرک سفید پتلونیں اور ریشمی ٹائیاں پہنے اپنے کام میں مصروف اِدھر اُدھر اڑے پھرتے ہیں۔ ٹیلیفون کی گھنٹیاں ہر طرف بج رہی ہیں۔
انسانی مصروفیات کے اِن مسکنوں میں جب کوئی دیہاتی آپھنستا ہے تو اُس کی حالت پر رحم آنے لگتا ہے۔ وہ حیران اور بے بس ہو ہو کر سب چیزوں کو دیکھتا ہے۔ اور جب وہ یہاں سے واپس اپنے گھر جاتا ہے تو اطمینان کا سانس لیتا ہے اور اسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے دل پر سے ایک بوجھل کا بوس اتر گیا ہے۔
یہ نئی عمارتیں یورپ کی عمارتوں کی جھوٹی نقل نہیں ہیں جیسی کہ عام طور پر مشرقی ملکوں میں دیکھنے میں آتی ہیں، بلکہ اُن میں ایک ٹھوس پن اور مضبوطی ہے۔ پارلیمنٹ کا ایوان جو ہائی بیا پارک کے پیچھے ایک بلند مقام پر تعمیر ہو رہا ہے اور جو اب تکمیل کو پہنچا ہی چاہتا ہے اپنی شان و شوکت کے لحاظ سے ہر دار الحکومت کے لئے فخر کا باعث ہو سکتا ہے۔
کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ اِدھر اُدھر جانے آنے کے لئے جن رکشا پر سوار ہوا کرتے تھے، لیکن آج یہ سواری اُن لوگوں کو کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے، شکستہ بازاروں میں بڑی بڑی ٹیکسیاں بھری رہتی ہیں اور ان کا کرایہ بھی کچھ زیادہ نہیں ہوتا۔
برقی ٹرین میں ٹوکیو سے یوکوہاما تک ۴۵ منٹ کے سفر میں جاپان کی تعمیر ثانی کلیتہً آشکار ہو جاتی ہے۔ آٹومیٹک ٹیلیفون ہر جگہ لگ رہے ہیں اور ہر طرف ٹراموے کی توسیع ہو رہی ہے۔
نیا ٹوکیو ایک عجیب چیز ہے لیکن جاپان کے دلدادہ جب آج سے ربع صدی پہلے کے تصورات لے کر یہاں آتے ہیں تو قدیم حسن کو موجود نہ پا کر وہ کچھ کھوسے جاتے ہیں۔

شبلی بحیثیتِ مصنّف

عنوانِ بالا سے جو مضمون گزشتہ مئی کے "ہمایوں" میں شائع ہوا تھا اس کے متعلق ہم یہ اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اسلامک انسٹیٹیوٹ لاہور کے ایما سے لکھا گیا تھا۔ اور ۱۳ اپریل ۱۹۳۰ء کے روز بہ سلسلۂ "یوم شبلی" وائی ایم سی اے ہال میں زیرِ صدارت آنریبل سر شیخ عبدالقادر بی اے پڑھا گیا تھا۔ اس موقع پر چار اور مضامین بھی علامۂ موصوف کی مختلف حیثیتوں پر پڑھے گئے تھے، جن کے موضوع مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) "شبلی بحیثیتِ شاعر" از صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم ایم اے
(۲) "شبلی بحیثیتِ نقاد" از مولانا علم الدین صاحب سالک
(۳) "شبلی بحیثیتِ سیاح" از ملک عبدالقیوم صاحب بیرسٹر ایٹ لا
(۴) "شبلی بحیثیتِ سیاسی مفکر" از مولانا چراغ حسن صاحب حسرت

وحدتِ موجودات

جن کو دیکھنے کے لئے آنکھیں اور سوچنے کے لئے دل ملا ہے اُن کے لئے اس دنیا کے ذرّے ذرّے میں حیرت کا سامان پوشیدہ ہے۔ اس کے بھید کو کوئی نہیں پا سکتا۔ اس کی وسعت کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ اس کی حیرت کاریاں ہر لمحہ جاری ہیں اور کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ اور اس کے باوجود یہ ساری وسیع کائنات جس میں طرح طرح کی چیزیں نظر آتی ہیں ایک ہے۔

تعجب انگیز اس کی اشیا کا بیہم اور خارج از قیاس تنوع نہیں بلکہ وحدت ہے جو تمام مخلوقات میں ایک حیران کر دینے والی حقیقت بن کر سماتی ہوتی ہے۔ آئیے اس پر کچھ دیر کے لئے غور کریں۔

سائنس آج ہمیں بتا رہی ہے کہ کائنات کی بڑی سے بڑی چیز اتنی حیرت انگیز نہیں جتنی کہ چھوٹی سے چھوٹی چیز ہے۔ کل اسی کائنات کی مادّی وسعت ہمارے دماغوں کے لئے ایک بارِ گراں بن گئی تھی اور مذہب کو نیست و نابود کر دینے کی دھمکی دے رہی تھی۔ کائنات کی حدوں کی ہمیشہ توسیع ہوتی رہی ہے۔ آسمان بلند تر ہوتے رہے ہیں اور گہرائیاں عمیق تر ہوتی رہی ہیں۔ نئے نئے ستارے آسمان پر جلوہ گر ہوتے رہے ہیں۔ اُس آسمان میں جسے ہمارے باپ دادا نے راتوں کو دیکھا اور اُس آسمان میں جسے آج ہم بڑی بڑی دوربینوں سے دیکھتے ہیں کوئی نسبت ہی نہیں۔ پھر دوربین میں سے دیکھنے والے ہیئت دان کو اُس عجیب و غریب نظارے کا عشرِ عشیر بھی نصیب نہیں جس کا نقش اُس حسّاس شیشے پر ہوتا ہے جسے آسمان کی تصویر اتارنے کے لئے دوربین کے چشم پارہ کے ساتھ لگاتے ہیں۔

لیکن اب اس مادّی کائنات کا مرکزِ تحیر بدل چکا ہے۔ حیرت زدہ تخیل اب اُتنا انتہائی بڑی چیزوں میں مشغول نہیں ہوتا جتنا انتہائی چھوٹی چیزوں میں ہوتا ہے۔ ریڈیم کے ایک خوردبینی دھبے کی طرف دیکھو، روشن آگ کا ایک شعلہ ہے جو کبھی بجھتا ہوا معلوم نہیں ہوتا! آسمان کے روشن ترین ستارے سماکِ رامح کو اس کے ساتھ رکھو کیا اس میں اس سے بڑھ کر روشنی ہے؟ مادّے کا کوئی عظیم الشان جسم یا فضا کی وسعتوں میں لٹکا ہوا کوئی سیّارہ ہمیں اس قدر متحیر نہیں کرتا جتنا ایک سالمہ کرتا ہے۔ اس کے بعد جوہر ہے جسے کل تک مادّے کا انتہائی اور آخری ٹکڑا سمجھا جاتا تھا اب ہم اس کی حدود سے بھی آگے گزر چکے ہیں اور ہمارے علم کے لئے ایک اس سے بھی عجیب دنیا کے دروازے کھل گئے ہیں۔ اس دنیا میں ہم برقیوں کے نظام سے دوچار ہوتے ہیں، جو برقی توانائی کے ایسے چھوٹے

چھوٹے نقطے ہیں کہ فہم وقیاس میں بھی نہیں آسکتے۔ یہ ستاروں کی طرح روشنی کی سی رفتار کے ساتھ اپنے محوروں پر گردش کر رہے ہیں۔ ستاروں کے وہ مجموعے جو ایک سلسلے کے خم سے وابستہ کر دیئے گئے ہیں اُن مجموعوں سے کہیں زیادہ حیرت انگیز ہیں جو آدھی رات کو آسمان پر چمکتے ہیں۔ یہ ہے متحرک ستاروں کا وہ نظام جو ایک ذرّے میں چھپا ہوا ہے۔

لیکن متجسس تخیل کے لئے نظامِ اشیا میں مرکزِ تحیر ایک دفعہ اور بدلتا ہے۔ اشیا نہیں بلکہ اشیا کا باہمی تعلق وہ چیز ہے کہ اُس کے کم سے کم احساس پر بھی انسان چونک اُٹھتا ہے۔ صرف آہستہ آہستہ ہیں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ تمام قوتیں، تمام چیزیں، تمام زندگیاں ایک مضبوط اور دُور رس رشتے کے ذریعہ سے آپس میں اس طرح جُڑی ہوئی ہیں کہ وہ تمام نظام جس کا ایک حصہ ہم ہیں ایک اکائی ہے اور کائنات غیر مربوط کوائف واشیا کا کوئی انبار نہیں بلکہ ایک نظام ہے، کوئی اندھیر نگری نہیں بلکہ ایک منظم بادشاہت ہے۔

بعض اوقات جب ہمیں مادے کی گوناگوں شکلوں کی یگانگت کا یا اُس وحدت کا جو قوت کی ہزار ہا مختلف اقسام میں چھپی ہوئی ہے احساس ہوتا ہے تو ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے اُس توحید کی ایک جھلک دیکھ پائی ہے جو ساری کائنات میں جاری وساری ہے۔ دیا سلائی کی تیلی سے ہائیڈروجن شعلے کا ایک ننھا سا نقطہ اور زحل کے چھلے سے روشنی کی ایک چھوٹی سی کرن لیجئے، اُس فاصلے کو جو آگ کے اِن دو ننھے ننھے نقطوں کے درمیان حائل ہے کون سا پیمانہ ہے جو ناپ سکے! لیکن طیف پیما سے ان دونوں شعلوں کو جانچئے، دونوں یکساں ہیں کہ نہیں؟ یہ ہے وہ وحدت جو کائنات کی انتہائی دوریوں کو آپس میں ملائے ہوئے ہے، اور ہر جگہ اور ہر چیز میں جلوہ گر ہے۔

قوت کی تمام شکلیں، جب سائنس ان کا تجزیہ کرتی ہے تو ایک ہی قوت کو اپنا مرجع بتاتی ہیں۔ جاذبیت کا کھنچاؤ، بجلی کی تڑپ، تیز رَو روشنی کا ارتعاش، یہ سب اُس پُراسرار ایتھر کے مظاہر کے سوا کیا ہیں جس نے کبھی ہر عقدے کو حل کر دینے کی امید دلائی تھی لیکن جس کے متعلق ہم اب تک کچھ نہیں جانتے!

بااین ہمہ جو بات ہم کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ یہ نہیں کہ سب اشیا ایک ہی قالب کے مختلف ٹکڑے ہیں جنہیں غیر محدود فضا نے جدا جدا کر رکھا ہے، اور یہ بھی نہیں کہ تمام طاقتوں کا منبع ایک ہی طاقت ہے بلکہ وہ انتہا درجہ گہرا اور انتہا درجہ پیچیدہ لطیف و باریک رشتہ ہے جو ایک واقعے کو دوسرے واقعے سے، ماضی کو حال سے اور حال کو مستقبل سے جوڑے ہوئے ہے ہم اسے وقت کا رشتہ کہہ سکتے ہیں۔ ایک بچے کو سمندر کے ساحل پر چاک کا ایک ٹکڑا مل جاتا ہے۔ چاک کا یہ ٹکڑا حقیقت میں ایک قدیم قبرستان ہے جس میں وہ مخلوق پڑی سوتی ہے جو لاکھوں کروڑوں سال گزرے

زندہ موجود تھی اور نظامِ اشیا میں اپنی رکنیت کے فرائض ادا کر رہی تھی۔ ابھی ہمارا سیارہ آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہو رہا تھا اور سمندروں کا پانی ابھی گرم تھا کہ اُس میں خوردبین سے نظر آنے والے ایسے بے حساب جاندار تیرنے لگے جن میں اُس سمندر سے جس میں وہ تیر رہے تھے اپنے بچاؤ کے لئے چُونے کا ایک ہلکا سا پردہ جدا کر لینے کی قابلیت موجود تھی۔ جب یہ بے حساب جاندار مر گئے تو چونے کے وہ چھوٹے چھوٹے خول جن کو وہ اپنے اجسام پر لپیٹے ہوئے تھے گرم پانیوں میں سے سمندر کی تہ میں ڈوب گئے۔ کئی زمانوں کے امتداد کے بعد ان کی شکل سفید چکنی مٹی کی سی ہوگئی، پھر زمین نے ذرا اپنا پہلو بدلا تو سمندر کی یہ تہ اوپر کو اٹھ آئی اور نرم سفید کیچڑ نے اب ایک چٹان کی صورت اختیار کر لی۔ بچے کی انگلیوں میں چاک کی وہ ٹکڑی اس تمام عمل کو ظاہر کر رہی ہے۔ آہ، سفید مٹی کا یہ چھوٹا سا ٹکڑا اپنے اندر کتنے زمانے، کتنے انقلاب کتنی بے اندازہ ارضیات چھپائے ہوئے ہے۔ یہ ایک تباہ شدہ ابدیت ہے جسے بچے نے اپنی ننھی انگلیوں میں پکڑ رکھا ہے۔

چاک کے ٹکڑے کی طرح آتشدان میں پڑا ہوا کوئلے کا ٹکڑا بھی نمائندگی کر رہا ہے ایک اُس زندگی کی جو بے حساب مدتیں گزریں موجود تھی اور اُس توانائی کی جو کبھی سرگرمِ کار تھی۔ مشعل کی گیس اور آتشدان کی آگ گرمی کے اُن موسموں کی نمائش کے سوائے اور کیا ہے جن کی قدامت کا تصوّر بھی ہمارے امکان سے باہر ہے؟ مادے کی ہر شکل جسے آج آنکھیں دیکھتی ہیں اور انگلیاں محسوس کرتی ہیں ایک مٹی ہوئی ابدیت کا نشان ہے۔

یہ تمام باتیں موہوم سمجھی جا سکتی ہیں۔ خیالات میں یہ ایک ہیجان برپا کر دیتی ہیں لیکن کہا جا سکتا ہے کہ عملی طور پر ان کو کیا اہمیت حاصل ہے۔ جس بات کو واقعی بڑی اہمیت حاصل ہے وہ اشیا کا عالمگیر باہمی رشتہ ہے، وہ گہرا لطیف اور عجیب رشتہ جس نے قوت اور حیات کی تمام شکلوں کو آپس میں جوڑ کر ایک کر دیا ہے۔ ہر اُس حقیقت کی پشت پر جو بظاہر تنہا معلوم ہوتی ہے ایسے رابطے موجود ہیں جو اُسے ایک دوسری حقیقت سے وابستہ کئے ہوئے ہیں، اور اس معاملہ میں دور نہیں جانا پڑتا بلکہ ہر معروف شئے میں ہمیں اس امر کی شہادت مل جاتی ہے۔

بہار کی ایک کلی، پھوٹتی ہوئی پنکھڑیوں کا ایک چھوٹا سا گچھا بتاتا ہے کہ زمین نے سورج کی طرف اپنے رخ کا ایک نیا زاویہ بنایا ہے۔ اور اگر یہ پوچھا جائے کہ زمین نے اپنا رخ یوں سورج کی طرف کیوں بدلا ہے تو سوچئے کہ بات کہاں کی کہاں پہنچ جاتی ہے! بہار کی کلی اُس سلسلہ کی محض آخری کڑی ہے جس کی رسائی نہ صرف آسمانوں کی چھت تک ہے بلکہ تمام دنیاؤں کی صبحِ آغاز تک بھی ہے۔ یہ کلی سیاروں کی گردش کی ایک روئداد ہے جسے نباتاتی اصطلاحات میں بیان کر کے ہمارے حواس کے آگے پیش کیا گیا ہے۔ ہمیں صرف کلی نظر آتی ہے، اور

اگر ہمیں اس کی پیدائش کے متعلق کچھ کہنا پڑے تو ہمیں صرف بہار کا خیال آتا ہے۔ لیکن اس نازک سی کلی کے ننھے سے خم میں گردش کرنے والے عظیم الشان سیاروں اور ان سیاروں کو چلانے والی دُور دراز کی قوتوں کا جلوہ پوشیدہ ہے۔

اگر پوچھا جائے کہ لالہ کے پھُول میں یہ آگ کا سا رنگ، نرگس کی آنکھ کی یہ سفیدی، بنفشہ کے ننھے کٹورے کی یہ نیلاہٹ کہاں سے آتی ہے؟ تو یقیناً یہی جواب ہوگا کہ رنگ آفتاب میں سے آتے ہیں۔ لیکن آؤ ہم اپنے آپ کو اُن تمام باتوں کا احساس کرائیں جو اس جواب میں شامل ہیں۔

آفتاب ہم سے نو کروڑ تیس لاکھ میل دور ہے۔ پھول کا وہ رنگ جو ہمیں سرور بخشتا ہے طلوع سے آٹھ منٹ پہلے خود آفتاب میں موجود تھا، اور پھول سے اتنا ہی دور تھا جتنا آفتاب دور ہے۔ یہ کیونکر پھول میں آیا اور اس میں نمایاں ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آفتاب سے ایک روشنی کی لہر اٹھتی ہے اور پھول پر آکر پڑتی ہے۔ کسی عجیب کیمیائی عمل کے ذریعہ سے، جس کے سامنے ہماری حکمت بالغہ بھی بے کار ہو جاتی ہے، پھُول کی پتی اس شعاع کو توڑ دیتی ہے پھر اس کے بعض اجزائے رنگی کو وہ جذب کر لیتی اور بعض کو واپس لوٹا دیتی ہے یہ معجزہ ہماری نظروں کے سامنے جاری رہتا ہے اور ہماری آنکھیں اس زندہ اور مسلسل عمل کو دیکھتی ہیں۔ مگر جو کچھ ہم دیکھتے ہیں وہ صرف عجائبات کے ایک سلسلے کی آخری کڑی ہے۔ نہیں، یہ آخری کڑی بھی نہیں، کیونکہ ہر انجام ایک آغاز ہے۔ پھول کی پتّی پر یہ ٹوٹی پھوٹی روشنی اپنے ارتعاش کو آنکھ کے اُس عصب بصری کے ذریعہ سے جو پتّی کو دیکھتا ہے دماغ تک پہنچاتی ہے جو آنکھ کے پیچھے ہے، اور پھر ایک اَور پُراسرار طریقے سے کہ اُس کے آگے بھی ہمارے علم وحکمت سے کوئی جواب نہیں بن پڑتا، دماغ کے پیچھے روح کو رنگ کا احساس کراتی ہے۔

بنفشہ کی نیلاہٹ، نرگس کی سفیدی، گلاب کی سرخی اُس زنجیر کے حلقے ہیں جو ہمارے شعور کا رشتہ آفتاب سے جوڑے ہوئے ہے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ یہی چھوٹا سا پھُول ہے جو ہمارے شعور کے لئے روشنی کے تمام عناصر کی تشریح کر رہا ہے۔

ایک سنگریزے کو ہم ساحل پر پڑا دیکھتے ہیں، اور اس طرح کے ہزاروں ہی سنگریزے وہاں موجود ہونگے لیکن یہ ایک وہاں کیسے آگیا؟ یہی ایک کیوں اس مقام پر پڑا ہے اور کوئی دوسرا نہیں؟ کہا جائے گا کہ یہ تعیّنِ مقام اُس موج کی قوت پر منحصر ہے جو اسے یہاں لائی۔ لیکن اس موج کے رخ اور توانائی کا تعین کرنے والا کون تھا؟ یقیناً ہوا کا وہ دباؤ جس کے باعث گرمی اور سردی کی بعض نامعلوم تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں وہ تبدیلیاں جو فضا کی نامعلوم وسعتوں پر چھائی ہوتی ہیں اور جن کا تعین وہ قوتیں کرتی ہیں جن کی پرواز آسمانِ

کی بلندیوں اور دنیاؤں کے آغاز تک ہے ۔ اگر یہی سنگریزہ اس مقام سے چند انچ آگے آکر پڑتا تو اس کائناتِ طبعی کی تاریخ یہ نہ ہوتی جو اب ہے بلکہ اس سے قطعاً مختلف ہوتی ۔

ہر وہ حقیقت جو ہمارے حیطۂ عقل میں آسکتی ہے حیاتِ کائنات کی پُراسرار سرگزشت کا ایک عنوان ہے، ایک وہ عمل ہے جس کا مرجع لامحدود وقت کا اولین لمحہ قرار دیا جاسکتا ہے ۔ اشیا وہ اعداد ہیں جن سے فطرت کے عظیم الشان خزانے کا حساب محفوظ ہے ۔ ہر حرکت، توانائی کی ہر تڑپ، مادے کی ہر شکل ایک اُس زنجیر کے حلقے ہیں جس کی ابتدا سرمدیت اور ابدیت سے ہوتی ہے ۔

لیکن اشیا کے متعلق ان کی سرگزشت سے عجیب تر ایک اَور بات ہے اور وہ زمانہ حال میں اُن کے باہمی تعلقات ہیں جو پُراسرار اور غیر محدود ہونے کے ساتھ ہی زندہ و پائندہ بھی ہیں ۔ کوئی حقیقت، کوئی واقعہ، کوئی قوت یہاں تنہا نہیں ہے ۔ کوئی ہستی نہیں جو دوسری ہستیوں کا ایک جزو بن کر موجود نہ ہو ۔ انسانی جسم کا نظامِ عصبی جو اس کے تمام اعضا کو احساس وشعور سے روشناس کرتا ہے ایک گنجان گندھی ہوئی رشتہ پردازی ہے جس نے مرئی اشیا کے تمام نظام کو جکڑ کر ایک کر رکھا ہے ۔ قرصِ آفتاب کا مطالعہ کرنے والا ہیئت دان دیکھتا ہے کہ اس کی سطح پر ایک روشن تر روشنی حرکت کررہی ہے ۔ یہ ایک برقی طوفان ہے جس نے بعض مقامات پر آفتاب کے شعلہ کو ایک نئی شدت کے ساتھ بھڑکا دیا ہے، اور زمین پر ہر رصدگاہ میں برقی آلے اُسی لمحہ ظاہر کرنے لگتے ہیں کہ آفتاب میں یہ کچھ ہو رہا ہے ۔ اتنی دوری کے باوجود ان میں ویسا ہی ارتعاش پیدا ہوجاتا ہے جیسا آفتاب کی توانائی میں برپا ہوتا ہے ۔

فضا کی لامتناہی وسعت میں کائنات کی عظیم ترین چیزیں حقیر ترین چیزوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہیں بہار کی ننھی سی کلی سیاروں کی گردش کا نتیجہ ہے، پھول کے رنگ کا شعلہ سورج کے رنگ کے شعلے کا کرشمہ ہے ۔ کلی اُسی وقت پھوٹتی ہے جب سیارہ گردش کرتا ہے اور اسی لئے پھوٹتی ہے کہ سیارہ گردش کرتا ہے ۔

اُس تعلق پر غور کرو جو ریت کے اُس ذرّے اور زمین میں ہے جسے ہوا نے اڑا کر شہر میں لا پھینکا، یا اس نظام پر جس کا تعلق زمین سے ہے ۔ کیا مادے کا یہ ذرّہ ہر دوسرے ذرّے کو مقرر و معلوم طریقے سے اپنی طرف نہیں کھینچتا ؟ اگر اس ذرّے کو تباہ کردیا جائے تو اس کا فقدان زمین کی قوتِ جاذبہ پر اثر انداز ہوگا، یہ اُس کے راستے کو بدل دے گا اور فضا میں بھٹکتا پھرے گا ۔ پس کہا جاسکتا ہے کہ زمین کو ذرّے کی ضرورت ہے اور اگر ذرّہ نہ رہے تو وہ کچھ کی کچھ ہوجائے ۔ اسی شدت سے چیزیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں اور

اِسی مضبوطی سے وہ ایک دوسری سے بندھی ہوئی ہیں۔

کائنات ایک زبردست اکائی ہے، اور اس کے تمام اجزا کا ایک دوسرے سے رشتہ ہے۔ ایک دوسرے کو وہ متاثر کرتے ہیں اور ایک دوسرے ہی کے وہ حصّے ہیں۔

اگر اُن قوتوں کے وسیع جال کے متعلق جنہوں نے اِس مرئی کائنات کو ترتیب دے رکھا ہے یہ سب کچھ صحیح ہے تو نوعِ انسانی کے متعلق بھی اسے صحیح ہونا چاہئے۔ کیونکہ انسانی نوع وہ نوع ہے جو ہر چیز کی سرتاج ہے، جو مادی کائنات کے جسم میں بمنزلہ دماغ کے ہے۔ نسلِ انسانی کا ایک جوہر سے ہونا، اُن کا ایک دوسرے سے متعلق ہونا اور ان کا ایک دوسرے کو متاثر کرنا مادی اشیا کے باہمی ربط و تعلق سے کسی حد تک واضح ہو جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمام انسانیت ایک زندہ عضویت ہے۔ ابھی ہمیں اس حقیقت کا صرف تھوڑا سا احساس ہوا ہے لیکن ہمارا یہ احساس بڑھ رہا ہے۔ اسے ابھی نوعِ انسان کی عقل و دانش کو تسخیر کرنا ہے، اُس کی فطرتِ ثانی بن جانا ہے، اور جب یہ ہو چکے گا تو اسے دنیا کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنا ہے اور نوعِ انسان کے لئے ایک نئے دور کا آغاز کرنا ہے۔

اِن مشاہدات کے باوجود جو گزر چکے اور جو گزر رہے ہیں ہماری سیاسیات آج کئی پہلوؤں سے اس حقیقت کا انکار کر رہی ہیں کہ خدا نے اس زمین پر بسنے والی تمام قوموں کو ایک جوہر سے پیدا کیا ہے۔ ہمارے معاشرتی قوانین بہت سی باتوں میں اخوت کے مفہوم سے دور جا پڑے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نظامِ معاشرہ میں ابتری اور قوموں کے تعلقات میں جنگ و جدل کا عنصر نظر آ رہا ہے۔ مگر سائنس اپنے خاص انداز اور درشت لہجے میں مذہب کی تعلیم کو دہرا رہی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اس حقیقت کو روشن کر رہی ہے کہ کائنات میں ایک وحدت ہے اور اس وحدت کا بہترین اظہار نسلِ انسانی میں ہوتا ہے۔

بے کار سمندروں نے اقوام کو جدا جدا کر رکھا ہے اور بے کار، زبان اور رنگ کے اختلافات نے نسلِ انسانی کے اجزا میں مغائرت پیدا کر دی ہے۔ نسل ایک اکائی ہے، اور اُن قوانین کے ماتحت جو زندگی پر حکومت کرتے ہیں ہر حصہ دوسرے حصے کا ایک جزو ہے۔ ایک کے آرام سے دوسرے کا آرام ہے اور ایک کے دکھ سے دوسرے کا دکھ ہے۔

کیا ہم نوعِ انسان کی تمام سیاسی تاریخ کو انسانی وحدت کی فراموش گاری کی بدولت تباہی اور بربادی کا افسانہ نہیں کہہ سکتے؟ ایک قوم نے سوچا کہ وہ دوسری قوموں کو تباہ کر کے اپنی عظمت میں اضافہ کرے گی،

ایک طبقہ نے خیال کیا کہ وہ دوسرے طبقوں کی دولت چھین کر اقبال و کامیابی حاصل کرلے گا، اور تاریخ اپنے جنگوں اور انقلابوں، اپنی تباہ شدہ سلطنتوں اور بادشاہتوں، برباد شدہ جماعتوں اور طبقوں کی کہانی سنا سنا کر بتا رہی ہے کہ فطرت نے ان سب خود غرضیوں اور نفس پرستیوں کو کیسے خاک میں ملا دیا۔

پھر صرف قوم کا قوم سے تعلق نہیں ہے بلکہ فرد کا بھی فرد سے رشتہ ہے ـــــ ایک شاعر کا ایک گنوار کے ساتھ، ایک کروڑپتی کا ایک نادار کے ساتھ، ایک اونچے خاندان کی لڑکی کا ایک آوارہ بچے کے ساتھ۔ ہم اس رشتے کو کبھی نہیں توڑ سکتے۔ معاشرہ ایک جہاز ہے جس میں ہم سب مسافر ہیں۔ جو کوئی اس جہاز کو نقصان پہنچاتا ہے یا اس کی فضا کو زہر آلود کرتا ہے یا اس کے نظم و نسق میں فتور ڈالتا ہے وہ اُن تمام لوگوں کی زندگی کو خطرے میں مبتلا کر دیتا ہے جو جہاز میں سفر کر رہے ہیں۔ بلیک نے اپنے ایک شعر میں کیا سچ کہا ہے:۔

"شہر کے دروازے پر ایک بھوکا کتا اس امر کی دلیل ہے کہ یہ شہر تباہ ہو جائے گا"

شاعر کی تیز نظر نے اِس عظیم لیکن عام طور پر نامعلوم حقیقت کو پالیا کہ بھوک کا اثر نہ صرف اُس فاقہ کش پر پڑتا ہے جو اُسے محسوس کرتا ہے بلکہ اُس تمام معاشرہ پر بھی پڑتا ہے جس کا وہ ایک فرد ہے۔ اس کی فاقہ کشی بتاتی ہے کہ معاشرہ میں کوئی خرابی واقع ہوگئی ہے یا انسانیت کا رشتہ کچھ ڈھیلا پڑ گیا ہے یا خدا کے پُر حکمت قانون کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ کسی قوم کی طاقت، اُس کی دولت، اُس کی خوشحالی، اُس کے افراد کی طاقت، دولت اور خوشحالی کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر ایک دماغ بھی ناآموزرہ جائے گا، اگر ایک جوہر بھی اپنا اظہار نہ کر سکے گا اور اگر ایک محتاج بھی بھوکا رہے گا تو یہ نقصان ساری مملکت کا نقصان اور یہ اختلاج مملکت کے ہر فرد کی احتیاج متصوّر ہوگی۔

لیکن یہ قانون تجارت اور سیاسیات کی سرحد سے آگے پہنچتا ہے۔ اخلاق کی دنیا میں کوئی شخص اُن رشتوں اور طاقتوں کا انکار نہیں کرے گا جنہوں نے انسان کو آپس میں ملا رکھا ہے اور جن کی وجہ سے وہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اُس اعلیٰ و ارفع دنیا میں ہمیں ایسے رشتوں نے ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے جو اس مادی دنیا کے رشتوں سے کہیں زیادہ لطیف ہیں اور چونکہ وہ غیر محسوس ہیں اس لئے زیادہ یقینی ہیں، سلائے سے بڑھ کر ہلکی اور آب دار لوہے سے بڑھ کر سخت اور کون سی چیز ہو سکتی ہے؟ لیکن جانتے ہو ایک پتّے کا سایہ ایک چمکتے ہوئے لوہے کے ٹکڑے پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا نشان ثبت کر دیتا ہے۔

سو ہر شخص کی سیرت ایک طاقت ہے جو تمام دوسری سیرتوں پر اپنا اچھا یا بُرا اثر ڈالتی رہتی ہے۔ اخلاقی قوتوں کی عظیم الشان دنیا میں کسی شخص کا وجود صرف اپنی ذات تک محدود نہیں ہے۔ ایک بے خوف اور آزاد انسان جس انسان سے بھی چُھو جاتا ہے اُس میں نیکی ہی نیکی بھر دیتا ہے اور ایک برا آدمی ہر شخص کے ضمیر کو داغ دار کر دیتا ہے۔ وہ اپنے آس پاس کے ہر شخص کے لئے نیکی کو مشکل اور برائی کو آسان بنا دیتا ہے۔

ہمارے اُن اعمال کی گونج جو ہم ایک دوسرے کے لئے کرتے ہیں عرش تک پہنچتی ہے۔ انسانوں کی خدمت خدا کی خدمت ہے اور انسانوں سے بے التفاتی خدا سے بے التفاتی ہے۔ کسی کی احتیاج کو پورا نہ کرنا ایک ایسا انکار ہے جس کی آواز کائنات کے گنبد سے ٹکراتی ہے اور جس کی بازگشت خالقِ کائنات کے ایوانِ عدل تک پہنچتی ہے۔

ہم ایک بڑے جلیل القدر زمانے میں پیدا ہوئے ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ ہم امیریت کے خیال سے بالاتر ہو جائیں اور ان کی بجائے آفاقی خیالات کو اپنے دماغ میں جگہ دیں، ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے آپ کو کل نظام اشیا کا ایک حصہ سمجھیں، وہ حصہ جو سب سے ملحق ہو اور جس سے سب ملحق ہوں ہم کائنات کو پارہ پارہ نہ سمجھیں بلکہ جیسا کہ اُسے اُس کے خالق نے بنایا، ایک اکائی، ایک منظم بادشاہت جو اپنی تمام مختلف شکلوں کے ساتھ ایک ہے، اور جو اپنی انتہائی حدود تک ایسے رشتوں سے بندھی ہوئی ہے جن سے مفر کا کوئی راستہ نہیں اور جو اتنے لطیف ہیں کہ ہمارا ادراک بمشکل اُن تک پہنچ سکتا ہے۔ ہم وہ پہلی نسل ہیں جسے اس دنیا میں موجودات کی وحدت کا احساس ہوا ہے، اور ہمارے لئے یہ بات بڑے فخر و مباہات کا موجب ہونی چاہئے۔

(ب ن)

منصور احمد

آواز

اپنے نغموں میں تیری لَے سنتا ہوں
میں اپنی صدا پہ، آپ سر دُھنتا ہوں

اپنی ہی صدا سے مست ہو جاتا ہوں
اپنے افسوں سے، آپ سو جاتا ہوں

تا عرش پہنچتی ہے فغاں کی آواز
کس درجہ قوی ہے ناتواں کی آواز

اس کھوکھلی نَے میں ہے غنا کی آواز
آتی ہے کہاں سے یہ انا کی آواز

کس دردبھری صدا سے چلّاتی ہے
کس بل پہ، یہ بانسری غضب ڈھاتی ہے

کیا جانئے کیا گزر رہی ہے دل پر
روتی ہے غریب ہچکیاں لے لے کر

ہر وقت یہ کیوں آہ و فغاں کرتی ہے
جب دیکھئے تب، یہ سسکیاں بھرتی ہے

کمبخت کی راگنی ہے دل کش کیسی
اس ہیزمِ خشک میں، یہ آتش کیسی

کھلتا ہی نہیں کسی طرح راز اس کا
معلوم نہیں، کون ہے دمساز اس کا

کس کے منہ سے لگی ہوئی ہے یہ نَے
کیا چیز ہے سوز، راگنی ہے کیا شَے

ہر ایک کو یہ شعلہ جلا دیتا ہے
آواز کا فلسفہ الٰہی کیا ہے ؟

آواز سمجھ ہی میں نہیں آتی ہے
آتی ہے کہاں سے، اور کہاں جاتی ہے

ہے چار طرف اسی کے اعجاز کا غُل
ہے سارے جہاں میں صرف آواز کا غُل

سارے عالم میں، جانِ عالم ہے یہی
گانے رونے کا جزوِ اعظم ہے یہی

اس میں کوئی پوشیدہ حقیقت تو نہیں
آواز، یہ زندگی کی صورت تو نہیں

اس ہستیٔ صامت کو سخن نے مارا
مُجھ کو تو تری صدائے کُن نے مارا

امجد

ابنِ اثیر الجزری

جزیرۂ ابنِ عمر دریائے دجلہ کے کنارے فیسابور کے شمال میں واقع ہے۔ اس کا بانی بقول یاقوت حموی (۶۲۶ھ) ایک شخص حسن بن عمر تغلبی ہے۔ علامۂ ذہبی نے (۷۴۸ھ) تذکرۃ الحفاظ میں ابنِ خلکان (۶۸۱ھ) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس جزیرہ کی بنیاد عبدالعزیز بن عمر برقعیدی نے رکھی تھی۔ امامِ واقدی (۲۰۷ھ) نے بقولِ مصنفِ نامۂ دانشوراں اس کا بانی عبدالعزیز بن عمر برقعیدی ہی کو ٹھہرایا ہے۔

بہرحال اِن بیانات سے پایا جاتا ہے کہ یہ جزیرہ تیسری صدی ہجری کے ابتدائی ایام میں کافی طور پر مشہور ہو گیا تھا۔

بقولِ یاقوتِ حموی، دجلہ آدھے شہر کے گرد نصف دائرے کی شکل میں آیا ہوا ہے۔ اور جزیرے کے اطراف ایک خندق ہے جو ہمیشہ پانی سے لبریز رہتی ہے، اس لئے یہ شہر بالکل ٹاپو معلوم ہوتا ہے۔ چوتھی صدی ہجری میں ابنِ حوقل (۳۶۶ھ) نے بیان کیا ہے کہ جزیرے کے گرد ایک فصیل واقع تھی۔ وہاں آرمینیا کی پیداوار، اور مال لاکر فروخت کیا جاتا تھا۔ اور خاص اس جزیرے کا پنیر اور شہد عام طور پر مشہور ہے۔ یہاں کے مکانات پتھر کے بنے ہوئے ہیں۔ مقدسی (۳۶۵ھ) نے لکھا ہے کہ یہاں سردی کے موسم میں بے حد کیچڑ ہوتا ہے جس سے راستہ گذرنے میں سخت دشواریاں پیش آتی ہیں۔ ابنِ بطوطہ (۷۷۹ھ) نے آٹھویں صدی ہجری میں اس شہر کا سفر کیا تھا تو اس وقت یہ بہت کچھ برباد اور تباہ ہو گیا تھا۔ اس وقت وہاں صرف ایک پرانی مسجد باقی تھی۔ مستوفی لکھتا ہے کہ اس میں سو سے زیادہ گاؤں اور قریے ہیں جو اس کے اعمال میں شامل ہیں۔

جزیرۂ ابنِ عمر نے اپنی خاک سے بہت سے نامور علما پیدا کئے جن میں ابوالحسن عزالدین علی ابن اثیر بن اثیرالدین ابی الکرم محمد بن محمد بن عبدالکریم بن عبدالواحد شیبانی عام طور پر مشہور ہیں۔ ان کے اور دو بھائی جو ابنِ اثیر کے نام سے شہرت رکھتے ہیں۔ تاریخ میں بڑے پایہ کے مفسر، محدث، اور شاعر گذرے ہیں[1]۔ امام سیوطی نے لکھا

---

[1] (۱) ابوالسعادت مجدالدین مبارک ابنِ اثیر کے بڑے بھائی تھے۔ ماہِ ربیع الآخر ۵۴۴ھ میں جزیرۂ ابنِ عمر میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے تعلیم کے لئے بڑے بڑے ممالک کا سفر کیا تھا۔ بقولِ علامۂ ذہبی اور ابن خلکان یہ حدیث میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔

(بقیہ حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

ہے کہ ان تینوں نے حدیث، فقہ، تفسیر، سیرۃ، اور تاریخ کی نہایت بیش بہا خدمات انجام دی ہیں معجم البلدان اور مفتاح السعادۃ کے مصنفین کا بیان ہے کہ ابن اثیر نہایت زبردست عالم اور امام ہے۔ ابن خلکان نے ان کا اپنے عہد کے اُن علما اور فقہا میں شمار کیا ہے جن کی نظیر صدیوں میں بھی نہیں ملتی ہے۔

ابن اثیر کی ولادت ۴ جمادی الاول ۵۵۵ھ میں جزیرۂ ابن عمر میں ہوئی اور یہ سن تمیز کو پہنچنے کے بعد اپنے والد کے ساتھ موصل آئے۔ یہاں بقول ابن خلکان ان کا بہت تھوڑا عرصہ قیام رہا۔ اُس زمانہ میں انہوں نے یہاں کے علماء سے مختلف فنون کی کتابیں پڑھیں۔ یہاں کے شیوخ میں ابن سبکی نے مسلم بن علی شیحی کا نام بتایا ہے۔ ان کے حلقۂ درس میں ابن اثیر کچھ عرصہ شریک رہے ہیں۔

ابن اثیر نے موصل سے مزید تعلیم کے لئے بہت سے ممالک کا سفر کیا تھا۔ دوران سیاحت میں انہوں نے متعدد علما سے مختلف فنون کی تکمیل کی۔ علامۂ ذہبی اور ابن خلکان کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو حدیث، فقہ، لغت، سیرت، اور فن تاریخ سے غیر معمولی دلچسپی تھی، اور یہ ان فنون میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ابو البرکات بن مستوفی مولف تاریخ اربل نے ان کو مشاہیر علماء اور محدثین کی صف اول میں کھڑا کیا ہے۔ ان کی متعدد تصنیفات حدیث، فقہ، انشاء اور نحو میں ہیں جن کی تعداد پندرہ تک پہنچی ہوئی ہے۔ مزید حالات کے لئے کتب ذیل دیکھئے وفیات الاعیان۔ تذکرۃ الحفاظ، معجم البلدان اور مفتاح السعادۃ۔ ان کا انتقال ۶۰۶ھ میں موصل میں ہوا، اور یہ اپنی بنائی ہوئی رباط میں مدفون ہیں۔

(۲) ابو الفتح ضیاء الدین نصر اللہ۔ ان کی ولادت ۲۰ شعبان ۵۵۸ھ میں جزیرۂ ابن عمر میں ہوئی۔ یہ ابن اثیر کے چھوٹے بھائی تھے ان کو فن انشا میں خاص مہارت حاصل تھی۔ بقول مورخین یہ اس فن میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ان کو شعر کہنے میں خاص کمال تھا ۵۸۷ھ میں یہ سلطان صلاح الدین کے دربار میں باریاب ہوئے۔ بادشاہ نے اپنے حکم سے ان کو ولی عہد ملک افضل کی سرکار میں منسلک کر دیا۔ شہزادے نے ان کی خوب عزت و توقیر کی اور اپنا وزیر بنا لیا۔ صلاح الدین کی وفات کے بعد جب ملک افضل سلطنت پر جلوہ افروز ہوا تو یہ اس کے وزیر مقرر ہوئے۔ انہوں نے بادشاہ کی جاں نثاری اور امور سلطنت میں کبھی غفلت نہیں کی ۶۱۸ھ میں یہ موصل چلے آئے اور سلطان ناصر الدین محمد بن عز الدین مسعود حاکم موصل کے دربار میں باریاب ہوئے۔ بادشاہ نے ان کو اپنا میر انشا بنایا۔ انہوں نے ۶۳۷ھ میں بغداد میں انتقال کیا۔ اس وقت یہ حاکم موصل کی جانب سے سفیر ہو کر خلیفۂ بغداد کی خدمت میں جا رہے تھے۔ انہوں نے فن بلاغت، انشاء اور صنف شاعری میں بہت سی کار آمد کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں بعض کے نام یہ ہیں۔ المثل السائر فی ادب الکاتب و الشاعر، الوشی المرقوم فی حل المنظوم، دیوان الترسل، کتاب المعانی المخترعہ، مجموعۂ اشعار۔ مزید حالات کے لئے کتب ذیل دیکھئے۔ وفیات الاعیان، نامۂ دانشوراں۔

ابنِ خلکان نے اس موقع پر ان کو حدیث کا امامِ وقت قرار دیا ہے۔

کان اماما فی حفظ الحدیث ومعرفتہ وما یتعلق بہ وحافظا للتواریخ المتقدمۃ والمتأخرۃ وخبیرا انساب العرب اخبارھم وایامھم ووقائعھم (وفیات الاعیان طبع ایران جلد اصفحہ ۳۷۸ و طبع مصر جلد اصفحہ ۳۴۸)

ابنِ اثیر نے جن مشاہیر و علما سے استفادہ کیا ہے اُن کی ایک فہرست وفیات الاعیان تذکرہ الحفاظ اور طبقاتِ سبکی کے مصنفوں نے دی ہے۔ ہم اس کو ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

موصل میں (۱) خطیبِ موصل (۲) ابو الفضلِ طوسی (۳) یحییٰ ثقفی (۴) مسلم بن علی شیحی۔

بغداد میں (۵) عبد المنعم بن کلیب (۶) یعیش بن صدقہ (۷) ابنِ سکینہ (۸) ابو عبد الوہاب بن صوفی۔

دمشق میں (۹) ابو القاسم بن صصری (۱۰) زین الامنار۔

شام میں ایک محدثین کی جماعت سے حدیث میں استفادہ کیا۔

قدس میں محدثین کی ایک بڑی جماعت کے اساتذہ سے حدیث میں استفادہ کیا۔

مورخین نے لکھا ہے کہ ابنِ اثیر نے جو یہ طول و طویل سفر کئے تھے وہ کسی اور مفاد کے مدِ نظر نہ تھے بلکہ انہوں نے صرف تحصیلِ علم کی خاطر اس قدر زحمت برداشت کی تھی۔ علامہ جرجی زیدان، آثار الادبار اور اکتفا القنوع کے مصنفین کی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ علم کے پرستار اور پروانہ ہیں۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ انہوں نے محض علما کی تلاش میں اتنے طویل سفر کئے ہیں۔

اس کے ایک عرصہ کے بعد یہ پھر موصل چلے آئے۔ موصل میں ان کا خاندان بڑا معزز اور باوقعت سمجھا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ انہوں نے حاکمِ موصل کے دربار میں رسائی حاصل کر لی اور بہت جلد بادشاہ کے منظورِ نظر ہو گئے۔ بادشاہ ان کی ان کے علم و فضل کے باعث بے حد قدر اور عزت کرتا تھا۔ چنانچہ حاکمِ موصل نے ان کو کئی مرتبہ اپنا سفیر بنا کر خلیفۂ بغداد کے دربار میں بھیجا ہے۔ اس موقع پر ابنِ خلکان نے لکھا ہے کہ انہوں نے ان سفارتوں کے زمانہ میں شام اور قدس (بیت المقدس) کا سفر اختیار کیا تھا۔ اور اسی زمانہ میں انہوں نے علمِ حدیث کی تحصیل کی ہے ابنِ خلکان کے ایک اور بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ شام گئے تھے تو اُس وقت یہ ایک عرصہ حلب میں مقیم رہے تھے۔ چنانچہ ۶۲۶ھ کے آخر میں ان سے اور ابنِ خلکان سے حلب میں شہاب الدین ۲۱ ایک طواشی کے مکان پر ملاقات ہوئی تھی۔ یہ اُن کے پاس مہمان تھے۔ طواشی اُن کی بڑی خاطر و مدارات کرتا تھا۔

ابنِ خلکان نے لکھا ہے کہ اُس سے جب ان کی پہلی مرتبہ حلب میں ملاقات ہوئی ہے تو یہ اس سے نہایت تواضع اور خلق سے پیش آئے۔ ابن خلکان جب تک حلب میں مقیم تھے یہ ان کے پاس برابر جایا کرتے تھے۔ وفیات الاعیان کے ایک بیان سے پتہ چلتا ہے کہ ابنِ خلکان کے والد سے ان کے قدیم تعلقات تھے۔ ۶۲۷ھ میں ابنِ خلکان حلب سے دمشق چلے گئے۔ اس کے بعد ۶۲۸ھ میں پھر حلب آئے تو ابنِ اثیر سے ملاقات کی۔ ابنِ خلکان کا بیان ہے کہ اسی سن میں یہ موصل کو واپس ہوئے ہیں۔

ابنِ اثیر نے سیاحتِ حلب کے بعد پھر کبھی سفر کا ارادہ نہیں کیا۔ اس کے بعد انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ مصنّفِ نامۂ دانشوراں نے بیان کیا ہے کہ اس زمانہ میں یہ علمی مشاغل میں منہمک رہتے تھے۔

بلادِ اسلامیہ سے جب یہ موصل آئے تو اُس زمانہ میں یہ حدیث بیان کیا کرتے تھے۔ فنِ حدیث میں ان کے سینکڑوں شاگرد ہیں۔ علامۂ ذہبی نے لکھا ہے کہ دمشق اور حلب میں بھی ان سے بہت سوں نے حدیث میں استفادہ کیا تھا جن میں بعض کے نام یہ ہیں۔

ابن الدبیثی، قوصی، مجد الدین عقیلی، شرف الدین بن عساکر، سنقر، فضائی۔

ابنِ اثیر کے تلامذہ کی جانب مورخین نے توجہ نہیں کی ہے۔ البتہ ابن سبکی نے طبقات الکبراء میں ذہبی و مجد ابی جرادہ کا تلامذہ میں تذکرہ کیا ہے جو عام طور پر مشہور ہیں۔

ابن اثیر تصنیف و تالیف کے باعث ہندوستان اور مغرب میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ انہوں نے بہت سی کارآمد کتابیں تصنیف کی ہیں۔ جن کا مختصر تذکرہ اس موقع پر کیا جاتا ہے۔

تاریخ کامل۔ یہ دنیا کی تاریخ ہے۔ اس میں ابتدائے تخلیقِ عالم سے ۶۲۷ھ تک کے واقعات نہایت صحت کے ساتھ تحریر ہیں۔ اس کتاب کے بعد جس قدر مصنفین نے تاریخیں لکھی ہیں اُن سب نے اپنی تصانیف میں اس سے استفادہ کیا ہے۔ مشہور مورخ خوندمیر اس کے متعلق لکھتا ہے

از جملہ مصنّفاتِ آنجناب تاریخِ کامل بغایت مشہور است ونکاتِ آں در مولّفاتِ متاخرین منقول و مسطور

(حبیب السیر جلد دوم جز سوم صفحہ ۷)

اِس کتاب پر جمال الدین محمد بن ابراہیم وطواط کاشی نے نہایت مفید حواشی اور تعلیقات لکھے ہیں۔ اور ابو طالب نجیب نے اس کا ضمیمہ تیار کیا ہے۔

سلطان میران شاہ بن امیر تیمور[۱] (۸۰۶ھ سنہ ۸۱ھ) نے نجم الدین طارمی سے اس کا فارسی زبان میں ترجمہ کرایا تھا۔

---

[۱] امیر تیمور کی دفات پر اس کے جو لڑکے زندہ تھے اُن میں میران شاہ سب سے بڑا تھا۔ ۱۳۶۷ء مطابق ۷۶۹ھ میں پیدا ہوا۔ امیر تیمور کی

۱۹۰۱ء میں محکمۂ آثارِ قدیمہ حیدر آباد کی سرپرستی میں مولوی عبدالغفور خاں صاحب رامپوری نے اس کا اردو زبان میں عروج الاسلام کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔اس کی چھ جلدیں ہیں۔ یہ ترجمہ حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت تک ہے۔

تاریخ کامل اصل عربی ۱۸۶۶ء میں نہایت اہتمام سے یورپ میں شائع ہوئی ہے۔اس کی تیرہ جلدیں ہیں جس میں انڈکس بھی شامل ہے۔اس کے سوا مصر میں بھی سنہ ۱۳۰۱ھ میں چھپی ہے۔

اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ۔ یہ کتاب سیرۃ میں ہے۔اس میں (۷۵۰۰) سات ہزار پانچ سو صحابہ کے حالات ہیں۔ ابنِ اثیر کی تصنیفات میں تاریخ کامل کے بعد یہ کتاب نہایت اہم سمجھی جاتی ہے۔ اس کتاب کو ابنِ اثیر نے مختلف کتابوں سے اخذ کیا ہے، جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔

۱۔ محدث ابنِ مندہ (ابو عبداللہ بن اسحاق اصفہانی ولادت ۳۱۶ھ) کی کتب اخبار الصحابہ۔

۲۔ محدث ابونعیم (احمد بن عبداللہ بن احمد بن مہران اصفہانی المتوفی سنہ ۴۳۰ھ) کی کتاب فضائل الصحابہ

۳۔ محدث ابنِ عبدالبر (ابو عمر یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبداللہ قرطبی مالکی المتوفی ۴۶۳ھ) کی کتاب الاستیعاب۔

۴۔ صوفی محدث ابوموسیٰ اصفہانی (محمد بن عمر اصفہانی مدائنی المتوفی ۵۸۱ھ) کی کتاب احوال الصحابہ۔

حاجی خلیفہ نے لکھا ہے کہ اس کے دو اختصار ہیں۔ پہلا اختصار بدرالدین محمد بن زکریا یحییٰ المقدسی الحنفی نے کیا ہے، جس کا نام وردالآثار، غرر الاخبار ہے، دوسرا اختصار محمد بن محمد علی کاشغری حنفی شافعی (صوفی نحوی لغوی) المتوفی سنہ ۷۰۵ھ کا ہے۔

یہ کتاب پانچ ضخیم جلدوں میں قاہرہ میں سنہ ۱۲۸۰ھ میں نہایت نفیس چھپی ہے۔اس کا اردو زبان میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔

انتخاب الانساب۔ یہ کتاب شیخ ابوسعید عبدالکریم بن سمعانی کی الانساب کا اختصار ہے۔ حبیب السیر کے مصنف نے اس کی اہمیت ان الفاظ میں بیان کی ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) زندگی میں عراق، آذربائیجان، دیار بکر اور شام کی حکومت اس کے سپرد تھی۔امیر کے مرنے کے بعد ۳ سال ۳ ماہ، ۷ دن زندہ رہا۔ قرا یوسف ترکمان نے ۲۰۔اپریل ۱۴۰۸ء مطابق ۲۴ ذیقعدہ سنہ ۸۱۰ھ میں قتل کر دیا۔اس خاندان میں یہ بڑا علم دوست بادشاہ ہوا ہے۔ اس نے کئی بیٹے ابوبکر میرزا، علی مرزا، عمر میرزا وغیرہ چھوڑے، جو یکے بعد دیگرے حکومت کرتے رہے۔

۱؎ رجال کی بعض کتابوں میں ان کا سنہ وفات ۶۰۵ھ تحریر ہے۔ اور یہ چودہ سال مکہ میں مقیم رہے ہیں۔

ابن اثیر کتاب الانساب ابن سمعانی را انتخاب کردہ دراں منتخب بر اغلاط مصنّف شرط تنبیہ بجائے آوردہ وانچہ از ابن سمعانی فوت شدہ بود اضافہ نمود وآں منتخب در سہ مجلد است و اصلش در ہشت جلد

(حبیب السیر جلد دوم جز سوم صفحہ ۷۷)

سمعانی کی الانساب اور ابن اثیر کے انتخاب کا امام سیوطی نے اضافہ کے ساتھ اختصار فرمایا ہے۔ اس کتاب کا نام لب اللباب ہے۔

قاضی قطب الدین محمد بن خضیری شافعی نے رشاطی (ابو عبداللہ بن علی بن عبداللہ اندلسی مری المتوفی ۵۴۲ھ) کی اقتباس الانوار والتماس الازہار انساب، اور ابن اثیر کی انتخاب الانساب دونوں کو سامنے رکھ کر ان کا ایک جامع خلاصہ کیا ہے۔ اس میں رشاطی اور ابن اثیر کی کتابوں سے بہت زیادہ معلومات اور اضافے ہیں۔ اس کتاب کا نام اکتساب ہے۔ اور غالباً یہ ان سب میں زیادہ کارآمد ہے۔

تاریخ الدولۃ الاتابکیۃ فی الموصل۔

ابن اثیر نے موصل کی ایک تاریخ لکھی ہے جس کا ذکر مؤرخ ابن خلکان نے بھی کیا ہے۔ علامہ ذہبی نے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ابن اثیر نے موصل کی ایک تاریخ لکھنی شروع کی تھی۔ لیکن اس کے تمام ہونے سے قبل ان کا انتقال ہو گیا۔

ابن اثیر نے یہ کتاب حاکم موصل کے دربار میں پہنچنے کے بعد تصنیف کی ہے۔

یہ کتاب ۱۸۷۶ء میں پیرس میں طبع ہوئی ہے۔ اس میں ایک صفحہ کے آدھے کالم پر اصل عربی حصّہ اور آدھے میں فرانسیسی ترجمہ ہے۔ اس کے چار سو (۴۰۰) صفحات ہیں۔

تحفۃ العجائب و طرفۃ الغرائب

ابن اثیر کی جن تصنیفات کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے اُن کا تذکرہ قریب قریب تمام کتابوں میں ملتا ہے، اور یہ عام طور پر مشہور ہیں۔ یہ کتاب بالکل نئی ہے۔ اس کے متعلق کچھ مزید معلومات نہیں ہیں۔ اس کا ایک نسخہ حلب کے کتب خانہ عثمانیہ میں موجود ہے۔

ابن اثیر کی تصانیف ہندوستان سے زیادہ یورپ میں مقبول ہیں۔ اور یہ وہاں خاص وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ ابن اثیر کی حقیقی شہرت کا باعث تاریخ کامل اور سیرۃ صحابہ ہے۔

ابن اثیر نے ماہ شعبان سنہ ۶۳۰ھ میں موصل میں انتقال کیا۔ وفات کے وقت اُن کی عمر ۷۵ سال کے قریب تھی۔

سیّد احمد اللہ قادری

غزل

دل نے جب روزِ ازل ٹوٹ کے آنا چاہا
فطرتِ حُسن نے خود ہاتھ بٹانا چاہا

عشق نے یُوں مری ہستی کو بڑھانا چاہا
خواب کو وصل کا مصداق بنانا چاہا

نہ ہنسانا مجھے چاہا نہ رُلانا چاہا
غم نے اک پیکرِ خاموش بنانا چاہا

کس کے جلوے نے دیا حسنِ طلب کا پیغام
دلِ خود دار نے بھی سر کو جھکانا چاہا

کوئی اس عالمِ تخئیل میں رہبر تھا مرا
راہ بھولا تو مجھے کس نے بتانا چاہا

دلِ مرحوم سا دیکھا نہیں پابندِ وفا
جان پر کھیل کے ایمان بچانا چاہا

ڈوبتے کیلئے تنکے کا سہارا تھا بہت
تم نے خود میری طرف ہاتھ بڑھانا چاہا

موت نے بڑھ کے وہیں کنجِ لحد دکھلایا
میں نے دنیا میں جو راحت کا ٹھکانا چاہا

اور بھی ہے کوئی صحرا میں مرے دل کے سوا
دے کے آواز مجھے کس نے بلانا چاہا

دفعتہً شورِ تلاطم نے اک انگڑائی لی
ناخدا نے مجھے ساحل پہ جو لانا چاہا

میرا تابوت تھا لہروں پہ سفینہ کیسا
کیا شکایت جو کسی نے نہ بچانا چاہا

حُسن بن کر ہی رہی چاک گریباں کی ادا
جوشِ وحشت نے بہت عیب لگانا چاہا

زیبا

مغربی مشاہیر کی دلچسپیاں

السنۂ مشرقیہ کے ساتھ

مشرقی زبانوں اور علوم سے اہلِ مغرب کو خاص دلچسپی رہی ہے۔ سنسکرت، عربی، فارسی، اور دوسری مشرقی زبانوں کے متعلق بعض مشاہیرِ مغرب نے انتہائی ذوق کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ ذیل کی سطور میں ہم ان میں سے چند کا تذکرہ کرتے ہیں جو بہت زیادہ مشہور ہیں۔ اور جنہوں نے بہت تھوڑے عرصے میں زبانوں پر کافی عبور حاصل کر کے اپنی ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔

سر ولیم جونس

سب سے پہلے سر ولیم جونس کا نام آتا ہے، جن کی محنت اور کاوش ہی کا ثمرہ ہے کہ آج سنسکرت اقصائے مغرب میں جلوہ فگن ہے، اور ہندوستانی عہدِ عتیق کی تہذیب نے دور دراز ملکوں میں اپنے مشتاقوں کی ایک کثیر جماعت پیدا کر لی ہے۔ ہندوستانی اگر اس جلیل القدر ہستی کے عزائم سے آج واقف ہو جائیں تو بلا شبہ اس کا نام بہت اعزاز و احترام سے لینے لگیں۔

یہ وہی سر ولیم جونس ہیں جو ۱۷۸۳ء میں فورٹ ولیم کلکتہ میں اعلیٰ جج مقرر ہو کر تشریف لائے تھے۔ انہی نے بنگال میں ایشیاٹک سوسائٹی قائم کر کے ملک پر اتنا زبردست احسان کیا ہے جو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ایشیاٹک سوسائٹی ہی کی محنتوں اور کاوشوں سے بعض بہت قدیم اور نایاب کتب، اور علوم و فنون کو تازہ روشنی دیکھنی نصیب ہوئی ہے۔

سر ولیم جونس کی نسبت معلوم ہوا ہے کہ وہ عربی، فارسی، گجراتی، کناری، بنگالی اور اُردو کے بھی ماہر تھے آخر میں انہوں نے سنسکرت کی طرف اپنی توجہ مبذول کی اور بہت دقتوں اور راہ ناتوں کا سامنا کر کے اُسے حاصل کیا۔

اٹھارھویں صدی عیسوی میں ہندوستانی پنڈتوں میں اس سے زیادہ کوئی معیوب بات نہیں خیال کی جاتی

تھی کہ سنسکرت مقدس دیوتاؤں کی متبرک زبان جس کے اسرار سینہ بسینہ اور نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے رہے ہیں وہ ایک ملیچھ شودر کو سپرد کر دیئے جائیں لہٰذا اس لئے جب سر ولیم جونس نے سنسکرت کے اکتساب کا ارادہ کیا تو ملک کے طول و عرض میں کوئی پنڈت انہیں سنسکرت سکھانے پر آمادہ نہ ہوا۔ باوجودیکہ بیش قرار تنخواہ کی طمع دلائی گئی اور بہت سے وعدے مواعید کئے گئے۔ قدیم ریکارڈ سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ دو تین پنڈت سر ولیم سے تنخواہ کی بابت دریافت کرنے گئے تھے، لیکن یہ بات پنڈتوں کی پُر اضطراب برادری سے پوشیدہ نہ رہی اور ان پنڈتوں کی بُری طرح نہ لے گرا جو پوچھنے گئے تھے۔ "حقہ پانی بند!" برادری کا کوئی رکن اُن کے ہاتھ کا پانی نہیں پیئے گا۔ روٹی بیٹی کا سروکار اور ناتا بالکل منقطع! ملیچھ اور شودروں کو اپنی پوتر بھاشا سکھائی جائے گی! یہ طرزِ عمل دیکھ کر ان پنڈتوں کا شوقِ اتالیقی سرد پڑ گیا۔

کرشن نگر کے مہاراج شیو چندر سر ولیم کے دوست تھے۔ انہوں نے بھی بہت کوشش کی لیکن کوئی پنڈت سر ولیم کو سنسکرت سکھانے کے لئے تلاش کر کے نہ دے سکے۔

آخر کار ایک پنڈت تیار ہو گیا۔ ان پنڈت جی کا نام رام لوچن کوی بھوشن تھا "جورو نہ جاتا خدا سے ناتا" ضرب المثل ان پر بالکل صادق آتی تھی۔ ان کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ وہ دنیا میں بالکل اکیلے تھے۔ وید بھی جانتے تھے اس لئے چار چھ مریض اکثر اُن کے ہاں روز آتے رہتے تھے۔

پنڈت جی کو ان کی برادری نے چھوڑ دیا لیکن سو روپے ماہوار اور رسلکیا سے چورنگھی تک مفت پالکی کی سواری، ایسے مراعات تھے کہ پنڈت جی نے برادری اور دوست احباب کی پروا نہیں کی۔

پنڈت جی نے سنسکرت سکھانے کے ضمن میں اس قدر سخت شرائط اور پابندیاں رکھی تھیں کہ اگر سر ولیم کے علاوہ کوئی اور ہوتا تو دوسرے ہی دن سنسکرت سیکھنے کے شوق سے باز آ جاتا۔ لیکن آفرین ہے اُن کی ہمت کو۔ انہوں نے تمام کڑیاں جھیلیں اور اپنے عزم میں ذرّہ برابر فرق نہ آنے دیا۔

بنگلے کے زیریں حصّے میں ایک کمرہ درس و تدریس کے لئے مقرر ہوا تھا۔ اس میں پنڈت جی کے حکم سے سنگ مرمر کا فرش بنوایا گیا تھا۔ دوسرا پنڈت جی کا یہ ارشاد تھا کہ جب تک وہ پڑھانے کے لئے تشریف لاتے رہیں بنگلے کے احاطے میں بھی کسی قسم کا گوشت نہ آنے پائے۔ سر ولیم پنڈت جی سے نہار منہ اور خالی پیٹ درس لیا کریں۔ جب وہ بہت منت سماجت کرتے تھے تب کہیں پنڈت جی محض ایک پیالہ چائے پینے کی اجازت دیتے تھے! ایک سوار مقرر تھا جو سبق شروع ہونے سے آدھا گھنٹہ پہلے پنڈت جی کے دولتکدے

پر خبر دینے جاتا کہ حضور! پڑھائی کا وقت ہوچکا۔ پھر پنڈت جی پالکی میں سوار ہوکر نازل ہوتے تھے۔ کمرے سے ملحقہ ایک کوٹھڑی انہیں محض اس لئے دی گئی تھی کہ وہ پوتر کپڑے جو پنڈت جی پہن کر آتے ہیں کوٹھڑی میں ٹانگ دیں، اور صاحب کے سامنے جانے کا لباس زیب تن کرلیں۔ ایک ہندو ملازم تھا جو روزمرہ درس کے کمرے کے در و دیوار اور فرش کو گنگا جل سے پاک و صاف کرتا تھا، حتیٰ کہ چند کرسیاں اور میز جو تھیں وہ بھی مطہر کی جاتی تھیں۔ پنڈت جی کا مزاج بہت چڑچڑا تھا، اور وہ اکثر سر ولیم کو جھڑک دیتے تھے کہ گوشت خور کبھی سنسکرت نہیں سیکھ سکتے۔ یہ ملیچھوں کی زبان نہیں ہے یہ دیوتاؤں کی زبان ہے۔ لیکن سر ولیم جونس پنڈت جی کی باتوں کا بُرا نہیں مانتے تھے۔ وہ ان کا بہت احترام کرتے تھے اور اُن کی تند مزاجی کا جواب خندہ پیشانی سے دیتے تھے۔ آخر کار سر ولیم نے سنسکرت سیکھ ہی لی۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ وہ ولایت ہی میں معمولی اردو سیکھ گئے تھے۔ اس لئے درس میں زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں ہوا۔ ورنہ پنڈت جی انگریزی نہیں جانتے تھے اور سر ولیم جونس سنسکرت سے نابلد تھے، لہذا بہت مصیبت کا سامنا ہوتا۔ مشہور گورنر جنرل لارڈ وارن ہیسٹنگس سر ولیم کی اس سنسکرت نوازی سے بہت خوش تھے۔ وہ خود مشرقی زبانوں سے بڑی ہمدردی رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ ڈراما پر پنڈت جی اور سر ولیم سے مباحثہ ہونے لگا۔ اُس وقت تک سر ولیم کو یہ معلوم نہیں تھا کہ سنسکرت میں بھی ڈراما کا وجود ہے جب انہیں معلوم ہوا تو بہت حیرت میں پڑ گئے۔ اس کے بعد انہوں نے کالیداس کے مشہور شاہکار شکنتلا کا مطالعہ شروع کیا اور پھر اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ ترجمہ بہت ناقص تھا اور خامیوں سے معمور، لیکن پھر بھی اہلِ یورپ کے لئے اس میں انتہائی دلآویزی اور جاذبیت تھی۔ مشہور جرمن شاعر گوئٹے تو یہ ترجمہ پڑھ کر اس قدر مسحور ہوا کہ اُس نے شکنتلا پر ایک نفیس نظم کہہ ڈالی۔

سر ولیم جونس من حیث المجموع اٹھائیس زبانیں جانتے تھے۔ ۱۷۹۴ء میں ہندوستان ہی میں اُن کی وفات ہوئی۔

لارڈ ہین ماؤتھ

سر ولیم کے بعد السنۂ مشرقیہ کے فاضل لارڈ ہین ماؤتھ سمجھے جاتے ہیں۔ لارڈ موصوف اردو کو بہت پسندیدہ زبان تصور کرتے تھے۔ اور انہیں اردو شاعری کا بھی بہت شوق تھا۔ انہوں نے اردو میں ایک مصرعہ کہا تھا:۔

دینِ اسلام گھٹے دینِ مسیحا بڑھ جائے

جس کی تکمیل ایک مسلمان شاعر نے یوں کی تھی:۔

گر براقِ نبوی سے خرِ عیسیٰ بڑھ جائے!

ان کے بعد السنۂ مشرقیہ سے دلچسپی لینے والے اکثر یورپینوں کے نام آتے ہیں لیکن ہم سر دست انہی کا تذکرہ کریں گے جو زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔

ملکہ وکٹوریہ

۱۸۵۳ء میں آنجہانی ملکہ وکٹوریہ کے شوہر پرنس البرٹ نے اپنے ملک میں مشرقی زبانوں کی ترویج و اشاعت میں بڑا زور لگایا تھا۔ انہیں اس امر کی توقع بھی نہ ہوگی کہ ایک دن خود میری بیوی میرے خواب کی تعبیر کا آغاز کرے گی اور مغلوں کی بخشی ہوئی اردو جو فارسی، عربی، اور بھاشا کا مخلوط مرکب ہے، سیکھنا شروع کرے گی۔

ملکہ معظمہ نے اپنی ساٹھ برس کی عمر میں اردو سیکھنا شروع کیا تھا اور اس قدر مشق بہم پہنچائی تھی کہ خط و کتابت اسی زبان میں کرتیں۔ اپنا روزنامچہ بھی اردو ہی میں لکھتیں۔ روزمرہ بات چیت تک اردو میں کرتی رہتیں۔ وہ اصول کی سخت پابند تھیں۔ اور اسی لئے معمولی سلطنتی کاروبار کے انصرام کے بعد وہ اپنا وقت نکال لیتی تھیں اور اردو نوشت و خواند میں مصروف رہتی تھیں۔ ۱۸۹۰ء میں شاہِ ایران نے انگلستان کی سیاحت کی تھی اور وہ ملکہ معظمہ سے بھی ملے تھے اس ملاقات کو اپنے اردو روزنامچے میں ملکہ معظمہ نے اس طرح درج کیا ہے۔ ان کے بجنسہٖ الفاظ یہ ہیں:-

"آج کا دن بہت اچھا رہا۔ شاہِ پرشیا مع چند وزیروں کے آئے تھے اور کھانا بھی ہمراہ کھایا۔ اور سوا تین بجے لندن واپس گئے"۔

جب ان کا لاڈلا نواسا ڈیوک آف کلیرنس مر گیا تو اپنے اردو روزنامچے میں اس سانحے کو وہ اس طرح قلمبند کرتی ہیں:-

"آج جس قدر رنج اور صدمہ ہم کو اور ہماری اولاد کو ہے ویسا کبھی نہیں ہوا تھا کیونکہ ہمارے جوان نواسے پرنس البرٹ وکٹر آف ویلس نو بجے فجر فوت ہو گئے"۔

ملکہ معظمہ کے فرزند ڈیوک آف کناٹ فصیح اردو میں بڑی روانی سے تقریر کر سکتے ہیں۔ آپ چند سال پہلے ہندوستان میں بھی آئے تھے، اور کونسلوں کا افتتاح آپ ہی نے کیا تھا۔

دیگر یورپین مشاہیر

پروفیسر ملس اور پروفیسر جیکسن نے فارسی کو خاص ایران میں رہ کر حاصل کیا۔

کپتان ولبرفورس کلارک کی فارسی کتابیں اور انگریزی حواشی وزوائد بغایت دلچسپ ہیں۔

لندن کی مشہور کتب فروش اور ناشر کمپنی ڈبلیو ایچ ایلین اینڈ کو کے مینجر مسٹر فریڈرک پن کاٹ سنسکرت فارسی، ہندی، اردو اور بنگالی کے بہت بڑے ماہر تھے۔

مظفر نگر میں پیدا ہونے۔ جرمنی کی گاٹینجم یونیورسٹی میں تعلیم پانے، اور آکسفورڈ میں پروفیسر مقرر ہونے والے، مسٹر میکڈانلڈ بہت شہرت رکھتے ہیں۔ ان کی دو کتابوں کو ہندوستانی یونیورسٹیوں نے اپنے نصاب تعلیم میں داخل کرلیا ہے۔ ایک سنسکرت کا صرف ونحو، دوسری "تاریخ زبانِ سنسکرت" ہے۔

پروفیسر میکسمولر (جرمن پروفیسر) نے سنسکرت کی صدہا کتابوں کا ترجمہ کیا ہے حتیٰ کہ ویدوں کا بھی ترجمہ اُن کا جرمن زبان میں ہے۔

مسٹر گریفتھ نے تلسی کرت رامائن کا عمدہ ترجمہ کیا ہے۔

پروفیسر براؤن کو فارسی اور عربی کے فضلائے یورپ میں اوّل نمبر شمار کیا جاتا ہے۔ انہوں نے بارہا ایران وبلادِ اسلامیہ کی سیاحت کی۔ وہ ایران کی تہذیب وتمدّن پر فریفتہ تھے اور اسے ایک بہترین تہذیب سمجھتے تھے۔

دورِ حاضر میں مسٹر آرٹ راتھ فیلڈ، مشرقی خاندیش کے کلکٹر کا نام بہت احترام سے لیا جائے گا۔ انہوں نے فارسی سیکھنے کے لئے خاص ایران سے معلّم بلوایا تھا اور جدید فارسی سولبین کورس کا امتحان پاس کیا تھا۔ ان کی فارسی شاعری کا نمونہ یہ ہے۔

روزہ یک سُو شد وعید آمد ودلہا برخاست　　　　مے ومے خانہ بجوش آمد ومے باید آست

مسٹر جارج رو کا نام کسی تشریح کا محتاج نہیں ہے۔ انہیں نے عمر خیام کو زندہ کیا ہے اور اُس کا پیغام نہایت خوبصورت کتاب کی شکل میں دنیا کے آگے پیش کیا ہے۔

لارڈ کچنر عربی زبان بخوبی لکھ پڑھ لیتے تھے۔ یہ جب مصر میں کمانڈر انچیف تھے تو بارہا مصری لباس میں بھیس بدل کر غنیم کے کیمپ میں جاتے اور بہت اہم خبریں حاصل کرتے تھے۔ بمبئی میں اکثر لوگ ہیں جنہوں نے لارڈ کچنر کو بے تکان فصیح عربی بولتے سنا تھا۔

لارڈ چیمسفورڈ سابق وائسرائے کی اہلیہ ہندوستان آتے ہی اردو زبان کی اس قدر والہ وشیدا ہوگئی تھیں کہ انہوں نے بڑی سرگرمی سے اسے سیکھا اور شملہ کے ایک زنانہ جلسے میں اردو ہی میں تقریر کی۔

بنگال کے ایک پرانے گورنر لارڈ کارمایکل بنگالی زبان میں نہایت بلیغ تقریر کرتے تھے۔ — حسن عزیز جاوید

سرحدِ جذبات

مجھے اِذنِ تماشا ہے تحشّر گاہِ حرماں تک
مری سیرِ نظر محدود ہے خوابِ پریشاں تک

نہ پوچھو وسعتِ جذباتِ وحشت مختصر یہ ہے
ہزاروں کوس کا چکّر ہے دامن سے گریباں تک

کوئی ایسا بھی کانٹا ہے مری قبرِ شکستہ پر
سلامِ شوق لے جائے بہارِ گل بداماں تک

محبّت کس کو لے آئی خراب آبادِ عبرت میں
لرز اُٹھّے مری تربت کے ذرّاتِ پریشاں تک

فضائے نے سے نغمے پھوٹ نکلیں گے محبّت کے
ربابِ دل کی آوازیں پہنچنے دو نیستاں تک

مری تنہائیوں کی خوف سامانی ارے توبہ!
کہ پروانے نہیں آتے چراغِ شامِ ہجراں تک

نمودِ ماہ سطرِ نیل گوں سے ہونے والی ہے
چلو ایسے میں ہم تم سیر کر آئیں گلستاں تک

چمن سے وہ تبسّم ریز ادائیں ساتھ لائی ہیں
کھلی کلیوں کا عالم ہے مرے گھر سے گلستاں تک

درختوں پر شبِ مہتاب مصروفِ تجلّی ہے
ہزاروں طُور ہیں صحنِ گلستاں سے بیاباں تک

مرے مٹتے ہی مٹ جائیں گی نشانیں حسنِ برہم کی
تری زلفوں کے چرچے ہیں مرے حالِ پریشاں تک

ساغر

بڑے بول کا سر نیچا

اننت گوہا اُس وقت پیدا ہُوا تھا جس وقت مایا کی دیوی نے گوہا خاندان سے بے التفاتی شروع کردی تھی۔ ایک وقت تو وہ تھا کہ یہ خاندان تمام علاقہ میں اپنے تموّل اور قدامت کے لئے مشہور تھا۔ لیکن اننت کے دادا نے اتنے کاموں میں پاؤں پھنسایا کہ آہستہ آہستہ خاندانی دولت میں زوال آنا شروع ہو گیا۔ ایسے باپ کا بیٹا ادی ناتھ قدرتی طور پر جزرس ہو گیا۔ اگر وہ آٹھ آنے میں کام کر سکتا تو ہرگز ایک روپیہ خرچ نہ کرتا تھا لیکن اِس جزرسی نے بھی معاملات کو کچھ زیادہ رُوبراہ نہیں کیا۔ جب اننت جوان ہُوا تو اُسے معلوم ہُوا کہ خاندانی ثروت میں ایک بڑے شکستہ مکان اور کسی قدر اراضی مزروعہ کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہا۔

اننت کی ماں کو اِس غم نے جھکا دیا۔ ایک زمانہ تھا کہ یہ گھر خدمتگاروں سے پُر تھا۔ لیکن اب وہ قبرستان اور اجاڑ معلوم ہوتا تھا۔ اسے اپنے بچے کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ گھر کے کام دھندوں کو بھی خود ہی کرنا پڑتا تھا۔ اس کے دل کا اطمینان اڑ گیا تھا۔ اُس نے کتنے ہی پاپڑ بیلے کہ کسی طرح اس کا خاوند بھی اس دکھ کا احساس کرے مگر وہ اس مٹی کا بنا ہُوا نہ تھا کہ جلدی سے کسی کی حالت دیکھ کر متاثر ہو جاتا۔ وہ اس کی ساری باتیں سُن کر ہنستا اور اتنا کہہ دیا کرتا۔ "پیاری! اگرچہ اب تم بچے کو اٹھانے سے تنگ آجاتی ہو لیکن وہ دن آئے گا کہ آخر تم خوش ہو جاؤ گی۔ یاد رکھو کہ یہی بچہ پھر ہمارے گھر میں لکشمی دیوی کو واپس لائے گا۔ اگر ہم اُس کی اچھے طریقے سے تربیت کریں گے تو ہماری تمام تکلیفیں دُور ہو جائیں گی۔"

دونوں میاں بیوی نے اپنے اکلوتے بچے اننت کی پرورش اور تربیت میں بڑی کوشش کی۔ ماں نے اپنے بچے کھچے زیور بیچ ڈالے اور کچھ روپے میں گھر بھی گروی رکھ دیا۔ اور اس طرح اننت کو شہر میں اپنی آئندہ تعلیم جاری رکھنے کے لئے بھیج دیا۔ یہ بچہ پہلے ہی سے جانتا تھا کہ اُس سے کیا کیا امیدیں وابستہ ہیں۔ اور اس لئے وہ اپنا فرض سمجھتا تھا کہ اس کھنڈر کی جگہ ایک شاندار گھر تعمیر کرے اور اِن زیوروں کے بدلے اپنی ماں کے لئے ایسے مناسب اور اچھے زیور بنا کر دے جنہیں وہ پہن بھی سکے۔ اس کے دماغ میں روپیہ پیدا کرنے کے خیالات کے سوا

کچھ نہ تھا اس لئے وہ اپنے وقت کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرتا تھا۔ جب کبھی تعطیلات میں وہ گھر آتا تھا تو ماں بیٹے میں بجز "دولت" کے اور کسی بات پر بات نہ ہوتی تھی۔

ماں کہا کرتی تھی "بس تمہارے گریجوایٹ ہوتے ہی میں تمہاری شادی کی تجویز کروں گی۔ بیٹے تم دیکھو گے کہ میں تمہارے لئے کیسی دلہن انتخاب کرتی ہوں۔ وہ شخص جو گھر بھر کا سامانِ آرائش اور صندوق بھر زیور اور روپے کی تھیلی دے گا وہی میرے بیٹے کو اپنی بیٹی کا خاوند بنا سکے گا"

بیٹا یہ سُن کر پیکرِ انکسار بن کر کہتا تھا "اری ماں چھوڑو بھی، کسے پڑی کہ تمہارے بیٹے کو اتنا ساز و سامان دے؟ گریجوایٹ ہونا تو آج کوئی بڑی بات نہیں۔ کلکتہ کی ہر گلی میں درجنوں گریجوایٹ بھرے پڑے ہیں"

"ہوا کریں" ماں کہا کرتی تھی "لیکن ان میں ایک بھی تو ایسا خاندانی نہیں جیسے تم ہو۔ اس خاندان کا ایک لڑکا دس ہزار روپے کے برابر قیمتی سمجھا جاتا تھا۔ اس گھر میں کبھی کوئی بہو کم جہیز لے کر نہیں آئی۔ تم جانتے بھی ہو کہ میرا باپ کیسے برباد ہوا تھا؟ صرف میری شادی کی وجہ سے۔ لیکن کبھی کسی نے اسے شکایت کرتے نہیں سنا۔ اُس نے وہی کیا تھا جو اس کی شان کے شایاں تھا"

انت کو اپنی ماں کے الفاظ پر ایمان تھا۔ اس لئے وہ بتدریج خود کو ایک گرانبہا جنس خیال کرنے لگا۔

آخر وہ گریجوایٹ بھی ہو گیا اُس کی ماں نے فوراً پیشہ ور مشاطاؤں کو اپنے لڑکے کے لئے مناسب بیوی تلاش کرنے کے لئے ملازم رکھ لیا۔ ان مشاطاؤں کو پہلی ہدایت یہ تھی کہ وہ معلوم کریں کہ لڑکی کے ماں باپ دولتمند بھی ہیں۔ جب اس کا یقین ہو جائے تو پھر دوسری کوئی بات دریافت کریں۔

آپ جانئے دلہنوں کا تو بنگال میں کبھی کال نہیں ہوا۔ جیسی دلہن آپ کو مطلوب ہو ویسی ہی جلد یا بدیر آپ کو مل رہے گی چنانچہ اکثر جگہ تو متمول باپ بھی ملے۔ ایک جگہ تو گفتگو بھی شروع ہو گئی۔ لڑکی بھی دیکھنے میں کچھ بدصورت نہ تھی۔ اس کی عمر تقریباً ۱۴ سال کی تھی۔ انت کی ماں مہالکشمی نے کہا "اگر اُس کے ماں باپ مانتے ہیں کہ اُن کی لڑکی چودہ برس کی ہے تو وہ یقیناً کم از کم سولہ یا سترہ برس کی ہو گی۔ کیونکہ وہ تو پوری عورت نظر آتی ہے۔ کیا معلوم وہ ہمارے طور طریقہ کی پابندی بھی کرے گی یا نہیں۔ اِس لئے مجھے ڈر ہے کہ وہ کہیں ہم میں اور ہمارے بیٹے میں غیریت نہ پیدا کر دے"

"یہ کچھ خوف نہیں" ادی ناتھ نے کہا "ہمارے خاندان میں کبھی کسی نے عورتوں کے مشوروں کی پابندی نہیں کی۔ پس اگر وہ لوگ ہماری شرطیں مان گئے تو مجھے تو لڑکی کی عمر پر کوئی اعتراض نہ ہو گا"

لڑکی کا باپ شرطیں مان گیا۔ اور مہالکشمی خوشی کے مارے دیوانی سی ہوگئی۔ شادی کا مقررہ دن برسوں دُور معلوم ہونے لگا اور وہ چاہتی تھی کہ اس دن کو زور سے قریب ترگھسیٹ لائے۔ چونکہ یہ بات اُس کے بس کی نہ تھی۔ اس لئے اُس نے اپنے دل کو طفل تسلیاں دینی شروع کر دیں۔ چنانچہ اُس نے ان زیوروں کی فہرست مرتب کرنا شروع کر دی جن کے بنوانے کا حکم بہو کا جہیز ہاتھ میں آتے ہی وہ سنار کو دے گی۔ دلہن کا باپ اِس بات پر رضامند ہوگیا تھا کہ وہ ان کو پانچ ہزار روپیہ نقد اور پانچ ہزار کے زیور اور دیگر تحایف دے گا۔ لڑکی اس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اِس لئے انہوں نے یہ بھی مان لیا تھا کہ ہر سال تہوار کے موقع پر قیمتی تحائف بھی اسے دیا کریں گے۔

لیکن جیسا کہ مشہور ہے "تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ"۔ واقعات اُس طرح ظاہر نہ ہوئے جس طرح مہالکشمی اُن کا خواب دیکھ رہی تھی۔ ادی ناتھ مقررہ تاریخ پر اپنے بیٹے، دوستوں، رشتہ داروں کی جماعت اور باجے گاجے کے ساتھ دلہن کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ مہالکشمی گھر ہی میں رہی۔ اور دلہن کے استقبال کے لئے پڑوسی عورتوں کے ساتھ انتظام و انصرام کرتی رہی۔ وہ اپنے گاؤں کی تمام حاسد بُوڑھی بلاؤں کو دکھا دینا چاہتی تھی کہ اب بھی وہ اپنی شان کے مطابق دلہن کا استقبال کرنے کے دم خم رکھتی ہے۔

اننت آج اپنی دلہن کو لے کر گھر آنے والا تھا۔ گھر میں عزیزوں اور مہمانوں کی وہ چہل پہل تھی کہ تِل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ مہالکشمی نے تمام انتظامات کو نقادانہ نظر سے دیکھا۔ اور اُس کی آواز حیرت انگیز شان اختیار کرنے لگی۔ اُس کے جوش و خروش کی کوئی حد نہ تھی۔ مکان کے صدر دروازہ پر بینڈ بج رہا تھا۔ آلاتِ موسیقی کے زیر و بم سے ایک سماں بندھا ہُوا تھا۔ آواز کا آسمان پہ پہنچ جانا اور پھر بتدریج خاموش ہو جانا ایک کیفیت تھی جو لفظوں میں نہیں سما سکتی۔ لوگ برات کے واپس آنے کا بشدّت انتظار کر رہے تھے۔

مہالکشمی کے میکے کی طرف سے اُس کے بھائی کی بیوی اپنے بچّے سمیت آئی جسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ نند بھاوج لگیں آپس میں باتیں کرنے۔

"بہن میں کہتی ہوں"، نئی آنے والی نے کہا "کیا یہ سچ ہے کہ دلہن کچھ خوبصورت نہیں ہے"۔

اِس بات سے مہالکشمی نے بگڑ کر کہا "وہ کون ہے جس نے یہ سفید جھوٹ گھڑا ہے۔ کیا کہنے والی نے خود دلہن کو جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھا بھی ہے؟"

"بہن افواہیں تو ہمیشہ اُڑا ہی کرتی ہیں" اُس کی بھاوج نے کہا "تمہیں ان پر ناراض نہیں ہونا چاہئے۔ چونکہ لوگوں نے سنا ہے کہ انت جہیز بڑا بھاری لائے گا۔ اِس لئے انہوں نے یہ بھی لگا دیا کہ یہ گرانی قیمت بے سبب نہیں ہو سکتی، لڑکی ضرور بدصورت ہی ہوگی۔

اِس بات نے تو مہالکشمی کے غصے کو اور بھڑکانا شروع کیا۔ "آخر انہیں حق کیا ہے کہ وہ ایسی بکواس کریں" وہ غصہ میں بھر کر چلائی اور کہا "میرا بیٹا ایسا ہی گیا گذرا ہے کہ کوئی اس کے پانچ ہزار روپے بھی نہ دے گا۔ کیا اس تمام علاقہ میں کوئی اور ایسا خاندان ہے؟ ایسی ایسی خوبصورت لڑکیاں کہ اُن کو پریاں کہنا چاہئے اس خاندان میں بیاہی گئیں اور وہ جہیز بھی اتنا اتنا اپنے ساتھ لائیں جو شہزادیوں کے شایانِ شان تھا۔ ایسی باتیں اڑانے والیاں حسد کی آگ میں جل جل کر مر رہی ہیں۔ بس بات یہی ہے نا؟

اس وقت بینڈ اس شان سے بجا کہ یہ باتیں وہیں ختم ہوگئیں۔ گھر میں جتنی عورتیں تھیں دلہن کو دیکھنے کے لئے اُٹھ دوڑیں۔ قدیم رسوم کے ادا کرنے اور منتروں کے پڑھنے کے شور شرابے میں جو دلہن کے اتارنے کے وقت ہُوا مہالکشمی کے لئے کوئی موقع نہ تھا کہ وہ اپنے خاوند سے کچھ بات چیت کر سکتی۔ دلہن گو خوبصورت تو کہلا نہیں سکتی تھی مگر چنداں بدصورت بھی نہ تھی۔ انت کا چہرا اترا ہُوا نظر آتا تھا، اس لئے مہالکشمی نے خیال کیا کہ وہ دلہن کو دیکھ کر مایوس ہو چکا ہے۔ وہ اپنے جی میں ہنسی کہ آخر عورت کی خوبصورتی قائم ہی کتنے دن رہتی ہے، وہ جونہی کہ ماں بنی اُس کا حسن خواب و خیال ہو جاتا ہے۔ دور کیوں جائیے خود اسی کو دیکھ لیجئے۔

جب ہمسائے اور مہمان رخصت ہوگئے تو بیچاری مہالکشمی کو بھی فرصت ملی۔ وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو اُس نے دیکھا کہ اُس کا خاوند نیچے لیٹا ہُوا ہے اور اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی ہیں۔ اِس منظر سے اس کا دل دھڑکنے لگا کہ ہو نہ ہو کوئی غیر معمولی بات ہے۔ اس لئے جھپٹ کر اپنے خاوند کے پاس گئی اور پوچھا "بات کیا ہے؟ تم یوں کیوں لیٹے ہوئے ہو؟"

"مجھے امید ہے کہ جب میں تمہیں بتاؤں گا تو تم گرجو اور برسو گی نہیں" ادی ناتھ نے کہا۔ کیونکہ اپنی کسی حماقت کا ڈھنڈورا پیٹ کر ہمسایوں کو شماتت کا موقع دینے کا کچھ فائدہ نہیں۔ اس لئے اس راز کو اپنے ہی تک محدود رکھو"

اب مہالکشمی کی حیرت کا کیا ٹھکانا تھا، بولی "پہلے مجھ سے کہو تو سہی۔ ہُوا کیا"

"میں جہیز کا روپیہ نہیں لایا ہوں" ادی ناتھ نے کہا۔

مہالکشمی کو ایسا معلوم ہُوا کہ گویا اُس کے دماغ میں آگ جلنے لگی ہے "تو پھر آپ اس چڑیل دلہن کو لائے

کیوں ہیں؟" وہ چلا کر بولی " کہا تم اپنے لڑکے کو جیسے لے گئے تھے ویسے ہی تنہا واپس نہیں لا سکتے تھے ؟"

" نہیں! میں ایسا نہیں کر سکتا تھا " ادی ناتھ نے کہا، " دلہن کا باپ بیمار تھا اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر روتے ہوئے وعدہ کیا کہ وہ چند ماہ میں تمام رقم ادا کر دے گا۔ اگر وہ ادا نہ کر سکا تو مجبور ہے کہ اپنی لڑکی کو واپس لے جائے۔ اور اُس وقت ہم اپنے بیٹے کی دوسری شادی کر دینے کے لئے آزاد ہونگے۔ ایسی گفتگو کے بعد بجز رضامند ہونے کے میں اور کر ہی کیا سکتا تھا۔ یوں ہی واپس آجانا کتنا دل توڑنے والا حادثہ اور ذلیل فعل ہوتا۔ اتنا تو خیال کرو کہ ہم بھی اپنے خاندان کی کچھ روایات رکھتے ہیں۔ دوسرے معاملات میں انہوں نے اپنا وعدہ وفا کیا۔ تحائف اور زیور سب بہت اچھے ہیں۔

اس بات نے مہالکشمی کو کسی بھی طرح مطمئن نہیں کیا" مجھے ان کی کیا پروا ہے؟" اُس نے چیخ کر کہا۔ مجھے تمہارے بیٹے کی بیوی کو زیوروں سے لدے ہوئے دیکھ کر کوئی خوشی نہیں۔ میں نے اپنے بیٹے کی تعلیم کے لئے اپنے تمام زیور بیچ ڈالے، کیونکہ مجھے امید تھی کہ اس کا مجھے اچھا بدلہ ملے گا۔ لیکن تم بھی کتنے احمق ہو۔ میں تو ایسا محسوس کرتی ہوں کہ گویا مجھے پھانسی پر لٹکا دیا گیا ہے۔ صبح اُٹھتے ہی پہلا کام میں یہ کروں گی اس دھوکے باز کی لڑکی کو ٹھوکریں مار کر اپنے گھر سے باہر نکال دوں گی "

ادی ناتھ بیوی کے اِس اظہارِ غضب سے اکتا چکا تھا اس لئے بولا" جلدی کیا ہے؟ اگر وہ تین مہینے کے بعد بھی روپیہ ادا نہیں کریں گے تو تمہیں اختیار ہوگا کہ جو چاہو کرو۔ ورنہ اِس مدت کے لئے تو میں نے قول دیا ہے اور میں اسے اپنے گھر میں رکھوں گا "

" کیا انہوں نے اپنا وعدہ پورا کیا" مہالکشمی نے غصہ سے کہا۔

" ہمیشہ لوگوں نے اخلاق و اطوار ہم سے سیکھے ہیں " ادی ناتھ نے کہا " ہم نے کبھی دوسروں سے نہیں سیکھا "

مہالکشمی غصہ میں بگڑی، چلائی چیخی مگر سب بے کار کیونکہ وہ اپنے خاوند کی مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ بہر حال دلہن کا استقبال جُوں توں کر کے ختم ہوا۔ لڑکی نے بھی اپنی پوزیشن کو صاف طور پر سمجھ لیا تھا لیکن وہ مجبور تھی کہ اپنی تقدیر پر بھروسا کرے۔ اُس نے اپنے باپ کو بڑے گڑگڑا کر خط لکھے کہ وہ اپنا وعدہ پُورا کر دیں۔ ورنہ ناقابلِ بیان مصائب اس کو پیش آئیں گے۔ لیکن مصائب تو اکثر بنگالی لڑکیوں کا پیدائشی حق ہیں اور ان سے یہ نئی دلہن للیتا کسی طرح بچ نہیں سکتی تھی۔ انتت کا گو اُس سے کوئی محبت کا سلوک نہ تھا لیکن وہ اس کے ساتھ کوئی ظلم بھی نہ کرتا تھا۔ للیتا کے خیال میں اس کی کوئی خطا نہ تھی۔ لیکن اس کی ساس اس کی مصیبت کی جڑ تھی۔ اس

کے تیز ظالمانہ الفاظ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ غریب لڑکی کے دل کو چھید چھید کر نکل جاتے تھے۔ وہ اس کا ایک ہی علاج کر سکتی کہ روتی رہے۔ اُسے اپنے خسر سے بھی کوئی واسطہ نہ تھا کیونکہ اُس نے اُسے دیکھا ہی نہ تھا۔ لیکن وہ بھی اس لڑکی کا بشدت مخالف تھا، کیونکہ وہ اُن کے "شریف خاندان" میں فریب سے بغیر مناسب و مرسوم رقم ادا کرنے کے گھس آئی تھی۔ وہ درحقیقت اُسے اپنے بیٹے کی بیوی سمجھتا ہی نہ تھا، اِس لئے وہ اپنے رویّہ میں سب سے مختلف و ممتاز تھا۔

لیکن بات یہیں تمام نہیں ہوگئی۔ تین مہینے بھی ختم ہوگئے اور روپیہ آنے کا کوئی ذکر مذکور نہ تھا۔ بجائے روپیہ آنے کے یہ خبر آئی کہ للیتا کا باپ بسترِ مرگ پر پڑا دم توڑ رہا ہے۔ اُس نے وعدہ کیا کہ اگر وہ موت سے بچ گیا تو آئندہ سال سب کچھ ادا کر دے گا۔ اسی کے ساتھ اُس نے درخواست کی تھی کہ وہ للیتا کو بھیج دیں کہ اُسے اپنی لڑکی کے دیکھنے کی بڑی تمنا تھی۔

یہ کہنے کی تو ضرورت ہی نہیں کہ اس رنج دہ خبر نے اس "اعلیٰ خاندان" میں کچھ افسوس اور رنج کا اثر پیدا نہیں کیا "جھوٹا فریبی" مہالکشمی نے چلّا کر کہا "لے جائیں یہاں سے اپنی چھوکری کو" وہ تو یہاں تک تُلی ہوئی نظر آتی تھی کہ اپنی بہو کو جھاڑو ہاتھ میں لے کر گھر سے باہر نکال دے لیکن اُس کے خاوند کی امیرانہ متانت نے اُسے ایسا کرنے سے روک دیا۔ اننت اس بارے میں چُپ تھا۔ وہ اچھا لڑکا تھا۔ اس لئے اُس نے کبھی اپنے والدین کی کسی بات میں مخالفت نہیں کی تھی۔ جب اس کی بیوی یہاں سے اپنے میکے چلی گئی تو کچھ عرصہ تک وہ روتا رہا اور اُس کے دل میں درد بھی رہا لیکن پھر جلدی ہی اُس نے اپنا دل اپنے خسر کی عہد شکنی کی وجہ سے سخت بنانا شروع کر دیا۔

اننت کو تجرد و تنہائی کی تکالیف زیادہ دنوں نہیں اٹھانی پڑیں۔ جلد ہی ایک نئی دلہن آگئی جس نے اُس کے گھر اور اُس کے دل کی تاریکی کو دُور کر دیا۔ اس دلہن کا نام مینگھ مالا تھا۔ یہ صُورت شکل میں للیتا سے کہیں اچھی تھی۔ یوں تو اننت کی قیمت شادی کی منڈی میں کسی قدر کم ہوگئی تھی، کیونکہ اب وہ کنوارا نہ تھا لیکن چونکہ وہ ایک اعلیٰ خاندان کا فرد تھا اس لئے اُسے اچھّی قیمت ہی مل گئی۔ اُس کے دوسرے خسر کی آمدنی اچھی تھی اس لئے اسے موعودہ رقم ادا کرنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ اب مہالکشمی نے اپنے دل کے حسبِ خواہش زیورات خریدے۔ پہلے ہی دن سے وہ مینگھ مالا کو پسند کرنے لگی تھی۔ لڑکی کا خاندان تو معمولی ہی تھا مگر اُس کی تربیت اچھّی ہوئی تھی۔ وہ اپنی

ساس کو عزت و ادب کے معاملہ میں دیوی سے کم نہیں سمجھتی تھی۔ غرض یونہی راحت سے زمانہ گذرتا گیا۔ اننت کو اُس کے والد کے ایک دوست کی سفارش سے کلکتہ کے ایک بینک میں معقول ملازمت مل گئی۔ وہ جزرس آدمی تھا اس لئے جلد ہی اُس نے روپیہ جوڑنا شروع کر دیا۔ اُس نے اپنی بیوی کو کلکتہ میں نہیں بلایا تھا کیونکہ ابھی اُس کے والدین زندہ تھے۔ البتہ وہ ہر ہفتہ کے آخر میں گھر جاتا تھا اور اپنی نوجوان بیوی کی ملاقات کا لطف اٹھاتا تھا۔ ہفتہ کے باقی تمام دن وہ ایک ہوٹل میں بسر کرتا تھا۔

غریب للِلنا کا حال کسی نے معلوم کرنے کی زحمت نہیں اٹھائی۔ اُدھر وہ بھی خاموش رہی۔ البتہ انہوں نے لوگوں کی زبانی اتنا سنا کہ اُس کا باپ مر گیا ہے۔ کبھی کبھی اننت کے دل میں ایک معصوم نوجوان چہرے اور دو سیاہ اشک آلود آنکھوں کی یاد آجاتی تھی۔ مگر پھر وہ فوراً ہی بھول جاتا تھا۔

اننت کی دوسری بیوی بیگھہ مالاحقیقۃً اُس کے لئے دولت لائی تھی۔ خاندان کی دولت دمبدم بڑھنے لگی۔ مہالکشمی کے پاس اب زیور کا بھرا ہوا صندوق تھا۔ اور گھر جو کھنڈر ہوتا جا رہا تھا مرمت ہو کر بالکل نیا نظر آنے لگا۔ نوکروں کی فوج بھی گھر میں پھر سے بھر گئی۔ مہالکشمی کسی کام کو ہاتھ نہ لگاتی تھی سوائے اس کے کہ اپنے ہمسایوں اور اُن کے معاملات پر بیٹھی نکتہ چینی کرتی رہا کرے۔ ہر شخص اُس کی غیر محدود فرصت اور اُس کی تیز زبانی سے تھرّاتا تھا۔

اننت جب کبھی گھر آتا تو دیکھتا کہ اُس کی ماں نے ایک معاشرتی عدالت جما رکھی ہے۔ مہالکشمی کی نظر میں یہ بات کچھ اہمیت نہ رکھتی تھی کہ مدعی اور مدعا علیہ دونوں اس عدالت سے غائب ہوتے تھے۔ اور اس عدالت میں موجود عورتوں کا صرف ایک کام تھا کہ دائیں بائیں اعتراضات کی بوچھاڑ کرتی چلی جائیں اور اسی میں وہ خوش اور مطمئن تھیں۔

اننت ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ وقت کو برباد کیا جائے۔ لیکن وہ اپنی ماں کے سامنے لب کھولتے ہچکچاتا تھا کیونکہ اسے خوف تھا کہ وہ لڑنا شروع کر دے گی۔

لیکن آئے دن کے اس منظر نے اس کو مشتعل کر ہی دیا چنانچہ اُس نے کہا "ماتاجی کیا ان بوڑھی عورتوں کے لئے کوئی کام نہیں ہے۔ جب کبھی میں آتا ہوں تو یہی دیکھتا ہوں کہ وہ اپنی ختم نہ ہونے والی گپوں سے آپ کا وقت برباد کر رہی ہوتی ہیں"۔

مہالکشمی نے تن کر بلند آواز سے کہا "میرے چاند مجھے کچھ کام تو کرنا نہیں ہوتا حتیٰ کہ میرا کوئی پوتا بھی نہیں جس سے میں کھیلوں یا اُسے اٹھائے اٹھائے پھروں۔ تم میرے اکلوتے بیٹے ہو اور تمہاری شادی پر بھی تین برس گزر چکے، لیکن اب تک میرے گھر میں ایک بچّے کا بھی پتہ نشان نہیں۔"

اننت خود بھی اس بارے میں کسی قدر احساسِ تکلیف کر رہا تھا۔ اُس کی ماں نے اُس کی روح میں ایک ہیجان سا پیدا کر دیا۔ میگھ مالا نے بڑی کوشش کی لیکن وہ اُس شام اپنے خاوند کے چہرے سے آثارِ تکدر دور نہ کر سکی۔

اننت کلکتہ واپس چلا آیا لیکن ایک دم کے لئے بھی اُس کی ماں کے الفاظ اس کے ذہن سے دور نہ ہوئے کیا وہ کبھی باپ نہیں بنے گا۔؟ اگر ایسا ہُوا تو یہ بڑی مصیبت ہے۔ اور اس کا اعلیٰ خاندان اس کی ذات پر ختم ہو جائے گا۔ کیا قدرت کی طرف سے اُسے یہ سزا دی جا رہی تھی کیونکہ اُس نے اپنی پہلی بے گناہ بیوی کو بلا وجہ گھر سے نکال دیا تھا؟۔ اگر میگھ مالا بانجھ رہی تو وہ اَور شادی کرنے پر مجبور ہو گا۔ آہ بیچاری میگھ مالا۔ عورتیں کس قدر بدقسمت واقع ہوئی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پیدا ہی مصیبتیں اُٹھانے کے لئے ہوتی ہیں۔ اگرچہ اکثر خطا ان کی نہیں ہوتی۔

لیکن میگھ مالا ابھی جوان تھی۔ وہ چند سال اَور صبر کر سکتا تھا۔ اگر اس کے ماں باپ رضامند ہو جاتے تو وہ اپنی بیوی کو کلکتہ میں لا کر کسی ماہرِ امراضِ نسواں طبیب سے مشورہ لے سکتا تھا اور پھر اگر وہ علاج کا مشورہ دیتا تو وہ اس کا علاج کراتا۔ اُسے یہ خیال بھی آیا کہ کیا وہ للیتا کو واپس نہیں لا سکتا؟ لیکن اس کی دوسری بیوی اپنی سوت کے ساتھ رہنے کے لئے بمشکل رضامند ہو گی؟ مگر سوت کے آنے کا امکان تو اب بھی موجود تھا خواہ وہ رضامند نہ بھی ہو۔ بس پرانی سوت نئی سوت سے بہتر ہو گی، اِس لئے وہ للیتا کا پتہ لگائے گا، کہ آیا وہ زندہ ہے اور ہے کہاں۔

ایسے خیالات تھے جو اُس کے دل میں آتے تھے۔ لیکن میگھ مالا سمجھدار لڑکی تھی۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ کوئی بات ہے جو اندر ہی اندر اُس کے خاوند کے دل میں خلجان پیدا کر رہی ہے۔ اور اس بات کا پتہ لگانا بھی کچھ مشکل نہ تھا کہ بات کیا تھی۔ اننت خود خاموش تھا مگر اُس کی ماں خاموش نہ تھی۔ اُس کی مایوسی بڑھتی چلی جا رہی تھی بلکہ طوفان کی صورت اختیار کر رہی تھی جو بس ٹوٹنے ہی کو ہو۔ اُس نے تمام سنی سنائی دوائیں جمع کر کے غریب لڑکی کو کھلا پلا ڈالیں۔ اِن باتوں نے میگھ مالا کو اَور کچل ڈالا۔

دفعتہً ادی ناتھ بیمار ہوگیا۔ چند دن کے لئے میگھ مالا کو لگاتار بہت کام کرنا پڑا۔ کسی شخص کو خیال نہ تھا کہ اُس غریب کی حالت پر توجہ کرتا۔ اننت نے ایک ماہ کی چھٹی لی اور اپنے باپ کی تیمارداری کے لئے گھر آگیا۔ کیونکہ گھر میں دیکھ بھال کے لئے کوئی اور مرد موجود نہ تھا۔

اُن کا گاؤں نسبتاً بڑا اور نئی قسم کا تھا۔ اس میں ایک سکول، ایک خیراتی ہسپتال تھا اور ایک ڈاکٹر بھی تھا۔ جو پرائیویٹ طور پر بھی پریکٹس کرتا تھا۔ چنانچہ اسے بلایا گیا۔ ادی ناتھ کی حالت پہلے تو کچھ سنبھل گئی، لیکن پھر بگڑی اور پھر نہ سنبھلی اور یہی حالت کوئی ہفتہ بھر جاری رہی۔

ایک دن صبح کو ڈاکٹر نے اننت کو بلایا اور کہا "اننت بابو دیکھئے۔ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ آپ کے والد بوڑھے آدمی ہیں اور روز بروز اُن کی حالت کمزور ہوتی جارہی ہے۔ میرا یہ خیال نہیں ہے کہ اگر وہ یہیں رہے تو اُن کو صحت نہیں ملے گی لیکن بڑی عمر کے لوگوں کے بارے میں کچھ زیادہ حفاظتی تدابیر اختیار کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ اگر آپ انہیں کلکتہ لے جانا چاہیں تو اب لے جائیے، کیونکہ اگر آپ اَور دیر کریں گے تو پھر انہیں حرکت دینا بھی ناممکن ہوجائے گا۔

اننت کو محسوس ہؤا کہ اُس کا دل بیٹھ رہا ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر نے بہت کوشش کی کہ اپنے اصلی مطلب کو چھپادے لیکن اننت نے خوب سمجھ لیا کہ اُس کے باپ کی حالت بہت زبوں اور نازک ہوتی جارہی ہے۔ اس لئے اُس نے فوراً کلکتہ میں اپنے ایک دوست کو تار دیا کہ اُس کے لئے ایک گھر کا انتظام کرے۔ اور خود ریلوے اسٹیشن پر گیا اور ایک پورا کمپارٹمنٹ اپنے اور اپنے گھر والوں کے سفر کے لئے مخصوص کرانے کا بندوبست کرآیا۔ گھر کے سب لوگوں کو جانا تھا۔ مہالکشمی اپنے خاوند کے ساتھ رہنے پر مصر تھی چونکہ میگھ مالا کو پیچھے تنہا چھوڑا نہیں جاسکتا تھا اس لئے وہ بھی جانے کو تیار ہوگئی۔ یہ بات بھی تھی کہ مریض کے لئے اُس کی خدمات درکار تھیں۔

خوش قسمتی سے اننت کو کلکتہ میں گھر اور سفر کے لئے ریل کا ایک آرام دہ کمرہ حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی۔ وہ سٹیشن کے لئے روانہ ہؤا۔ مریض کو ڈولی میں ڈالا گیا اور عورتیں ایک سواری میں روانہ ہوگئیں۔ اسباب چھکڑے میں بھردیا گیا۔ اننت کو اب یہی خیال کھائے جارہا تھا کہ اسے کس قدر زیر بار ہونا پڑے گا۔

یہ لوگ بخیریت کلکتہ پہنچ گئے۔ اور ادی ناتھ کا علاج جس قدر ممکن تھا کیا جانے لگا۔ لیکن موت کا علاج کوئی نہیں۔ چند روز بعد وہ چل بسا اور گھر کے تمام تعلقات اور فخر و مباہات کی روایات یہیں کی یہیں رہ گئیں۔

موت سے پہلے اگر اُسے اپنی کسی بدقسمتی کا شکوہ تھا تو یہی کہ مرتے وقت اپنا پوتا دیکھے بغیر دنیا سے جا رہا ہے۔ اِس صدمے سے میگھ مالا کا دل ٹوٹ رہا تھا۔

میگھ مالا کے درد بھرے بین نے گھر بھر کو غم واندوہ سے بھر دیا تھا۔ اُسے تسلّی دینے والا کہیں کوئی نظر نہ آتا تھا۔ دنیا اس کی آنکھوں میں تاریک تھی۔

"ماتا جی اب چلو گاؤں کو واپس چلیں" انت نے کہا "یہاں اور ٹھہرنے سے کیا حاصل ہے؟"

مہالکشمی نے سختی سے اعتراض کیا اور روتے ہوئے کہا "میں قدیم گھر میں جانے کی ہرگز روادار نہیں ہوں۔ اُن بوڑھی بلّیوں کی تو اب دلی آرزو پُوری ہوئی۔ اُن کی آنکھیں غصّہ سے آگ ہو جاتی تھیں جب مجھے وہ زیور سے لدا ہوا دیکھتی تھیں۔ اب مجھے بیوہ دیکھ کر وہ کتنی خوش ہونگی۔ میں انہیں یہ خوشی کا موقع دینا نہیں چاہتی"

"لیکن ماتا جی گھر تو کھنڈر ہو جائے گا" انت نے کہا "کرپا کر کے ایسی بات تو نہ کہئے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ پتا جی کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، لیکن پھر بھی دھندا چل رہا ہے۔ اس لئے ایسا تو نہ ہونا چاہئے کہ ہمارے گھر میں کُتّے کھیلیں"

اب مہالکشمی کا غصّہ کسی قدر ٹھنڈا ہو چکا تھا اس لئے بولی "میرے بیٹے میرا سب کچھ تم ہی ہو۔ مجھے اور کسی جائداد کی ضرورت نہیں۔ تم سلامت رہو۔ بس میں خوش ہوں۔ میں کس کے لئے گاؤں جاؤں اور جائداد کی نگرانی کروں؟ تم بے اولاد ہو۔ جب ہم سب اِس دنیا میں نہ ہونگے تو یہ سب بدخواہ رشتہ دار آئیں گے اور تمام چیزوں پر قبضہ جما لیں گے۔ ہمیں ضرورت نہیں کہ گھر اور زمین کی نگرانی اُن کے لئے کرتے رہیں۔ ان سب چیزوں کو برباد ہونے دو"

ان لفظوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انت کے دل پر کاری زخم لگا ہے۔ بات وہی سچّی تھی جو اُس کی ماں نے کہی۔ آخر کس لئے وہ دولت جمع کر رہا تھا اور یہ سب جائداد بنا رہا تھا۔ بچوں کے بغیر اُن کا گھر سُونا پڑا تھا۔

"تم نے کیا فیصلہ کیا ہے" رات کے وقت میگھ مالا نے دریافت کیا "کیا ہم واپس گاؤں چلیں گے یا یہیں رہیں گے"

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں" انت نے کہا "اور ماتا جی تو سرے سے جانے کی ہی مخالفت کر رہی ہیں لیکن ہمیں جانا ضرور ہے۔ چاہے شرادھ منانے ہی کے لئے سہی۔ اس کے بعد بھی اگر وہ واپسی پر اصرار

کریں گی تو ہم واپس آجائیں گے۔ اور یہ بات ایک صورت میں مفید ہی ہوگی۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ کچھ عرصہ کے لئے تم کو یہاں ٹھہرائے رکھوں تاکہ ماہر ڈاکٹروں سے مشورہ کیا جا سکے۔

"و کس لئے"، میگھ مالا نے تاسف آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "کیا اس لئے کہ میرے کوئی بچہ نہیں ہے؟"

"یہ کوئی ہنسی کی بات نہیں"، انت نے ذرا ابھاری آواز میں کہا "میں اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ اگر میرے ہاں کوئی بیٹا نہ ہوا تو خاندان کا نام مٹ جائے گا۔ اور یہ بڑی آفت ہے۔ ہمارا خاندان ہمارے علاقے میں سب سے قدیم اور شریف مانا گیا ہے۔"

"ایک ماہر ڈاکٹر میرے لئے کیا کر سکتا ہے؟" اس کی بیوی نے کہا "میں تو نہیں سمجھتی کہ میں کبھی کسی بچے کی ماں ہوں گی ہاں بہتر یہ ہے کہ تم ایک اور شادی کر لو۔"

یہ بات اُس نے نیم مزاح اور نیم تجسس کے لہجہ میں کہی۔ کیونکہ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ انت کا ارادہ کیا ہے لیکن جونہی کہ یہ الفاظ اُس کی زبان سے نکلے اسے تکلیف کا احساس ہونے لگا۔ کیونکہ انت کے چہرے پر اُسے کچھ اور آثار نظر آنے لگے۔

"اگر قسمت کو منظور ہوتا"، انت نے کہا "تو میں کب کا یہ کام کر چکا ہوتا!" اس کا جواب میگھ مالا کے پاس کچھ نہ تھا۔

انت کا دل محتاط ہوگیا۔ اس کے والد کی وفات کے بعد ایک شخص للیتا کی تلاش و جستجو کے لئے بھیجا گیا، لیکن وہ شخص یہ خبر لے کر واپس آیا کہ للیتا کے خاندان نے اُس بستی کو ہی چھوڑ دیا جس میں وہ پہلے رہا کرتے تھے۔ اُن کا گھر ٹوٹ پھوٹ کر ویران ہوگیا۔ پرانے لوگ چل بسے۔ نوجوان تلاشِ معاش میں کہیں کے کہیں نکل گئے۔ کوئی شخص نہیں بتا سکتا تھا کہ للیتا کہاں ہے۔ اور ہے تو زندہ ہے یا مرگئی؟

اس خبر سے انت بہت دل شکستہ ہوا۔ یہ اس کا بڑا کارنامہ ہوتا اگر وہ للیتا ہی کو واپس لا سکتا، لیکن اگر وہ اور شادی کرے تو سوسائٹی میں بڑی چہ میگوئیاں ہونگی۔ کیونکہ کوئی شخص اُس کی احتیاج کو تو سمجھ نہیں سکے گا البتہ ہر ایک اُس پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دے گا۔ علاوہ ازیں یہ بھی تو مشکل ہے کہ ان حالات میں اس کو کوئی اچھی بیوی مل جائے۔ کون ایسے دولہا کو پسند کرے گا جس کے گھر میں پہلے سے دو بیویاں موجود ہوں؟ اور اس بارے میں تو اس کا شریف و نجیب خون بھی اُس کی چنداں مدد نہیں کر سکتا۔ ہاں اس کو ایک ایسی لڑکی کا مل جانا ممکن ہے جسے اُس کے سوا اور کوئی قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔ مگر کیا اُس کے لئے ایسی غیر موزوں عورت کے ساتھ

زندگی بسر کرنا ناممکن نہ ہو جائے گا جب کہ وہ میگھ مالا جیسی بیوی کے ساتھ زندگی بسر کر چکا ہے۔ علاوہ ازیں اُسے یہ خیال بھی آتا تھا کہ غریب میگھ مالا کا کیا حشر ہوگا۔ اسے رنج و اندوہ اور یاس وحرماں بُری طرح اپنی آماجگاہ بنالیں گے اور اگر وہ للیتا کو واپس لا سکتا تو اس کی بے نام مشکلات بیک بار طے ہو جاتیں۔ اس سے اُس کے اپنے دل کو بھی اطمینان حاصل ہوتا اور اعتراضات کی بجائے لوگ بھی اس کی تعریفیں کرتے۔ حتیٰ کہ میگھ مالا بھی نئی سوت پر پرانی سوت کو ترجیح دیتی، کیونکہ للیتا کا حق اُس سے پہلے ہے۔ میگھ مالا کی شادی اُس کے والدین نے للیتا کے متعلق جانتے ہوئے کی تھی اس لئے وہ بھی اس کے دوبارہ آجانے پر معترض نہ ہوتے۔ اور یوں بھی للیتا بہت موہنی اور اچھی لڑکی تھی اگرچہ وہ حسن اور جمال کی مورت نہ تھی۔ اُس کا ارادہ تھا کہ وہ اپنی ان دونوں بیویوں کو ایک جگہ رکھے گا۔ اُس کے خیالات تو یہ تھے مگر للیتا کا کوئی پتہ نشان نہ ملتا تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ بڑی بُری طرح یہاں سے نکال دی گئی تھی، لیکن اب اس کے خاوند کے گھر کے دروازے اُس کے استقبال کے لئے بالکل کھلے پڑے تھے مگر وہ پھر بھی واپس نہ آئی تھی۔ ابسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کی کروڑوں کی بستی میں وہ ہمیشہ کے لئے گم ہو گئی ہے۔

انت اپنے والد کے شرادھ کی رسم ادا کرنے کے لئے اپنے گاؤں میں گیا اور پھر کلکتہ میں اپنی بیوی اور ماں سمیت واپس آگیا۔ اُس نے میگھ مالا کے علاج معالجہ میں خرچ کرنے میں کوئی دریغ نہیں کیا۔ اِدھر مہالکشمی نے بھی ٹونے ٹوٹکے کرنے میں کسر نہیں چھوڑی کہ شاید اسی سے اس کی بہو کی بانجھ پن کی لعنت دور ہو جائے لیکن میگھ مالا تھی کہ روز بروز ناامیدی کے دریا میں ڈوبتی چلی جا رہی تھی۔

چونکہ وہ ابھی بالکل نوجوان تھی اس لئے انت کو کچھ مایوسی نہیں ہوئی تھی وہ دو سال تک اور انتظار کرنے کے لئے تیار تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس عرصہ کے بعد میگھ مالا خود حالات کا اندازہ کر کے اُس کو اور شادی کی اجازت دے دے گی، اور اگر وہ شادی کرے گا تو اس سے بے توجہی کا سلوک ہرگز روا نہ رکھے گا بلکہ وہی گھر کی ملکہ رہے گی اور نئی بیوی کو اس کے ماتحت رہنا ہوگا۔

مہالکشمی کی صحت بھی خراب ہوتی جا رہی تھی۔ اُس پر ایک نہیں کئی امراض نے حملہ کیا تھا۔ مگر اس کو ضد تھی کہ ڈاکٹر کا علاج نہیں کرائے گی۔ چنانچہ یہی حالت کچھ دنوں چلتی رہی۔

ایک دفعہ اچانک کیا ہوا کہ اُس کی حالت بہت بگڑ گئی۔ انت اپنے بنک میں گیا ہوا تھا۔ نوکر بھی کہیں گھر

سے باہر تھا۔ اور شام تک اُس کے واپس آنے کی امید نہ تھی۔ اب گھر میں اگر کوئی تھا تو ایک گھر کی بوڑھی خادمہ دوسری خوفزدہ نوجوان گھر کی مالکہ۔

میگھ مالا اپنی ساس کی اس نازک حالت کو دیکھ کر خوف سے لرز رہی تھی۔ "ارے کسی کو بلاؤ" اُس نے بوڑھی خادمہ سے بالتجا کہا "کہ میں اپنے پتی کو بنک سے بلاؤں"۔

"میں کیسے بلاؤں؟" بوڑھی خادمہ نے کہا "اس وقت گھر میں کون بیٹھا ہوگا۔ سب اپنے اپنے کام پر جا چکے ہیں"۔

"تو پھر ہم کیا کریں" میگھ مالا نے بے چارگی کی حالت میں کہا۔

"ہاں دیکھیے تو" خادمہ نے کہا "اسی گلی کی نکڑ پر ایک لیڈی ڈاکٹر رہتی ہے۔ کیا اُسے جا کر بلا لاؤں"؟

میگھ مالا نے اطمینان کا سانس لیا "بہت اچھا" اُس نے کہا "جھپٹ کر اس کے پاس جاؤ۔ اس کی فیس میں "اُن" کے آتے ہی اسے بھجوا دوں گی"۔

بوڑھی عورت سے جتنا ممکن تھا وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی گئی اور آدھ گھنٹے کے بعد ایک نوجوان خاتون کو ساتھ لئے ہوئے واپس آئی۔ اس کا لباس قرینہ کا تھا گو سادہ تھا۔ خادمہ اس کا چھوٹا ہینڈ بیگ اُٹھائے ہوئے تھی۔

جب لیڈی ڈاکٹر نے میگھ مالا کو دیکھا تو کہا "کون بیمار ہے؟ تمہاری خادمہ کچھ بیان نہیں کر سکی"۔

"کمرے میں چلئے کر پا کر کے" میگھ مالا نے کہا "میری ساس بیمار ہے"!

لیڈی ڈاکٹر اندر گئی۔ مہالکشمی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ کیونکہ ڈاکٹر ایک عورت تھی۔ اور وہ بھی بالکل نوجوان اور پھر یوں بھی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ اور طبیعت کی بھی اچھی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر نے غور سے بوڑھی خاتون کا معائنہ کیا اور چند باتیں بھی پوچھیں۔ پھر اُس نے بوڑھی خادمہ کو اپنے گھر بھیجا کہ وہ وہاں سے ضروری چیزیں اور دوا لے آئے اور خود ایک گھنٹے تک وہیں ٹھہری رہی اور جب مہالکشمی کی حالت کسی قدر سنبھل گئی تو واپس چلی گئی۔ اُس نے میگھ مالا سے کہا کہ اگر بوڑھی خاتون کی طبیعت پھر خراب ہو تو فوراً اُسے بلا لیا جائے۔ اگر وہ گھر پر نہ ملے تو وہاں دو نرسیں موجود ہیں جو آکر مریضہ کی دیکھ بھال کریں گی۔

میگھ مالا نے کہا کہ جونہی کہ انت واپس آتا ہے وہ اس کی فیس بھیج دے گی۔

نوجوان لیڈی ڈاکٹر ہنسی اور بولی "فیس کے متعلق آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہئے۔ فیس بعد میں آ سکتی ہے"۔ یہ کہا اور چل دی گویا کہ اُسے جلدی تھی۔

میگھ مالا اپنی ساس کے پاس گئی - بوڑھی خاتون بہت بے چین ہوگئی تھی اِس لئے اُس نے بار بار یہی پُوچھا کہ انت کب آئے گا" اور وہ خوش قسمتی سے آج معمول سے پہلے ہی آگیا - میگھ مالا اسے بتانے کے لئے دوڑ کر گئی " بہت اچھا ہُوا کہ آج تم جلدی سے واپس آگئے - میری تو عجیب حالت تھی - ماتا جی کو تو ایشور ہی نے بچایا ہے - خادمہ نے ایک لیڈی ڈاکٹر کو بلایا - اُس نے ہماری بڑی مدد کی - چلو اور ماتا جی کو دیکھو - وہ بہت بے چین ہیں - میں نے ابھی تک لیڈی ڈاکٹر کی فیس بھی نہیں دی "

انت اِس حالت میں واپس آیا تھا کہ اُس کی اپنی طبیعت اچھی نہ تھی لیکن اب اُسے اپنی تکلیف تو بھول گئی اور وہ سیدھا ماں کی حالت دیکھنے چلا گیا -

" آخر تم آہی گئے ؟" مہالکشمی نے کہا " لیکن تمہاری طبیعت اچھی نہیں معلوم ہوتی "

" میری پروا نہ کیجئے میں نے سنا ہے کہ آپ بہت بیمار ہوگئی تھیں - اب آپ نے دیکھا کہ مرض کو بے علاج چھوڑنے کا اثر کیا ہوتا ہے ؟"

" میرے بچے میں بڑھیا ہوں " مہالکشمی نے کہا " اور ہمیشہ زندہ نہیں رہ سکتی - اگر میں تمہارے ہاتھوں میں جاؤں تو اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھوں گی "

" آپ اس لیڈی ڈاکٹر کو ہی اپنا علاج کرنے دیجئے " انت نے کہا " وہ پاس ہی رہتی ہے اور جب ضرورت ہو آکر مدد دے سکتی ہے "

" بہت اچھا " اُس کی ماں نے کہا " یہ لڑکی مجھے بہت بھلی معلوم ہوتی ہے - اس نے تو مجھے کسی کی یاد دلا دی "

انت اپنی ماں کے کمرے سے باہر آگیا " میں اب کچھ نہیں کھاؤں گا " اُس نے میگھ مالا سے کہا " مجھے شدید بخار معلوم ہوتا ہے میں جا کر لیٹتا ہوں "

" ہے پرماتما " میگھ مالا نے کہا " مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی - اب تم دونوں بیمار ہوگئے - میں تم دونوں کی تیمارداری کیسے کرسکوں گی ؟"

" قسمت کا شکوہ بے کار ہے " انت نے کہا " لوگ ارادۃً مرنے کے لئے تو بیمار ہوتے نہیں جس طرح بن پڑے تیمارداری کرو "

اُس کا بخار بتدریج تیز ہوتا گیا - دوسرا دن بھی آگیا لیکن اس میں کمی کے آثار نظر نہ آتے تھے غریب میگھ مالا

کے حواس گم ہوتے جاتے تھے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ کس کس کی دیکھ بھال کرتے وہ اپنے خاوند کو ایک لمحے کے لئے بھی تنہا چھوڑنے پر راضی نہ تھی، لیکن اگر وہ اپنی ساس کو خادمہ کی نگرانی پر چھوڑ دیتی تو بوڑھی خاتون خفا ہو جاتی۔
انت نے اُس کی بیچارگی کو بھانپ کر کہا "ہمیں خرچ کا خیال نہیں کرنا چاہئے۔ اپنی لیڈی ڈاکٹر کو بلاؤ اور اُس سے ماتاجی کی تیمارداری کے لئے ایک نرس مانگ لو۔ خادمہ بے کار ہے۔ اگر ماتاجی خفا ہوتی ہیں تو اُن پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا"۔
میگھ مالا نے لیڈی ڈاکٹر مس مترا کو بلا لیا۔ جب وہ آئی تو اُس نے اس سے درخواست کی کہ وہ بوڑھی خاتون کے لئے ایک نرس مقرر کر دے۔ اور خود اپنے خاوند کے پاس چلی گئی۔ کیونکہ انت کا تنہا چھوڑ دینا اُسے گوارا نہ تھا۔
لیڈی ڈاکٹر مہالکشمی کے بستر کے پاس بیٹھ گئی "آؤ آؤ، میری بچی"۔ بوڑھی خاتون نے کہا "میرے دل میں تو تمہاری محبت پہلی ہی نظر میں پیدا ہو گئی تھی۔ تمہارا نام کیا ہے۔ میں تمہیں ڈاکٹر تو کہہ نہیں سکتی"۔
"میرا نام لتیکا مترا ہے" نوجوان لیڈی نے کہا
"کیا تم شادی شدہ نہیں ہو؟" اس کی مریضہ نے پوچھا "میں خیال کرتی ہوں کہ تم اپنے کاروبار میں زیادہ مصروف رہتی ہو؟ یہ تم نے اس عمر میں چشمہ کیوں لگا لیا ہے؟ کیا تمہاری نظر بہت خراب ہے؟"
"ہاں کسی قدر" لڑکی نے کہا "آپ کی طبیعت آج کیسی ہے؟ یہ سوال اُس نے اس لئے کیا کہ مہالکشمی کو اس گفتگو کا اَور موقع نہ دے۔
اُس وقت میگھ مالا کمرے میں داخل ہوئی اور مہالکشمی نے اس سے دریافت کیا "اب انت کا کیا حال ہے؟"
"بخار کچھ پھر زیادہ ہو گیا ہے" میگھ مالا نے تاسف آمیز لہجہ میں کہا۔
"کیا ان کا بخار ہر روز بڑھتا جا رہا ہے" لیڈی ڈاکٹر نے سوال کیا۔
"ہاں" میگھ مالا نے کہا "دواؤں کے استعمال میں تو انہوں نے کمی نہیں کی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دواؤں میں اُن کے لئے کچھ اثر ہی نہیں رہا"۔
"تو پھر تبدیلِ آب و ہوا کے لئے باہر چلے جائیے" لیڈی ڈاکٹر نے مشورہ دیا۔ "کیونکہ ایسے امراض اور مریضوں کے لئے یہی بہترین علاج ہے۔ انہیں شہر میں تو ہرگز نہیں رہنا چاہئے"۔ اتنا کہہ کر وہ مہالکشمی کی طرف متوجہ ہوئی اور

بولی "تبدیلِ آب و ہوا آپ کے لئے بھی بہت مناسب اور مفید ہے۔"

"میری صحت کی تو کوئی فکر نہیں میری بچی" بوڑھی خاتون نے حسرت بھرے لہجہ میں کہا "جب سے میں نے اپنے بچّے کی بیماری کا حال سنا ہے میرا تو خون پانی بن گیا ہے۔ میں بڑی ہی خوش قسمت ہونگی اگر میں اُس سے پہلے مرجاؤں۔ کیونکہ وہ میرا اکلوتا بچہ ہے۔"

بوڑھی خادمہ کمرے میں آئی اور مس منرا سے بولی "ایک چھوٹا بچہ آپ کو پوچھ رہا ہے۔"

یہ سُن کر لیڈی ڈاکٹر بسرعت اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی "اب میں جاتی ہوں۔ کل صبح میں آپ کے پاس ایک نرس بھیج دوں گی۔"

"یہ بچّہ کون ہے" مہالکشمی نے دریافت کیا "تم نے تو کہا تھا کہ تمہاری شادی نہیں ہوئی۔"

نوجوان خاتون نے جواب دیا "جی اس بچّے کو میں نے پالا ہے" اُس کے جواب سے گھبراہٹ سی ظاہر ہوتی تھی اور وہ جلدی سے باہر چلی گئی۔

مہالکشمی نے منہ ٹیڑھا بنا کر کہا ایسی بی صاحبہ کا اعتبار ہی کیا ہے۔ کوئی جان ہی نہیں سکتا کہ درحقیقت یہ ہیں کیا۔"

اننت کی صحت میں کوئی بہتری کی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ اُس کے ڈاکٹر نے بھی اسے یہی مشورہ دیا کہ وہ ایک لمبے عرصہ کے لئے تبدیلِ آب و ہوا کے لئے باہر چلا جائے۔

اننت کا دل ٹوٹ چکا تھا، وہ جانتا تھا کہ اس کا مرض کیا ہے۔ اور یہ بھی اسے معلوم تھا کہ اُس کی بحالیٔ صحت کی اب کوئی امید نہیں۔ لیکن موت کے بڑھے چلے آنے کا خوف بھی اُسے یہ بات بھولنے نہ دیتا تھا کہ وہ بے اولاد مر رہا ہے۔

وہ پڑا سوچ رہا تھا کہ میگھ مالا اندر آئی اور بولی۔ "ماتا جی نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تم کو اُن کے کمرے میں لے جاؤں۔ کیونکہ وہ کمرہ ہوا اور روشنی کے لحاظ سے اِس سے زیادہ اچھا ہے۔ وہ چل پھر سکتی ہیں، لیکن تم بستر پر ہی پڑے رہنے پر مجبور ہو۔"

اب حالت یہ تھی کہ غریب اننت نے کسی بھی بات پر اعتراض کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اِس لئے اُس نے کہا۔

"بہت اچھا"

نوکر بلائے گئے اور جلدی کمرے ادل بدل کر دیے گئے۔ دوسرے دن میگھ مالا اننت کے لئے کھانا پکا رہی

تھی اور اننت تنہا پڑا سوچ رہا تھا کہ چند دن جن میں وہ ابھی زمین پر ہے کیسے بیت جائیں گے۔ لیکن اس کے بعد کون ہے جو اُس کی اپاہج ماں اور نوجوان بیوی کی دیکھ بھال کرے گا؟

وہ انہی خیالات میں پڑا چکر کھا رہا تھا کہ اُس نے بھاری قدموں کی آواز سنی اور خیال کیا کہ کہیں یہ موت کا فرشتہ ہی تو نہیں جس کا اسے کچھ دنوں سے انتظار تھا۔

ایک لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ بھی بستر پر پڑے ہوئے شخص کی صورت دیکھ کر گھبرا سی گئی۔ لیکن اُس نے پوچھا "کیا آپ کی ماتا جی کل یہیں نہیں تھیں"

"ہاں" اننت نے کہا "لیکن ہم نے کل شام کمرے بدل لئے۔ لیکن تم کون ہو؟ کیا تم للیتا ہو۔ یا یہ میری بھول ہے؟"

لڑکی نے رنگین چشمہ اپنی آنکھوں سے اتار لیا جس نے اُس کا چہرہ چھپا یا ہوا تھا۔ "ہاں ایک زمانہ میں للیتا ہی کے نام سے پکاری جاتی تھی" اُس نے کہا "لیکن اب میں لیڈی ڈاکٹر لتیکا منترا ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ تمہاری والدہ کہاں ہیں کہ میں انہیں جا کر دیکھوں"

"حیرت ہے کہ ماتا جی نے تمہیں اب تک نہیں پہچانا حالانکہ وہ تمہیں روز دیکھتی تھیں" اننت نے کہا۔

"وہ مجھے کیسے پہچان سکتی تھیں" للیتا نے کہا "کیا پچھلے زمانے میں انہوں نے کبھی میرا چہرہ دیکھا تھا؟ غالباً صرف ایک بار انہوں نے مجھے دیکھا تھا، وہ بھی اُس وقت جب میں تمہارے گھر میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ مجھے کوسنے کاٹنے میں مصروف ہوگئیں۔ اُن دنوں میرے چہرے پر گھونگٹ ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں اس بات پر اب دس برس گذر چکے ہیں۔ شکلیں بدل گئی ہیں۔ پھر یہ چشمہ بھی تو ہوتا تھا۔

دفعتہً ایک لڑکا کمرے میں داخل ہوا اور بولا "ماتا جی آپ کو بھی کیسی بھول جانے کی عادت ہے۔ یہ دیکھئے آپ اپنا دواؤں کا بیگ تو گھر ہی میں چھوڑ آئی تھیں!"

للیتا نے اُس کے ہاتھ سے بیگ چھین لیا اور بولی "چھوٹے، تم بھی عجب دخل درمعقولات کرتے ہو تمہیں کس نے یہاں آنے کو کہا تھا۔ اب یہاں سے چلے جاؤ"

"اسے ٹھہرنے دو" اننت نے مذوق وشوق کہا "میں اسے اچھی طرح دیکھنا چاہتا ہوں۔ للیتا یہ کس کا بچہ ہے؟"

للیتا دریچوں میں سے باہر دیکھنے لگی۔ مگر اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اننت اچھل کر اپنے بستر پر بیٹھ گیا پھر للیتا کے پاس آیا "تم نے اب تک اسے کہاں چھپائے رکھا" اُس نے

کہا "کیا تم جانتی ہو کہ ایک بچّے کے بغیر میری زندگی بے حاصل ہوئی جا رہی ہے ۔ حتیٰ کہ میں اطمینان سے مر بھی نہیں سکتا۔"

"لیکن تم نے بھی تو کسی دوسرے کی زندگی کو تباہ کرنے سے پہلے ایک بار غور نہیں کر لیا تھا۔" للیتا نے کہا۔

"میں نے اِس گناہ کی کافی سزا پالی" انت نے کہا۔ "مجھ پر رحم کرو اور واپس آؤ ۔ مجھے میرا بچّہ دے دو۔"

دفعتہً للیتا کا چہرہ سخت ہوگیا اور وہ بولی "کون کہتا ہے کہ یہ تمہارا بچّہ ہے؟ یہ ایک یتیم ہے جسے میں نے خیرات کے طور پر پرورش کیا ہے۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو" انت نے شکستہ آواز میں چلّا کر کہا۔

"جھوٹ ہوگا" للیتا نے کہا۔ "لیکن تم ثبوت کیا دو گے۔؟"

وہ اپنے بچّے کا ہاتھ تھام کر بھاری قدموں سے کمرے کے باہر چلی گئی۔

(ماڈرن ریویو) مہر محمد خاں شہاب

ہدیۂ نیاز

گلزارِ جہاں کے ہر گل سی مجھے وحشت ہے ۔ اِک نیرِ تصوّر ہے جو مونسِ فرقت ہے

دنیا میں ہے خاموشی آرام میں ہے ہر شے ۔ میرا ہی دلِ مضطر درماندۂ کلفت ہے

میں بلبلِ شیدا ہوں تو اک گلِ خوبی ہے ۔ پروانہ ہوں میں اور تو اک شمعِ محبّت ہے

تو شرم کی دیوی ہے تو حسنِ مجسّم ہے ۔ تو عشق کی دولت ہے تو گوہرِ عصمت ہے

او پیکرِ معصومی ہر ایک ادا تیری ۔ میرے لئے تسکیں ہے میرے لئے راحت ہے

پُر کیف نگاہوں کی پُر کیف لگاوٹ سے
ہاں کیف کی ہستی بھی وارفتۂ الفت ہے

ظہیر احسن کیفؔ
انصاری بلگرامی

تجلّیات

تُو ہو، تو لطف یکساں ہے دشت میں چمن میں
خلوت میں انجمن ہے خلوت ہے انجمن میں

دل میں جو عکسِ گل ہے تصویر ہے کسی کی
کوئی بسا ہُوا ہے پھُولوں کے پیرہن میں

اب بے کلی نہیں ہے وہ بے دلی نہیں ہے
موجِ مئے سکوں ہے مہتاب کی کرن میں

جنگل کی چاندنی میں یہ پھُول جھُومتے ہیں
یا رقص ہو رہا ہے پریوں کی انجمن میں

نغمے جدا جدا ہیں بہرِ تسلّیِ دل
صحرا میں خامشی ہے شورش ہے انجمن میں

ناصح کی بھی زباں اب رُک رُک کے چل رہی ہے
کیا کیا کرامتیں ہیں اُس چشمِ سحر فن میں

کیونکر اثر بیاں ہو بے مہریِ عزیزاں
غربت میں اب وطن ہے غربت ہے اب وطن میں

آثر صہبائی

قیدِ خود اختیاری

(۱)

ہوں مبارک دوستو! دنیا کی تم کو وسعتیں — میری قسمت میں فقط اک تنگ زنداں رہ گیا
ہم کو کیا اہلِ خرد ہوں محوِ گلگشتِ چمن — "چل دیئے اہلِ جنوں خالی بیاباں رہ گیا"

(۲)

راحت کی تمنّائے کم انجام بہت ہے — یعنی کہ مجھے بھی ہوسِ خام بہت ہے
لیکن کبھی کوشش سے نہ حاصل ہوئی جو شے — وہ تیرے لئے اب دلِ ناکام بہت ہے

"نے تیر کماں میں ہے نہ صیّاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے"

پورٹ بلیر (جزائر انڈمان)

یلدرم

فردوسِ وطن

جس سرزمیں میں خوف و خطر کا گذر نہ ہو — جس سرزمیں میں حاکمِ جابر کا ڈر نہ ہو
جس سرزمیں میں علم کی پرواز ہو بلند — جس سرزمیں میں فرقہ پرستی کے ہوں نہ بند
جس سرزمیں میں بات ہو آئینۂ خیال — جس سرزمیں میں فکر رہے تشنۂ کمال
جس سرزمیں میں عقل نہ گم کردہ راہ ہو — جس سرزمیں میں روح سے اُس کا نباہ ہو

اُس جنتِ نظر میں بسیں میرے ہم وطن
گہوارۂ طرب میں رہیں میرے ہم وطن

(ترجمہ از "گیتانجلی")

عطاء اللہ کلیم

زرکار اچکن

کہتے ہیں کہ کسی شہر میں ـــــ جس کا محلِ وقوع خارج از بحث ہے ـــــ ایک غریب لڑکا رہتا تھا جس کی ماں نے اُس کے لئے ایک خوبصورت اچکن سی دی تھی۔ سبز زمین پر سنہری بوٹے، بڑے بڑے جیسے سبزہ زار پر کھلے ہوئے لالہ کے پھول، بے حد نظر فریب۔ شوخ نارنجی گوٹ شفق کی طرح۔ چاندی کے بٹن، گویا دمکتے تارے۔ وہ اسے پہن کر پھولوں نہ سمایا۔ گھنٹوں آئینہ کے سامنے کھڑا تکتا رہا۔ "بس بیٹا اب اتار دو" ماں لاکھ کہتی رہی مگر حیرت اور مسرت نے اُس کے قدم زمین پر گاڑ دیئے تھے۔ اُس کا جی وہاں سے ہٹنے کو نہ چاہتا تھا۔

وہ اُسے ہر وقت اور ہر جگہ پہننا چاہتا تھا ـــــ ہر ایک کو دکھاتے پھرنا۔ اُن تمام مقامات کی یاد اُس کے ذہن میں تازہ ہوگئی جنہیں یا تو خود اُس نے دیکھا تھا یا تاریخ میں پڑھا اور لوگوں کی زبانی سنا تھا۔ وہ خیال کرنے لگا کہ اگر یہ اچکن پہن کر وہاں چلا جائے تو کیسی تفریح ہوگی۔ کیسی ہل چل پڑ جائے گی۔ خاموش اور پُرامن گلیوں میں ہر انگلی اُس کی طرف اُٹھے گی اور ہر آنکھ اُسی کی جانب نگراں ہو گی۔ وہ اسے پہن کر سبزہ زار کی نرم اور لمبی گھاس اور ساحل کی نرم اور عمیق ریت میں کھیلنا چاہتا تھا ـــــ کودنا، پھاندنا، لوٹ جانا۔ ہا! کیسا لطف ہوگا۔ مگر ماں نے اس کی اجازت نہ دی۔ اُس نے کہا کہ یہ صرف بڑے بڑے موقعوں پر پہننے کے لئے ہے۔ اور اسے نہایت حفاظت اور احتیاط کے ساتھ رکھنا چاہئے، کیونکہ ہماری غریبانہ حالت دوسری ایسی اچکن بنانے کی اجازت نہیں دیتی۔ اُس نے بٹنوں پر گلے پر اور ایسے مقامات پر جن کے خراب ہو جانے اور پھٹ جانے کا اندیشہ تھا کم قیمت سرخ کپڑا چڑھا دیا۔ لڑکے کو یہ بہت بُرا معلوم ہؤا مگر ماں کے حکم کے سامنے سر ہلانے کی مجال نہ تھی۔ آخر کار ماں نے اُسے تہ کیا اور ایک رومال میں لپیٹ کر الماری میں مقفل کر دیا۔ لڑکے کو ایسا محسوس ہؤا جیسے اب یہ اچکن ہمیشہ کے لئے اُس سے جدا ہوگئی ہے۔ وہ رات دن اسی کے خیال میں ڈوبا رہتا اور اُس لمحے کے تصور میں کھویا رہتا جب وہ کسی شاندار موقع پر اُسے پہنے گا ـــــ حفاظتی کپڑا اتار کر، خراب ہونے سے بے پرواہ ہو کر، بغیر کسی احتیاط کے۔ اس خیال سے اُسے بے پایاں مسرت حاصل ہوتی

آہ اسے پہن کر وہ کیسا خوبصورت نظر آئے گا؟

اب اُسے خواب بھی اچکن ہی کے آتے تھے۔ایک رات جب کہ وہ حسبِ معمول خواب میں اچکن پہنے کھڑا تھا، اُس نے ایک بٹن پر سے سرخ کپڑا کھول دیا۔ہائیں! وہ تعجب سے چونکا۔بٹن کی چمک مدھم پڑ گئی تھی۔اُس کے دل کی ننھی سی کلی مرجھا گئی، اور اُس نے راکھ سے بٹن کو چمکانا شروع کیا۔وہ اسے پوری قوت سے گھستا اور رگڑتا رہا، مگر بٹن نہ چمکنا تھا نہ چمکا۔وہ جاگ پڑا اور صبح تک اسی طرح جاگتا رہا۔مدھم اور بے رنگ بٹن کی تصویر اُس کے دماغ پر مرتسم ہوگئی۔اُس نے دلی رنج کے ساتھ اُس وقت کا خیال کیا جب وہ کسی بڑے موقع پر اس اچکن کو پہنے گا جس کا ایک بٹن زنگ آلود ہوچکا ہے۔آہ کتنی معیوب بات تھی۔کئی دن تک یہی خیال اُسے ستاتا رہا اور جب ایک دن اُسے اچکن پہننے کی اجازت ملی تو وہ رہ نہ سکا اور سب کی نظر بچا کر اُس نے اِدھر کے بٹن کا کپڑا کونے سے ذرا علیحدہ کیا، تاکہ اپنے خواب کی تصدیق کرلے۔

وہ مسجد کو راستہ بھر خوش خوش گیا اور اُس کا دل اسی قدیم اور وحشی آرزو سے بھرا ہوا تھا۔یہاں آپ کو یہ معلوم کرا دینا ضروری ہے کہ اُس کی ماں جمعہ کے روز اُسے اچکن پہننے کی اجازت دے دیا کرتی تھی ـــــ عید المومنین کے روز، جب کہ وہ اپنے ماموں کی انگلی پکڑے نماز ادا کرنے محلہ کی مسجد میں جاتا تھا۔مکرر ہدایتوں اور تاکیدوں کے بعد، وہ بھی جب مطلع بادلوں سے صاف ہو، بارش کا خوف نہ ہو، گرد و غبار نہ اڑ رہا ہو، اور کسی طرح اچکن کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو۔بٹن اسی طرح ملفوف رہتے اور گلا بھی ڈھکا ہوا۔ایک چھتری اسے دی جاتی تاکہ وہ اچکن کو دھوپ سے بچائے رکھے، کیونکہ تیز دھوپ رنگ اڑا دیتی ہے۔اور جب وہ گھر واپس آتا تو ہمیشہ بڑی احتیاط سے اس کی گرد جھاڑتا، اُسے برش کرتا اور سلوٹیں صاف کرکے ماں کی ہدایات کے مطابق تہ کرکے رومال میں لپیٹ کر الماری میں مقفل کردیتا۔

ان تمام قیود کی جو اُس کی ماں نے اچکن کے استعمال کے متعلق عائد کر رکھی تھیں وہ تعمیل کرتا رہا کیونکہ چون و چرا کی گنجائش ہی نہ تھی۔حتیٰ کہ ایک شب وہ نیند سے بیدار ہوا اور لیٹے ہی لیٹے دریچے میں سے اپنے منہ پر چمکنے والے چاند کو دیکھنے لگا۔اسے ایسا محسوس ہوا کہ یہ چاندنی کوئی معمولی چاندنی نہیں اور نہ یہ رات ہمیشہ کی سی سادہ رات ہے۔اسی دماغی ترغیب کے زیر اثر نیم وا آنکھوں سے وہ لیٹا ہوا چاند کو تک رہا تھا۔دل میں خیالات کا ایک سمندر تھا جو آن کبھی ختم نہ ہونے والی سرگوشیوں کی طرح متلاطم تھا جو نازک لبوں سے نکل کر سخت دلوں کو

مسحور کر لیتی ہیں۔ یکایک وہ اچھل کر اپنے چھوٹے سے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ سر سے پاؤں تک وہ کانپ رہا تھا اُس نے مصمم ارادہ کر لیا۔ وہ جانتا تھا کہ آج وہ ضرور اچکن پہنے گا۔ ضرور۔ وہ سہما ہوا تھا۔ خطرناک طور پر خوفزدہ۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ خوش بھی تھا۔ اُس کے دل میں بچپن کی معصوم مسرتوں کا چشمہ ابل رہا تھا۔

وہ اُٹھا اور لمحہ بھر کے لئے دریچہ کے پاس کھڑا ہو کر باغ کو دیکھنے لگا جس میں چاندنی کا دریا لہریں لے رہا تھا۔ وہ اس خیال سے بار بار کانپ رہا تھا کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔ فضا میں چھٹکی ہوئی چاندنی زیر زمین مخلوق کی ہلکی ہلکی آوازوں سے مرتعش تھی۔ چھوٹے چھوٹے کیڑوں کا سریلا راگ مسلسل سنائی دے رہا تھا۔ چرّاتے ہوئے تختوں پر سے وہ دبے پاؤں گذرا۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں کوئی جاگ نہ اُٹھے۔ پھر اُس الماری کی طرف گیا جس میں اُس کی خوبصورت اچکن رکھی تھی۔ حسن اتفاق سے وہ غیر مقفل تھی۔ اُس نے آہستہ سے اُسے کھولا، دانتوں سے پوٹلی کی مضبوط گرہ کھولی اور ایک ایک کرکے بٹنوں اور گلے پر سے غلاف اتارنے لگا۔ آہا! کیسی دلفریب کیسی خوشنما اچکن تھی، ہر بٹن اور ہر سنہری پھول دمکتا ہوا نظر آرہا تھا۔ وہ اب بھی ویسی ہی نئی تھی جیسی کہ اُس دن جب اُس نے اسے پہلے روز دیکھا تھا ——— اوہ، اُسے وہ دن ہزار ہا سال قبل کا معلوم ہو رہا تھا۔ کسی بٹن کی چمک مدھم نہ ہوئی تھی۔ اور نہ زرکار پھولوں کا کوئی دھاگا اکھڑا تھا۔ اس کی اپنی پیاری اچکن! اسے اتنی خوشی ہوئی کہ اُس کی آنکھوں سے جلد جلد آنسو گرنے لگے۔ پھر وہ پلٹا اور پنجوں کے بل آہستہ آہستہ باہر جانے لگا۔ وہ کھڑکی کے پاس باغ کو دیکھنے کے لئے ایک منٹ تک ٹھیرا رہا۔ چاند کے نور میں غرق چمکتے ہوئے بٹن تاروں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ پھر وہ اچک کر دہلیز پر چڑھ بیٹھا۔ اور نئے لباس کی سرسراہٹ کو حتی الامکان کم کرتے ہوئے وہ باغ کی ایک روش پر باہر کو کودا۔ اب وہ اپنے گھر کے سامنے کھڑا تھا، جو اُسی طرح سفید و صاف نظر آرہا تھا جیسے دن کی روشنی میں نظر آیا کرتا تھا۔ ہر کھڑکی سوائے ایک کے جس سے وہ ابھی ابھی باہر کودا تھا چشم خوابیدہ کی طرح بند تھی۔ درختوں کے خاموش سائے مختلف النوع جھالروں کی طرح دیواروں پر منعکس تھے۔

چاندنی رات کا باغ دن کے باغ سے بالکل مختلف تھا۔ جھاڑیوں سے اور پھیلے ہوئے درختوں کے پتوں سے چاندنی چھن چھن کر گر رہی تھی۔ ہر پھول اور سرخ سفید صاف نظر آرہا تھا۔ درختوں کی پوشیدہ گہرائیوں میں گانے والی چڑیوں اور حوض کے کنارے پانی میں رہنے والے جانوروں کی آواز ایک ہلکے شیریں نغمے کی طرح ہوا میں گونج رہی تھی۔ دنیا میں کسی جگہ بھی تاریکی کا نام و نشان نہ تھا۔ صرف گرم پُر اسرار سائے اِدھر اُدھر ناچ رہے

تھے۔ درختوں کے پتّوں کے کناروں پر روپہلی گوٹ ٹنکی ہوئی تھی۔ اور پھولوں پر شبنم کے موتی جمے ہوئے تھے۔ رات نسبتاً گرم تھی اور تاروں بھرا آسمان وسیع اور قریب تر۔

اپنی بے پایاں مسرت کے باوجود لڑکا تھوڑی دیر تک خائف اور ششدر کھڑا رہا پھر ایک عجیب دھیمی چیخ کے ساتھ ہوا میں ہاتھ پھیلا کر دوڑا۔ گویا بیک وقت تمام دنیا کو اپنے سینے سے چمٹا لینا چاہتا ہے۔ باغ کے کٹے ہوئے چھوٹے چھوٹے خوبصورت راستوں پر سے گذرنے کا اُسے شوق نہ تھا اس لئے سبزے کی روشوں اور پھولوں کے تختوں کو روندتے، گملوں کو پھاندتے، پودوں سے الجھتے، دلدل میں پھنستے ہوئے وہ بے تحاشا دوڑنے لگا۔ وہ اُس اونچی جھاڑی کے پاس پہنچا جو چوپایوں سے باغ کی حفاظت کے لئے بطور باڑ کے لگائی گئی تھی۔ مگر وہ وہاں بھی نہ رکا اور اس کے اندر گھس پڑا۔ کانٹوں سے اُس کے جسم کو کئی جگہ خراش پہنچی اور نئی اچکن کئی جگہ سے پھٹ گئی۔ وہ پتلی پتلی شاخوں کے اندر جکڑ گیا۔ پھر زور کر کے نکلا۔ کئی کانٹے اُس کے بدن میں چبھے ہوئے رہ گئے۔ مگر اُسے اس کی پروا نہ تھی۔ قطعاً۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ بھی پہننے کا ایک طریقہ ہے۔ وہ طریقہ جس کی اسے مدت سے آرزو تھی۔ اُس نے کہا "میں خوش ہوں کہ میں نے موقع کے مناسب لباس پہنا۔ میں خوش ہوں ——— بڑا خوش"

جھاڑی کے باہر ایک جوہڑ تھا جو بطوں کے تیرنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ غلیظ وکثیف پانی اور دلدل سے لبریز مگر وہ صرف دن کے وقت ایسا نظر آتا تھا۔ رات میں، چاندنی رات میں خصوصاً آج کی نورانی شب وہ ایک حوض تھا جس میں سیماب لرز رہا تھا۔ مینڈکوں کی خوش آئند موسیقی سے فضا میں ایک تموج پیدا تھا۔ لڑکے نے قدم بڑھایا۔ سیماب کا دریا موجیں مارنے لگا۔ ٹخنے تک، گھٹنے برابر، کمر ——— سینہ ——— گلا ——— دو نازک ہاتھوں سے اُس پانی کو چیرتے ہوئے جس کے اندر ستارے، چاند، پورا آسمان پھنسا ہوا تھا وہ تیرنے لگا۔ کنارے پر پہنچا، وہ خوش تھا۔ اُسے حقیقی مسرت حاصل تھی۔ اُس نے کہا "میں خوش ہوں، بے حد خوش، کہ ایسے لباس میں ملبوس ہوں جو ہر طرح مناسبِ حال ہے"

وہ خوش خوش ہانپتا ہانپتا سڑک پر پہنچا۔ سڑک سیدھی تھی ——— تیر کی طرح سیدھی ——— چاند کے نیچے آسمان کی نیلی گہرائیوں میں غائب ہونے والی چمکتی ہوئی سفید سڑک جیسے دودھ کی نہر۔ اس پر وہ دوڑ رہا تھا۔ دونوں طرف درختوں پر پرند چہچہا رہے تھے۔ ناچتے، کودتے، ہوا میں ہاتھ اچھالتے اُن کپڑوں میں ملبوس جو اُس کی ماں کے محبت بھرے، انتھک ہاتھوں نے بنائے تھے وہ چلا جا رہا تھا۔ راستہ میں گرد و غبار اڑ رہا تھا۔ لیکن اُ

کے حق میں وہ غبار نور تھا، ہلکا ہلکا دھیما دھیما۔ اسے ایک خوبصورت تیتری اڑتی نظر آئی، رنگین، قوسِ قزح کے شوخ رنگوں میں رنگی ہوئی۔ وہ اس کے سر کے گرد چکر لگانے لگی۔ پہلے تو اُس نے کچھ خیال نہ کیا۔ پھر وہ بھی ناچ ناچ کر اُس کے ساتھ چکر لگانے لگا، "نازک تتلی"، اُس نے کہا، "اے اس حسین رات کی تتلی جو دنیا کی کل راتوں سے بڑھ کر حسین ہے۔ کیا میری یہ اچکن تجھے خوبصورت معلوم ہوتی ہے؟ پیاری تتلی کیا تو میری اچکن کو ایسا ہی خوبصورت سمجھتی ہے جیسے تیرے یہ رنگین پر ہیں اور جیسا یہ زمین و آسمان کا سیمابی نور ہے۔" تیتری اور زیادہ قریب ہو کر چکر کاٹنے لگی، اتنی قریب کہ اُس کے قرمزی پر ایک مرتبہ لڑکے کے لبوں سے چھو گئے ....

دوسرے روز لوگوں کو ایک حسین و کمسن لڑکے کی لاش ملی، جو زر کار اچکن میں ملبوس ایک گہرے گھڑے میں پڑا تھا۔ اُس کی گردن اور پسلیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ لباس نہ صرف خون سے آلودہ تھا بلکہ پانی میں تر اور کیچڑ اور کائی میں لتھڑا ہوا تھا۔ لیکن اُس کے چہرے سے اذیت کے آثار بالکل ناپید تھے۔ اور بجائے اس کے ایک تبسّم اُس کے لبوں پر کھیل رہا تھا ——— ابدی تبسّم!

تنویر قریشی

(ماخوذ)

رباعی

مجھ میں ہے کوئی چھپی ہوئی شے تیری
نغموں میں مرے ضرور ہے لے تیری
صورت سے تو آشنا نہیں ہیں آنکھیں
آواز کہیں سنی ہوئی ہے تیری

امجد

غزل

بے دلی ہی باعثِ صد عیش سامانی مجھے
داغِ حسرت ہو گیا مُہرِ سلیمانی مجھے

کیا پشیماں ہو کے نکلا تھا میں اُس کی بزم سے
لے گئی پھر کھینچ کر میری پشیمانی مجھے

جب حریمِ خاص تیرا جلوہ گاہِ عام ہو
کیوں کشاکش میں نہ ڈالے تیری ارزانی مجھے

ہے خیالِ قرب کیا کم موجبِ تسکینِ دل
کاش مل جائے کہیں اس در کی دربانی مجھے

دوستو فصلِ بہاری میں نہ دو تکلیفِ باغ
باعثِ صد عیش ہے خود گھر کی ویرانی مجھے

کیوں نہ ہوں بے اعتبارِ خلق میں جب وہ حریف
زخمِ ظاہر غیر کو دے رنجِ پنہانی مجھے

میری رندانہ روش کو، بہرِ اصلاحِ خیال
محتسب سے کم نہیں، فرحت، مرا دانی[1] مجھے

مرزا فرحت اللہ بیگ

[1] دانی سے مراد میرے دوست مولوی غلام یزدانی صاحب ہیں۔

تعزیرات پر ایک علمی نظر

مجرموں کے معاملہ میں لوگوں کے خیالات نرمی اور سختی کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ بیشتر لوگوں کا خیال ہے کہ مجرم کو جرم سے باز رکھنے اور جرائم کا سدِّباب کرنے کے لئے سختی بے حد ضروری اور مفید ہے۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل خلاف ہے۔ گذشتہ سالوں میں جب امریکہ کے اندر اُس عورت کو پھانسی کا حکم دیا گیا جس نے اپنے عاشق کے ساتھ شوہر کے قتل کی سازش کی تھی، تو لکھنے والوں نے اس موضوع پر کافی بحث کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ولایاتِ سبعہ (امریکہ) نے پھانسی کی سزا کو بالکل لغو قرار دے دیا۔

موجودہ انگریزی قوانین مجرم کے معاملہ میں بہت زیادہ سخت ہیں، اور گذشتہ زمانوں میں اس سے بھی زیادہ سخت تھے چنانچہ عہدِ ماضی میں جیب کتروں کو بھی پھانسی کی سزا دی جاتی تھی لیکن حکومت نے اس سزا کو موقوف کر دیا۔ اس موقوفی کا باعث کچھ جیب کتروں کے ساتھ نرمی نہ تھی، بلکہ حکومت نے دیکھا کہ جب سُولیوں کے گرد بھی لوگوں کا مجمع ہوتا ہے تو یہ اور دلیری کے ساتھ جیبیں کترتے ہیں، اس لئے ناچار اس قانون کو منسوخ کر دینا پڑا۔ پس جب سُولی کا جاں گداز اور روح فرسا منظر بھی چوروں کو چوری سے نہ روک سکا تو پھر کیونکر سختی کو مفید اور ضروری کہا جا سکتا ہے؟

جرائم کی زیادتی سختی کو مفید سمجھنے والے یہ خیال کرتے ہونگے کہ اسی کی وجہ سے جب لوگ رُو با صلاح ہو چلے تو قدیم سزاؤں میں تخفیف کر دی گئی اور مسجونین کا معاملہ ایک حد تک ہلکا ہو گیا، لیکن غور کیجئے تو آپ کو صاف نظر آئے گا کہ بایں ہمہ جرائم کی تعداد روز بروز بڑھتی ہی جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ازدیادِ حضارۃ اور وسائلِ عیش کی فراوانی بھی دو چیزیں ہیں جو مجرموں کے لئے اسبابِ جرائم مہیا کرتی ہیں جب تک لوگ معمولی انداز پر زندگی بسر کرتے تھے، اور ان میں اسبابِ عیش کا رواج نہ ہوا تھا چوریاں بہت کم اور معمولی ہوتی تھیں، لیکن حضارت نے جوں جوں ترقی کی، سرقہ کے وسائل اور مسروقات کی قسمیں بھی بڑھتی گئیں، چنانچہ اس وقت برقی آلات بنک کی تجوریں، نقود کے تھیلے چرائے جاتے ہیں اور پولیس سے مل کر بڑی بڑی دوکانوں اور کوٹھیوں پر ڈاکے ڈالے جاتے ہیں۔ کوئی رہزنی کر کے موٹریں لے بھاگتا ہے، کوئی ٹیلیفونی اور ٹیلیگرافی آلات کے سرقہ کا موجب ہوتا ہے الغرض وسائلِ جرائم کی کثرت ہی کثرتِ جرائم کی اصل علت ہے۔ بخلاف اس کے زراعتی مقامات میں جہاں مدنیت نام کو نہیں ہے چوریاں یا تو بالکل نہیں ہوتیں یا بہت ہی کم ہوتی ہیں۔

گیت گانے میں روسی تصوّر اپنے آپ کو مذہب یا اخلاق کا پابند نہیں سمجھتا - یہ کوئی عجیب بات نہیں، ساری دنیا میں یہی ہوتا ہے - لیکن روسی طبیعت بات بنانا نہیں جانتی، اور جو آزادی دوسری جگہ لوگ شرما کر مانگتے ہیں اُس کا اعلان کرنا روسی اپنا فرض یا اپنی مجبوری سمجھتا ہے - جنسی جذبات کے بیان اور جنسی تعلقات کی داستانیں سنانے میں وہ خاص طور پر نفاست سے پرہیز کرتا ہے، اکثر اس حد تک کہ پڑھنے یا سننے والے کو ناگوار گذرتا ہے - روسی فطرت کے محرم راز اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ روسی نہایت درجہ تقدیر پرست ہوتا ہے، ہر مصیبت اپنی ہو یا پرائی اُسے تقدیر کا ایک کھیل معلوم ہوتی ہے، جس پر وہ رائے زنی یا شکایت نہیں کرتا اس لئے کہ تقدیر پر اُسے کوئی قابو نہیں، نہ تقدیر کی مصلحتوں میں دخل - یہ بھی کوئی نرالی خاصیت نہیں، لیکن روسی ایسے گناہوں کو جو اس نے دیدہ و دانستہ کئے ہوں تقدیر کے سر تھوپتا ہے، اِس لئے کہ اس کے جذبات اس قدر شدید اور قوی ہیں کہ وہ بے بس ہو جاتا ہے، کیونکہ جذبات کو تابع رکھنے کے لئے جس مضبوط ارادے کی ضرورت ہے وہ اس سے محروم رکھا گیا ہے: جنسی جذبات سب سے زیادہ قوی ہوتے ہیں، اس لئے ایسے گناہوں کے معاف کرنے پر روسی طبیعت آسانی سے آمادہ ہو جاتی ہے، اور ان کا اعتراف کر کے روسی اپنی بے بسی اور مجبوری ثابت کرتے ہیں - یہ ذہنیت ہزارہا گیتوں کی تصنیف کی ذمہ دار ہے،

یہ ایک لڑکی کی داستان ہے:

"میری ماں مجھ سے بہت محبت کرتی تھی، مجھے پوجتی تھی،\
کہتی تھی مجھ سے نظر ہٹانا دشوار ہے:\
لیکن میں، اُس کی لڑکی، اندھیری رات کو خزاں کے موسم میں\
ایک بیگانے مرد کے ساتھ بھاگ نکلی -\
میں کبھی گھنے جنگل میں بھاگی،\
کبھی گھنے کنج میں،\
آسمان کی طرف دیکھا، ٹھنڈی سانس بھری،\
اور اپنا پیدائشی گھر یاد کیا\
مجھے گھنے کنج سے کیا مطلب\
پیدائشی گھر سے کیا واسطہ؟

جب کبھی گھر کے پاس کا دریا یاد آیا
تو دو ایک گرم آنسو بہادوں گی۔

زہر کچھ زیادہ قیمتی نہیں،
دو چار پیسے کی چیز ہے،
مگر لعنت تجھ پر میری بے رحم زندگی،
میں زہرا بھی خاتمہ کرتی ہوں، ٹھہر تو!
میں نے اپنی رقیب سے کہا،
"تو بھی زہر کھالے۔
مجھے تو نے اس دنیا سے مار بھگایا،
تو بھی کم بخت مرجا!"

میرے دوستو، آؤ،
میں اب میز پر لٹائی جاؤں گی۔
تم میرے اعمال پر رائے زنی نہ کرنا،
میرے جنازے کو کسی خاموش جگہ دفن کر دینا"

روسی گیت پڑھنے کے لئے نہیں تصنیف کئے گئے تھے۔ اُن کے پڑھنے میں کوئی لطف نہیں آتا۔ اُن کی تاثیر کا صحیح اندازہ ہم اسی وقت کر سکتے ہیں جب وہ گائے جائیں، اور گانے والے خود روسی ہوں۔ روسی عوام، وولگا کے برلاک اور وادئ دون کے کوسک انہیں گیتوں کے بے معنی الفاظ کو اپنے جاں گداز جذبات کا ترجمان بناتے ہیں۔ اُن کا لہجہ غم یا خوشی کی وہ داستان سناتا ہے جو گیت کے الفاظ میں مضمر نہیں معلوم ہوتی۔ عوام کے گیتوں کو دراصل نامکمل سمجھنا چاہئے جب تک وہ ایک خاص ماحول میں ایک خاص ادا سے گائے نہ جائیں۔ الفاظ دل کی ترجمانی شاعری میں کرتے ہیں، گیتوں میں نہیں کر سکتے۔

"اردو"

کُوک پپیہے کُوک

کوک پپیہے کوک اے میرے پیارے پپیہے کوک

میں دکھیاری، برہ کی ماری، تڑپت ہوں دن رین
سیّاں تو پردیس سدھارے، ہردے ناہیں چین

کنتھ کنہیا سے کب تک اب نہیں ملیں گے نین

میرے کلیجے میں اٹھتی ہے رہ رہ کر اک ہوک　　کوک پپیہے کوک اے میرے پیارے پپیہے کوک

کوک پپیہے کوک اے میرے پیارے پپیہے کوک
بادل گرجے، بجلی چمکے، مینہ برسے رام　　بار بار پیا کی یاد ستائے جیرا ترسے رام
جوگن کا میں بھیس بنا کر نکلوں گھر سے رام

تیرے کلیجے سے اٹھتی ہے میرے دل کی ہوک　　کوک پپیہے کوک اے میرے پیارے پپیہے کوک
"عالمگیر"

ایک مصوّر کے نام ایک نقّاد کا خط

پیارے دوست تم پوچھتے ہو کہ میں نے تمہاری تصویریں دیکھیں یا نہیں؟ اس کا جواب اثبات میں ہے۔

تم لکھتے ہو اپنی صحیح رائے سے مطلع کرو۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ تمہاری تصویروں سے لیاقت کوشش اور نیک نیتی کا اظہار ہوتا ہے۔ تم واقعی ایک بلند روش اور لطیف منتہائے نظر کی طرف پرواز کرنے کی کوشش کرتے ہو۔ تم رسمی باتوں سے گریز کرتے ہو، آرٹ سے محبت کرتے ہو، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود تمہاری تخلیقات بے معنی ہیں۔ ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ ان کا کوئی مصرف نہیں۔ ان میں صداقت احساس نہیں ہے۔

اس سے میری مراد یہ نہیں کہ تم چراغ کی بجائے جگنو بیچ رہے ہو۔ نہیں ہرگز نہیں۔ بات صرف یہ ہے کہ تم نے اب تک اس راز کو نہیں پایا کہ زندگی کے تغیرات آرٹ میں تغیرات پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اسی کمی کی وجہ سے تمہاری تخلیقات بے کار ہو گئی ہیں۔

زندگی کی قطاریں، دنیا کے مناظر میں، کائنات کے مختلف پہلوؤں میں اس قدر تغیر ہو چکا ہے کہ پرانا آرٹ اب صحیح طور پر زندگی کی نمائندگی نہیں کر سکتا۔ ضرورت ہے کہ کوئی مجتہد آرٹ کو زندہ کر دے۔

"ادبی دنیا"

مطبوعاتِ جدیدہ

اردو شہ پارے۔ جلد اول مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری ایم اے پی ایچ ڈی۔ اس کتاب میں اردو ادب کے آغاز سے ولی کے زمانے تک کے ادبا کے مختصر حالات اور ان کی نظم و نثر کے دلچسپ انتخابات جمع کئے گئے ہیں۔ شروع میں چند صفحات کا ایک مقدمہ ہے جس میں مصنفین اور اُن کے کارناموں پر ایک سرسری تاریخی نظر ڈالی ہے اور آخر میں قدیم اردو کے مشکل اور اجنبی الفاظ کا فرہنگ دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سات شعرا اور چار نایاب قطعات کے عکس بھی کتاب کی زینت ہیں۔ اگرچہ یہ انتخاب زبان کی قدامت کی وجہ سے آج عوام کے لئے دلچسپی کا باعث نہیں بن سکتا لیکن زبان کی تدریجی ترقی کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ کتاب بے حد مفید ہے۔ کہیں کہیں کتاب میں خامیاں رہ گئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مولف نے زیادہ غور اور تحقیقات سے کام نہیں لیا ہمیں امید ہے کہ وہ آئندہ ان کے رفع کرنے کی کوشش کریں گے۔ کتاب بڑی تقطیع کے تقریباً چار سو صفحات پر نہایت اہتمام کے ساتھ چھپی ہے مجلد کی قیمت چھ روپے بارہ آنے مقرر کی گئی ہے۔ مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدر آباد دکن سے طلب فرمائیے۔

فیروز شاہ۔ مصنفہ حکیم محمد سراج الحق صاحب مینیجر دلگداز پریس لکھنؤ۔ یہ ایک تاریخی ناول ہے جس میں سلطان فیروز شاہ بہمنی اور راجہ دیو رائے والئی بیجانگر کے محاربات عشق و محبت کے سچے واقعات دلچسپ اور نتیجہ خیز طریق پر لکھے گئے ہیں۔ زبان بہت اچھی ہے۔ حجم ۱۴۴ صفحات، قیمت ایک روپیہ۔

نغمۂ دل۔ مصنفہ شیخ نذیر احمد صاحب ظفر۔ اس کتاب کے تین حصے ہیں پہلے حصے میں نو مختصر افسانے ہیں، دوسرے حصے میں نظمیں ہیں اور تیسرے میں غزلیات ہیں اور یہی حصہ اس کتاب کی جان ہے۔ افسانے دلچسپ ہیں لیکن ان میں اکثر زبان و بیان کی خامیاں موجود ہیں نظموں میں "پروانہ" "سعید" اور "برسات کی ایک رات" خوب ہیں۔ غزلیں بے تکلف اور جذبات سے پُر ہیں۔ ہم اہل ذوق سے سفارش کریں گے کہ وہ اس کتاب کو ضرور پڑھیں۔ حجم ۲۲۴ صفحے۔ قیمت مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے۔ پتہ۔ دارالاشاعت نغمۂ دل، گجرات (پنجاب)

اردو کا قاعدہ۔ مصنفہ میاں علاؤ الدین صاحب ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ انڈسٹریل سکول، قصور۔ یہ قاعدہ ایسے طریق پر لکھا گیا ہے کہ ہمارے خیال میں اس کے مطالعے سے بچے چند ہی ماہ میں اردو عبارت بخوبی لکھ پڑھ سکیں گے ابتدائی تعلیم کو آسان بنانے میں میاں صاحب کی یہ کوشش قابلِ قدر ہے۔ حجم ۴۸ صفحات قیمت دو آنے۔

صاحبانِ قلم کیلئے زرّیں موقع

"چاند" اُردو۔ قیمت سالانہ آٹھ روپیہ
ششماہی پانچ روپیہ۔ فی جلد ایک روپیہ

چاند میں اشتہار دینا کلید کامیابی ہے
مینجر اُردو "چاند" چندر لوک الہ آباد

اس کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے

ہزاروں روپے کے انعام

تمام ہندوستان کے مشہور اہلِ قلم "چاند" میں اپنے اپنے مضامین بھیج رہے ہیں آپ بھی جلد روانہ فرمایئے یہ تو معلوم ہی ہے کہ چاند جس آب و تاب سے شائع ہوتا ہے ویسا اردو میں کوئی دوسرا رسالہ نہیں ہے اسی لئے تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی اشاعت ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ہو گئی ہے اور مشہور اہلِ قلم اپنے مضامین چاند میں بھیجنا ضروری سمجھتے ہیں۔ چاند ایک ماہواری علمی، ادبی، اخلاقی، معاشرتی رسالہ ہے۔ اس میں مختلف قسم کی عمدہ سے عمدہ تصاویر بھی شائع ہوتے ہیں۔ تصاویر کا مجموعہ کیا ہے گویا ایک مصور کا البم ہے۔ چاند سال میں کئی مرتبہ "خاص نمبر" کی حیثیت سے شائع ہوگا۔ حال ہی میں اس کا اسپیشل نمبر شائع ہونیوالا ہے۔ اس کے لئے جلد از جلد مضامین بھیجے جاویں۔ مضمون نگاران کیلئے اچھا موقع ہے ان کو اختیار ہے کہ جس "سبجکٹ" پر چاہیں مضمون لکھیں اس شخص کو جس کا سب سے اچھا مضمون ہوگا انعام دیا جاویگا۔ تین انعام ہوں گے :۔

(۱) مضمون (نثر) (۲) افسانہ (۳) نظم۔ ہر ایک مصنف کو بایہ مضمون کے اعتبار سے سو روپیئے تک کا نقد انعام دیا جاویگا +

اس کے علاوہ

سال بھر تک جن اصحاب کے سب سے اچھے مضامین (نثر ہو یا نظم) چاند میں شائع ہوں گے انکو بھی بہترین مضمین پر انعام دیا جاویگا۔ اس میں بھی تین انعام ہونگے (۱) مضمون نثر (۲) افسانہ (۳) نظم۔ سو روپے تک کا انعام اس میں بھی ہوگا۔ مضامین، افسانے، اور نظمیں ان شرائط کی پابندی سے لکھے جاویں +

(۱) مضامین علمی، ادبی، اخلاقی، معاشرتی، طبی، تاریخی یا تحقیقی ہوں۔

(۲) افسانوں میں کوئی خاص جدت ہو۔

(۳) نظم کسی خاص مضمون پر ہو، قواعد عروضی و زبان کی غلطیاں نہ ہوں۔

(۴) سب مضامین صاف و شستہ زبان میں لکھی جاویں اردوئے لطیف یا دقیق اُردو نہ ہو۔

(۵) مضامین غیر مطبوعہ اور نئی طرز کے ہوں +

(۶) جتنے مضامین ہوں نظم ہوں یا نثر یا افسانے انکو مضمون نگار پھر کسی دوسرے پرچے میں بھیجنے کا مجاز نہ ہوگا۔ جملہ حقوق کا مختار ایڈیٹر ہو جائیگا مضمون نگار کا کوئی حق باقی نہ ہوگا

(۷) مضمون زیادہ طویل نہ ہوں حشو و زوائد سے پاک ہوں +

(۸) اگر کوئی مضمون نگار چاہے تو ایک سے زائد بھی مضمون افسانہ یا نظم بھیج سکتا ہے

(۹) ایڈیٹر کا فیصلہ آخری ہوگا جو کسیطرح مسترد نہ ہو سکیگا اور وہ فیصلہ قانوناً قابل تسلیم ہوگا

(۱۰) اسپیشل نمبر کیلئے ۳۱ اگست تک تمام مضامین نظم و نثر و افسانے آجانا چاہئیں دیگر مضامین ماہ بماہ آتے رہیں گے +

(۱۱) وہ مضامین جن کو مقابلہ میں انعام نہ دیا جا سکیگا۔ اگر وہ پسند آویں گے۔ تو چاند میں شائع کر دیئے جائیں گے۔ لیکن وہ مضامین جو چاند میں نہ شائع ہو سکیں گے وہ اسی شرط پر واپس ہو سکتے ہیں۔ کہ مضمون نگار حضرات اپنا پتہ صاف لکھیں اور واپسی کے لئے مہر کے ٹکٹ روانہ کریں +

(۱۲) ہر مضمون نگار کو چاند کا خریدار فرمانا ضروری ہے۔

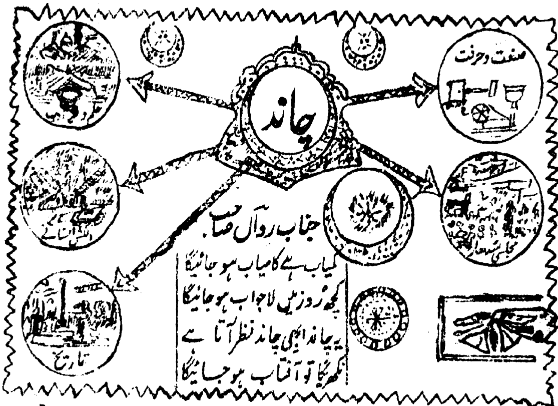
جملہ مضامین وغیرہ حسب ذیل پتہ پر بھیجنے چاہئیں +

منشی کنھیالال ایڈیٹر "چاند" الہ آباد ٹیلیفون نمبر ۲۰۵

تار کا پتہ "چاند"







اصلاح، ادب، علمی فوائد، صنعت وحرفت پندونصیحت، نتیجہ خیزافسانے، اصلاح نیک اترقی کی راہیں، اتحاد کے ترانے اور اتفاق کے درس دیکھنا اور سننا چاہیں تو "چاند" الہ آباد کو دیکھیں۔ اخبار ورسائل کی دنیا میں اس رسالہ کی دھوم مچگئی ہے ہندی چاند پندرہ ہزار اور اردو چاند پانچ ہزار چھپتا ہے اردو چاند ابھی ابتدائی دور میں ہے پبلک اس کی گرویدہ ہورہی ہے اور مانگ بڑھتی جاتی ہے۔ اگر ہمدردان ملک و قوم کو اسطرف توجہ ہوئی تو یقیناً اس کی روشنی سے تمام ملک جگمگا اٹھیگا۔ اور اردو چاند بھی بیسیوں ہزار کی تعداد میں نکلنے لگیگا۔ عمدہ کاغذ، صاف ستھری اعلیٰ درجہ کی چھپائی، تصویروں کی کثرت اور ضخامت میں کوئی رسالہ اس کی برابری نہیں کرسکتا۔ زمانہ کی سچی خدمت اس کا اعلیٰ مقصد، اور اصلاح ودرستی پاکیزہ مدعا ہے۔

ایڈیٹر منشی کنھیا لال ایم، اے، ایل، ایل، بی، ایڈوکیٹ

چندہ سالانہ آٹھ روپیہ

ششماہی پانچ روپیہ

فی جلد ایک روپیہ

کاپی نمونہ بلا قیمت نہ اجرا ہوگی۔

نام نامی بلا توقف مندرج فہرست خریداران کرالیجئے۔

"چاند" (اردو) میں اشتہارات دینا کامیابی کا وسیلہ ہے معقول ہے مفصل کیفیت منیجر دفتر "چاند" (اردو) ایڈیشن چندر لوک الہ آباد سے دریافت کیجئے ٹیلیفون ۱۶۳ تار کا پتہ: "چاند"

خاص نوٹ:- مضامین نظم ونثر اور دیگر ایڈیٹوریل مضامین کی بابت مراسلت بنام ایڈیٹر "چاند" (اردو) ہونا چاہیئے +









جدید فہرست کارخانہ مفت طلب فرمائیے؛

طبقۂ نسواں میں اس کارخانہ کا عطر سہاگ اور عطر عروس نہایت مقبول ہے؛

اعلیٰ طبقہ کی خواتین سر میں لگانے کیلئے اس کارخانہ کا تیار کردہ بانو ہیئر آئیل استعمال کرتی ہیں؛

قواعد

۱- "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲- علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پُورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳- دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴- ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵- خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶- ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور ساڑھے نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷- رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتہً بھیجا جائے گا۔

۸- جواب طلب امور کے لئے ۱ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیئے۔

۹- قیمت سالانہ پانچ روپے، ششماہی تین روپے (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ر نمونہ ۶ر۔

۱۰- منی آرڈر کرتے وقت کُوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجیئے۔

۱۱- خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۳- لارنس روڈ لاہور

سید عبد اللطیف مینیجر رسالہ ہمایوں نے مسلم پرنٹنگ پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

موصولہ ۲۹ [illegible] (پنجشنبہ)

(ی۔ ت)

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۶۲

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگار علامہ فضیلت مآب آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہُمایُوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: منصور احمد

فہرست مضامین

جلد ۱۸ — نمبر ۳

بابت ماہِ ستمبر ۱۹۳۰ء

تصویر — دن بھر کی تابش کے بعد — قاہرہ کے قریب

جہاں نما

سویڈن میں "نئی تعلیم"

یورپ کے دوسرے تمام ممالک کی طرح سویڈن میں بھی مکتب کا مطمحِ نظر علم و فضل کی ترویج اور بچوں کے لئے ایک حقیقی دماغی غذا کی بہم رسانی رہا ہے اور ہے۔ لیکن آج کل سویڈن کا نظامِ تعلیم تمام یورپ میں اول درجہ پر مانا جاتا ہے۔ مدرسوں اور دوسرے تعلیمی اداروں کی عمارتیں نہایت شاندار ہیں۔ تعلیم پر ہر سال بے اندازہ روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ استادوں کا عملہ بے نظیر، روشن خیال، ایثار کرنے والا اور فرض شناس تسلیم کیا گیا ہے۔ ورزشی کرتبوں اور کھیلوں میں یہاں کے طلبا دنیا بھر میں شہرت رکھتے ہیں۔ سات اور پندرہ سال کی عمر کے درمیان تعلیم ہر شخص کے لئے لازمی ہے۔ تعلیم سب کے لئے مفت ہے، اور بڑی حد تک طبی امداد، غسل (جس کے ساتھ تیرنے کی تعلیم بھی ہے) مدرسے کی ضروریات، پہننے کے کپڑے اور غذا بھی مفت بہم پہنچائی جاتی ہے۔ اور وہ دن دُور نہیں جب اس ملک میں کوئی شخص محض غربت کی وجہ سے تعلیم حاصل کرنے سے محروم نہیں رہے گا۔ تعلیمی تنوع اور عمدگی میں غالباً کوئی یورپی ملک سویڈن سے بڑھا ہوا نہیں ہے۔

یورپ میں اب ایک نئی تعلیمی روح پیدا ہو رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی ابتدا جنگِ عظیم سے پہلے ہو گئی تھی، لیکن اسے ترقی جنگ کے بعد ہی نصیب ہوئی۔ حکومت کی اُن کوششوں کے خلاف جو شخصیتوں کو مٹا دیتی ہیں اس کا کام بچوں میں انفرادی سیرت کو ابھارنا ہے۔ بجائے خود غرضانہ ترقی کی خواہش کے اور فوق الانسان بننے کے ارادے کے اس کا مقصد معاشرتی ہمدردی اور باہمی امداد ہے۔ بخلاف فوق الانسانیت کے اس کی خواہش انسانیت ہے۔ بجائے جنگ کی تاریخ کے یہ تہذیب و تمدن کی تاریخ چاہتی ہے۔ غرض یہ ایک ایسی تحریک ہے جو ترقی کر کے دنیا کی اہم ترین تحریک ہوا چاہتی ہے، جس کے مطالبات طریقِ تعلیم کے معاملہ میں جدید ہونگے جس کے مدِنظر "جدید تعلیم" ہوگی جو ایک "دورِ جدید" کا پیش خیمہ ہوگی۔

بندہ و آقا کے درمیان، مرد اور عورت کے درمیان، اونچے اور نیچے طبقوں کے درمیان، بوڑھوں اور جوانوں کے درمیان، اکثریتوں اور اقلیتوں کے درمیان، اعلیٰ اور ادنیٰ نسلوں کے درمیان، مشرق اور مغرب کے درمیان،

انسان اور فطرت کے درمیان جتنے اختلافات ہیں فنیلن کے اس فلسفے کے آگے ہیچ ہو جاتے ہیں کہ "مجھے اپنے خاندان سے محبت ہے، مگر اپنے وطن کی محبت مجھے اس سے زیادہ ہے، مجھے اپنے وطن سے محبت ہے مگر نوعِ انسان کی محبت مجھے اس سے زیادہ ہے۔

اُس "نئی تعلیم" کو مدِنظر رکھ کر جس کا ذکر اوپر ہوا ۱۹۲۷ء میں "سلجن باغ" کے مدرسے کے قیام سے ایک حقیر سی کوشش عمل میں لائی گئی۔ بانیاں مدرسہ کہتے ہیں کہ "اُس تھوڑے سے سرمائے سے جو ہمارے پاس تھا ایک ایسے مدرسے کی بنا رکھنا جس کے مقاصد رائج الوقت تعلیمی اصول سے اس قدر متبائن و متناقض واقع ہوئے ہوں ایک بے حد مشکل اور خطرناک کام معلوم ہوتا تھا۔ سویڈن میں جہاں اُس وقت حکومت کے طریقِ تعلیم کو نہایت شد و مد سے رواج دیا جا رہا تھا جہالت اور بے اعتمادی کی وجہ سے بیسیوں مشکلات نظر آ رہی تھیں"

"سلجن باغ" کا مدرسہ سویڈن کے حسین ترین اضلاع میں سے ایک (ڈیلارنا) کے وسط میں دیہات کے قدیم تہذیب و تمدن کے درمیان، سلجن جھیل کے کنارے پر اور سٹاک ہالم کے شمال مغرب میں کوئی تین سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ مکانات پرانی طرز میں لکڑی کے بنے ہوئے ہیں۔ ان کا منظر نہایت دلکش ہے اور حوالیات سے انہیں پوری مناسبت معلوم ہوتی ہے۔ شکل اور رنگ کے لحاظ سے ان کی اندرونی آرائش ایسے عجیب انداز سے کی گئی ہے جو یکسر فرحت بخش اور خیال انگیز ہے۔ اندر اور باہر ہر جگہ بچوں کے لئے خوبصورت اور روح افزا مناظر موجود ہیں۔ یہ ایسے حالات ہیں جن کی اہمیت صرف اُن لوگوں پر عیاں ہے جنھوں نے موجودہ نفسیاتِ تعلیم کو سمجھ لیا ہے۔ مدرسے کی حقیقی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک گھر معلوم ہوتا ہے جہاں شوہر اور بیوی رہتے ہوں اور بچوں کے لئے اور بچوں کے ساتھ مل کر کام کرتے ہوں۔

گودا لگانے کی حکمت

"مدراس میل" کے ایک مضمون میں بیان کیا گیا ہے کہ بدن کے گودنے میں جس کا التزام قدیم اقوام اب تک کرتی ہیں بڑی حکمت پوشیدہ ہونے کا امکان ہے یعنی ممکن ہے کہ اس میں صحت بخش اثرات موجود ہوں۔ مسٹر الگزینڈر کیبلر جو فوک لور سوسائٹی" کے ایک رکن ہیں لکھتے ہیں" لوگوں کا خیال ہے کہ بدن گودنے سے بدروحیں دور رہتی ہیں اور چونکہ بدروحیں ہی تمام بیماریوں کی وجہ قرار دی جاتی ہیں اس لئے ہم اس دستور میں ادویات کے اثر کا امکان تصور کر سکتے ہیں"

گودنے کا دستور نہ صرف قدیم اقوام میں عام ہے بلکہ ہندوستان کی بعض خاندانی ہندو خواتین میں بھی پایا جاتا ہے۔ رام کرشن صاحب کی کتاب "ہندوستان کی دیہاتی زندگی" میں ہمیں اس کے متعلق مندرجہ ذیل تصریحات ملتی ہیں:-

پونی اُس کوراٹھی عورت کا نام ہے جو گاؤں گاؤں چٹائیاں اور ٹوکریاں بیچتی پھرتی ہے اور چونکہ وہ گودنا بھی جانتی ہے اس لئے اکثر ہم اُسے دو دو چار چار پیسے پر اپنی خدمات پیش کرتے دیکھتے ہیں۔ ہندو عورتیں اپنے بدن چھدنے کی بڑی شائق ہیں۔ اسی وجہ سے پونی کی تجارت خوب چلتی ہے۔ پونی اُس جگہ پر جو اسے گودنے کے لئے پیش کی جاتی ہے پہلے بچھو یا سانپ کا خاکا بناتی ہے۔ پھر کچھ سوئیاں لے کر انہیں ایک عرق میں ڈبوتی ہے جو اس کے پاس تیار موجود ہوتا ہے، اور اس کے بعد اُن سے گوشت کو بڑی بے رحمی سے چھیدتی ہے۔ چند دن کے بعد تصویر سبز رنگ میں نمودار ہو جاتی ہے۔ یہ ہندوؤں کے نزدیک ایک حسن سمجھا جاتا ہے۔ گدائی کے شدید عمل کے دوران میں پونی گیت گاتی جاتی ہے تاکہ درد کا خیال بھولا رہے۔ اُس کے ایک گیت کا ترجمہ یہ ہے:-

"ٹھیر میری جان، ٹھیر! یہ گھڑی دو گھڑی بات ہے،
اور پھر تو سب حسینوں سے زیادہ حسین ہوگی۔
تیری کنول کی سی آنکھیں وحشی درندوں کو بھی رام کر لینے والی ہیں،
تیرے ہونٹ نئے نئے کھلے ہوئے گلاب کی پنکھڑیاں ہیں، اور
تیرے دانت چمکنے والے موتی ہیں،
مگر جو کچھ میں بنا رہی ہوں اُس کے آگے اِن سب کی کیا حقیقت ہے؟"

لوگوں کا خیال ہے کہ طاعون اور چیچک کے ٹیکے کی طرح یہ بھی کسی نہ کسی بیماری کا علاج ہے۔ یہ امر تحقیقات طلب ہے اور اگر تحقیقات کی جائے تو ممکن ہے اس سے کوئی مفید نتیجہ برآمد ہو۔ ہندوستان میں توہم اور مذہب پہلو بہ پہلو چلتے ہیں اور مذہب اور سائنس کا آپس میں گہرا رشتہ ہے۔ جدید خیال کے لوگوں کو جو ہر ناقابل تشریح بات کو توہم سے تعبیر کرنے کے خوگر ہیں یہ سب کچھ وہم معلوم ہوتا ہوگا، لیکن ان "اوہام" میں بہت سی باتیں ایسی ہیں کہ اگر ہم ان کی تحقیقات کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ اوہام نہیں ہیں، اور ان کو مذہبی عقاید میں اس لئے جگہ ملی ہے کہ سائنس اور مذہب میں ایک کامل اتحاد قائم ہو جائے۔

مشیّت

فطرتِ عشق کو غمناک بنانا چاہا | تجھ سے اے داغِ ہوس پاک بنانا چاہا

تو نے اے شمع جلایا نہیں پروانے کو | حُسن نے عشق کو بے باک بنانا چاہا

تھا پریشانیٔ عالم کا مُرقّع منظور | یہ جو میرا دل صد چاک بنانا چاہا

تو نے اکسیر بنایا تھا مگر قسمت نے | مجھ کو مُشتِ خس و خاشاک بنانا چاہا

ہمہ تن پیکرِ ناکامیٔ فطرت ہوں میں | کیا بنایا ہے مجھے، خاک بنانا چاہا

اُس کی ہر بات کو اک ظُلمِ مجسّم جانا | عقل نے نفس کو سفّاک بنانا چاہا

ہم ہیں اور سینکڑوں مجروح تمنّائیں ہیں
دِل کو تقدیر نے فتراک بنانا چاہا

حامد علی خاںؔ

آنکھوں پر بہاری کے دوہے

مہا کوی بہاری کا مرتبہ ہندی شاعری میں بہت بلند ہے خصوصاً عشقیہ شاعری میں تو وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان کا کلام مشکل ہوتا ہے۔ تلاش الفاظ اور ترکیب کی روش میں ان کا رنگ کچھ کچھ غالب اور مومن سے ملتا ہے۔ سلاست اور روانی بھی اُن کے کلام میں نمایاں نظر آتی ہے۔ خوبصورت آنکھوں پر ہمارے متقدمین و متاخرین اردو شعرا نے خوب طبع آزمائیاں کی ہیں۔ اسی موضوع پر آج میں بہاری کا کلام بھی پیش کرتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیے بھاشا کے اس باکمال شاعر نے اس زمین میں کیا کیا گل کھلائے ہیں۔

سایْنک سم ما یک نین رنگے تر ودھ رنگ گات   جھکھ دیکھ در جات جل لکھ جل جات لجات

سایْنک (شام) جھکھ (مچھلی) جل جات (کنول)

مطلب ۔ اس کی آنکھیں شام کی طرح ہیں اور تین رنگ میں رنگی ہوئی ہیں (اسی وجہ سے) ان کو دیکھ کر کنول شرما جاتا ہے اور مچھلیاں پانی میں چھپ جاتی ہیں (یہاں پر آنکھوں کو شام سے تشبیہ دی ہے مشہور ہے کہ شام ہوتے ہی مچھلیاں پانی میں چھپ جاتی ہیں اور کنول اپنا منہ بند کر لیتا ہے۔)

سنگت دوش لگے سبے کہے جو سونچ بین   کُٹل بنک بھر سنگ تے بھئے کُٹل گت نین

کُٹل (شریر۔ کپٹی) بنک (ٹیڑھی) بھُر (بھوں۔ ابرو)

مطلب ۔ لوگوں نے جو کہا ہے کہ صحبت کا اثر ضرور ہوتا ہے وہ سچ ہے (دیکھو نا) شریر کمانِ ابرو کی صحبت سے آنکھیں بھی ترچھی چال والی ہوگئی ہیں۔

برجات سرمین کے ایسے دیکھے مَیں   ہرنی کے نیناں توں ہری نیکے یہ نیں

مطلب ۔ اس کی آنکھیں تو مرگ نینوں سے بھی اچھی ہیں۔ انھوں نے تو مدن (عشق کے دیوتا) کے تیروں پر بھی زبردست فتح پائی ہے۔ مَیں نے تو ایسی آنکھیں کبھی نہیں دیکھیں۔

نیچی یے نیچی نپٹ ڈیٹھ کو ہی لون دور   اٹھ اونچے نیچے دیو من کلنگ جھکور

کوہی (ایک قسم کا چھوٹا باز۔ یہ جب کسی چڑیا کا شکار کرتا ہے تو پہلے کچھ دیر تک اُس کے پیچھے نیچے

اُڑا کرتا ہے اور پھر یکایک اوپر اُٹھ کر اس پر ٹوٹ پڑتا ہے پھر اس کو جھنجھوڑ کر، تاکہ بے دم ہو جائے زمین پر جھپٹ کر اُتر جاتا ہے۔ معشوق کی نیچی نگاہوں کو بہاری ستئے کو ہیٔ سے تشبیہ دی ہے (کلنگ (ایک قسم کی چھوٹی چڑیا۔ بھنگ)

مطلب۔ معشوق کی نیچی نظروں نے "سکوہی" کی طرح نیچے ہی نیچے دوڑ کر پھر (یکبارگی) اُوپر اُٹھ کر میرے من کلنگ (دل کی چڑیا) کو جھکجور (جھنجھوڑ) ڈالا (پہلے تو اس نے نیچی نظروں سے مجھے دھوکا دیا اور پھر یکبارگی آنکھیں ملا کر میرا دل چھین لیا)

نے کِت کمینتی پڑھی بن جہ بھون کمان ــــ چل چِت بے جھو چوکت نا نہ بنک بلوکن بان

کمینتی (تیر اندازی) جہ (زہ۔ چلّہ) بے جھو (بے جھا۔ نشانہ)

مطلب۔ اے سندری تو نے ایسی تیر اندازی کہاں سے سیکھی ہے کہ بغیر چلّے کی کمان (ابرو) سے ترچھی چتون کے (ایسے) تیر چلاتی ہے کہ اُس کا نشانہ ٹھیک دل پر پڑتا ہے"

اس دوہے میں یہ خوبصورتی ہے کہ اگرچہ بغیر چلّے کی کمان کام نہیں دیتی لیکن وہ بغیر چلّے ہی کے اپنے کمانِ ابرو سے کام نکال لیتی ہے۔ ترچھے تیر ٹھیک مقام پر نہیں پہنچتے لیکن اس کی ترچھی چتون کا نشانہ خطا نہیں کرتا۔ چنچل اور بے قرار چیز پر ٹھیک نشانہ نہیں لگتا لیکن اُس کی ترچھی چتون دنیا بھر میں سب سے زیادہ بیتاب اور چنچل دل کو بھی بیدھ لیتی ہے۔

نینا نیک نہ مانہیں۔ کتو کہو سمجھائے ــــ تن من ہاریں ہوں نہیں تن سوں کہا بسائے

مطلب (ایک لڑکی اپنے محبوب کو دیکھ کر مسکراتی ہے۔ اس پر اس کی سکھی کہتی ہے کہ مرد کو دیکھ کر تجھے مسکرانا نہیں چاہئے۔ اس پر برہ کی ماری جواب دیتی ہے) ــــ "میں نے اُن سے کتنا سمجھا سمجھا کر کہا (لیکن) آنکھیں (میرا کہنا بالکل) نہیں مانتیں (بھلا جو) تن من ہارنے پر بھی ہنستی رہتی ہیں اُن پر کیا زور چل سکتا ہے"

(اگر کوئی کچّا جواری ہوتا ہے تو ہارنے پر وہ گھبرا جاتا ہے اور اپنے دوستوں کے کہنے پر وہ جوا کھیلنا چھوڑ دیتا ہے لیکن جو پکّے جواری ہوتے ہیں وہ خوب ہار کر بھی جوا کھیلنے سے باز نہیں آتے ایسے۔ پکّے جواریوں کو کچھ سمجھانا بے کار ہے)

درگن لگت بیدھت ہیا ہیں بکل کرت رنگ آن ــــ اے تیرے سب تیں بشیم ایچھن تیچھن بان

ایچھن تیچھن (بانکے ترچھے)

مطلب (سکھی کہتی ہے) اے پیاری یہ تیرے ترچھی نگاہوں کے تیر سب (تیروں) سے زیادہ تیز ہیں (کیونکہ) لگتے تو یہ آنکھوں میں ہیں پر چھیدتے ہیں دل کو اور بے چین کرتے ہیں سارے جسم کو۔

چھپات چھبیل نین بیچ گھونگھٹ پٹ جھین — مانہو سُرسریتا بل جل اچھرت جگ مین

جھین (باریک۔ مہین) سرسریتا (دیوتاؤں کی ندی بمعنی گنگا)

مطلب۔ مہین گھونگھٹ کے اندر اُس کی چنچل آنکھیں اس طرح چمک رہی ہیں جیسے گنگا کے شفاف پانی میں دو مچھلیاں اُچھل رہی ہوں۔

جو جگت سیکھے سبے مانو مہامنی بین — چاہت پیا ادھنتا کانن سیوں نین

مہامنی (بڑے پنڈت۔ کامدیو)

مطلب۔ گویا کام دیو نے اُسے ریاضت کی سب ترکیبیں سکھا دی ہیں۔ اپنے پریتم سے ہمیشہ ملے رہنے کی خواہش سے (اس سندری کی) آنکھیں کانوں تک پہنچ گئی ہیں" (آنکھیں بڑی ہوگئی ہیں) مندرجہ بالا لفظی ترجمہ کا مطلب سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل تشریح پر غور کیجئے۔

جب کوئی جوگی بن میں جا کر تپسیا کرتا ہے تو اس سے اس کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ پرماتما اس سے خوش ہو تا کہ ایشوری ملاپ ہو۔ اس اصول کو پیشِ نظر رکھ کر بہاری نے یہ دوہا کہا ہے جس میں اُس نے آنکھوں کو جوگی سے اور کانوں کو بن سے (بھاشا میں کانن بمعنی بن بھی مستعمل ہے) تشبیہ دی ہے اور کہتا ہے کہ یہ ریاضت کش جوگنیں (آنکھیں) جو بن میں پہنچ رہی ہیں یعنی جن کو نشۂ شباب نے بہت بڑھا دیا ہے اُن کی بڑائی کو دیکھ کر پریتم ضرور مسرور ہوگا اور پریم ملاپ ہو جائے گا۔ اس کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ ایک جوانی پر آئی ہوئی سندری کی بڑی بڑی آنکھوں کو دیکھ کر اس کی سکھی کہتی ہے کہ بس اب تو نے پالا مار لیا۔ تیرا پریتم ان آنکھوں کو دیکھ کر تیرے قابو میں آ جائے گا۔ بہاری نے مبالغہ کو تشبیہ اور استعارہ کے دامن میں ایسا چھپایا ہے کہ مبالغہ کا گمان ہی نہیں ہوتا۔

کبت سبے کب کمل سے مومت نین پکھان — نتر کو کت ان بے لگت اپجت برہ کرشان

نتر کو (نہیں تو) بے (دونوں) کت (کیوں) پکھان (پشان۔ پتھر) کرشان (آگ)

مطلب۔ بہاری کہتے ہیں کہ "سب شاعر (آنکھوں کو) کنول سے تشبیہ دیتے ہیں لیکن میرے خیال میں تو یہ (آنکھیں) پتھر ہیں، نہیں تو دوسری (آنکھیں جب ان سے) ملتی ہیں تو (ان کی رگڑ سے) برہ کی آگ کیوں پیدا ہوتی ہے۔

جھوٹے جان نہ سنگرہے من منہ نکے بین　　　　باہی سنے مانو کئے بانن کو بدھ نین

جھوٹے (جھوٹ - منہ سے اگلی ہوئی چیز کو جھوٹا کہا جاتا ہے - اسی معنی میں یہاں بہاری نے منہ سے نکلی ہوئی بات کو "جھوٹا" کہا ہے) نہ سنگرہے (ناقابلِ اعتبار)

مطلب - چونکہ منہ سے نکلی ہوئی باتوں کو جھوٹا سمجھ کر کوئی یقین نہ کرتا، اسی لئے برہما (پروردگارِ عالم) نے (دیکھی) باتیں کرنے کے لئے آنکھیں بنائی ہیں - (زبان دھوکا دے سکتی ہے لیکن دل میں جو کچھ ہوتا ہے وہ آنکھوں کے ذریعہ سے معلوم ہو جاتا ہے - آنکھیں دل کی تابع ہوتی ہیں - اُن کے اشارے کنائے کبھی جھوٹے ثابت نہیں ہوتے)۔

پھر پھر دوست دیکھت نچلے نیک رہین　　　　بے کجرارے کون پے کرت کجاکی نین

کجرارے (کاجل لگے ہوئے - یہ لفظ بہاری نے اس وجہ سے استعمال کیا ہے کہ قزاقوں کی پوشاک عموماً کالی ہوتی ہے) - کجاکی (قزاقی)

مطلب - (ایک عورت اپنے پریتم کے انتظار میں جھروکے میں بیٹھی ہوئی چاروں طرف نظریں دوڑا رہی ہے - اس کی سکھی گو اصلیت سے واقف ہے پھر بھی مذاق میں اُس کی آنکھوں کو ڈاکو بنا کر کہتی ہے کہ تیری یہ چنچل آنکھیں) بار بار اِدھر اُدھر دوڑتی پھرتی ہی رہتی ہیں - ان سے نچلا بیٹھا ہی نہیں جاتا (آخر بتا تو سہی یہ) "کجرارے" (کاجل سے رنگے ہوئے - سیاہ پوش) نینا (اب) کس پر ڈاکا ڈالنے والے ہیں (کیونکہ اپنے پریتم کے دل کو تو تو پہلے ہی لوٹ چکی ہے)

کہت، نٹت، ریجھت، کھجت، ملت، کھلت، لجیات　　　　بھرے بھون میں کرت ہیں نین ہی سے بات

مطلب - (ایک ایسے مقام پر نایک (عاشق) اور نایکہ (معشوقہ) موجود ہیں جہاں پر ان کے بزرگوں کا مجمع ہے۔ وہاں وہ دونوں خاموش بیٹھے ہیں لیکن آنکھوں ہی آنکھوں میں دل کا اظہار ہو رہا ہے - اس کا نقشہ بہاری یوں کھینچتے ہیں) (عاشق کچھ) کہتا ہے (اِس پر معشوقہ آنکھوں کے اشارہ سے) 'نہیں' کرتی ہے - (اس 'نہیں' کی ادا پر عاشق) فریفتہ ہو جاتا ہے (تب معشوقہ اُس کی فریفتگی پر بناوٹ سے) چیں بجبیں (ہوتی ہے) (پھر دونوں میں) 'ملاپ' ہو جاتا ہے (عاشق معشوقہ کے مصنوعی غصّہ پر جو اس قدر جلد دُور ہو گیا) ہنس دیتا ہے (اور معشوقہ اُس کے ہنسنے پر شرما جاتی ہے) ایک بڑے مجمع میں (یہ دونوں عاشق و معشوق اسی طرح) آنکھوں ہی آنکھوں میں (دل کی سب) باتیں کر لیتے ہیں۔

ڈیٹھ برت باندھی اٹن - چڑھ دھاوت نہ ڈرات
اِت اُت تے چِت دہن کے نٹ لوں آوت جات

برت (رسی) - اٹین (اٹاریوں پر - کوٹھوں پر) -

مطلب - (نایک اور نایکہ اپنی اپنی اٹاریوں پر کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں اور تارِ نظر پر دونوں کے دل آجا رہے ہیں - اس تارِ نظر کو "نٹ (بازیگر) کی رسی" سے تشبیہ دے کر بہاری کہتے ہیں کہ) "(دونوں نے اپنی اپنی) اٹاری سے (دوسرے کی اٹاری تک) نظر کی رسی باندھ رکھی ہے (اس پر) چڑھ کر دونوں کے دل دوڑنے میں ڈرتے نہیں (اور) نٹ کی طرح اِدھر اُدھر جاتے آتے ہیں"

جُرے دہُن کے دِرگ جھماک رُکے نہ جھینے چیر ہلکی فوج ہرول جیوں پرت گول پہ بھیر

جھماک (جھم سے - پھرتی سے - فوراً) - جُرے (مل گئے) - ہرول (ہراول - فوج کا وہ چھوٹا حصہ جو فوج کے آگے آگے چلتا ہے) گول (غول - جھنڈ یہاں اس کا مطلب خاص فوج سے ہے جہاں سالارِ جنگ رہتا ہے)

مطلب - (نایک کو دیکھ کر نایکہ نے گھونگٹ کاڑھ لیا - لیکن مہین گھونگٹ کی وجہ سے نایک کی آنکھیں نایکہ کی آنکھوں سے مل گئیں اور تیرِ نظر چلنے لگے، اسی کا نظارہ بہاری یوں دکھاتے ہیں) "دونوں کی آنکھیں فوراً لڑ گئیں - مہین گھونگٹ سے رُک نہ سکیں جس طرح ہراول کی فوج ہلکی (ہونے سے) خاص فوج پر (قلب میں) لڑائی کا بار آپڑتا ہے -

معشوق کی آنکھوں کو "قلبِ لشکر" اور "گھونگٹ" کو "ہراول" بطورِ استعارہ استعمال کیا گیا ہے -

لگت کُٹِل کٹاچھ سر کیوں نہ ہوہیں بے حال کرٹ بت جو بیو دُسار کری تیو ربیت نٹ سال

کٹاچھ (ترچھی نظریں - گھائل کرنے والی نظریں) دُسار (دو ٹکڑے، آرپار کرنے والا) نٹ سال (تیر کا وہ حصہ جو ٹوٹ کر بدن کے اندر رہ جاتا ہے اور درد پیدا کرتا ہے)

مطلب - تیری ترچھی نظروں کے تیر لگنے سے عاشق کیوں نہ تڑپے؟ ترچھے تیر گو جگر کے پار ہو جاتے ہیں پھر بھی ان کی کسک باقی رہتی ہے -

نین تُرنگم الک چھب چھری لگی جیہ آئے تہ چڑھ من چنچل بھئے مت دینی بسراتے

تُرنگم (سمند، گھوڑا) الک چھب (رخ پر پڑی ہوئی زلف کی خوبصورتی)

مطلب - ایسے نین روپی گھوڑے (آنکھیں) پر جس پر زلف کی چھڑیوں کی مار پڑ رہی تھی سوار ہو کر میرا من

چنچل ہوگیا اور سُدھ بُدھ بُھول گئی (محبوب کی شوخ اور چنچل آنکھوں کو دیکھ کر میں اپنی سُدھ بُدھ بھُول گئی) بہت لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بہاری کا دوہا نہیں ہے۔ چنانچہ ہندی کے مشہور ادیب اور نقاد جگن ناتھ داس "رتناکر" بی، اے کی "بہاری رتناکر" میں مجھے یہ دوہا نہیں ملا۔ میں نے یہ دوہا لالہ بھگوان دین کی "بہاری بودھنی" سے لیا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ کسی کی آنکھوں پر چڑھنا" کے محاورے سے بہاری نے آنکھوں کو گھوڑا بنایا ہے ایسی ترکیبیں بہاری کے سوا اور کسی ہندی شاعر میں نہیں ملتیں۔

ناوک سر سے لائے کے تلک ترن ان تاتک   پاوک جھر سے جھمک کے گئی جھروکہ جھانک

تلک (پل بھر۔ چشم زدن) پاوک جھر (آگ کی لپٹ) جھمک کے (جھم سے۔ جلوہ دکھا کر جلدی غائب ہوجانا) لائے کے (لگاکر۔ مارکر) ناوک سر (ایک ایسا تیر جو نلی کے اندر سے چلایا جاتا ہے یہ نلی لوہے کی ہوتی ہے اس میں کچھ بارود ڈال کر جب آگ دکھائی جاتی ہے تو تیر نکل کر بندوق کی گولی کی طرح چوٹ کرتا ہے) تانک (سوچ سمجھ کر، شست لگاکر)

مطلب۔ وہ جھروکے سے جھانک کر تھوڑی دیر میری طرف تاک کر اور مجھ پر تیرِ نظر پھینک کر جھم سے غائب ہوگئی۔

یہ دوہا بظاہر معمولی معلوم ہوتا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو بہاری نے تشبیہات اور استعارات سے اس دوہے میں جان ڈال دی ہے۔ جھروکے کو بہاری نے "نلی" رخ منور کی چمک کو "آگ کی لپٹ" عاشق پر نظر کی چوٹ کو "ناوک" اور معشوق کو "ناوک سر" کہا ہے۔ اس دوہے کا لفظی ترجمہ یوں ہوسکتا ہے کہ جس طرح ناوک سر شکار پر شست لگاکر ناوک کی نلی میں بارود ڈال کر پلک مارتے تیر چلاکر شکار کو زخمی کرتا ہے اسی طرح معشوق نے (ناوک سر) جھروکے کی نلی سے تیرِ نظر کو تاک کر مارا تو جس طرح رنجک اُڑنے میں کچھ روشنی ہوتی ہے اسی طرح معشوق کے رخ منور کی ایک چمک معلوم تو ہوئی مگر پھر غائب ہوگئی۔

پھوے پھدکات لے پھری پل کٹاچھ کروار   کرت بچاوت بے نین پایک گھائے ہزار

پھری (ڈھال) کروار (تلوار) بے (دونوں) پایک (پیدل سپاہی۔ پیادہ)

مطلب۔ (بڑے بوڑھوں میں نایک اور نایکہ بیٹھے ہوئے نظر کے تیر چلا رہے ہیں۔ آنکھوں کو پیادے سے پلک کو ڈھال سے اور ترچھی چتون کو تلوار سے تشبیہ دے کر ایک سکھی دوسری سکھی سے کہتی ہے) "دونوں کے نین روپی پیادے (آنکھیں) پلک کی ڈھال اور ترچھی چتون کی تلوار لئے ہوئے مسکرا مسکرا کر پینترے بدل بدل کر ہزاروں میں چوٹ کرتے ہیں اور بچاتے ہیں۔

کرے چاہ سوں چٹک کے کھرے اڑدن ہین نین　　　لاج نوائے نرپھرت کرت کھندی سی نین

کھرے اڑون ہین (خوب اڑنے والے) نرپھرت (تڑپتے) کھندی (گھوڑے کی وہ شوخی جس کی وجہ سے وہ ایک جگہ پر کھڑا نہیں ہوسکتا) چٹک کے (سن کی ایک گاؤدم رسی سے ایک چابک بنایا جاتا ہے اس کو "چٹکی" کہتے ہیں۔ گھوڑا نکالتے وقت جب گھوڑے کو "اڑان" (قدم چلنا) سکھایا جاتا ہے تب یہ چابک گھوڑے کے پیچھے تڑاخ تڑاخ بجایا جاتا ہے جس سے گھوڑا قدم چال چلنے لگتا ہے) کھندی کرنا (جب گھوڑا قدم چلنا چاہتا ہے لیکن سوار اس کو اس سے روکنا چاہتا ہے تو گھوڑا ایک جگہ ستھر ہوکر کھڑا نہیں رہتا اور شوخی کرتا ہے اسی کو "کھندی کرنا" کہتے ہیں۔ کھندی کرنا، کو گاؤں والے "... مارنا" "ٹاپ مارنا" بھی کہتے ہیں جب گھوڑے کو پھیرتے وقت چابک سوار اس کے چابک مارتا ہے تو وہ اوپر کو اٹھ جاتا ہے اور بھاگنا چاہتا ہے لیکن باگیں کھینچنے سے وہ بھاگ نہیں سکتا اور ٹاپ مارنے لگتا ہے)

مطلب (معشوقہ کی نشیلی آنکھیں اُوپر اُٹھ کر عاشق کو دیکھنا چاہتی ہیں لیکن شرم کے مارے پھر نیچی ہوجاتی ہیں۔ اُس کے اِس عالم کو گھوڑے کی کھندی (شوخی) سے تشبیہ دے کر بہاری کہتے ہیں)

"کام دیو نے (محبت کے دیوتا نے) تازیانۂ الفت سے اُس کی آنکھوں کو خُوب اڑنا سکھا دیا ہے لیکن لاج اور شرم کی لگام لگی رہنے سے تڑپ تڑپ کر وہ گھوڑیاں (آنکھیں) شوخیاں کرنے لگتی ہیں۔

دوہے میں آنکھوں کو ترنگ (گھوڑا گھوڑی) بہاری نے صاف لفظوں میں نہیں کہا ہے "چٹک کے" "کھندی" اور "اڑون ہیں" ہی سے "ترنگ" کا مطلب نکل آتا ہے۔

بادوں بل تنے درگن پے الی کھنجن مرگ مین　　　آدھی ڈیٹھ چتونی جن کتے لال ادھین

مطلب۔ میں بل جاؤں نبری ان آنکھوں پر بھونرا، خنجر، مرگ اور مچھلی ان آنکھوں پر نچھاور کردوں جن کی نیم بازی نے مجھے اپنے بس میں کرلیا۔

مین توں سوں کیا کیبو تو جن انہیں پتیائے　　　لگا لگی کری لوینی اُر میں لائی لائے

کیا (کتنی مرتبہ) پتیائے (اعتبار کر) لگا لگی (رگڑ۔ لاگ۔ ڈانٹ۔ یہاں پریم کی لگن سے مطلب ہے) لائی (لگائی) لائے (آگ)

مطلب۔ (محبت زدہ عورت سے اس کی سکھی کہتی ہے) میں نے تجھے کئی مرتبہ کہا کہ تو ان آنکھوں کا اعتبار نہ کر لیکن تو نے میرا کہنا نہ مانا دیکھ آخر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ (رگڑ تو کھائی آنکھوں نے کہ لڑیں تو آنکھیں) اور آگ لگی دل میں۔

ساجے موہن موہ کو موہی کرت کوچین　　　کہا کروں الٹا پرے ٹوٹے لونے نین

موہن (سری کرشن۔ عاشق) کو چین (تکلیف) ٹونا (جادو)

مطلب (اے سکھی میں نے آنکھوں میں کاجل (سری کرشن کو فریفتہ کرنے کے لئے لگایا تھا لیکن اسے اب) کیا کروں اس کا اثر متضاد ہوا میں تو خود فریفتہ ہوگئی (میری آنکھیں خود مجھ کو بے چین کر رہی ہیں) میری خوبصورت آنکھوں کا ٹونا مجھ پر ہی پڑ گیا۔

الی ان لوئن سرن کو کھرو بشم سنچار لگے لگائے آیا سے دہوا نی کرت سمار

مطلب (ایک لڑکی نے تیر نظر سے اپنے محبوب کو گھائل کر دیا اس پر اس کی سکھی کہتی ہے، واہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ تم آرام کرو اور وہ بیچارا تڑپے۔ اس پر وہ جواب دیتی ہے) اے سکھی (تو یہ نہ سمجھ کہ صرف وہی تڑپ رہا ہے میں بھی اس کی یاد میں تڑپ رہی ہوں) ان آنکھوں کے تیروں کی بڑی مار ہوتی ہے۔ دوسرے کی آنکھیں مجھ سے لڑیں یا میری آنکھیں دوسرے سے لگیں (دونوں صورت میں) نتیجہ ایک ہی ہوتا ہے (یعنی شکار اور شکاری دونوں زخمی ہوتے ہیں یہ صفت کسی اور شکار اور شکاری میں نہیں ہوتی)

لاج لگام نہ مان ہی نیناں موبس نا ہہ نہ منہ جور ترنگ لوں انیچیت ہو چلی جا نہہ

مطلب (اے سکھی) یہ میری آنکھیں شرم و لحاظ کی لگام کو نہیں مانتیں۔ یہ میرے قابو میں نہیں ہیں۔ یہ منہ زور گھوڑے کی طرح لگام کھینچے رہنے پر بھی جدھر چاہتی ہیں چلی جاتی ہیں" اسی قسم کا ایک دوہا اوپر آچکا ہے۔

لکھی لوئن لوینی کین کوئن ہوئی نہ آج کون گریب نواجیو کت تیٹھو رتراج

لوینی (آنکھیں) کوئن (آنکھ کی پتلی کے دونوں طرف جو سیاہ حصہ ہوتا ہے وہ آنکھوں کے کوئے کہلاتے ہیں) گریب نواج (غریب نواز) رتراج (کام دیو)

مطلب۔ (عورت کی آنکھوں میں کاجل لگا دیکھ کر اس کی سکھی کہتی ہے) آج تیری سرگین آنکھوں سے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کس غریب پر مہربانی ہونے والی ہے اور کس سے کام دیو خوش ہوا ہے۔

طوالت کے خوف سے اب مضمون کو ختم کرتا ہوں "آنکھوں" پر بہاری نے مندرجہ بالا دوہوں کے علاوہ اور بھی بہت سے دوہے کہے ہیں۔ بہاری کا حسن بیان، نازک خیالی اور جذبات کا اندازہ لگانے کے لئے اتنے ہی دوہے بہت کافی ہیں۔ ان دوہوں سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ بہاری نے فارسی اور عربی کے الفاظ بھی اپنے دوہوں میں استعمال کئے ہیں اور انہیں اس خوبصورتی سے نباہا ہے کہ کچھ برا نہیں معلوم ہوتا۔ میں نے حتی المقدور ترجمہ کو عام فہم اور سلیس بنانے کی کوشش کی ہے جو لوگ ترجمہ کی دقتوں سے واقف ہیں وہی میری ان مشکلات کا جو مجھے بہاری ایسے نازک خیال مشکل پسند شاعر کے کلام کا ترجمہ کرنے میں پیش آئی ہیں بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ بہاری نے خود ایک موقع پر کہا ہے کہ میرے دوہے ناوک کے تیر

منزلِ حیرت

بختِ بدیار کیوں ہے، کیا باعث | زندگی بار کیوں ہے، کیا باعث
سینہ کیوں خار خار پاتا ہوں | حالِ دل زار کیوں ہے، کیا باعث
دِل جگر کیوں فگار پاتا ہوں | آنکھ خونبار کیوں ہے، کیا باعث
یاس گھر دل میں کیوں بنا بیٹھی | آس بیزار کیوں ہے، کیا باعث
آہ تاثیر کیوں گنوا بیٹھی | نالہ بیکار کیوں ہے، کیا باعث
جستجو راس کیوں نہیں آتی | آرزو خوار کیوں ہے، کیا باعث
خوشدلی پاس کیوں نہیں آتی | غم کی بھرمار کیوں ہے، کیا باعث
بخت کی آنکھ کیوں نہیں کھلتی | فتنہ بیدار کیوں ہے، کیا باعث
مشکل آسان کیوں نہیں ہوتی | زیست دشوار کیوں ہے، کیا باعث
او لگاتار جبر کے خوگر! | صبر بے کار کیوں ہے، کیا باعث
کون واقف کہ دوست کے نزدیک | دوستی عار کیوں ہے، کیا باعث
کیا خبر، کوئی حرفِ حق کہہ کر | قابلِ دار کیوں ہے، کیا باعث
کیا پتا، یا دِیار کے ہوتے | بےکسی یار کیوں ہے، کیا باعث
کون سمجھا سکے کہ عادتِ دوست | دوست آزار کیوں ہے، کیا باعث
اے رہِ آرزو کے راہ نورد | سُست رفتار کیوں ہے، کیا باعث

کاش اظاہر ہو، آج کل آزاد
جی سے بیزار کیوں ہے، کیا باعث

حکیم آزاد انصاری

صُوفی اور مُلحد

ملحد۔ آپ کا فرمانا یہ ہے کہ لغوی معنی اگر لئے جائیں تو کوئی شخص بھی دہریہ نہیں ہوسکتا کیونکہ زمانہ یا دہر شخصی ہستی سے بالاتر ہے اور اس معنی میں اگر کوئی دہریہ ہوسکتا ہے تو وہ خود خدا ہی ہوسکتا ہے۔

صوفی۔ مگر آپ یہ بھول گئے کہ میں متشرع صوفی ہوں۔ شرعاً اس قسم کے سوال کہ خدا کی اپنی نسبت کیا رائے ہے، کیا وہ خود اپنا قائل ہے اور اگر ہے تو کیوں؟ قطعی ممنوع ہیں۔ غلط العام میں "دہریہ" لفظ کا اس شخص پر اطلاق ہوتا ہے جو ذاتِ باری کی صفات میں چون وچرا کرے یا اُن سے مُنکر ہو۔ زبان کی لغزشوں میں سے یہ مستانہ ترین لغزش ہے کہ "دہریہ" جیسا متبرک اور محیطِ ہستی لفظ ایسے شخص کے لئے استعمال کیا جائے جو صرف مروجہ عقاید سے باغی ہو۔ صوفی نقطۂ خیال سے آپ جیسے لوگ دہریہ نہیں صرف ملحد ہیں۔

ملحد۔ میرے ایک دوست نے مجھے یہ تحریر بھیجی ہے (پڑھ کر سناتا ہے)

تحریر

اے ہستئ مطلق!

تو میرے دوستوں کا خدا ہے اور انہیں اپنے آپ کو تجھ سے جدا کرنے میں مزہ ملتا ہے نہیں، تُو خود یہ مزہ لیتا ہے! جدائی کا اور جدائی کے ساتھ ہی ملاپ کا مگر میرے دوستوں کو اس کا پتہ نہیں! وہ محض انجان بلکہ بے جان پیمانے ہیں اور تو شراب بن کر انہیں عبور کرجاتا ہے۔ پیمانے کو کیا پتہ کہ اس میں پانی تھا کہ دوا تھی کہ شراب؟ پیمانے کو کبھی پیاس نہیں لگتی، نہ اسے کبھی شفا ہوتی ہے نہ کبھی وہ نشہ میں چُور ہوتا ہے۔ پیمانے کو تو تھوڑے اور بہت کی بھی تمیز نہیں۔ تُو جسے چاہے بھردے!

اے ہستئ مطلق!

مَیں جو تیرا قلیل سا جزو ہوں اس بزرگ نسبت کے باعث حمد سے، نعت سے، گدا سے بے نیاز ہوں۔ نہ مانگتا ہوں، نہ دیتا ہوں، نہ ڈرتا ہوں،

اے ہستئ مطلق!

مجھے کسی چیز سے بچنے کی ضرورت نہیں یہاں تک کہ مجھے رسمی نیکی سے بھی گریز نہیں۔

اے ہستیٔ مطلق!

اگر تُو دیکھنے والا ہے تو میں دیکھتا ہوں۔ اگر تُو سمیع ہے تو میں سنتا ہوں مگر مجھے اس علم کا علم نہیں۔

اے علم کی ضرورت و قید سے بالاتر ہستیٔ مطلق!!

اے بے خبر باخبروں کا رُوپ بھرنے والی ہستیٔ مطلق!!

اے خیال کے جنجال سے آزاد ہستیٔ مطلق!!

تجھے بُلا نہیں رہا، بُھلا نہیں رہا، سیکھ نہیں رہا سکھا نہیں رہا۔ تو اعلانِ مطلق ہے مگر وہ اعلان جس میں عبارت نہیں، لفظ نہیں حرف نہیں، جس میں صدا کی ادا نہیں۔

اے خوشی کی مصیبت سے بالاتر ہستیٔ مطلق!!

اے نام کی زنجیروں سے معرّا ہستیٔ مطلق!!

تجھے نام دے کر خوشی چاہنے والوں کی صف کس قدر طویل ہے؟ خیال کرتے ہیں کہ اسی سے تیرے نام کی رونق ہے!

اے نورِ مطلق!

تو رونق سے بے نیاز۔ تیرا یہ جزوِ لاینفک عقاید سے عاری!

جو شخص یہ لکھے اس کی نسبت آپ کا کیا خیال ہے۔

صوفی۔ لفظ کہیں کہیں اچھے ہیں۔ شاید معنی بھی ہوں مگر مجھے اس شخص کی نسبت رائے پیش کرنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔

ملحد۔ آخر کچھ تو آپ نے خیال کیا ہی ہوگا؟

صُوفی۔ یہ خیال ضرور آیا کہ یہ شخص دروغ بافی میں ماہر ہے۔ اپنے آپ کو عقاید سے مبرّا بتلاتا ہے اور ساتھ ہی اس عقیدہ پر زور دیتا ہے کہ وہ ہستیٔ مطلق کا جزو ہے۔ اسے جزو اور کل کی تمیز کیونکر ہوئی اور اگر ہوئی تو اسے ظاہر کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ صوفیائے کرام اپنی تعلیم کے ایک خاص مقام پر خاموش ہو جاتے ہیں۔ اگر اس شخص کی تعلیم صحیح ہوتی تو یہ شخص بھی خاموش ہو جاتا۔

ملحد۔ کیوں حضرت! راستی کا اظہار کیوں نہ کیا جائے؟

صوفی۔ جناب من میرے مذہب میں بحث منع ہے۔ صرف آپ کے سوال کا جواب دوں گا۔ راستی کا اظہار منع نہیں بشرطیکہ وقت ہو اور سننے والے کے مبلغ علم کا پورا اور صحیح اندازہ ہو۔ راستی کوئی سنگریزہ نہیں کہ اٹھایا اور پھینک دیا۔ یہ وہ گراں بہا لعل ہے کہ صرف گوہر شناس کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے۔

ملحد۔ گویا آپ کا تصوّف اجازت دیتا ہے کہ اخفائے حق کیا جائے۔

صوفی۔ اجازت کیسی ہمیں حکم ہے کہ جس کی جتنی سمجھ ہو اس سے اسی قدر بات کی جائے۔ جو شخص موجودہ عقاید کا صحیح استعمال کرنے کے ناقابل ہیں انہیں بہتر عقاید بتلانے سے کیا فائدہ؟ گدھے کو ہوائی جہاز میں سیر کرانے سے گدھے کے لئے کیا مفید نتیجہ نکلے گا؟

ملحد۔ آپ کے نزدیک زندگی ایک سر بمہر راز ہے جس کی کلید سینہ بسینہ صوفیائے کرام کی تفویض میں ہے۔

صوفی۔ یقیناً

ملحد۔ تو مجھے آپ کچھ تلقین کر سکتے ہیں؟

صوفی۔ جناب من مثال کے طور پر آپ یوں سمجھئے کہ میں اپنی فوج کا ایک ادنیٰ سپاہی ہوں۔ میں کبھی اپنی وردی کو داغ نہ لگاؤں گا۔ جو مجھے حکم ملے گا اُس کی تعمیل کروں گا اور یہ کبھی نہ پوچھوں گا کہ یہ حکم کیوں ملا اور نتیجہ کیا ہوگا؟ اس لئے میں تو یہی تلقین کر سکتا ہوں کہ آپ اپنے الحاد میں ثابت قدم رہئے۔ آخر آپ کو اپنے الحاد یا میرے تصوف سے ڈر کیوں لگتا ہے؟

ملحد۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی فوج قطعی مٹ جائے۔

صوفی۔ کیوں؟

ملحد۔ فتح کی خوشی کے باعث اور احیائے حق کی خدمت میں۔

صوفی۔ آپ کی تعلیم ابھی اپنے دروغ باف دوست کی تعلیم سے بھی کم ہے۔ جو شخص خوشی کے لئے زندہ ہے وہ گویا مردہ ہے۔

ملحد۔ اچھا آپ فرمائیے کہ آپ کس لئے زندہ ہیں؟

صوفی۔ مجھے کیا پتہ؟ میں صرف اس قدر جانتا ہوں کہ چونکہ میں زندہ ہوں اس لئے مجھے حتی الوسع لغو سوالوں لغو کاموں سے اجتناب لازمی ہے۔ وقت دوبارہ نہیں آتا اور علم کی کوئی حد نہیں۔ اس لئے علم سے زیادہ عمل کی ضرورت ہے۔ جتنا کم کھا سکو اتنا کم کھاؤ اور دل جسم کو صاف رکھو۔ اس سے زیادہ نیکی کی ضرورت نہیں

گو اس کا حاصل ہونا بھی بہت مشکل ہے

ملحد۔ میرے پاس دلیل کوئی نہیں مگر میرا دل کہتا ہے کہ آپ کی تعلیم قطعی غلط ہے۔ بہت کھانے والا اور دل جسم سا گندا بھی ایسا موقع حاصل کرسکتا ہے کہ بہت بڑا کام کرجائے۔ محض از راہِ ہمدردی کسی ڈوبتے کو بچا لے، کسی مریض کو اپنا خون دے دے، کسی مجروح کو پیٹھ پر لاد کر شفاخانے پہنچا دے۔

صوفی۔ بجا اور قطعی بجا مگر آپ زندگی کو لمحوں میں ٹکڑے ٹکڑے کرکے دیکھتے ہیں۔ ہم لوگ ساری رَو کو دیکھتے ہیں۔ زندگی یہ نہیں کہ کسی ایک موقع پر عروج ہو جائے بلکہ اصلی زندگی یہ ہے (کیونکہ موت کا وقت معیّن نہیں) کہ ہر وقت انسان اُجلا ہو۔ روحانیات میں کوئی خاص فعل خاص طور پر قابلِ تعریف نہیں ہوتا بلکہ جس طاقت سے فعل سرزد ہوتے ہیں اُس طاقت کو ہر وقت بے لوث رکھنا قابلِ تعریف ہوتا ہے

"جی، جا"

زندگی ضرور اور صرف پشیمانی کے لئے ہے گو میری تمنا ہمیشہ یہ رہی اور رہے گی کہ پشیمانیاں خوبصورت اور شاعرانہ ہوں! یعنی یہ حسرت نہ ہو کہ کیوں غلطی کی بلکہ یہ ہو کہ کیوں اعلیٰ تر غلطی نہ کی! یہ البتہ ضرور صحیح ہے کہ غلطی کے لئے جرات درکار ہے اور مجھ جیسے مذہب کے سوکھے ٹکڑوں پر پلے ہوئے نحیف و زار میں جرات کہاں؟ اس لئے میرے پشیمانیوں کے خزانے میں گرانبہا خلعت کم ہیں۔ عام طور پر اس توشہ خانے میں صرف دیسی اور بھدی پوشاکیں ہیں۔ ولایتی گلشنیں بہت نایاب ہیں اور خالص ولایتی اعلیٰ قسم کا ریشم تو گویا ہے ہی نہیں۔

یہ بھی سچ ہے کہ اعلیٰ تر بلکہ اعلیٰ ترین غلطی کی متواتر اور زبردست خواہش نے مجھے ہزارہا ذلیل قسم کی غلطیوں سے محفوظ رکھا گویا میں محض اپنے شدید قسم کے کفر کی بدولت اکثر سہی ایمان میں مضبوط رہا۔ اے کاش کہ ایمان کی تلاش والے اس سہل طریقے کو سمجھ لیں کہ دوزخ کے دلدادوں کو ان کی ناکامیابی کی سزا میں بہشت ملے گی! گناہ کی طرف منہ اٹھائے چلے جانے نے مجھے سیدھا دارالثواب میں داخل کردیا! کس قدر میں بھٹکا؟

(پاپ یوگ کا دیباچہ)

التجائے دید

تری ادائے دل افروز جانِ محبوبی — تری نگاہِ جہاں سوز برقِ ایمنِ حُسن

یہ رُوئے رشکِ گل تر یہ زلفِ عنبر بار — بہارِ کیف بداماں ہے تیرا گلشنِ حُسن

ہے خارِ غم سے مرا دامنِ محبّت چاک — گلِ نشاط سے لبریز تیرا دامنِ حُسن

تو اک مجسمۂ لائقِ سجودِ نیاز — مَیں سومناتِ محبّت میں ہوں برہمنِ حُسن

ہے تیری دید سے وابستہ زندگی میری — "مدار جلوہ دریغ از دلم کہ خرمنِ حُسن

بخوشہ چینیِ آئینہ کم نمے گردد"

'سروری'

رباعی

غنچے سے کہا یہ میں نے خنداں ہو

بن ہو کے مثلِ گلشن ہو چھپتا ہو

آ آ آ آ کی آ رہی ہے آواز

دیکھا نہیں آج کا گُل ہنستا ہو

امجد

سما

عقلِ انسانی نے اپنے ارتقا کے ہر دور میں آسمان کی طرف فلسفیانہ اور شاعرانہ نظروں سے دیکھا ہے اور اکثر بمقتضائے عبودیت اس پر غور و فکر کی نگاہیں ڈالی ہیں۔ چاند کی ٹھنڈی اور صاف روشنی، ستاروں کی کثرت، خورشیدِ درخشاں کی تمازت، صبح و شام فضائے آسمانی کی خوشگوار رنگینیاں، موسم برشگال میں ابر کے ٹکڑوں کا کبھی کالی گھٹا کی صورت میں کبھی دُھنی ہوئی روئی کے گالوں کی طرح کبھی سرخ سرخ بادۂ ارغوانی سے تر اسفنج کی ہیئت میں نمودار ہونا، قوسِ قزح کی ہفت رنگی، بجلی کی چمک، رعد کی گرج، یہ سب ایسی باتیں تھیں جو خود بخود پیکرِ عبودیت انسان کی رہنمائی منتظمِ کائنات کی طرف کر رہی تھیں۔ مگر چونکہ ابتدائی زمانے میں جس طرح دنیا کم سن تھی اسی طرح انسان کی عقل بھی بچہ تھی اس لئے زمین و آسمان کی ہیبت ناک تبدیلیوں کو تو انسان نے خدائے غضب کے مظاہر تسلیم کیا اور اس طرح واحد القہار کے وجود تک اپنی عقل کو کچھ کچھ رسا کیا، اور جو خوشگوار اور دلفریب مظاہر تھے اُن تک بھی اپنے تصوّر کو پہنچایا یا غرض کسی کو ہیم کسی کو آرٹمیس، کسی کو یوشا اور علیٰ ہذا القیاس حسنِ فطرت کے ہر مظہر کو کسی نہ کسی خاص نام سے موسوم کیا گیا۔ اُن سے التجائیں کی گئیں، دعائیں مانگی گئیں، اور اُن کے ظہور کے وقت نہایت عقیدت سے اُن کا خیر مقدم کیا گیا ؎

وہ آکاش کی دیوی آئی ۔۔۔ یوشا مائی سَما پر چھائی
صحت اور بقا کی مائی ۔۔۔ عزت اور محبت لائی
دیوی ہم کو دولت دے
طاقت دے اور قوت دے (وید مقدس)

مگر جب دنیا میں تہذیب پھیلنا شروع ہوئی جب انسان کو کائنات اور مظاہرِ کائنات کے علم کی تدوین و ترتیب کا خیال پیدا ہوا، جب اُسے خود اپنی ہستی کے کھوج لگانے کا شوق ہوا، اُس وقت سے اب تک قوموں کی عقلمند ہستیوں نے سَما یا آکاش یا فضائے آسمانی کو اپنے محدود علم کے موافق مختلف نظریوں میں پیش کیا ہے۔ کسی نے آسمان کو بالکل ٹھوس مانا، لیکن کوئی عقل میں آنے والا ثبوت پیش نہ کیا۔ قدیم یونانی علما کے نزدیک

سما یا Space یا آکاش کی کوئی اصلیت ہی نہ تھی، بطلیموس نے بھی خلا کی ماہیت بتانے میں خاموشی اختیار کی، کوپرنکس کے یہاں بھی اس کی کوئی حقیقت نہیں، حتٰی کہ قرونِ وسطیٰ کے آخر میں گیلیلیو نے نظامِ عالم میں گو ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیا، تاہم فضائے بسیط پر کوئی قابلِ اطمینان رائے ظاہر نہ کی۔ ہاں، کوپرنکس اور گیلیلیو کی جد وجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ آسمان کو ایک دبیز پتھر کی چھت جس میں چاند تارے جڑے ہوئے ہوں، ماننا حماقت سمجھا جانے لگا۔ اور کل اجرامِ فلکی کے وجود کو فضائے بسیط میں رقص یا دوریا قیام کی حالت میں تسلیم کیا گیا۔

لیکن ہیئتِ جدید کی نئی ترکیب کو جو ابھی تک قائم ہے۔ نیوٹن نے کششِ اجسام اور کششِ ثقل کے مسئلوں سے ایک حد تک مکمل کر دیا، اور وہ رموز جن کو گیلیلیو اور کوپرنکس نہ حل کر سکے تھے ظاہر کر دئے۔ اس طرح ہم کو افلاک کے قیام و گردش ہی نہیں بلکہ اُن کے توسل و توازن کا بھی پتہ چل گیا۔ یہی وجہ ہے کہ "سورج چاند کو نہیں پکڑ سکتا، اور رات دن کی پیش بندی نہیں کر سکتی"[1]۔ یا یوں کہئے کہ کشش کی وجہ سے اجرامِ فلکی میں ایک طرح کی پابندی قائم کر دی گئی ہے۔ پس ہم سما یا فضائے بسیط کو محض بے اصل یا برائے نام کوئی شے ماننے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے، کیونکہ ستاروں میں ایک قسم کی میزان[2] قائم ہے جس کا اثر ضرور تمام کائنات میں جاری وساری ہے۔ مقناطیس اور سوئی کے درمیان جو فضا ہے وہ خالی نہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ محمود غزنوی نے الموڑہ کی پہاڑیوں میں ایک مندر دیکھا تھا جس کے ایک حجرے میں لوہے کا ایک بُت چھت اور زمین اور چاروں دیواروں کے بیچ میں بالکل معلق کھڑا تھا۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ہر چہار طرف اور نیچے اوپر سنگِ مقناطیس ہے اس لئے بت بالکل معلق ہے[3]۔ تو ایسی حالت میں اس حجرے کا خلا قوتِ کشش سے بھرا تھا۔ اگر وہاں کوئی سپاہی زرہ بکتر پہنے ہوئے جاتا تو وہ بھی معلق ہو جاتا اور سادہ دل ہندوستانیوں پر اپنی خدائی کا رعب جما دیتا ہے۔ پس ہر جرمِ فلک کے درمیان کوئی نہ کوئی قوت ضرور ہے۔ اجرامِ فلکی اسی قوت کی مضبوط ڈوری سے بندھے ہوئے ہیں۔ اس نظام میں جو خلا ہے اُس میں ایتھر[4] کا وجود مانا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ موجودہ زمانے کی تحقیقات کے بعد کسی زمانے میں ایتھر کا مسئلہ جو ابھی صرف ایک استفہامی نظریہ ہے کسی اور ہی صورت میں غور کیا جائے۔ میر ؎

کیا جانئے کہ کیا کچھ پردے سی ہووے ظاہر ۔۔۔ رہتے ہیں دیکھتے ہم ہر صبح آسماں کو

[1] القرآن ۔ [2] و وضع المیزان (الرحمن)، [3] تاریخِ فرشتہ [4] مارٹن صاحب کا نظریہ۔

جرمن فلاسفر کینٹ کا مقولہ ہے کہ Space یا آکاش، کا ساحتِ کائنات میں کوئی ذاتی وجود نہیں بلکہ یہ احساس کی بالکل ایک فاعلی حالت ہے، فلسفۂ ویدانت کے رو سے بھی سما کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ہر چیز اس میں سرایت کر سکتی ہے اور اسی اعتبار سے وہ جاذبِ کُل مانا گیا ہے۔ نہ اس میں کوئی تشکیل ہے نہ اس کی کوئی حالت۔ جو حالتیں فضائے فلکی میں نمایاں ہوتی ہیں ان کا وجود اجرامِ فلکی کی گردش وغیرہ سے ہے۔ مگر یونان میں فیثاغورث، افلاطون، ارسطو اور اپیکورس وغیرہ نے فضائے آسمانی کا وجود مانا ہے جس کی دلیل اور تصدیق دورِ حال کے ریاضی دان نیوٹن نے اپنے نظریے سے کر دی ہے۔ یعنی مظاہرِ قدرت کی ابتدا چند موجی حرکتوں سے ہے اور ان موجی حرکات کی جولانگاہ فضائے بسیط ہے اور ہر موج اجزائے ایتھر یا ایک قسم کے لطیف مادے سے بھری ہوئی ہے۔

کرۂ باد سے پرے اجزائے لطیف کا ایک پُر سکوت دریا خیال میں مسکرانے والی متانت اور خاموشی کے ساتھ تمام کائنات میں جاری و ساری ہے۔ اور ہر جگہ اس طرح پھیلا ہوا ہے جیسے کسی بڑے کمرے میں دھواں بھر جاتا ہے، مگر قدرت نے ایتھر کے اجزا میں توازن و تناسب قائم کر کے اس کو دھوئیں سے بالکل مختلف کر دیا ہے۔ ایتھر کے اجزا دھوئیں کی طرح کہیں ہلکے کہیں گہرے نہیں بلکہ ایک مناسبت پر ہیں۔ یہ اجزا، روشنی پھیلانے میں بہت مدد کرتے ہیں۔ ایتھر کا ہر ذرّہ عکسِ خورشید سے منوّر ہو کر تمام کائنات کو روشن کر دیتا ہے۔ اگر یہ اجزا نہ ہوتے تو روشنی کا وجود ہی نہ ہوتا۔ نہ دنیا میں دھوپ پھیلتی نہ چاند میں چاندنی ہوتی، کائنات میں اندھیر اگھُپ ہوتا۔ جو ستارے بذاتِ خود روشن ہیں بالکل نظر نہ آتے یا اگر دکھائی دیتے تو تاریک کمرے میں جگنو یا چنگاریوں کی طرح اُڑتے ہوئے معلوم ہوتے۔ غرض دنیا تاریک ہوتی۔

ایتھر کے ذرّے روشنی کو تو پھیلاتے ہیں مگر آواز کو رد کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ برسات کی اندھیری راتوں میں بجلی کی چمک پہلے اور کڑک بعد میں ہوتی ہے، یا رات کو توپ سر ہوتے وقت روشنی پہلے نمودار ہوتی ہے اور آواز بعد میں آتی ہے پس روشنی کی رفتار آواز کی رفتار سے کہیں زیادہ ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ آواز کی رفتار محض دو فرلانگ فی سکنڈ ہے اور روشنی کی رفتار بیس ہزار میل فی سکنڈ تک معلوم کی گئی ہے۔

کیا ایتھر پر کششِ اجسام کا اثر پڑتا ہے؟ نیوٹن کے یہاں اس کی کوئی خاص صراحت نہیں، ممکن ہے کہ آیندہ زمانے میں اس کی کوئی تحقیقات ہو۔ ۱۹۱۵ء میں جرمنی کے مشہور ریاضی دان اینسٹن نے یہ نظریہ پیش کیا کہ روشنی پر قانونِ کشش کا اثر پڑتا ہے۔ طیف نما سے اس کی تحقیقات کی گئی اور کچھ کچھ صداقت ظاہر

ہوئی مگر امریکہ میں اِس کو محض ایک استفہامی نظریہ سمجھا گیا۔ لیکن چند کسوفِ شمسی اور کسوفِ قمری کے وقت اس کی آزمائش مختلف جگہوں پر کی گئی اور اینسٹن کا قول پورا اترا۔ اس طرح یہ ظاہر ہے کہ کشش کا اثر ایتھر پر ضرور ہوگا۔ مگر شاید خود ایتھر ہی کشش سے وجود پذیر ہوا ہو اور جس طرح عرصے تک کسی مادے کو پڑا رہنے دیں تو اس کی دوسری ہیئت ہو جاتی ہے اس طرح کشش کی قوت نے اجرامِ فلکی کی قدامت سے عرصے کے بعد ایتھر کے اجزا کو پیدا کیا ہو۔ اور ممکن ہے کہ جس طرح موجودہ تحقیقات میں سورج کا دھیرے دھیرے مفقود[۵۱] ہونا بتایا جاتا ہے اسی طرح ایتھر کے اجزا کو بھی قدامت کی بنا پر روز افزوں ترقی پاتے ہوئے تسلیم کر لیا جائے اور ایک زمانے میں تمام کائنات ایتھر کے ذرّوں سے دھواں دھار ہو جائے، سورج تاریک اور تمام دنیا اندھیری ہو جائے، اور یہ خلا ضیق النفس پیدا کرنے والے اجزا سے بھر جائے۔

دورِ جدید کی تحقیقات نے بھی یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہوا سے پرے فضائے لطیف میں کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر کوئی وہاں جائے تو گلا گھٹنے لگے اور یہی نہیں بلکہ مادۂ کثیف کی نسبت سے جسم ریزہ ریزہ ہو جائے۔

مشرقی کاملینِ فلسفہ نے پہلے ہی بیان کر دیا تھا کہ "آکاش" جس کے لفظی معنی خود کو ظاہر کرنے والے کے ہیں تمام سنسار میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ روحِ کل ہے جو ہر جگہ جاری و ساری ہے۔ اس کے اثر سے کوئی ذرہ بری نہیں[۵۲]۔ پس اگر برھما کے معیّنہ قانون کے خلاف کوئی اس روحِ کل کے مستقل قانون میں دخل دے تو سزا کو پہنچے گا کیونکہ یہ امرِ ربّی کی نافرمانی ہے۔ روشنی آواز اور دیگر اشیا فضائے فلکی میں اس طرح داخل ہوتی ہیں جیسے بطخیں تالاب کے پانی میں داخلہ کرتی ہیں، یا ایک قسم کی روشنی دوسری قسم کی روشنی میں سرایت کر جاتی ہے۔ اور چونکہ بطخیں اور روشنی حسبِ مراتب پانی اور روشنی سے اہلیت رکھتی ہیں اس لئے ان کو نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ کلامِ مجید میں بھی سورج اور چاند کو آسمان میں "پیرنا[۵۳]" کہا گیا ہے۔ اور وہ اِس بحرِ کائنات کی شناوری کے اہل بنائے گئے ہیں۔

لیکن ایک مشرقی خلا سفر "برھم دیو" نے فضائے آسمانی کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک "لوک آکاش" ہے

---

۵۱ ایک امریکن عالمِ ہیئت کا نظریہ ہے۔

۵۲ مغربی علمائے نفسِ حیات (مثلاً لائبنز) کے قول کے مطابق تمام کائنات میں حیات جاری و ساری ہے۔ اس کو اگر فلسفۂ ہند کے معیار پر دیکھا جائے تو "جیو آتما" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ جس کا قیام پرکرتی یا مادے کے قیام تک ہے۔

۵۳ "وکل فی فلکٍ یسبحون" (یٰسین)

جس میں اجرام فلکی، ارواح، وقت اور حرکت وسکون وغیرہ اپنا وجود رکھتے ہیں۔ دوسری قسم کو "الوک" کہا ہے جو ایک لامتناہی پھیلاؤ رکھتے ہوئے ہر قسم کے وجود سے خالی مانا گیا ہے۔ یعنی ایک وہ جس میں وجود کائنات ہے، اور ایک وہ جس میں کچھ نہیں۔ شاید ازل سے پیشتر یا اس کائنات کے وجود سے پیشتر موخر الذکر قسم اپنا وجود رکھتی تھی اور وہ ایسا وجود تھا جس کا نام رکھنے کے لئے ہمیں اپنی زبان اور کسی دیگر زبان میں ابھی تک کوئی لفظ نہیں ملا۔

تاریکی و روشنی، گرمی و سردی، اپنی متضاد خاصیتوں کے درمیان کوئی سلسلہ ضرور رکھتی ہونگی چنانچہ ارسطاطالیس نے لکھا ہے کہ فضائے فلکی اجسام فلکی اور لامتناہی خلا کے درمیان رشتہ ہے۔ رواقی فلسفیوں نے فضائے فلکی کو حرکت وسکون اور وقت وغیرہ سے بالکل علیحدہ اس دنیا سے باہر ایک شے مانا ہے۔ وقت ایک ابدی سلسلہ ہر قید سے بالکل مبرا ہے۔ البتہ آواز فضائے فلکی کی خصوصیت ہے۔ اگر خلا نہ ہو تو آواز بھی نہ ہو۔ آواز اسی طرح ہمارے کان میں پہنچتی ہے جس طرح کہ ہمارے مشام میں شامہ کا احساس اُن چھوٹے چھوٹے اجزا سے واقع ہوتا ہے جو ہوا کے ذریعے سے ناک میں جاتے ہیں۔ پس وقت، شے یا چیز ہونے کی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس لئے سما اور اس کے متعلقات یعنی آواز و روشنی سے وقت کو کوئی نسبت نہیں۔ البتہ حرکت وسکون کا انحصار اشیائے مادی کے وجود پر ہے۔ اس لئے ان کا وجود "لوک آکاش" میں ممکن ہے۔ غرض فضائے آسمانی کا مسئلہ ابھی تک صاف نہیں ہوا اور چونکہ اس میں علم ہیئت اور مختلف سائنسوں کی ضرورت ہے اس لئے کسی ایک فرد سے یہ کام ہوتا ہوا معلوم نہیں ہوتا۔

قدیم زمانے کے مذاہب نے فضائے آسمانی کو نہایت پر تقدیس ہستیوں کا مسکن سمجھا ہے۔ وہ مناظر قدرت کو کسی نہ کسی دیوتا کا مظہر سمجھتے تھے اور فضائے فلکی کو روحانی سکون کا گہوارہ مانتے تھے۔ قدیم یونانیوں کا تو یہ خیال ہے کہ فضائے فلکی میں ستارے صرف رقصاں ہی نہیں بلکہ ترانہ نواز بھی ہیں۔ اور اُن کے خیال کے مطابق روح نماں قیام پذیر ہو کر سرود انجم سنا کرتی ہے[۱]۔ اسی سے ملتا جلتا فضائے آسمانی کی بابت قدیم آریہ لوگ بھی عقیدہ رکھتے تھے، یعنی نیک لوگوں کی ارواح مرنے کے بعد فضائے آسمانی کے دیوتا یم کے یہاں عیش و عشرت میں رہا کرتی ہیں۔

علوم متعارفہ، ہیئت و ریاضی کی امداد سے اجرام فلکی کی بہت کچھ تحقیقات ہوگئی ہے۔ مگر فضائے آسمانی

---

[۱] فیثاغورث۔

کو جس کی ماہیّت نہ دوربین سے دیکھی جاسکتی ہے نہ بغیر وہاں تک پہنچے علم کیمیا کے ذریعے سے اُس کا تجربہ کیا جاسکتا ہے اور دریافت کرنا بہت مشکل ہے

چیست ایں سقفِ بلند و سادۂ بسیار نقش
زیں معما ہیچ دانا در جہاں آگاہ نیست

جو لوگ فضائے آسمانی کی رنگینیوں کو دیکھ کر شاعرانہ خیالات میں محو ہو جاتے ہیں اور مظاہر صبح و شام کی بے نیاز کیفیت سے لطف اندوز ہو کر بے ساختہ فضائے آسمانی کے پیدا کرنے والے کی تعریف کرنے لگتے ہیں، واقع میں ایک حقیقی احساس رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "ورڈسورتھ" اور "شیلی" کی طرح اکثر مغربی شعرا بالکل نیچر پرست تھے۔

اگر ہم کو عالمِ فردوس کی کچھ جھلک ملتی ہے تو صرف فضائے آسمانی کی رنگا رنگ کیفیتوں سے۔ بس ممکن ہے کہ زندگی ایک خواب ہو جس کی تعبیر ہمیں عدم میں ملے، شاید نگارِ کائنات کے اس پردے میں حسنِ فطرت کا کوئی راز پنہاں ہو، ایسا بھی ممکن ہے کہ یہ کیفیتیں ہمیں صرف قیدِ عناصر یعنی پابندِ آب و گل ہونے کی حالت میں معلوم ہوتی ہوں اور اس قفسِ خاکی سے آزاد ہونے کے بعد کوئی اور ہی عالم نظر آئے۔ بہرحال زمین و آسمان اور تمام کائنات ایک زبردست قانون کی پابندی میں قائم ہیں، یا اگر کوئی قانون نہیں ہے تو ہم کو بھی نظامِ کائنات کے تحقیقی نظر ڈالنے والے قیصرِ روم[1] سے زیادہ علم کا دعویٰ نہیں ہوسکتا۔ اس کا خیال تھا کہ کائنات یا تو عناصر کا ایک بے ترتیب منظر ہے یا کسی زبردست قانون کے نظام کی پابند ہے جس میں تغیر نہیں[2]۔ لیکن ؎

کس کی قدرت کے یہ مظاہر ہیں
اِن مظاہر میں خود "وہ" ہے کہ نہیں؟

ایسا سوال ہے جس کا جواب اہلِ فلسفہ ابھی تک کسی مستقل مسئلے کی صورت میں نہیں دے سکے۔ سب یہی کہتے رہے کہ جتنی نئی باتیں معلوم ہوتی جاتی ہیں اتنے ہی نئے نظریے پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ بقولِ اکبر ؎

نہ یہاں حدوں کا نشاں کہیں، نہ محلِ حرف و بیاں کہیں
مرا عشق ہے ترا حسن ہے مری آنکھ ہے تری شاں ہے

سیّد مقبول حسین

[1] مارکوس اوریلیوس
[2] ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا (القرآن)

اے پھول مرے آ پھولوں میں!

اے پھول مرے اے پھول مرے آ مل کر کھیلیں پھولوں میں
آ پیار کریں آ پیار کریں آ جھولیں مل کر جھولوں میں
اے پھول مرے آ پھولوں میں!

آ کودیں ہم آ ناچیں ہم آ آنکھ مچولی کھیلیں ہم
تو شیریں ہے میں رنگیں ہوں آ پریم کی ہولی کھیلیں ہم
اے پھول مرے آ پھولوں میں!

جو کچھ ہوا اور جو کچھ ہوگا آ بھولیں ہم آ بھولیں ہم
جو کچھ بھی ہے اُس کی بہاروں میں آ پھولیں ہم آ پھولیں ہم
اے پھول مرے آ پھولوں میں!

آ جگ میں جئیں ہم رل مل کر آ عمر ہے باہم ملنے کی
آ کھیل یہ کھیلیں گھل مل کر آ رُت ہے یہ من کے کھلنے کی
اے پھول مرے آ پھولوں میں!

دنیا یہ بلا سے فانی ہو اور زیست بھی آنی جانی ہو
جو دن ہو مگر اک سپنا ہو جو رات ہو پریم کہانی ہو
اے پھول مرے آ پھولوں میں!

دنیا سے پرے کسی جنگل میں تاروں بھری راتیں ہوں اپنی
پانی بھرے پھولوں کے منہ میں وہ رس بھری باتیں ہوں اپنی
اے پھول مرے آ پھولوں میں!

وہ عمر بہم حاصل ہو ہمیں کٹ جاتے جو باتوں باتوں میں
کیا زیست ہو وہ بھی یونہی بیتیں دن زیست کے راتوں راتوں میں
اے پھول مرے آ پھولوں میں
اے پھول مرے آ پھولوں میں!

ب ل

پتّیاں

خوف نہ کھا، نفرت نہ کر، اور صرف خیالوں میں زندگی بسر نہ کر!

انسانیت کی دنیا کا باشندہ بن، اوروں کی روزمرہ اونچ نیچ میں حصّہ لے اور اس معمولی کو غیر معمولی سمجھ!

کائنات جس میں ایک ذرّہ بھی صحرا اور اک قطرہ بھی سمندر ہے اُس میں بڑے چھوٹے کی تمیز نہ رکھ!

جب دھواں دھار بادل چھا جائیں، بجلیاں چمکیں، رعد گرجے، دنیا ساری تیرہ و تار ہو جائے اور طوفان زندگی کی بستی پر ٹوٹ پڑے تو ناامید نہ ہو کہ ناامیدی کے بادل پھر جلد ہی ایک سرے سے دوسرے سرے تک شق ہو جائیں گے اور نئی نویلی امنگوں کی کرنیں رحمت ایزدی کے سورج سے ترستی زمین پر اپنی سنہری روپہلی بارش کرنے لگیں گی! ——— اے بے اختیار! تجھے پھر اختیار ملنے والا ہے!

زندگی کو گوناگوں دلچسپیوں سے زرّیں و رنگیں بنالے!

دلچسپی ہی ہے جو دلیری کو قائم رکھتی ہے انسان کے لئے۔ خوشی کی دلچسپی نہیں تو غم کی دلچسپی ہی سہی مگر دلچسپی ضرور ہو اور غم بھی جبھی تک کہ وہ دلچسپ رہے۔ جہاں غم پھیکا ہو گیا غم کا لُطف جاتا رہا۔ وہ جو رنگیں ہو شیریں ہو سیمیں ہو زرّیں ہو وہ غم ہو یا خوشی علم ہو یا جہل شک ہو یا اعتقاد محبت ہو یا بے اعتنائی تو اُس کا ہو جا کہ وہ تیری ہو جائے۔ پھر جب اُسے تجھ میں کچھ نہ ملے جب تُو اُس کے لئے پرانا ہو جائے تو وہ بھی تیرے لئے پرانی ہے اور بے کار۔ زندگی فقط دلچسپی میں ہے اسے اکتائے ہوئے!

نہیں! تجھ سے رُوگردانی؟ یہ کیونکر ممکن ہے؟ اے صداقت کے آئینے میرے لئے میرے ہی گھر میں جس کا آئینہ دار خود خدا ہے!

باغبان

اینٹ کی بیگم

روسی افسانہ نگار الیگزینڈر پشکن کا ایک شاہکار

(۱)

نوجوان افسروں کا گروہ ہارس گارڈز کے لفٹننٹ نارومف کے مکان پر تاش کھیل رہا تھا۔ موسم سرما کی طویل رات معلوم ہوئے بغیر گزر چکی تھی اور اب صبح کے پانچ بجے تھے۔ میزوں پر کھانا رکھا گیا جیتنے والے خوشی خوشی کھاتے اور ہارنے والے خالی طشتریوں کو دیکھتے رہے۔ پھر شراب کا دور چلنے لگا اور گفتگو آہستہ آہستہ خوشگوار ہو گئی۔

میزبان نے ایک افسر سے پوچھا "سورائین تم جیتے یا ہارے؟"

"ساوہ میں حسبِ معمول ہارا ہوں میری قسمت ہی بُری ہے۔ میں جوا اتنا باقاعدہ کھیلتا ہوں گویا یہ میرا پیشہ ہو، اور ٹھنڈے دل سے کھیلتا ہوں کبھی کسی سے نہیں جھگڑتا اور تاہم میں ہمیشہ ہارتا ہوں"

ایک اور شخص نے ایک نوجوان انجنیر کی طرف اشارہ کر کے کہا: "اور تمہارا ہرمن کے متعلق کیا خیال ہے اس نے آج تک نہ شرط باندھی ہے اور نہ کسی پتے پر کوئی پیسہ لگایا ہے، تاہم یہ ساری ساری رات بیٹھا ہمیں جوا کھیلتے دیکھتا رہتا ہے!"

ہرمن نے کہا "میں یہ اس لئے کرتا ہوں کہ مجھے کھیل دلچسپ معلوم ہوتا ہے، لیکن مجھے زائد روپیہ حاصل کرنے کی خواہش میں اپنی ضروریات کا روپیہ ضائع کرنے کا خبط نہیں"

کونٹ ٹامسکی نے دخل دیتے ہوئے کہا "اصل بات یہ ہے کہ ہرمن جرمن ہے اور اسی لئے کنجوس ہے لیکن میری دادی کونٹس اینا اس سے بھی بڑھ کر ایک عجوبہ ہے۔ وہ تاش کے پتے کو چھوتی تک نہیں"

میزبان نے جواب دیا "واقعی یہ حیرت انگیز بات ہو کہ اسی سال کی عورت ہو اور جوا نہ کھیلے!"

"کیا تم نہیں جانتے کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہے؟"

"نہیں، تو اس کی کوئی خاص وجہ بھی ہے؟"

"ہاں، ذرا سنو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ساٹھ سال ہوئے میری دادی کو پیرس کے ایک سفر کے دوران میں حیرت انگیز کامیابی حاصل ہوئی۔ کہتے ہیں کہ دربار کے تمام ذی مرتبہ لوگ اُسے دلچسپی کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔

"ان دنوں تاش کی فیشن ایبل کھیل "فارو" تھی، ایک دن محل میں جوا کھیلتے ہوئے میری دادی نے ڈیوک آف اورلینز کے پاس ایک معقول رقم ہار دی، اور وطن پہنچ کر ادا کرنے کا اقرار نامہ تحریر کر دیا۔ گھر پہنچ کر اُس نے میرے دادا کو اپنی بدقسمتی سے آگاہ کیا، اور قرض ادا کرنے کو کہا۔ وہ ہمیشہ اُس سے خوف کھاتا تھا، لیکن اس دفعہ اس خطیر رقم نے جو دادی اماں نے ایسی بے طرح ہاری تھی غصّہ نے اس کی حالت دگرگوں کر دی۔ اُس نے اپنے بہی کھاتے نکالے اور کونٹس پر ثابت کر دیا کہ اُس نے پچھلے چھ ماہ کے عرصہ میں پچاس ہزار پونڈ سے زیادہ روپیہ خرچ کر دیا ہے۔ پھر اُس نے روپیہ دینے سے بالکل انکار کر کے گفتگو کا خاتمہ کر دیا۔ تم اندازہ کر سکتے ہو کہ کونٹس کتنی غضب ناک ہوئی ہوگی، اُس نے دادا کے کانوں پر خوب مکّے رسید کئے اور اپنے تئیں کمرے میں بند کر لیا۔

دوسرے دن اُس نے ایک اَور حربہ استعمال کیا، اور زندگی میں پہلی دفعہ بڑی فروتنی سے میرے دادا کی منت سماجت کی، لیکن اس نے اس کی ایک نہ سنی، کیونکہ میرا دادا ارادہ کا پکّا تھا۔ میری دادی آپے سے باہر ہو گئی۔

"خوش قسمتی سے وہ اُس زمانے کی ایک مشہور شخصیت کو جانتی تھی۔" تم نے کونٹ ڈی سینٹ جرمین کا نام ضرور سُنا ہوگا، جس کے متعلق کئی افسانے مشہور ہیں۔ تم جانتے ہو کہ اُس نے اپنے تئیں "آوارہ گرد یہودی" مشہور کر رکھا تھا، بعض کہتے ہیں کہ وہ ایک جعلساز ہے، بعض اسے جاسوس سمجھتے ہیں، لیکن خواہ وہ کچھ ہو بہرکیف وہ ایسا شخص تھا جس کی ہر کہ ومہ کو ضرورت تھی۔ میری دادی نے اس سے درخواست کی۔ سینٹ جرمین نے ذرا توقف کے بعد کہا: " مادام میں تمہیں بڑی خوشی سے یہ رقم دے دیتا، لیکن میں جانتا ہوں کہ جب تک تم اسے ادا نہ کر لوگی تمہیں کسی پل چین نہ پڑے گا، اور میں نہیں چاہتا کہ تم ایک اور پریشانی میں پھنس جاؤ۔ بہرکیف بچاؤ کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ تم وہ رقم واپس جیت لو۔"

"میری دادی نے جواب دیا، "لیکن کونٹ میں نے تمہیں پہلے کہہ دیا ہے کہ میرے پاس ایک پھوٹی کوڑی نہیں بچی۔"

"سینٹ جرمین نے جواب دیا کہ اس میں روپے کی کوئی ضرورت نہیں، اور پھر اُس نے اُسے ایک راز بتایا اور میرے خیال میں تمہیں وہ راز ضرور معلوم کرنا چاہئے۔"

یہ معلوم کرکے کہ تمام نوجوان اس کے الفاظ پر ہمہ تن گوش ہیں، "تامسکی نے پائپ جلایا۔ منہ سے دھوئیں کا بادل نکالا اور اپنی کہانی پھر شروع کی :

"اسی شام کو کونٹس ورسیلز میں ملکہ کے محل میں جوا کھیلنے گئی۔ ڈیوک آف اورلینز ساہوکار تھا، دادی نے پہلی رقم کی ادائیگی میں تاخیر کے لئے معذرت کی اور کھیلنے لگی۔ اُس نے تین پتے منتخب کئے، پہلا جیت گیا، اُس نے دوسرے پر اپنی شرط دوگنی کردی، دوسرا بھی جیت گیا۔ اُس نے تیسرے پر اپنی شرط پھر دگنی کردی، وہ بھی جیت گیا۔ مختصر یہ کہ اُس نے اُس رقم سے جو اُس نے ہاری تھی کئی گنا زیادہ رقم جیت لی۔"

مجمع میں سے ایک چلایا: "خوب!"

ہرمن نے حیرت سے کہا: "کیا ہی حیرت انگیز داستان ہے!

تیسرے نے کہا: "پتوں پر ضرور نشان لگا ہوگا۔"

میزبان نے بلند آواز سے کہا: "تو ہمیں بتانے سے تمہارا یہ مطلب ہے کہ تمہاری ایک دادی ہے جو تین ایسے پتے جانتی ہے جو بلا شبہ جیتتے ہیں اور یہ کہ ابھی تمہیں پتہ نہیں کہ وہ پتے کون سے ہیں۔"

"تامسکی نے جواب دیا: "یہی تو بدبختی ہے! اُس کے چار بیٹے تھے اور سب کے سب قمار باز، لیکن ان میں سے ایک بھی اس کا یہ راز معلوم نہیں کرسکا، جو شاید اُن کے لئے از حد فائدہ مند ہوتا اور میرے لئے بھی۔ لیکن میرے ایک چچا نے مجھے بتایا کہ اُس نے فضول خرچ چپلٹسکی کو اس سے مستثنےٰ کیا۔ مجھے اس کی وجہ معلوم نہیں مگر اُس نے ایک دوست کے پاس تین لاکھ روبلز ہار دیئے تھے۔ میری دادی نے اُسے تین پتے بتائے اور اُس سے وعدہ لیا کہ پھر وہ کبھی جوا نہ کھیلے گا۔ چنانچہ اُس نے اپنے حریف کو تلاش کیا اور اس سے بغرضِ انتقام کھیلنا شروع کیا۔ مختصر یہ کہ اُس نے اُن تینوں پتوں کے ساتھ اپنی ہاری ہوئی رقم کے علاوہ ایک اور کثیر رقم بھی جیت لی۔ لیکن اب چھ بج رہے ہیں یہ ہمارے سونے کا وقت ہے۔"

گلاس خالی کئے گئے اور مجمع منتشر ہوگیا۔

(۲)

کونٹس اپنا اپنے سنگار کے کمرے میں ایک آئینہ کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کے گرد تین کنیزیں کھڑی تھیں ایک کے ہاتھ میں سرخی کا برتن تھا، دوسری کے ہاتھ میں سیاہ پنوں کا ڈبا، اور تیسری نے ایک بڑی سی ریشمی ٹوپی اٹھا رکھی تھی، کونٹس کو حسین نہیں کہا جاسکتا تھا، لیکن اُس میں ابھی تک شباب کا ناز و انداز موجود تھا۔ وہ

پچھلے پچاس سال کے فیشن کا لباس پہنتی تھی، اور اپنی آرائش پر کافی وقت صرف کرتی تھی۔
کمرے کی ایک کھڑکی میں اُس کی سہیلی لزابیٹا کشیدہ کاڑھ رہی تھی۔
ٹامسکی نے کمرے میں داخل ہو کر کہا: "سلام دادی اماں، سلام مادام لزی، دادی جان میں ایک درخواست کرنے آیا ہوں، میں ناچ میں ایک دوست کو لانا چاہتا ہوں۔"
"اچھا لے آنا، اور اُسے میرے سامنے پیش کرنا۔ کیا کل رات تم شہزادی کے رقص پر موجود تھے؟"
"ہاں، کیا اچھی رات تھی! ہم پانچ بجے تک رقص کرتے رہے۔ الٹسکی واقعی حسین لڑکی ہے۔"
"ہاں لیکن اگر تم حقیقی حسن دیکھنا چاہتے ہو تو اُس کی دادی شہزادی ڈاریا کو دیکھو ——— لیکن میری جان اب تو وہ ضعیف ہو گئی ہوگی۔"
ٹامسکی نے کہا "ضعیف! وہ تو پچھلے سات سالوں سے قبر میں سو رہی ہے!"
لزابیٹا نے سر اٹھا کر ٹامسکی کو ایک اشارہ کیا اور اُسے فوراً یاد آگیا کہ کونٹس کے سامنے اُس کی ہمعصر عورتوں کی موت کا ذکر کبھی نہیں کیا جاتا۔ لیکن کونٹس نے اس خبر کو اطمینان سے سنا اور کہا: "مر گئی؟ لیکن میں نے تو نہیں سنا! ہم ایک ساتھ ہی ملکہ کی کنیزیں مقرر ہوئی تھیں، جب ہم پیش ہوئیں تو ملکہ ———"
اور کونٹس نے اپنے پوتے کو اپنے زمانۂ شباب کی وہ داستان سنائی جو وہ اسے سو دفعہ پہلے بھی سنا چکی تھی پھر وہ اپنی تینوں کنیزوں سمیت ایک پردے کے پیچھے چلی گئی اور ٹامسکی اُس کی سہیلی لزابیٹا کے ساتھ تنہا رہ گیا۔
لزابیٹا نے ایک مدھم آواز میں پوچھا: "وہ کون ہے جسے تم مادام کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہو؟"
"نارومف، کیا تم اُسے جانتی ہو؟"
"نہیں، کیا وہ ——— کیا وہ ——— فوج میں ہے؟"
"ہاں"
"انجنیروں ——— میں؟"
"نہیں، ہارس گارڈز میں۔ لیکن تمہیں اُس کے انجنیروں میں ہونے کا خیال کیونکر آیا؟"
لزابیٹا کے ہونٹوں پر ایک خفیف سا تبسم نمودار ہو گیا لیکن وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔
ٹامسکی نے بلند آواز سے کہا "اچھا الوداع دادی اماں، الوداع لزابیٹا لیکن تمہیں نارومف کے انجنیروں میں ہونے کا خیال کیونکر آیا؟"

ٹامسکی باہر چلا گیا +

لزابیٹا نے اپنے تئیں تنہا پا کر اپنا کام سنبھالا اور پھر کھڑکی میں بیٹھ گئی۔ اُسی لمحہ نیچے بازار میں ایک نوجوان افسر نمودار ہوا اُسے دیکھ کر اُس کا رنگ سرخ ہو گیا۔ اُس نے سر جھکا لیا اور پھر کشیدہ کاڑھنے میں مشغول ہو گئی +

یہ نوجوان افسر جو بازار میں نمودار ہوا تھا، ٹامسکی کے اُس سوال کا جواب تھا جو اُس نے لزابیٹا سے دو مرتبہ کیا تھا۔

لزابیٹا کی زندگی قابل رشک نہ تھی۔ کوئی شخص اُن مشکلات کو بیان نہیں کر سکتا جنہوں نے اُسے ایک بڑھیا کی سہیلی بنا دیا تھا۔ گو کونٹس بدمزاج نہ تھی لیکن خود غرض اور خود بین ضرور تھی، جیسا کہ وہ لوگ اکثر ہوتے ہیں جو اعلیٰ سوسائٹی میں اُٹھنا بیٹھنا کم کر دیتے ہیں۔ وہ رقص و سرود کی محفل میں شریک ہوتی تھی، جہاں وہ جدید فیشن کا لباس پہن کر اور رخساروں پر غازہ مل کر ایک گوشہ میں بیٹھ جاتی تھی اور اپنے تئیں محظوظ کرتی تھی۔

کونٹس کے ساتھ لزابیٹا کی زندگی ایک مسلسل عذاب تھی۔ وہ چائے پینے بیٹھتی اور ضائع شدہ چینی کے لئے دشنام سنتی، وہ کونٹس کو ناول پڑھ کر سناتی اور مصنفین کی تمام بیہودگیوں کے لئے ذمہ دار ٹھہرائی جاتی تھی۔ سوسائٹی میں بھی اس لڑکی کو کوئی حیثیت حاصل نہ تھی ہر شخص اُسے جانتا تھا مگر اُس کی طرف بالکل توجہ نہ دیتا تھا۔ وہ رقص کرتی، لیکن صرف اُس وقت جب ایک جوڑا بنانا مقصود ہوتا۔ اُس کی دلی خواہش تھی کہ اُسے کوئی ایسا شخص ملے جو اُسے اِن تکالیف سے رہائی دلائے، اور اُس کی یہ زنجیریں توڑ دے۔ گو لزابیٹا کئی عورتوں سے زیادہ حسین تھی، لیکن اس کی طرف کوئی متوجہ نہ ہوتا تھا۔ کئی مرتبہ وہ کونٹس کے کمرے کی شان و شوکت سے بھاگ کر اپنے چھوٹے سے کمرے میں چلی گئی، جو پرانے پردوں، ایک پھٹے ہوئے قالین، ایک چھوٹے سے آئینے ایک پلنگ اور لکڑی کے صندوق سے آراستہ تھا، ایک شمعدان تھا جس میں موم بتی جلتی تھی، یہاں وہ تنہائی میں اکثر رویا کرتی تھی +

ایک صبح نارومف کے مکان والے جلسہ سے دو دن بعد اور اُس واقعہ سے جو آج ہوا ایک ہفتہ پہلے لزابیٹا کمرے کی کھڑکی میں اپنا کشیدہ لئے بیٹھی تھی، کہ معاً اُس کی آنکھیں نیچے بازار میں ایک نوجوان سپاہیں جو انجنیروں کا افسر معلوم ہوتا تھا اور جو خاموشی سے اُس کی طرف نگاہیں جمائے کھڑا تھا۔ لزابیٹا نے سر جھکا لیا اور

تیزی سے پھر کام میں مشغول ہوگئی۔ چند لمحہ بعد اُس نے سر اُٹھا کر پھر بازار میں دیکھا۔ افسر اُسی مقام پر کھڑا تھا۔ چونکہ وہ آج تک راہ چلتے نوجوانوں سے آنکھیں لڑانے کی عادی نہ تھی۔ اس لئے اس نے اپنی آنکھیں اپنے کشیدہ پر جمائے رکھیں اور دو گھنٹوں تک اسی طرح بیٹھی کام کرتی رہی، یہاں تک کہ کھانے کا وقت آن پہنچا۔ اُس نے پھر بازار میں دیکھا، افسر ابھی تک اسی مقام پر اسی انداز سے کھڑا تھا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد وہ پھر کھڑکی کی طرف گئی، لیکن اب افسر وہاں موجود نہ تھا۔ اُس نے اس واقعہ کے متعلق تمام خیالات کو اپنے دماغ سے نکال دیا۔

دو دن بعد وہ کونٹس کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو رہی تھی کہ اُس نے اس افسر کو مکان کے دائیں طرف کھڑا دیکھا۔ اُس نے سمور کے ایک کالر سے اپنے چہرے اور آنکھوں کو چھپا رکھا تھا۔ لزابیٹا کو بے حد تکلیف ہوئی، لیکن وہ اس کی موجودگی کی وجہ معلوم نہ کر سکی، اور جب وہ گاڑی میں بیٹھی تو کانپ اٹھی +

جب دونوں سیر سے واپس ہوئیں، تو لزابیٹا دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کھڑکی کی طرف دوڑی۔ افسر اپنی جگہ پر کھڑا تھا، اور اس کی تیز نگاہیں اُس کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ فوراً پیچھے ہٹ گئی۔ وہ ایک عجیب خیال کا شکار تھی جو آج زندگی میں پہلی دفعہ اُسے محسوس ہُوا تھا۔

اُس دن کے بعد ایک روز بھی ایسا نہ گزرا جب وہ نوجوان انجنیر اُس کی کھڑکی کے نیچے پھرتا نظر نہ آیا ہو۔ بہت جلد ایک خاموش رشتۂ الفت ان میں قائم ہوگیا۔ وہ کشیدہ کاڑھتی ہوئی اپنا سر اُٹھاتی اور اُس کی موجودگی سے لطف اندوز ہوتی۔ ہر دوسرے روز وہ آگے سے زیادہ دیر تک اپنی آنکھیں اُس پر جمائے رکھتی، اور عنفوانِ شباب کی تیز آنکھوں سے دیکھتی کہ ہر مرتبہ جب اُن کی محبت بھری نگاہیں دوچار ہوتی ہیں تو افسر کے زرد زرد رخساروں پر سُرخی دوڑ جاتی ہے۔ ایک ہفتہ کے بعد اُن کی یہ خاموش نظر بازی ایک لطیف اور دلکش تبسّم کی حد تک پہنچ گئی +

یہ نوجوان افسر ہرمن تھا +

وہ جرمن نسل سے تھا اور ایک معقول جائداد کا وارث تھا۔ وہ اس سرمایہ پر ناجائز تصرف کو گناہ سمجھتا تھا، اور اپنی آمدنی میں سے گزارا کیا کرتا تھا۔ وہ اپنے تئیں معمولی نفس پرستی کی بھی اجازت نہ دیتا تھا۔ وہ خود دار تھا، لیکن اُس کا دل ارمانوں سے لبریز تھا، وہ اپنے پُر سکون رویّے کی تہ میں تیز و تند محبت کے جذبات اور پریشان خیالات کو چھپائے رکھتا تھا۔ وہ طبعاً قمار باز تھا، لیکن آج تک اُس نے تاش کے پتّے کو ہاتھ نہ لگایا تھا، گو وہ ساری ساری رات بیٹھا اس کھیل کو شوق سے دیکھتا رہتا تھا +

اُس کے دل میں ٹامسکی کی سینٹ جرمین والی داستان اور تین پتّوں کے واقعے نے جوش و ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ اُسے اُس رات اِس کے سوا اور کسی بات کا خیال نہ آیا تھا۔ دوسرے دن شام کے وقت وہ اسی کے متعلق سوچتا ہوا سینٹ پیٹرز برگ کے بازاروں میں گھومنے گیا۔

اُس نے اپنے دل میں کہا "کاش بوڑھی کونٹس مجھے اپنا راز بتا دے! کاش وہ مجھے تین جیتنے والے پتّوں کے نام بتا دے! مجھے ضرور اُس سے ملنا چاہئے اور اُس کا اعتبار حاصل کرنا چاہئے۔ وہ اسّی سال کی بڑھیا ہے! شاید وہ اسی ہفتہ مر جائے۔ شاید کل ہی مر جائے! لیکن کیا یہ افسانہ سچّا ہے؟ نہیں نہیں میرے جیتنے والے تین پتّے کفایت شعاری پرہیزگاری اور کام ہیں! ہاں ہاں یہی میرے تین پتّے ہیں! یہی میرے سرمایہ کو دگنا بلکہ سہ گنا کرنے میں میری مدد کریں گے اُن کی مدد سے میں یقیناً خود مختاری اور مسرت حاصل کر لوں گا"۔

اسی طرح دل سے باتیں کرتے کرتے وہ ایک بازار میں ایک قدیم طرز کے مکان کے سامنے پہنچ گیا۔ اُس کی کھڑکیوں میں سے روشنی نکل رہی تھی اور بازار گاڑیوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ نئی گاڑیاں آ کر اپنی سواریوں کو جو زرق برق لباسوں میں ملبوس تھیں اس مکان کے سامنے اتارتی جاتی تھیں۔ ہرمن نے ایک چوکیدار سے پوچھا کہ یہ کس کا مکان ہے۔ اُس نے بتایا کہ یہ ٹامسکی کی دادی کونٹس اینا کا مکان ہے۔

وہ کانپ اٹھا۔ تین پتّوں کی داستان کا خیال پھر اُس پر غلبہ پانے لگا، اور اس مکان کی مالکہ اس کی دولت و ثروت اور اس کے راز کے متعلق جو صرف وہی جانتی تھی، سوچنے لگا۔ وہ اپنے غریبانہ مکان پر واپس پہنچ کر دیر تک جاگتا رہا، اور جب نیند اس پر غالب آ گئی تو وہ خواب میں بھی پتّوں، سبز پوش میز، اشرفیوں اور نوٹوں کو دیکھتا رہا۔ اُس نے دیکھا کہ وہ ہر دفعہ اپنی شرط دگنی کر دیتا ہے، اور جیت جیت کر اپنی جیب نوٹوں سے بھر رہا ہے۔ وہ اُٹھا اور اُسے معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ ایک دلکش خواب سے زیادہ نہ تھا۔ اُس نے ان خیالات سے نجات حاصل کرنے کے لئے پھر بازاروں میں پھرنا شروع کیا۔ کسی زبردست طاقت نے اُسے دھکیل کر پھر کونٹس کے مکان کے سامنے لا کھڑا کیا۔ وہ ٹھہر گیا اور غور سے دیکھنے لگا۔

ایک کھڑکی میں اُس نے ایک لڑکی کا سر دیکھا ——— نوجوان حسین، سیاہ بالوں والی لڑکی کا سر جو ایک دلکش انداز میں کسی کتاب پر یا کسی کشیدہ پر جھکا ہوا تھا۔ پھر اُس لڑکی نے سر اوپر کو اٹھایا اور ہرمن کو ایک لمحے کے لئے اُس کی سیاہ مست آنکھیں نظر آئیں۔

اس ایک لمحے نے ہرمن کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔

(۳)

ایک دن جب کہ دو نوکر بڑی مشکل سے کونٹس کو گاڑی میں بٹھا رہے تھے، لزابیٹا نے دیکھا کہ وہ نوجوان افسر اُس کے بالکل قریب کھڑا ہے۔ اُس نے محسوس کیا کہ اُس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ہے۔ وہ خوف سے کانپ اُٹھی۔ ایک لمحہ بعد وہ اس کی انگلیوں میں ایک خط دے کر غائب ہو گیا۔ لزابیٹا نے اُسے تیزی سے دستانے میں چھپا لیا اور گاڑی میں بیٹھ گئی +

دورانِ سیر میں اُس نے نہ کوئی بات کی اور نہ کوئی چیز دیکھی۔ اُس نے کونٹس کے ہر سوال کا جواب بالکل مہمل سا دیا۔ اور اس سے کونٹس کو بے حد تکلیف ہوئی +

گھر واپس آ کر لزابیٹا اپنے کمرے میں گئی، اُس خط کو دستانے سے نکالا، اور پڑھنا شروع کیا۔ اس میں اظہارِ محبت تھا۔ خیالات اعلیٰ اور محبت سے لبریز تھے، جو ایک جرمن ناول میں سے لفظ بلفظ ترجمہ کئے گئے تھے لزابیٹا چونکہ جرمن زبان نہ جانتی تھی، اس لئے وہ اِس عبارت سے بہت محظوظ ہوئی +

لیکن وہ پریشان تھی۔ اُس کی زندگی کا یہ پہلا راز تھا۔ ایک نامعلوم الاسم انسان کا محبت نامہ! وہ اس کی دلیری کے خیال سے کانپ اٹھی۔ پھر اپنی بے حیائی پر افسوس کرنے لگی۔ اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے +

کیا وہ کھڑکی میں بیٹھ کر کام کرنا چھوڑ دے اور ایک سرد مہر نگاہ سے نوجوان افسر کو بددل کر دے؟ ـــــ کیا اس کا خط اُسے واپس بھیج دینا چاہیئے؟ ـــــ یا اُسے ایک فیصلہ کن جواب دینا چاہیئے؟ کون سی راہ بہتر ہے؟ یہ تھے خیالات جو غریب لزابیٹا کو پریشان کر رہے تھے۔ اُسے کوئی مشورہ بھی نہ دے سکتا تھا، کیونکہ وہ اپنی مشیر آپ ہی تھی + آخر اُس نے جواب دینے کا فیصلہ کر لیا +

اُس نے کاغذ اور قلم اُٹھایا۔ اُس نے کئی دفعہ خط شروع کیا اور پھاڑ دیا بعض دفعہ تحریر بہت پھیکی تھی، اور بعض دفعہ خودداری سے یکسر خالی۔ آخر کار وہ چند ایسی سطور لکھنے میں کامیاب ہو گئی جنہوں نے اسے مطمئن کر دیا +

اُس نے لکھا: "مجھے یقین ہے کہ تم مجھے ایک شریف انسان کی طرح محبت کرتے ہو اور تمہارے دل میں اپنے اِس بے باکانہ برتاؤ سے مجھے ناراض کرنے کی کوئی خواہش نہیں۔ لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اس طرح ہماری دوستی نہیں نبھ سکتی۔ میں تمہارا خط واپس بھیج رہی ہوں، اور امید کرتی ہوں کہ تم مجھے اپنی بے باکی پر افسوس کرنے کا کوئی موقع نہ دو گے۔"

دوسرے دن جب اُس نے بازار میں ہرمن کو دیکھا تو اُس نے کام کرنا بند کر دیا اور کھڑکی کھول کر خط نیچے

پھینک دیا۔ اُسے یقین تھا کہ نوجوان افسر ضرور اُسے حاصل کرے گا۔ ہرمن نے وہ خط فوراً اٹھا لیا۔ خط زیادہ ناامید کرنے والا نہ تھا، اس لئے وہ مطمئن ہو کر گھر واپس آ گیا۔

ہر روز لزابیٹا کو کسی نہ کسی طرح ایک خط مل جاتا۔ اب خطوط میں جرمن ناولوں کے تراجم نہ ہوتے تھے۔ کیونکہ اُن میں زیادہ جوش اور سرگرمی کا اظہار نہ پایا جاتا تھا۔ بلکہ وہ ایک ایسے انداز میں لکھے ہوتے تھے جو سادہ اور پُر از محبّت ہوتا تھا۔ بہت جلد ان خطوط کی خوش کلامی لزابیٹا کے حجاب پر غالب آ گئی۔ اب وہ ان خطوط کے ملنے سے مسرور ہوتی تھی اور فوراً جواب لکھنے کے لئے تیار ہو جاتی تھی۔ آخر ایک دن اُس نے خط پھینکا جس کا مضمون یہ تھا:۔

"آج رات سفیر کے ہاں محفلِ رقص ہے۔ کونٹس جا رہی ہے، ہم دو بجے تک وہیں رہیں گے۔ میں تمہیں بتاتی ہوں کہ تم مجھ سے کسی مزاحمت کے بغیر کیونکر مل سکتے ہو، سنو جب کونٹس ۱۱ بجے محفل میں شریک ہونے کے لئے جائے گی تو سب نوکر اپنے اپنے کام میں مشغول ہونگے، صرف سوس ڈیوڑھی میں موجود ہوگا، لیکن وہ ہمیشہ اپنے ڈبے میں سویا رہتا ہے۔ ۱۱ بجے کے بعد فوراً مکان میں داخل ہو جاؤ، اور جتنی تیزی سے ہو سکے سیڑھیوں پر چڑھ جاؤ۔ اگر تمہیں راستہ میں کوئی ملے تو تم پوچھ سکتے ہو کہ کونٹس موجود ہے یا نہیں۔ بلاشبہ تمہیں بتایا جائے گا کہ وہ باہر ہے۔ اس حالت میں تم چلے جانے پر ہی قناعت کرنا۔ لیکن قیاس غالب ہے کہ تم سے راستہ میں کوئی مزاحم نہ ہوگا، کونٹس کی تمام کنیزیں بہت دُور ہوتی ہیں۔ ملاقات کے کمرے میں پہنچ کر بائیں طرف مڑ جاؤ اور سیدھے چلتے جاؤ یہاں تک کہ تم کونٹس کے کمرے میں پہنچ جاؤ۔ اس میں ایک لمبے پردے کے پیچھے دو دروازے ملیں گے، دائیں جانب کا دروازہ ایک تاریک غیر مستعمل چھوٹے سے کمرے میں کھلتا ہے اور بائیں جانب کا ایک غلام گردش میں، جس کے خاتمے پر ایک چھوٹا سا پیچ دار زینہ ہے۔ یہ میرے کمرے کو جاتا ہے"۔

(۴)

دس بجے کے بعد ایک شیر کی مانند جو اپنے شکار پر تاک لگائے بیٹھا ہو ہرمن مقررہ وقت کے انتظار میں جوش سے کانپتا ہوا کونٹس کے مکان کے دروازے کے باہر پھر تا رہا۔ ہوا تیز تھی اور برف گر رہی تھی لیمپوں کی روشنی مدھم تھی اور بازار سنسان تھا۔

آخر کونٹس کی گاڑی دروازے پر آ کر ٹھہری۔ ہرمن نے دو نوکروں کو پژمردہ، ضعیف عورت کو اٹھاتے

اور نرم گدیلوں پر بٹھاتے دیکھا۔ ایک لمحہ بعد لزابیٹا ایک لبادے میں لپٹی اور سر پر پھولوں کا ہار پہنے نکلی اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ گاڑی میں سوار ہوگئی۔ دروازہ بند ہوگیا اور گاڑی نرم اور سفید برف پر چلنے لگی۔

ہرمن اِدھر اُدھر گھومتا رہا، بہت جلد وہ ایک لیمپ کے پاس پہنچ گیا۔ اپنی گھڑی دیکھی اا بجنے میں ۲ منٹ باقی تھے۔ وہ لیمپ کے کھمبے کے ساتھ لگ کر انتظار کرنے لگا، ٹھیک گیارہ بجے وہ مکان کی ڈیوڑھی میں داخل ہؤا، اور یہ دیکھ کر کہ وہاں دیکھنے والا کوئی بھی نہیں بڑا خوش ہؤا، وہ تیزی سے سیڑھیوں پر چڑھا، چند لمحہ بعد وہ ملاقات کے کمرے میں تھا، جہاں ایک نوکر ایک پرانی آرام کرسی پر سو رہا تھا۔ ہرمن تیزی سے اُس کے پاس سے گزر گیا اور دیوان خانے میں پہنچا جہاں کوئی روشنی نہ تھی۔ صرف ملاقات کے کمرے کی روشنی راستہ دکھا رہی تھی۔ آخر وہ کونٹس کی خوابگاہ میں پہنچ گیا۔

ایک سنہری لیمپ اِس کمرے کو روشن کر رہا تھا۔ قیمتی آرام کرسیاں اور صوفے جو رنگ برنگ کے چینی ریشم کر ڈھکے تھے دیواروں کے ساتھ ساتھ قرینے سے رکھے تھے۔ ہر کونے میں قسم قسم کے ظروف، ٹوکریاں، پنکھے اور ہزاروں کھلونے جن میں عورتوں کو شغف ہوتا ہے پڑے تھے۔

ہرمن ایک پردے کے پیچھے ہوگیا۔ اس نے دونوں دروازوں کو دیکھا۔ دایاں جو تاریک کمرے میں جاتا تھا اور بایاں جو غلام گردش میں کھلتا تھا، اُس نے موخرالذکر دروازے کھول کر اس چھوٹے سے زینے کو دیکھا جو غریب لزابیٹا کے کمرے کو جاتا تھا۔ پھر اُس نے وہ دروازہ بند کر دیا اور تاریک کمرے میں چلا گیا۔

وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ مکان میں ہر طرف خاموشی تھی۔ دیوان خانے کے کلاک نے بارہ بجائے اور پھر خاموشی چھاگئی۔ ہرمن ایک دیوار کے ساتھ تکیہ لگائے تاریک کمرے میں کھڑا تھا۔ اُس کا دل ایک ایسے آدمی کے دل کی طرح دھڑک رہا تھا جس نے تمام خطرات کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہو۔

اسی حالت میں اُس نے ایک بجنے کی آواز سنی، پھر دو بجے اس کے تھوڑی دیر بعد دور سے گاڑی کے پہیوں کی آواز آئی اور مکان کے پاس آکر رک گئی۔ نوکروں کی پریشان آوازیں آنے لگیں۔ آخر خود کونٹس کمرے میں داخل ہوئی جو ایک چلتی پھرتی لاش معلوم ہوتی تھی۔ وہ ایک آرام کرسی پر دراز ہوگئی۔ ہرمن دروازے کے ایک شگاف میں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اُس نے لزابیٹا کو اپنے پاس سے گزرتے دیکھا۔ پھر چھوٹے پیچ دار زینے پر چڑھتے وقت اُس کے قدموں کی آہٹ سنی۔ اُس وقت اُس نے اپنے دل میں ایک بات محسوس کی جو پشیمانی سے مشابہ تھی، لیکن بہت جلد اُس نے ان خیالات پر غلبہ پالیا، اور ایک دفعہ پھر اُس کا دل پتھر کی مانند

سخت ہوگیا۔

اکثر ضعیف لوگوں کی طرح کونٹس بھی بے خوابی کا شکار رہتی - جب اُس کے سونے کی تیاریاں مکمل ہو چکیں تو اُس نے اپنی کنیزوں کو کھڑکی کے پاس آرام کرسی رکھنے کا حکم دیا - اور پھر انہیں رخصت کر دیا - شمعیں بجھا دی گئیں - صرف ایک مدھم سی روشنی جو ملاقات کے کمرے والے لیمپ سے آرہی تھی کمرے میں دکھائی دیتی تھی کونٹس زرد ہو رہی تھی - اُس کا چہرہ پژمردہ تھا اور وہ کرسی پر ادھر اُدھر ہل رہی تھی اُس کی آنکھیں حرکت نہ کرتی تھیں، بلکہ وہ ایک مردے کی آنکھوں کی طرح ساکن تھیں -

فوراً اُس کی حالت متغیر ہوگئی - اُس کے ہونٹ کانپنے لگے اور اُس کی آنکھیں اِدھر اُدھر پھرنے لگیں ایک نامعلوم آدمی اُس کے سامنے آکھڑا ہوا - یہ ہرمن تھا +

اُس نے ایسی آواز میں جو مدھم تھی لیکن جو صاف سنی جاسکتی تھی کہا: "مادام ڈرو نہیں - خدا کے لئے ڈرو نہیں - میرے دل میں تمہیں گزند پہنچانے کی کوئی خواہش نہیں - بلکہ میں صرف تم سے ایک مہربانی کا طالب ہوں"

ضعیفہ نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا، گویا وہ اس کی بات کا مطلب نہ سمجھی ہو - ہرمن نے خیال کیا شاید وہ بہری ہے اور اُس نے جھک کر اُس کے کان میں پھر وہی بات دہرائی - کونٹس پھر خاموش رہی -

ہرمن نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا: "تم مجھے ساری زندگی کے لئے ایک بے پایاں مسرت دے سکتی ہو میں جانتا ہوں کہ تم مجھے وہ تین پتّے بتا سکتی ہو جو ــــــ"

وہ ٹھہر گیا - بلاشبہ کونٹس سمجھ گئی تھی کہ وہ کیا چاہتا ہے، لیکن وہ خاموش رہی، گویا وہ کسی موزوں جواب کی تلاش میں ہو -

پھر کہنے لگی: "یہ مذاق تھا - خدا کی قسم یہ مذاق تھا +"

ہرمن نے غصّے سے کہا: "نہیں مادام یہ مذاق نہ تھا، کیا تم چپلٹسکی والے معاملہ کو بھول گئیں؟"

ایک لمحے کے لئے کونٹس کے چہرے سے پریشانی اور اضطراب کے آثار نمایاں ہوئے لیکن بہت جلد پہلا سا سکون واپس آگیا -

ہرمن نے کہا: "کیا تم مجھے تین جیتنے والے پتّے نہیں بتا سکتیں؟"

کونٹس بدستور خاموش رہی - اُس نے پھر کہا: "اپنے دل میں اس راز کو کیوں چھپاتی ہو؟ کیا اپنے پوتوں

کے لئے ؛ وہ تو اس کے بغیر بھی امیر کبیر ہیں، وہ روپیہ کی قدر نہیں جانتے، تمہارے تین پتّے اُن کے کس کام؟
لیکن میں ؛ میں ایک پختہ ارادے کا انسان ہوں اور روپے کی قدر و قیمت کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ مجھے بتا دو کہ وہ تین پتّے کون کون سے ہیں "

وہ جواب کی توقع میں رک گیا، لیکن کونٹس نے زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکالا۔

ہرمن دوزانو ہو کر کہنے لگا: "اگر تمہارا دل کبھی محبت سے آشنا ہوا ہے، اگر تمہیں اس کی شیریں مسرتیں یاد ہیں، اگر کبھی ایک نوزائیدہ بچّے کی بھولی بھالی شکل دیکھ کر تمہارے لبوں پر تبسّم نمودار ہوا ہے، اگر کبھی کسی انسانی خیال نے تمہارے دل کو متاثر کیا ہے، تو میں تمہیں ایک خاوند، عاشق، والدہ اور جو کچھ زندگی میں مقدّس ہے اُس کا واسطہ دے کر التجا کرتا ہوں کہ میری درخواست کو رد نہ کرو! مجھے اپنا راز بتا دو! شاید کوئی خوفناک گناہ اس راز سے وابستہ ہے ——— دائمی مسرت کا نقصان ؟ کیا تم شیطانی طاقتوں سے کوئی عہد و پیمان کرنا چاہتی ہو؟ اگر چاہتی ہو تو خیال کرو کہ تم ضعیف ہو اور بر لبِ مرگ ہو۔ مَیں تمہارے سارے گناہ اپنے ذمے لینے اور خدا کے سامنے جوابدہ ہونے کے لئے تیار ہوں! مجھے وہ راز بتا دو۔ سوچو! ایک انسان کی مسرت تمہارے اختیار میں ہے۔ نہیں! صرف میری نہیں، بلکہ میرے بچّوں کی اور بچّوں کے بچّوں کی بھی، وہ سب تمہیں یاد رکھیں گے اور ایک سرپرست کی طرح ہمیشہ تمہاری تعظیم کریں گے!"

ضعیف کونٹس نے ایک لفظ بھی زبان سے نہ کہا، ہرمن اُٹھا اور دانت پیس کر چلّانے لگا: "ملعون بڑھیا، میں جانتا ہوں کہ کس طرح یہ راز معلوم کیا جا سکتا ہے"۔

اور اُس نے جیب سے ایک پستول نکالا۔

پستول دیکھ کر کونٹس پھر مضطرب ہوئی، اس کا سر زیادہ تیزی سے کانپنے لگا۔ اُس نے اپنے بازو پھیلا دیئے گویا وہ پستول سے بچنا چاہتی ہو، پھر معًا وہ کرسی پر پیچھے گر پڑی اور بے حس و حرکت لیٹی رہی۔

ہرمن نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہا: "اس قدر مکّار نہ بنو، اور سیدھی طرح مجھے وہ راز بتا دو۔ میں آخری دفعہ پھر التجا کرتا ہوں کہ مجھے وہ تین پتّے بتا دو۔ کیا بتاتی ہو یا نہیں؟"

کونٹس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہرمن خوف اور استعجاب سے کانپ گیا۔ کونٹس مر چکی تھی۔

(۵)

لزابیٹا اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ وہ ابھی تک رقص کے لباس ہی میں تھی اور خیالات میں غرق تھی۔

گھر واپس آکر اُس نے اپنی کنیز کو یہ کہہ کر کہ وہ خود ہی لباس اتارے گی چلے جانے کا حکم دیا تھا، اور زینہ پر چڑھ کر کمرے میں چلی گئی تھی۔ وہ ہرمن کے خیال سے خوفزدہ تھی، اور چاہتی تھی کہ وہ نہ آیا ہو۔ جب اُس نے اُسے وہاں نہ پایا تو شکر کیا۔ وہ خیالات میں غرق کھڑی رہی، اور رقص کا لباس اتارے بغیر اس محبت کے گذشتہ واقعات کو دہراتی رہی، جو اتنا تھوڑا عرصہ قائم رہی تھی، اور تاہم اتنی زیادہ ہوگئی تھی +

وہ یونہی بیٹھی تھی۔ اُس کے ہاتھوں پر دستانے نہ تھے، اُس کے کندھے ننگے تھے اور اُس کا سر اُس کے سینے پر جھکا ہوا تھا۔ معاً دروازہ کھلا اور ہرمن کمرے میں داخل ہوا۔

وہ خوف سے چونکی، اور کانپ کر پوچھنے لگی: "تم کہاں تھے؟"

ہرمن نے جواب دیا "میں کونٹس کی خواب گاہ میں تھا۔ وہ مر گئی ہے"+

"او میرے اللہ۔ تمہارا اس سے کیا مطلب ہے؟"

اُس نے آرام سے کہا "وہ مر گئی ہے، اور مجھے خوف ہے کہ اس کی موت کا سبب میں ہی ہوں"+

لزابیٹا نے حیرت سے اُس کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھا۔ ہرمن کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا اور اطمینان آمیز لہجے میں اُسے سارا واقعہ سنانے لگا +

لزابیٹا بیٹھی خوف سے سنتی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا وہ محبت بھرے خطوط، وہ شعلہ زن فقرات، وہ عشق بازی محض جھوٹ تھی؟ ان خطوط میں سے ایک بھی سچی محبت سے متاثر ہو کر نہیں لکھا گیا تھا؟ کیا ہرمن کی روح صرف سونے کے لالچ سے لبریز تھی؟ کیا صرف میں نے ہی حقیقی طور پر اپنا دل اُسے دیا تھا؟ اُس نے محسوس کیا کہ وہ ایک ظالم لٹیرے کے ہاتھ میں صرف ایک آلۂ کار تھی۔ اپنی ضعیف مالکہ کے قاتل کے ہاتھ میں۔ اور وہ فرطِ غم سے ہچکیاں لے لے کر رونے لگی +

ہرمن خاموشی سے اُسے روتا دیکھتا رہا، ناخوش حسینہ کے آنسو اور اس کا چہرہ جو غم کی وجہ سے زیادہ دلکش ہو گیا تھا، اُس کے پتھر دل کو نرم نہ کر سکا۔ وہ صرف کونٹس کی موت پر افسوس کر رہا تھا، صرف ایک خیال اُسے رہ رہ کر تکلیف پہنچا رہا تھا اور وہ یہ کہ وہ راز جس کے متعلق اُسے بڑی بڑی توقعات تھیں اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کونٹس کے ساتھ دفن ہو جائے گا +

تھوڑا عرصہ خاموش رہنے کے بعد لزابیٹا چلائی "آہ تم ظالم ہو!"+

ہرمن نے سرد مہری سے جواب دیا "میرا ارادہ اُسے مارنے کا بالکل نہ تھا۔ میرا پستول خالی تھا"+

کچھ عرصے تک ایک دوسرے کی طرف دیکھے اور زبان سے کوئی لفظ نکالے بغیر وہ یونہی کھڑے رہے پو پھوٹنے لگی تھی۔ لزابیٹا نے شمع بجھادی۔ اُس نے اپنے آنسو پونچھے اور نگاہیں ہرمن کے چہرے پر جمادیں۔

آخر اُس نے پوچھا"تم اب یہاں سے باہر کیسے نکلو گے؟ میرا ارادہ تمہیں خفیہ زینہ سے باہر نکالنے کا تھا، لیکن اُس کے لئے کونٹس کے کمرے میں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ میں بے حد خوفزدہ ہوں"

"اگر تم مجھے زینے کا پتہ بتادو تو میں خود چلا جاؤں گا"

وہ اُٹھی اور ایک دراز سے چابی نکال کر اُس نے ہرمن کو دی اور چور دروازے کا پتہ بتادیا۔

وہ پیچ دار زینے سے اُتر کر کونٹس کے کمرے میں داخل ہوا جہاں اُسے ایک چھوٹا سا دروازہ ملا، جس کے کھلنے سے ایک زینہ نظر آیا۔

زینے کے خاتمے پر ایک اور دروازہ تھا جو چابی لگانے سے کھل گیا، پھر وہ ایک غلام گردش میں پہنچا اور چند لمحہ بعد وہ بازار میں تھا۔

(۶)

اِس منحوس رات کے تین دن بعد صبح کے نو بجے ہرمن گرجا میں داخل ہوا، جہاں شہر کے تمام امیر لوگ بوڑھی کونٹس کی نعش کی تجہیز وتکفین کی آخری رسوم ادا کرنے کے لئے جمع تھے۔ اُس نے کسی قسم کی پشیمانی محسوس نہ کی گو وہ اس حقیقت سے پوری طرح باخبر تھا کہ وہی اس بیچاری کا قاتل ہے۔ اس کے دل میں مختلف اوہام پیدا ہو رہے تھے۔ اُسے یہ خیال نہ چھوڑتا تھا کہ شاید مردہ کونٹس اُس پر شیطانی طاقتوں کی مشق کرے گی۔ اور اب وہ اس لئے آیا تھا کہ اُس کے جنازے پر حاضر ہو کر اُس کی روح کو تسکین دے۔

گرجا لوگوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ اِس لئے اُسے نشست حاصل کرنے میں بڑی دقت ہوئی۔ نعش سفید ساٹن کے کفن میں لپٹی ہوئی مخمل کے ایک شامیانے کے نیچے ایک شاندار تختے پر رکھی تھی۔

وعظ مروجہ دعا کے ساتھ ختم ہوگیا۔ ایک مشہور مبلغ نے مردہ عورت کی خوبیوں کو خوب بڑھا چڑھا کر بیان کیا، اس کے بعد رشتہ دار کونٹس کی نعش کو آخری الوداع کہنے کے لئے نزدیک آئے۔

ہرمن بھی تابوت کے نزدیک گیا، کچھ دیر کو وہ زمین پر دوزانو بیٹھ گیا، پھر ایک مردہ کی طرح زرد ہو کر اُٹھا اور کونٹس کا چہرہ دیکھنے کے لئے آگے جھکا۔ معاً اُسے معلوم ہوا کہ مردہ کونٹس نے آنکھیں کھول دی ہیں اور اُس کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھ رہی ہے۔

وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا اور سر کے بل سیڑھیوں پر گر پڑا - اُسے اٹھاتے وقت گرجا میں ہل چل پڑ گئی - اسی اثنا میں لزابیٹا بے ہوش ہو گئی - اس واقعے نے تجہیز و تکفین کی شان کو پھیکا کر دیا - کئی لوگ سرگوشیاں کرنے لگے کہ ہو نہ ہو یہ نوجوان افسر جو اس قدر متاثر ہوا ہے ضرور مردہ کونٹس کا کوئی گمنام نزدیکی رشتہ دار ہے +

دن کے باقی ماندہ حصے میں ہرمن سخت بے آرام اور بے چین رہا - خلافِ عادت اُس نے اس ہوٹل میں جہاں وہ کھانا کھایا کرتا تھا خوب شراب پی ، اس امید پر کہ شاید اس طرح وہ ڈراؤنے خیالات سے نجات حاصل کرے - لیکن شراب نے اُس کے تصورات اور خیالات کو اور بھڑکا دیا - اُسی وقت وہ گھر واپس آیا اور لباس اتارے بغیر بستر پر دراز ہو گیا ، اور سو گیا -

جب وہ بیدار ہوا تو رات ابھی سر پر کھڑی تھی اور چاندنی اُس کے کمرے میں داخل ہو رہی تھی - اُس نے گھڑی دیکھی تین بجنے میں پندرہ منٹ تھے - اب اُس کے دل میں سونے کی کوئی خواہش نہ تھی ، اس لئے وہ اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا اور بوڑھی کونٹس کا خیال کرنے لگا +

معاً اُس نے کسی شخص کو گلی میں کمرے کی کھڑکی کے پاس کھڑے دیکھا ، گویا کوئی کمرے میں جھانک رہا ہو ، اور پھر جلدی سے آگے چلا گیا - ہرمن نے بالکل توجہ نہ دی - پھر اُسے معلوم ہوا کہ کسی نے بیرونی کمرے کا دروازہ کھولا ہے - اُس نے خیال کیا کہ شاید یہ اس کا اردلی ہے جو حسبِ معمول مخمور ہو کر مٹر گشت سے واپس آیا ہے لیکن غور سے سننے کے بعد اُسے معلوم ہوا کہ یہ اُس کے قدموں کی آہٹ نہیں - کوئی شخص دبے پاؤں نزدیک آ رہا تھا -

دروازہ کھلا ، اور ایک عورت جو سفید لباس پہنے ہوئے تھی ، کمرے میں داخل ہوئی -

ہرمن نے خیال کیا کہ یہ ضرور اُس کی بوڑھی دایا ہے ، اور حیران ہوا کہ اس وقت وہ کیوں آئی ہے لیکن ایک لمحہ بعد وہ عورت اس کے بستر کے پاس کھڑی تھی ــــــ یہ کونٹس تھی -

عورت نے بلند آواز میں کہا : " میں اپنی خواہش کے خلاف تم سے ملنے آئی ہوں ، میں تمہاری درخواست منظور کرنے پر رضامند ہو گئی ہوں ، سنو ــــ تگی ــــ ستا ــــ اِکا ــــ یہ جیتنے والے پتّے ہیں ، لیکن یاد رکھو کہ ۲۴ گھنٹوں کے اندر ایک سے زیادہ پتّوں کی شرط نہ لگانا ، اور اس کے بعد پھر کبھی جوا نہ کھیلنا ! میں تمہیں معاف کرتی ہوں بشرطیکہ تم میری سہیلی لزابیٹا سے شادی کر لو "

یہ کہہ کر وہ دروازہ کی طرف مڑی ، اور غائب ہو گئی - ہرمن نے بیرونی کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز

سنی، اور پھر اُس نے کونٹس کے جسم کو گلی میں جاتے دیکھا ایک لمحے کے لئے وہ کھڑکی کے پاس اُسے دیکھنے کے لئے رُکی اور پھر غائب ہوگئی ۔

کچھ عرصے تک وہ حیرت میں غرق رہا، پھر اُٹھ کر بیرونی کمرے میں گیا، اُس کا اردلی زمین پر گہری نیند سو رہا تھا اُس نے اُسے بڑی مشکل سے جگایا، لیکن اُس نے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا۔ پھر بازار والا دروازہ دیکھا۔ وہ مقفل تھا۔ ہرمن اپنے کمرے میں واپس آگیا اور اُس نے جلد جلد سارے حالات قلمبند کر لئے ۔

(۷)

تگی ـــــ ستا ـــــ اکا ـــــ! اس خیال نے ہرمن کے دماغ میں کونٹس کے آخری لمحات کی یاد کو تازہ کر دیا ۔

تگی ـــــ ستا ـــــ اکا ـــــ! یہ الفاظ پھر پل بھر کے لئے بھی اُس کے دماغ سے نہ نکلے، سارا سارا دن یہ الفاظ اس کی زبان پر رہتے ۔ اگر وہ بازار میں کسی حسین عورت کو دیکھتا تو آہستہ سے کہتا "کیسا خوبصورت جسم ہے بالکل پان کی تگی ہے!" اگر اس سے کوئی وقت پوچھتا تو وہ جواب دیتا "اینٹ کے ستے میں ۵ منٹ!" اگر اُسے کوئی موٹا تازہ آدمی ملتا تو وہ اُسے حکم کے اکے کی یاد دلا دیتا ۔

اُس کے تمام خیالات ایک مسئلہ پر مرتکز تھے، اور وہ یہ کہ وہ اُس علم کو جو اسے اتنی محنت کے بعد حاصل ہوا تھا کیونکر استعمال کرے؟ اُس نے رخصت حاصل کر کے سفر کا خیال کیا۔ اُس نے سوچا کہ اس طرح شاید پیرس میں کوئی قمار خانہ مل جائے جہاں اُس کے لئے صرف تین شرطیں جیت کر دولت حاصل کرنا ممکن ہو لیکن قسمت نے اس کی مشکل حل کر دی ۔

ماسکو میں ایک قمار خانہ تھا، جس کے مالک کا نام چیکالنسکی تھا۔ وہ کروڑپتی تھا، اُس نے اپنی طویل زندگی میں جو قمار بازی پر قربان تھی، صرف چند روپے ہارے تھے اور نوٹوں کے نوٹ جیتے تھے ۔ وہ ایک شاندار مکان کا مالک تھا، اور عام طور پر لوگوں میں ہر دلعزیز اور قابلِ عزت سمجھا جاتا تھا۔ یہی چیکالنسکی اب سینٹ پیٹرز برگ میں وارد ہوا۔ بہت جلد اس کا مکان دارالحکومت کے قمار بازوں سے بھر گیا۔ جنھوں نے رقص و سرود کی محفلوں میں جانا بالکل چھوڑ دیا، اور یہیں کے ہو رہے ۔

ناروموف ہرمن کو چیکالنسکی کے مکان پر لے گیا ۔

وہ کمروں کے ایک لمبے سلسلے میں سے گزرے جن میں خوشامدی نوکر کھڑے تھے۔ سارا مکان مہمانوں سے بھرا

تھا۔جرنیل اور پریوی کونسل کے ارکان گنجفہ کھیلنے میں مشغول تھے،نوجوان افسر آرام کرسیوں پر لیٹے قلفیاں کھا رہے تھے اور لمبے لمبے پائپ پی رہے تھے۔سب سے بڑے کمرے میں ایک لمبی سبزپوش میز کے گرد کھلاڑی جمع تھے،میزبان "فارو" کے ایک کھیل میں ساہوکار کا پارٹ ادا کر رہا تھا۔اُس کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ تھی۔اُس کا چہرہ مہربان اور امیرانہ تھا۔اُس کے بال برف کی مانند سفید تھے۔خوش مذاقی،شفقت اور تندرستی اُس کے خدو خال سے ٹپکی پڑتی تھی۔ناروموف نے اُس سے ہرمن کا تعارف کرایا اور چیکالنسکی نے ہاتھ ملا کر خوش آمدید کہی اور پھر پتّے کاٹنے میں مشغول ہو گیا۔

پتّوں کی تقسیم میں کچھ عرصہ لگا،کیونکہ تیس سے زیادہ پتّے واپس کئے گئے تھے۔ہر پتّے کی وصولی کے بعد چیکالنسکی جیتنے والوں کو شرط دگنی کرنے کا موقع دینے کے لئے ٹھہر جاتا،روپے ادا کرتا اور ہارنے والوں کے نازیبا کلمات بڑی تہذیب اور شائستگی سے سنتا اور اس سے بھی زیادہ شائستگی کے ساتھ اُن پتّوں کے کونے سیدھے کرتا جو کھلاڑیوں کے بے پروا ہاتھوں سے مڑ جاتے۔جب پتّوں کی تقسیم ختم ہو گئی تو اُس نے اُن کو ملا دیا اور پھر ایک تازہ تقسیم کے لئے تیار ہو گیا۔

ہرمن نے اپنا بازو ایک موٹے تازے آدمی کے کندھے پر سے جو سب سے زیادہ جیت رہا تھا،آگے بڑھا کر کہا:"کیا آپ مجھے ایک پتّا لینے کی اجازت دیں گے؟"

چیکالنسکی اُس کی طرف دیکھ کر مسکرایا،اور رضامندی ظاہر کرنے کے لئے جھکا۔

ناروموف ہنسا اور اپنے دوست کو گذشتہ پارسائی سے نجات حاصل کرنے پر مبارکباد دینے لگا،اور کہنے لگا کہ خدا قماربازی کی ابتدا میں تمہاری قسمت اچھی کرے۔

ہرمن نے اپنے پتّے کی پشت پر اپنی شرط لکھ کر کہا:"یہ لیجئے!"

چیکالنسکی نے آنکھیں جھپک کر پوچھا:"کتنی؟ معاف کیجئے میری نظر زیادہ صاف نہیں ہے۔"

ہرمن نے کہا:"۴۷ ہزار روبلز!"

اِن الفاظ پر سارے کھلاڑیوں کے سر اُٹھ گئے اور ہر آنکھ بولنے والے کے چہرے پر گڑ گئی۔

ناروموف نے دل میں کہا:"یہ دیوانہ ہو گیا ہے!"

چیکالنسکی نے مسکرا کر کہا:"مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ آپ کی شرط بہت زیادہ ہے۔اس کھیل میں زیادہ سے زیادہ شرط ۲۷۵ روبلز مقرر ہے۔"

ہرمن نے جواب دیا: "بہت خوب لیکن کیا آپ میری یہی شرط منظور فرمائیں گے؟"

چیکالنسکی یہ ظاہر کرنے کو کہ اُسے یہ شرط منظور ہے جھکا اور کہنے لگا: "میں چاہتا ہوں کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ گو مجھے اپنے دوستوں پر اعتبار ہے، لیکن جب تک نقد روپیہ ادا نہ کر دیا جائے میں کوئی پتّا تقسیم نہیں کرتا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کا صرف وعدہ ہی کافی ہے، لیکن میں ممنون ہوں گا اگر آپ کھیل کو باقاعدہ بنانے اور حساب کتاب کی الجھن سے بچنے کے لئے اپنی شرط اپنے پتّے پر رکھ دیں"۔

ہرمن نے اپنی جیب سے نوٹوں کا ایک پلندا نکالا اور چیکالنسکی کو دے دیا، جس نے اُسے دیکھ کر پتّے پر رکھ دیا۔

اُس نے پتّے تقسیم کئے، دائیں طرف ایک دہلا تھا اور بائیں طرف ایک تگّی۔

ہرمن نے اپنا پتّا دکھا کر کہا: "میں جیت گیا ہوں"۔

کھلاڑی حیرت سے سرگوشیاں کرنے لگے۔ ایک لمحے کے لئے چیکالنسکی کے ابرو تن گئے لیکن پھر وہ حسبِ معمول مسکرانے لگا۔

اُس نے ہرمن سے پوچھا: "کیا میں حساب چکا دوں؟"

ہرمن نے کہا "جیسا آپ مناسب سمجھیں"۔

چیکالنسکی نے اپنی پاکٹ بک سے نوٹ نکال کر اُسی وقت ادا کر دیئے۔ ہرمن نے اپنی جیت جیب میں ڈالی، میز سے اُٹھا، لیمنیڈ کا ایک گلاس پیا اور گھر چلا آیا۔

اگلی شام کو وہ پھر چیکالنسکی کے مکان پر آیا، اور اُسے پتّوں کی تقسیم میں مشغول پایا۔ ہرمن میز کے قریب گیا، اس مرتبہ کھلاڑیوں نے اُس کے لئے خود بخود جگہ چھوڑ دی، چیکالنسکی عزّت کے ساتھ اس کی طرف جھکا ہرمن ایک تازہ تقسیم کے شروع ہونے تک انتظار کرتا رہا، پھر اُس نے ایک پتّا منتخب کیا اور ۴۷ ہزار روبلز اور اس کے علاوہ گذشتہ شام کی جیت بھی اُس پر لگا دی۔

چیکالنسکی نے تقسیم شروع کی، دائیں طرف ایک غلام تھا اور بائیں طرف ایک ستّا۔

ہرمن نے ستّا نکال کر دکھایا۔

اس پر حیرت کی ایک عام صدا بلند ہوئی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ چیکالنسکی بے قرار ہو گیا ہے اُس نے ۹۴ ہزار روبل گن کر ہرمن کے حوالے کر دیئے، جن کو ہرمن نے پُورے سکون سے وصول کیا، میز سے اٹھا اور

جلدی سے مکان سے باہر نکل آیا +
اگلی شام کو وہ پھر آیا، ہر شخص کو اُس کے آنے کی توقع تھی۔ بڑے بڑے امرانے اس غیر معمولی قمار باز کو دیکھنے کے لئے گنجفہ کھیلنا چھوڑ دیا۔ نوجوان افسر بھی اپنی کرسیوں سے اُٹھ کر بڑے کمرے میں آگئے اور ہرمن کے گرد کھڑے ہوگئے۔ تمام قمار بازوں نے کھیلنا بند کر دیا، وہ بڑی بے صبری سے ہرمن اور چیکالنسکی کی جنگ دیکھنے کے منتظر تھے۔ چیکالنسکی مردے کی طرح زرد تھا لیکن حسبِ معمول مسکرا رہا تھا۔ ہرمن میز کے قریب ہوگیا +

دونوں حریفوں نے میز پر پتّے پھیلا دیئے۔ ہرمن نے ایک پتّا اٹھایا اور اُس پر نوٹوں کا ایک پلندا رکھ دیا، دائیں طرف ایک بیگم تھی اور بائیں طرف ایک اِکّا +

ہرمن نے پتّا اُٹھا کر کہا "اِکّا جیتا ہے"

چیکالنسکی نے ایک شیریں لہجہ میں جواب دیا: "آپ کی بیگم ہر گئی ہے!"

ہرمن کانپ اٹھا، بجائے اکّے کے جس کے متعلق اُسے پختہ یقین تھا، اس کے سامنے میز پر اینٹ کی بیگم رکھی تھی! اُسے یقین نہ آتا تھا۔ اس کی آنکھیں نہ مانتی تھیں کہ یہ غلطی کس طرح ہوئی۔ اُس نے ٹکٹکی لگا کر اس منحوس پتّے کو دیکھنا شروع کیا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ اینٹ کی بیگم ایک آنکھ بند کرکے اس کی طرف ایک طنز آمیز نگاہ کے ساتھ غور سے دیکھ رہی ہے۔ اپنے خوف و ہراس میں اُس نے دیکھا کہ اس اینٹ کی بیگم کی شکل بالکل مردہ کونٹس کی شکل سے ملتی ہے اور ——

وہ غضب ناک ہو کر چلّایا: "ذلیل نابکار بڑھیا!"

چیکالنسکی نے اپنی جیت اکٹھی کی۔ ہرمن کچھ دیر تک بے حس و حرکت کھڑا رہا پھر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ ہر طرف گفتگو ہونے لگی کہ واقعی یہ ایک لاثانی جوا تھا، سب قمار باز اس پر متفق تھے چیکالنسکی نے پتّے ملائے اور کھیل شروع ہوگیا۔

ہرمن کا انجام ایک پاگل خانہ میں ہوا جہاں وہ ہر سوال کا جواب دینے سے انکار کر دیتا۔ اور ہر وقت اپنے دل سے کہتا رہتا "تگّی —— ستّا —— اِکّا! تگّی —— ستّا —— اِکّا!" +

سراج الدین احمد

رباعیاتِ فراق

(۱)

ہر سمت خموشی کا سماں ہوتا ہے
عالم ہے کہ بے ہوش پڑا سوتا ہے
اے دوست مگر رات کے سناٹے میں
لے لے کے ترا نام کوئی روتا ہے

(۲)

کھوتے ہیں اگر جان تو کھو لینے دو
اے دوست جو ہو جائے وہ ہو لینے دو
سمجھے جو چھٹے صبر بھی کر لیں گے کبھی
اس وقت تو دل کھول کے رو لینے دو

(۳)

ہاں نام تو دیکھی محبت تیری
بدنام تو پرکھی محبت تیری
کہتے ہیں جو لوگ ہم سمجھے بھی نہیں
اب جا کے کھٹکنے لگی محبت تیری

(۴)

دیوانے کے ہاتھ اٹھ گئے گریباں کی طرف
دیوانے کی آنکھ اٹھی بیاباں کی طرف
ہے صبحِ بہار لڑکھڑاتی ہے نسیم
اٹھتی ہے نظر تری گلستاں کی طرف

فراق
گورکھپوری

جذبۂ اُولیٰ

"خاتون، خاتون!" کے الفاظ فضا میں گونج گئے۔ کمرے کا دروازہ یکبارگی کھلا، اور خادمہ تیزی کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ ایک پست قد اور فربہ جسم کا آدمی جو پریشانی کے سبب زرد رو ہو رہا تھا اس کے ہمراہ آیا۔

"شکر ہے تم موجود ہو!"

گوینڈٹا پیانو کے مقابل بیٹھی اس کو کھول رہی تھی۔ آواز سنتے ہی نیم وا ڈھکن ہاتھ سے چھوٹ کر گرا، اور پیانو کے تمام پردے بیک وقت چیخ اُٹھے۔ اسی "ہنگامہ" میں نووارد نے ہانپتے ہوئے کہا "لیمبرٹی بیمار ہے ...... سخت بیمار ...... وہ مرنے کے قریب ہے۔ آج شب ریڈی گونڈا کا تماشا ہو رہا ہے، اور وہ اس میں ہیروئن کا پارٹ کرنے والی تھی۔ حضور شاہ اور بادشاہ بیگم موجود ہونگے۔ گوینڈٹا بجز تمہارے کوئی شخص اس کے گیت نہیں گا سکتا۔ تمہیں گانا پڑے گا۔ وعدہ کرو کہ تم آؤ گی، اور میرے تماشے کو برباد نہ ہونے دو گی۔ کیوں؟ اس پارٹ سے تو تم بخوبی واقف ہو نا؟ بولو، تیار ہو؟"

"تیار ہوں! کیا خوب!!" نوجوان مغنیہ نے جواب دیا۔ ابھی تک وہ پیانو کے نزدیک ایک ملبوس بت کی طرح ساکت تھی۔ اُس کا چہرہ تھیئٹر کے مینیجر سے زیادہ زرد تھا۔ "ریڈی گونڈا کے گیت میرے ذہن میں بخوبی محفوظ ہیں، اور میں انہیں لیمبرٹی سے بہتر طریق پر ادا کر سکتی ہوں کیا آخر کار وہ میرے لئے جگہ خالی کر رہی ہے؟"

"گوینڈٹا! تم کو مشق کی تو ضرورت نہیں؟ میں ایک لمحہ میں آرکیسٹرا فراہم ......"

"نہیں مجھے کچھ نہیں چاہئے"، اُس نے جواب دیا "میں ہر ریہرسل پر موجود تھی، اور میں نے اس پارٹ کا بخوبی مطالعہ کیا ہے۔ میں تو اس کی منتظر ہی تھی۔ اس کے نغمات کے زیر و بم، اس کی ایک ایک ادا، اور اس کی ہر ایک مسکراہٹ میرے دل پر نقش ہے۔ میں گاؤں گی اور کامیاب ہونگی۔ تم نے کیا کہا؟ ... کیا لیمبرٹی جاں بلب ہے؟"

مینیجر اس سے مصافحہ کر کے مطبع کی جانب روانہ ہوا۔ اشتہار میں گوینڈٹا کا نام سبز زمین پہ سیاہ حرفوں میں ہوگا۔ پرائما ڈونا موت سے ہم آغوش ہو رہی تھی، اور اُس کے جانشین کا اعلان ضروری تھا۔

گوینڈٹا اس کی اپنی "دریافت" تھی۔ اور اس سے قبل صرف کسی دہقانی دوشیزہ یا کسی ہیروئن کی خادمہ کے معمولی

پارٹ کیا کرتی تھی۔

بنجر کے چلے جانے کے بعد بھی وہ بت بنی کھڑی رہی۔ مگر اس کا تنفس تیز تھا، اور سسکیوں کی خفیف آواز سنائی دے رہی تھی۔

"الینا! سامان طیار کر لو۔" بالآخر اُس نے خادمہ سے چلا کر کہا "میری سرخ اونی ٹوپی، زیورات اور موتی لیتی چلنا۔ وہ سرخ، سنہری، اور سفید ریشم کے جوتے نہ بھول جانا جسامت میں لیبرٹی مجھ سے کچھ ہی زیادہ ہوگی، مگر قد میرے ہی برابر ہے۔ اس کا لباس میرے بالکل ٹھیک ہوگا۔ میں وہی پہنوں گی ہمیں فوراً تھئیٹر پہنچ جانا چاہیے۔ کیا بجا ہے؟"

پانچ کا عمل تھا، اور تماشا آٹھ بجے شروع ہوتا تھا۔ اُس نے اپنے چھوٹے سے خوبصورت سر کو پشت کی جانب خفیف سی جنبش دی۔ وہ چاہتی تھی کہ دوسرے ایکٹ کے گیت کو ایک مرتبہ دہرا لے، کہ دروازے پر گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ "الینا چاہے بادشاہ سلامت خود ہی کیوں نہ ہوں، تم کسی کو اندر مت آنے دینا۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے نہایت دلکش انداز سے مدھم سروں میں ایک راگ چھیڑا، ساتھ ہی دروازہ ایک مرتبہ پھر کھلا۔

"ارکول! تم!! تمہیں کیا چاہیے؟" ارکول، گوبیڈا کے ایک قدیمی دوست، پرنس اسٹیلیو کا خادم تھا۔ وہ جانتی تھی کہ پرنس اسٹیلیو بیمار ہے۔ کہیں یہ تو نہیں کہ اُس کے بھی مرنے کا یہی وقت رہ گیا تھا۔

خادم نے کانپتے ہوئے رُک رُک کر کچھ کہا۔ گوبیڈا نے غصہ کے مارے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ پرنس قریب المرگ تھا اور اُس نے اپنے وفادار نوکر کو گوبیڈا کے پاس اس لئے بھیجا تھا کہ وہ اسے اپنے ہمراہ لے آئے۔ کیا اُسے جانا چاہیے؟ ہاں، جانا پڑے گا۔ وہ اس کے تعلیمی اخراجات کا کفیل ہوا تھا، اور اب تک مکان وغیرہ کے اخراجات برداشت کرتا تھا۔ موسیقی جو آج اس کی زندگی کی روح تھی، اسی کی عطا کی ہوئی تھی۔ پرنس کی مدد اگر شاملِ حال نہ ہوتی، تو اب بھی وہ وایالارگا کے بازاروں میں نارنگیاں فروخت کرتی نظر آتی۔

"الینا! تم چلو۔ میں ایک گھنٹے کے اندر وہاں پہنچ جاؤں گی۔ آج فالودے کا شربت شہد سے تیار کرنا۔ تماشے سے قبل مجھ کو تین کچے انڈے اور یوکلپٹس کے قطرے ضرور ملنے چاہئیں۔"

اُس نے اپنے سنہری بالوں کو ایک رومال سے ڈھانپ لیا۔

"حضور! موٹر باہر موجود ہے۔" ارکول نے نہایت آہستہ سے کہا۔

اُس نے کمرے پر ایک غائر نگاہ ڈالی۔ جس وقت وہ اس کمرے میں پھر قدم رکھے گی تو بہر حیثیت میں تغیر ہوگا۔ بادشاہ سلامت اس کو ہدیہ مبارکباد دیں گے، وہ مشہور ہوگی، اور خلقت اس کا کلمہ پڑھ رہی ہوگی۔ جس انقلاب

کے اب تک وہ صرف خواب دیکھا کرتی تھی آج اُس کو بچشم خود مشاہدہ کرنے کے واسطے جارہی تھی۔

روم کی سڑکوں پر موٹر تیزی کے ساتھ جارہا تھا۔ خوبصورت مجسمے، نظر فریب فوارے، عالی شان محل اب کو ایک پراں بادل کی طرح دھندلے نظر آرہے تھے۔ شہر کے شور وشغب کی دھیمی آوازیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی موٹر سے آآکر سمندر کی لہروں کی طرح ٹکرارہی ہیں۔ کل ہر ایک اس کو مبارکباد دے گا۔ تمام سر اس کے آگے خم ہو جایا کریں گے۔ ہر شخص کے لب پر اس کا نام ہوگا۔ اور لوگ اس کی آواز سنتے ہی اس کے واسطے جگہ خالی کر دیں گے۔ کل ...."

موٹر رُکا، اور وہ اتر پڑی۔ اسٹیلیو جاں بلب سہی۔ اس کو کسی سے کیا مطلب؟ اس وقت اس کو کسی کے دیکھنے کی مہلت نہیں۔ اور تو اور سینٹ جسٹینا کے حضور میں دعا مانگنے کا بھی وقت نہیں ہے۔

کمرے میں ڈاکٹر رخصت ہونے کی تیاری کر رہا تھا " خاتون! میں ابھی واپس آتا ہوں۔ اس وقت انہیں کچھ تکلیف نہیں ہے۔ مگر وہ زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے اور زندہ رہیں گے۔ ہمارے امکان میں اب کچھ نہیں۔ برابر وہ تم ہی کو یاد کرتے رہے۔ جب تک تم سامنے نہ ہوگی ان کو موت بھی نہیں آئے گی۔ تم ہی ان کی آنکھیں موندو گی۔ اس وقت تم کو اُن کے پاس رہنا چاہئے"

"تین گھنٹے ...."

"میں تھوڑی دیر میں واپس آیا۔ ان کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوگی۔ زندگی کا آخری تحفہ، محبت کی آخری نذر جو تم پیش کر سکتی ہو، یہی چند لمحات ہیں۔ تم اس وقت ان کو تنہا نہ چھوڑنا"

مغنیہ نے کچھ بھی نہ سنا۔ وہ یہی کہہ رہی تھی "کیا تین گھنٹے اور؟"

"ہاں، تقریباً تین گھنٹے۔ خاتون! دنیا میں کوئی چیز اس قیمتی ساعت کا نعم البدل نہیں ہوسکتی۔ ان کو اپنی موت کا یقین تھا، اور اس لئے انہوں نے اپنا وصیت نامہ تیار کرا دیا ہے۔ خاتون! انہوں نے اپنی آدھی ملک تمہارے نام لکھ دی ہے۔ اور تم جانتی ہو کہ وہ امیر آدمی تھے"

"تین گھنٹے ...."

گوبڈ ما نے ڈاکٹر کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوئے کہا "بہت اچھا آپ جاسکتے ہیں۔ میں اپنے فرض سے بخوبی واقف ہوں"

وہ آگے بڑھی۔ اس کی زندگی کا اہم ترین فرض؟ .... اس کا فن، اس کا ہنر، اس کی موسیقی تھی۔ وہ گائے گی۔ آج شب کو آٹھ بجے ایک جم غفیر کے روبرو ہوگی۔ انسان کی زندگی میں ایسا موقع صرف ایک مرتبہ آتا ہے۔ اگر ہم اس کو ٹھکرا دیں تو آئندہ اس کے حصول کی امید بے کار ہے۔"

وہ مختلف کمروں میں سے گذرتی ہوئی مریض کی خواب گاہ تک پہنچ گئی۔ پرنس کے تمام نوکر دروازے کے پاس کھڑے تھے۔ کوئی چپکے چپکے رو رہا تھا اور کچھ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ سرمائی رات کی تاریکی چھا رہی تھی۔ ایک چراغ آتش دان پر ٹمٹما رہا تھا۔

اُس نے بیٹھ کر حساب کرنا شروع کیا۔ چھ بجے نوشہ خانہ میں پہنچنا ضروری ہے۔ کم از کم ایک گھنٹہ تیار ہونے میں صرف ہوگا۔ اسٹیج پر جانے سے قبل اس کو کامل آدھ گھنٹہ تخلیہ کی ضرورت ہے۔ ورنہ وہ گانے کے قابل نہ ہوگی۔ یہ بدبخت انسان اسی وقت کیوں مر رہا تھا! اس کی تمام امداد کیا اسی واسطے تھی، کہ وقت پر اس کو محنت کا ثمر حاصل کرنے سے باز رکھے؟ گاتے وقت محبت اور شفقت، رحم اور کرم سے اس کا دل بے نیاز ہو جاتا تھا۔ اور پھر کسی کو ان کا ہدیۂ پیش کرنا اُس کے لیے محال ہوتا تھا۔ اس کی زندگی کی روح، اس کی جان، صرف موسیقی تھی۔ پھر کیوں اس کا دل پتھر کے مانند نہ ہوتا۔ کیونکر کوئی شخص اُس کے دل کا طلب گار ہو سکتا تھا، جب کہ اس میں بجز موسیقی کے کسی دوسری چیز کی گنجائش ہی نہ تھی۔ اس کے رحم کا وہ شخص ہرگز مستحق نہیں، جو اس کی پانچ سال کی محنت و مشقت کے صلہ میں اس کو محروم رکھنا چاہتا ہے۔

پرنس محوِ خواب تھا، اور شمعوں کی روشنی اُس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ ارکول باہر چلا گیا۔ گوبڈٹا پلنگ کی طرف بڑھی۔ اس کے ریشمی لباس کی سرسراہٹ نے کمرے کی حسرت ناک خاموشی کو برہم کر دیا۔ گوبڈٹا نے چاروں طرف نگاہ ڈالی، مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ مرنے والے کے تنفس کی بھاری آواز کے علاوہ کمرے میں خاموشی طاری تھی۔

اسٹیلیو نے آنکھیں کھول دیں۔ مگر اُن کے اوپر ایک بھورا سا پردہ پڑا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ کیا ان کی بینائی زائل ہو چکی تھی؟ مگر وہ کسی چیز کا متلاشی نظر آتا تھا۔ گوبڈٹا نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دفعتہً اس کا اپنا ہاتھ پرنس اسٹیلیو کی مضبوط گرفت میں تھا۔ گرفت اس قدر سخت تھی کہ گوبڈٹا کسی وحشی درندے کے چنگل میں پھنسی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

"چھوڑ دو! ورنہ میں تمہارا ہاتھ توڑتی ہوں"

مگر وہ ناواقف تھی کہ جانکنی کے وقت انسان کے اندر کتنی طاقت آ جاتی ہے۔ پرنس اسٹیلیو نے اس کو

مضبوط پکڑ رکھا تھا۔ طاقتِ گویائی سلب ہو چکی تھی۔ وہ دیکھنے اور سننے سے معذور تھا۔ زندگی باقی تھی تو صرف اس کے قویٰ میں۔

گویڈ ٹا نے رہائی کی کوشش ترک کر دی، اور اپنا ہاتھ اس کی آہنی گرفت میں رہنے دیا۔ مگر اُسے تکلیف ہو رہی تھی اور خیال یہی تھا کہ "آدھ گھنٹہ کے اندر مجھے اس کمرے سے روانہ ہو جانا چاہئیے۔ گیسو کا کلیسا سوا پانچ بجا رہا ہے۔ چھ بجے تک مجھ کو تھیئٹر میں موجود ہونا چاہئیے، ورنہ میں کچھ بھی نہ گا سکوں گی۔ آہ یہ مر کیوں نہیں جاتا!"

کیا اُس کو رہائی کے لئے مدد کی کوشش کرنی چاہئیے۔ مگر کون ہے جو اسے رہائی دے گا۔ ہر ایک اس کو یہاں رہنے پر مجبور کرے گا جب تک کہ موت خود آن کر رہائی نہ دے۔ اس میں ابھی نہیں .... پرنس کی نگاہیں اس پر گڑی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کو پہچانتا ہے۔ کیا گویڈ ٹا کا دل کتاب کے ایک ورق کے مانند اس کے سامنے تھا، اور کیا وہ اُن جذبات کا مطالعہ کر رہا تھا جو اس وقت اس میں بھرے ہوئے تھے۔ ہاتھ اُس نے اب تک نہیں چھوڑا تھا۔ گویڈ ٹا نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورنا شروع کیا۔ دفعتاً وہ کہنے لگی۔

"ٹھہرو۔ میں تمہیں مار ڈالوں گی۔ میں اپنی زندگی، اپنا مستقبل، تمہاری زندگی کے آخری اور غفلت کے لمحات پر کیوں قربان کر دوں۔ کیا تمہارے مرنے کی ساعت میری شہرت سے زیادہ قیمتی ہے! اسٹیلیو! تم میرے اوپر اپنی زندگی کی اول اور آخر بھینٹ چڑھا دو۔ روپیہ جو تم نے مجھے دیا وہ تمہارے ہاتھ کا میل تھا۔ مجھے تم اپنی زندگی سے، اُس زندگی سے جو ختم ہو چکی ہے، دو گھنٹے نذر کر دو۔ کیونکہ تمہیں نے مجھے میری یہ زندگی عطا کی۔ اور پھر میں آج رات گا سکوں گی۔"

اُس نے بائیں ہاتھ سے میز کی دراز کھول کر ایک ڈبیا نکالی۔ اس میں خواب آور سفوف کی پڑیاں رکھی تھیں۔ اس سے قبل اُس نے پرنس کو نیند لانے کے واسطے اکثر اس کا استعمال کرایا تھا۔ اور وہ اس کی قوت سے واقف تھی۔ ڈبیا میں تین پڑیاں تھیں۔ اس نے تینوں کو پیمانے میں ڈال کر پانی سے حل کیا اور پانی کے صاف ہو جانے کا انتظار کرنے لگی۔ مرنے والے کا منہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے اُس کو اٹھا کر تکیہ کے سہارے بٹھا دیا، اور دوا اس کے منہ میں انڈیل دی۔ کچھ حلق میں گئی اور کچھ اُس نے اُگل دی۔ مگر گویڈ ٹا کو رحم نہ آیا۔ قے کی ہوئی دوا کو منہ سے لگے ہوئے پیمانہ میں لیا اور پھر حلق میں ڈال دیا۔ یہاں تک کہ اس کا ایک ایک قطرہ حلق سے اتر گیا۔ پیمانہ کو پانی سے دھویا اور پانی پلنگ کے پیچھے فرش پر پھینک دیا۔

کتنا وقت اور صرف ہوگا؟ بیس منٹ کے اندر وہ آزاد ہو جائے گی!

اب اس پر ایک خوف سا طاری ہونا شروع ہوا۔ ریڈی گونڈا کی جانکنی کے وقت کے دردناک مگر شیریں نغمے کس طرح ادا ہونگے؟ وہ اس کے دماغ میں گونج رہے تھے۔ مگر زبان سے بھی ادا ہو سکتے تھے یا نہیں؟ اس نے گانا شروع کیا۔ اس کا ایک ہاتھ اب تک اسٹیلبو کی آہنی گرفت میں تھا، اور وہ پلنگ پر جھکی ہوئی تھی۔

دروازہ کھلا اور ارکول کا اشک آلود چہرہ نظر آیا۔ گویڈٹا گاتے گاتے رک گئی۔ اور بے صبری کے ساتھ کہنے لگی ”اس کی یہی خواہش ہے“۔

ارکول دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ گویڈٹا گاتی رہی۔ اس کی شیریں آواز نہایت دلکشی کے ساتھ مدھم اور تیز ہوتی تھی، اور آخرکار کم ہوتے ہوتے خاموش ہو گئی۔ اس کو معلوم ہو گیا کہ وہ گا سکتی ہے۔

مغنیہ نے ایک گہرا سانس لیا۔ ہاتھ کھینچا اور چھڑا لیا۔ پرنس مر چکا تھا۔

گویڈٹا آزاد تھی۔ وہ تن کر کھڑی ہو گئی۔ کمرے کے دوسرے سرے سے ارکول نے اس کے چہرے کے تغیر کو دیکھا۔ وہ مسہری کی جانب ”آہ! میرے آقا۔ میرے آقا!“ کہتا ہوا جھپٹا۔

پرنس کی کھلی ہوئی آنکھیں بند کرتے ہوئے گویڈٹا نے جواب دیا ”وہ اب اس دنیا میں نہیں“۔

وہ کمرے سے باہر نکل آئی اور صدر دروازے کی جانب روانہ ہوئی۔ تمام نوکر اضطراب کی حالت میں سرنگوں تھے ”آہ! آہ!!“ کی آواز نے اُن کو اپنے آقا کی موت کا پیغام دیا اور وہ رونے لگے۔

گویڈٹا کا دل مسرت سے لبریز تھا۔ شیریں نغمات جو روئے زمین پر اس سے پہلے کبھی نہیں سنے گئے تھے اس کی آواز کے ساتھ نکلنے کے واسطے تڑپ رہے تھے۔ آج کی شب تمام دنیا کو وہ اپنی موسیقی سے مسحور کر لے گی۔ کل وہ پرنس کی دولت کی وارث ہوگی۔ اُس سے بڑھ کر ماہرِ موسیقی دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔ بادشاہ اور پوپ اس کے سامنے ہیچ ہونگے۔

موٹر میں بیٹھ کر اُس نے اپنے شوفر سے کہا ”تھیٹر چلو“

(ترجمہ)

حفیظ الرحمن

(کرۂ منذر)

اضطرار

جب سے ہے یہ دلِ بربادِ تمنّا مضطر
نظر آتا ہے مجھے سارا زمانا مضطر

چشمِ پُرنم میں وہ طوفانِ الم زا بے چین
جس کے ہر قطرے میں اک موجۂ گنگا مضطر

نالۂ بانگِ درا سوزِ فغاں سے رنجور
راہِ منزل میں ہر اک خارِ خلش زا مضطر

نغمۂ نے میں ہی آہنگِ پریشاں پنہاں
ضربِ مضراب سے ہر ساز کا پردا مضطر

پہلوئے موسیِٔ عمراں میں تحمّل مدہوش
قُلّۂ طور پہ اک برقِ تجلّا مضطر

کفِ غنچہ میں جو اک نکہتِ مشکیں بیتاب
قفسِ تنگ میں اک بلبلِ شیدا مضطر

چشمِ مخمور میں بدمستیِ ساقی مخزوں
جامِ بلّور میں کیفیّتِ صہبا مضطر

صرصرِ تند کے جھونکے سی ہیں ذرّے بیکل
زحمتِ حدّتِ خورشید سے صحرا مضطر

شادؔ بے چین ہے دل روح کی بیتابی سے
موج مضطر نہیں در اصل ہے دریا مضطر

احمد علی خاں شادؔ

پتھّر کا ٹکڑا

ڈرائنگ رُوم میں خوب رونق تھی۔ کالے کوٹ رنگارنگ کی ساریوں کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھ رہے تھے آنکھیں چمک رہی تھیں۔ لب مسکرا رہے تھے۔ ہر کونے سے قہقہوں کی آواز آرہی تھی۔ یکایک ایک نازنین نے انگیٹھی سے ایک خوبصورت پتھر کو اٹھایا اور میزبان سے کہا "سر صفدر جنگ یہ کیا ہے؟"

سب نے حیرت کی نگاہ سے پتھر کی طرف دیکھا۔ کسی نے کہا "بس ایک خوش رنگ پتھر ہے اور کیا؟" ایک نے کہا "دیکھنا کیسا پیارا ہے۔ بالکل ایک پھول کی مانند!" دوسرے نے کہا "مَیں نے آج تک ایسا پتھر نہیں دیکھا۔ ذرا غور سے دیکھئے یہ قوسِ قزح کی طرح رنگا ہوا ہے اور ہر رنگ اتنا ہلکا اور خوشنما ہے کہ ایک خاص نازک انداز سے دوسرے رنگ میں مل کے غائب ہو جاتا ہے" کسی نے کہا "مُونگے کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ سر صفدر! اسے آپ نے کہاں سے لیا؟ کیا یہ کسی سمندر کی تہ سے لایا گیا ہے؟"

"اس کی داستان بہت لمبی ہے" - سر صفدر نے مسکرا کر کہا "اگر آپ صاحبان آرام سے بیٹھ جائیں تو میں آپ کو سناؤں" کالے کوٹوں نے ساریوں کو کرسیاں پیش کیں۔ "تھینک یُو" کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر کمرے میں سناٹا ہو گیا۔

سر صفدر نے ایک سگار سلگایا اور یوں کہنا شروع کیا "میں اپنے دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ بہت سی مثلیں میرے سامنے جمع تھیں اور میں ایک قتل کی اپیل کے کاغذات مطالعہ کرنے میں محو تھا۔ رات کے دس بج چکے تھے اور ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ یکایک منشی خانے سے شور و غل کی آواز آئی۔ میں نے پکار کر منشی سے کہا "فضل الٰہی یہ شور کیسا ہے" "غریب پرور!" فضل الٰہی نے آکر کہا "ایک غریب بڈھا ہے جو آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ مَیں نے ہر چند روکا مگر وہ کہتا ہے کہ سر صفدر سے مل کے چھوڑوں گا" میں نے کہا "اچھا اسے اندر بھیج دو"

چند لمحوں کے بعد ایک بڈھا اندر داخل ہوا۔ اُس کے پھٹے پرانے کپڑے کیچڑ سے بھرے تھے۔ کمر جھکی ہوئی تھی۔ منہ پر جھرّیاں ہی جھرّیاں تھیں۔ کئی گھنٹوں کا بھوکا معلوم ہوتا تھا اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

میں نے پوچھا "بابا میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں ؟"

"میں ایک .... غریب .... کسان ہوں ۔" اُس نے رکتی ہوئی آواز میں کہا ۔ "مصیبت زدہ ...... ہوں ...... میری مدد کیجئے !" "کوئی بھیک منگتا ہوگا ۔" میں نے دل میں سوچا اور ذرا تیز آواز سے کہا "میں تمہاری مدد کس طرح کر سکتا ہوں ؟" اُس نے اپنی پگڑی کے سرے سے ایک گرہ کھولی اور کچھ نوٹ نکالے ...... میں جانتا ہوں کہ آپ کی فیس اس سے بہت زیادہ ہے لیکن میں مفلس ہوں اپنا چھوٹا سا کچا گھر بیچ کر تین سو روپے لایا ہوں ۔ یہ حاضر ہیں" یہ کہہ کر اُس نے اپنا زرد لرزتا ہوا ہاتھ آگے بڑھایا اور روپے میری میز پر رکھ دیئے ۔

"لیکن بابا یہ روپے تم مجھے کس لئے دے رہے ہو ؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا ۔

آنسو اُس کی آنکھوں سے میری میز پر ٹپکنے لگے ۔ آنکھوں نے اک التجا بھری نگاہ سے میری طرف دیکھا پھر اُس نے آہستہ آہستہ کانپتی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا "میرا ایک بیٹا ہے ...... اٹھارہ اُنیس برس کا ہوگا ...... ابھی بچہ ہے ...... ہمارے گاؤں میں ایک قتل ہوگیا ...... دشمنوں نے جھوٹی شہادت دے کر اُسے ملزم قرار دیا ۔ اب وہ قید میں ہے ۔ ہائی کورٹ میں اپیل کی ہے ۔ لوگوں نے کہا ...... اگر اُسے کوئی بچا سکتا ہے تو سر صفدر جنگ ہی ۔ اُن کے پاس جاؤ مگر آپ کی فیس بہت ہے اور میرے پاس صرف یہ تین سو روپے ...... آپ کے منشیوں نے روکا ، مارا پیٹا لیکن اکلوتے بیٹے کی محبت آپ کے پاس لے آئی ...... دنیا میں میرا کوئی نہیں ...... بس ایک وہ پروردگار ہے ...... اور ایک آپ ...... دل میں آپ کی سخاوت اور مہربانی کی شہرت ...... اپنی اک کانپتی ہوئی امید ...... لایا ہوں ...... للّٰہ میری مدد کیجئے ۔

میں نے اُس کے روپے اُسے واپس دے دیئے اور کہا "جاؤ بابا ! اپنا گھر واپس مول لے لو ۔ اور مقدمے کے کاغذات مجھے کل بھیج دینا ۔ میں تمہارا مقدمہ کر دوں گا ۔"

بے خود ہو کر اُس نے میرے پاؤں چومے ۔ زبان سے کچھ نہ کہہ سکا لیکن آنکھوں سے دعائیں دیں ۔

دوسرے دن میں نے مقدمے کے کاغذات دیکھے ۔ مقدمہ اچھا تھا ۔ میں نے بھی اس پر بہت محنت کی ۔ آخر ہائی کورٹ میں پیش ہوا ۔ دو طرفہ بحث ہوئی ۔ جب میری تقریر کا وقت آیا میرے دل میں ایک سمندر لہریں لے رہا تھا ۔ بڈھے کی پُر نم آنکھیں میری آنکھوں کے سامنے تھیں ۔ میری زبان کو خدا نے قوت دی اور

میں نے اُس روز ایسی تقریر کی جیسی کبھی پہلے نہ کی تھی"۔

سر صفدر جنگ کا چہرہ چمک رہا تھا...... ایک نازنین نے اپنے چھوٹے سے رومال سے آنکھیں پونچھیں.... "اور پھر" کسی نے پوچھا۔

سر صفدر جنگ نے کہا "لڑکا رہا کر دیا گیا۔ جس وقت حکم سنایا گیا بڈھے کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ جوش میں آ کر اُس نے اللہ اکبر کا ایک نعرہ بلند کیا اور ہاتھ اُٹھا کر مجھے دعا دی۔

"کچھ دنوں کے بعد وہ پھر میرے پاس آیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایسے چند پتھر نما ٹکڑے تھے جو اُس نے میرے قدموں میں رکھ دیئے اور کہا "خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے اور آپ پر ایسا مہربان ہو جیسے آپ غریبوں پر مہربان ہیں"۔ خوشی کے جھلملاتے آنسو موتیوں کی طرح اس کی آنکھوں سے گرے اور اُس کی ہچکی بندھ گئی...... کچھ دیر کے بعد اُس نے کہا "یہ نمک کے ٹکڑے میں نے آپ کے واسطے رنگے ہیں..... میرے پاس اور کچھ نہیں...... آپ انہیں قبول فرمائیں"۔

یہ پتھر جو آپ سب دیکھ رہے ہیں بس اُن نمک کے ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑا ہے...... وہ صرف ایک کسان تھا جاہل، اَن پڑھ...... لیکن اُس کی مسرت نے اُسے ایک لمحے کے واسطے ایک سچا آرٹسٹ بنا دیا۔ اُس نے معمولی نمک کے ڈھیلوں کو توڑ کر اور رنگ کر انہیں پھول بنا دیا......"

کمرے میں سناٹا تھا اور سر صفدر جنگ کی آنکھوں میں آنسو......

ملازم نے آ کر کہا "حضور! کھانا تیار ہے"!

"کلی"

رباعی

ہر ایک کو بیتاب بنا کے اٹھّے
شعلے دل سوزاں سے اٹھا کے اٹھّے
بیٹھے بھی اگر دل میں سما کے بیٹھے
اٹھّے بھی اگر آگ لگا کے اٹھّے

فراق

محفلِ ادب

حیاتِ اقوام و ادب کے تین دَور

نفسی کیفیت کے لحاظ سے متمدن قوموں کی زندگی تین مدارج سے گزرتی ہے۔ اُس کے ادب کو بھی، اگر وہ حقیقی معنی میں ادب یعنی زندگی کا آئینہ ہے، یہی مدارج طے کرنا پڑتے ہیں۔

جب کوئی قوم بدویت سے تمدن کی سرحد میں داخل ہوتی ہے تو اُس کی معاشرت اور اُس کے خیالات میں یک رنگی خشونت اور مردانگی ہوتی ہے۔ اس کی زندگی ایک سادہ نظام کے ماتحت ہوتی ہے۔ اُس کے پیشِ نظر ایک معین اور سہل الحصول نصب العین ہوتا ہے۔ یہی حالت اُس کے ادب کی بھی ہوتی ہے، وہ اپنے جذبات کا اظہار عموماً شاعری سے کرتی ہے اور شاعری میں بھی رزمیہ شاعری کو اختیار کرتی ہے۔ اس میں کسی ایسے ہیرو کی زندگی کی مکمل تصویر پیش کی جاتی ہے جو ایک جانی بوجھی راہ پر چل کر ساری رکاوٹوں کو آسانی سے دور کرتا ہوا کامیابی کی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔

دوسرا وہ ہوتا ہے جب فطری قوتِ ارتقا کی بدولت انسان اپنے تنگ دائرۂ حیات کو توڑ کر اس میں وسعت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس کی ابتدا جذبات کے ہیجان سے ہوتی ہے، جو ساری زندگی پر چھا جاتا ہے۔ انسان کے دل میں نئی آرزوئیں، نئے مقاصد پیدا ہوتے ہیں اور وہ انہیں پورا کرنے کے لئے تڑپتا ہے۔ زندگی کا بندھا بندھایا شیرازہ بکھر جاتا ہے، ہر فرد جماعت سے الگ ہو کر اِدھر اُدھر بھٹکتا ہے۔ یہ دور رومانی دور کہلاتا ہے۔ اس زمانے کے ادب میں جذبات پرستی، بے چینی، کشمکشِ آرزو غالب ہوتی ہے جس کے اظہار کا ذریعہ غنائی شاعری اور ڈراما میں المیّہ ہے۔

تیسرا دور وہ ہے جب پھیلی ہوئی زندگی سمیٹی جاتی ہے۔ اُس تمدن کی جو بہت وسیع ہو گیا ہے، حد بندی ہوتی ہے۔ اس میں ہم آہنگی اور ترتیب پیدا کی جاتی ہے۔ اجتماعی زندگی کا نصب العین نئے سرے سے معین ہوتا ہے اور معاشرت کا نظام دوبارہ قائم ہوتا ہے۔ زندگی کے پیچیدہ مسائل ایک معینہ نصب العین کے ماتحت حل کئے جاتے ہیں۔ یہ دور کلاسکی دور کہلاتا ہے اور اپنے اظہار کے لئے ناول اور فرحیے کا ذریعہ ڈھونڈتا ہے۔

"اردو"

شاعر کا دل

چاندنی رات کا اُجلا سماں تھا اور کرشن جی ایک جھیل کے کنارے بیٹھے کہہ رہے تھے ۔

"میرا خیال تھا کہ اس دھرتی پر انسان سے زیادہ حسین کوئی مخلوق نہیں ۔ لیکن کنول کا یہ پھول جو رات کی نرم ہواؤں میں ہلکورے لے رہا ہے تمام مخلوق سے حسین ہے ۔ اس کی پنکھڑیاں چاند کی روپہلی کرنوں میں کھل گئی ہیں اور میرا جی چاہتا ہے کہ ابدالآباد تک اس کے حسن کا نظارہ کرتا رہوں ۔"

کرشن ایک ٹھنڈی سانس بھر کے پھر بولے ۔ "ہاں سچ مچ انسان اس حسن کی مثال پیش نہیں کر سکتا ۔ میں دیوتا ہوں کیوں نہ اپنی شکتی سے ایک ایسی حسین مخلوق پیدا کروں جسے انسانوں میں وہی رتبہ حاصل ہو جو کنول پھولوں میں رکھتا ہے تاکہ یہ ساری کائنات اور سارے انسان اس کے حسن سے لطف حاصل کریں ۔ اے کنول کے پھول ! انسان کا روپ دھار لے اور میرے سامنے کھڑا ہو جا ۔"

لہروں میں ایک ہلکی سی جنبش پیدا ہوئی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابابیل کے بازو سطح آب سے چھو گئے ہیں ۔ رات زیادہ روشن ہو گئی چاند زیادہ تیزی سے چمکنے لگا کوئل کی رس بھری تانیں ہواؤں میں پھیل گئیں اور پھر دفعتہً خاموشی چھا گئی ۔ اچنبھے کی بات تو یہ تھی کہ کنول کا پھول ایک دوشیزہ کا روپ دھار کر کرشن بھگوان کے سامنے آکھڑا ہوا ۔ اُس کا روپ دیکھ کر بھگوان بھی حیران رہ گئے اور بولے ۔

"اے جھیل کی سطح پر تیرنے والے پھول ۔ اب میرے تخیل کے چمن زار کا پھول بن جا ۔ اور بول !"

دوشیزہ نے نہایت شیریں و لطیف آواز میں بولنا شروع کیا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہار کی نرم و سبک رو ہوا کنول کی سپید پنکھڑیوں کو چوم رہی ہے ۔

"بھگوان ! آپ نے مجھے انسان کا روپ دیا ۔ اب مجھے رہنے کی جگہ بتائیے ۔ جب میں جھیل کی سطح پر رہتی تھی تو ہوا کی ہر لہر میرے جسم پر کپکپی طاری کر دیتی تھی ۔ اور میں سہم کر اپنی پنکھڑیاں بند کر دیتی تھی ۔ میں طوفان اور مینہ کی بوچھاڑ سے ڈر جاتی تھی ۔ میں بادلوں کی گرج اور بجلی سے کانپ اٹھتی تھی ۔ میں تو سورج کی تیز کرنوں سے بھی ڈر جاتی تھی ۔ آپ نے ہی مجھے انسان کا روپ دھارنے کا حکم دیا ۔ لیکن میری فطرت ——— کنول کی فطرت نہیں بدلی ۔ بھگوان میں دھرتی اور دھرتی کی تمام چیزوں سے ڈرتی ہوں ۔ اب مجھے کہاں رہنے کا حکم ہوتا ہے ۔" کرشن جی مہاراج نے اپنی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھائیں اور کچھ دیر سوچنے کے بعد بولے "کیا تو پہاڑ کی چوٹی پر رہنا چاہتی ہے ؟"

"لیکن بھگوان وہ تو برف سے ڈھکی رہتی ہے ۔ وہاں سردی ہے اور میں سردی سے ڈرتی ہوں ۔"

"اچھا ! تو میں جھیل کی تہ میں تیرے لئے بلور کا ایک محل بنا دیتا ہوں ۔"

"بھگوان! میں وہاں رہنے سے بھی ڈرتی ہوں۔ پانی کی گہرائیوں میں سانپ اور دوسرے موذی جانور ہیں۔"

"کیا تجھے وسیع سبزہ زاروں میں رہنا پسند ہے؟"

"بھگوان وسیع سبزہ زاروں میں آندھی کے جھکڑ چلتے رہتے ہیں اور مینہ کے طوفان آتے ہیں"

"تو اے رنگ اور بُو کے پیکر! بتا میں کیا کروں؟ ہاں خوب یاد آیا سادھو اور جوگی ایلورا کے غاروں میں رہتے ہیں کیا تو دنیا کے ہنگاموں سے دُور ان غاروں میں رہنا چاہتی ہے؟"

"بھگوان! غاروں میں اندھیرا ہے اور میں اندھیرے سے ڈرتی ہوں۔"

کرشن مراری ایک پتھر پر بیٹھ گئے۔ اور سر کو ہاتھوں پر ٹیک دیا۔ دوشیزہ سہمی ہوئی کھڑی کانپ رہی تھی۔ پَو پھٹنے لگی۔ پورب کی طرف سے صبح کا اجالا دھیرے دھیرے سارے آسمان پر چھا گیا۔ روشنی نے جھیل کی سطح کو چوما اور کھجور اور بانس کے درختوں پر سنہری رنگ پھیر دیا۔ گلابی پروں والے بگلے نیلے پنکھوں والے سارس اور سفید براق راج ہنس پانی میں اور مور جنگلوں میں گانے لگے۔ پھر ایک ساز کی صدا سنائی دی جو سیپ پر فولادی تار چڑھا کر بنایا گیا تھا اور ساتھ ہی ایک انسانی گیت کی آواز گونج اٹھی۔

کرشن جی گہری سوچ سے چونک پڑے اور کہنے لگے "والمیک شاعر۔ سورج دیوتا کی مہما کے گیت گا رہا ہے"

تھوڑی دیر میں سرخ پھولوں کے جھرمٹ سے جو بیلوں کے گرد لپٹے ہوئے تھے والمیک نمودار ہوا لیکن کنول کو انسانی روپ میں دیکھ کر وہ ساز بجاتے بجاتے تھم گیا۔ اور سیپ کا ستار اُس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ وہ اس طرح چپ چاپ جھیل کے کنارے کھڑا تھا گویا کرشن جی نے اُسے پیڑ کی صورت میں تبدیل کر دیا ہے۔

بھگوان کرشن نے جب شاعر کو اس حیرت کے عالم میں دیکھا تو ان کے چہرہ پر سرخی چھا گئی۔ اور وہ بولے "والمیک جاگو اور بول"

لیکن والمیک کی زبان سے صرف اتنا نکلا "میں ــــ محبت ــــ کرتا ہوں"

اُسے صرف یہی الفاظ یاد تھے اور اس کی زبان صرف اسی قدر کہہ سکتی تھی۔

بھگوان کا چہرہ تمتما اُٹھا اور وہ بولے "اے حسین دوشیزہ میں نے تیرے رہنے کے لئے ایک موزوں جگہ تلاش کر لی شاعر کے دل کو اپنا مسکن بنالے"۔ والمیکی نے پھر یہ الفاظ دہرائے۔ "میں محبت کرتا ہوں"

بھگوان کرشن کی خواہش دوشیزہ کو شاعر کے دل کی طرف کھینچنے لگی بھگوان نے والمیک کے دل کو بلور کی طرح شفاف بنا دیا دوشیزہ جب اپنے مسکن میں داخل ہوئی تو وہ گرمی کے دنوں اور گنگا کی لہروں کی طرح شانت تھی لیکن جب اُس نے والمیک کے دل کو غور سے دیکھا تو اُس کا چہرہ زرد ہو گیا اور خوف جاڑے کی سرد ہوا کی طرح اس پر چھا گیا۔ کرشن جی نے حیران ہو کر پوچھا "کیا تو شاعر کے دل سے بھی ڈرتی ہے؟"

وہ بولی بھگوان آپ نے مجھے کہاں رہنے کا حکم دیا۔ میں اس ایک دل میں پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں عجیب مخلوق سے معمور سمندر کی گہرائیاں سبزہ زار اور آندھی کے جھکڑ اور مینہ کے طوفان اور ایلورا کے تنگ و تار غار موجود پاتی ہوں بھگوان میں یہاں بھی ڈرتی ہوں"

کرشن بولے" انسان کے روپ میں کنول کے پھول! مت ڈر۔ اگر تجھے والمیک کے دل میں برف نظر آتی ہے تو بہار کی گرم سانس بن کر اُسے پگھلا دے۔ اگر یہاں تجھے سمندر کی گہرائیاں دکھائی دیتی ہیں تو موتی بن جا جو سمندر کی گہرائیوں میں رہتا ہے۔ اگر یہاں سنسان سبزہ زار اور میدان ہیں تو ان میں سُکھ کے پھول اگا۔ اگر یہاں ایلورا کے تاریک غار ہیں تو سورج کی کرن بن کر انہیں روشن کر دے۔

اب والمیک میں بھی بات کرنے کی طاقت آگئی تھی۔ اس نے کہا" میں تجھے آشیرباد دیتا ہوں"

"خیالستان"

لال قلعہ کی ایک جھلک

لال قلعہ کی تمیز اور بات چیت میں اور شاہجہان آباد کی تمیز اور بات چیت میں بڑا فرق تھا۔ ایک بیاہ کی محفل میں لال قلعہ کی بیگمیں شاہجہان آباد کے اندر شریک ہوئیں محل کی انگنائی میں ایک چوکے پر شاہجہان آباد کی لڑکیاں جن کی عمر پانچ چھ سال سے زیادہ نہ تھی دس پانچ بیٹھی آپس میں کھیل رہی تھیں۔ ان ہی میں ایک قلعہ کی رہنے والی بادشاہزادی بھی بیٹھی تھی جن کی عمر بھی شہر والی لڑکیوں سے زیادہ نہ تھی۔ شہر والی لڑکیاں "تُو" کہہ کر ایک دوسری سے بولتی تھیں اور قلعہ والی لڑکی کو "تُو" کہنا نہیں بھاتا تھا، وہ ان کی باتوں سے گھبرا گئیں تو توتلی بولی میں کہنے لگیں" بیگم "تُو" نہیں کہتے" تم "کہتے ہیں" مگر نقار خانہ میں طوطی کی صدا کون سنتا ہے ان کے کہنے کا کسی نے خیال نہ کیا تو انہوں نے دادا سے کہا "دد انم مجھے گود میں اٹھا کر لے چلو یہ تو پکار مجھ سے نہیں سنی جاتی۔

بچوں کی زبان میں طاقت آنے کے لئے یہ کہاوت انہیں سکھاتیں" لپ بھر آٹا مٹھی چنے ٹکڑا روٹی گڑ کی ڈلی" اور بچوں سے کہا جاتا لپ کہو تو ایک ہات سے لپ بناؤ، پھر مٹھی چنے کہو تو مٹھی بناؤ، ٹکڑا روٹی کہو تو مٹھی میں دو انگلیوں کو کھول اور انگوٹھا اس پر رکھ کر ٹکڑے کی صورت بناؤ، گڑ کی ڈلی کہو تو کلمہ کی اور بیچ کی انگلی اور انگوٹھے کو کھول کر ڈلی کی صورت بناؤ اور اس کہاوت کو جلدی جلدی کہو۔

ایک بیگم اپنی صاحبزادی کو اس طرح بلاتی تھیں" بیوی تاجو تاج ملو کو سر پر تاج نصرت بانو بیٹیاں شاہ بیویاں" ایک دن محل کے چبوترے پر مرغا بھاگا پھرتا تھا کسی طرف سے بلی آئی اور مرغے کو زخمی کر گئی تو بیگم نے نصرت بانو کو اس طرح بلایا" بیوی تاجو تاج ملو کو سر پر تاج نصرت بانو بیٹیاں شاہ بیویاں چھری لاؤ مرغا مرتا ہے۔ اس خطاب کو پورا کرتے کرتے مرغا مر گیا اور چھری نہ آنے پائی۔

"ساقی"

نئی کتابیں

مخزن نکات یعنی تذکرۂ شعرائے اردو، تصنیف شیخ محمد قیام الدین قائم مع مقدمہ و انتخاب کلام قائم از مولوی عبد الحق صاحب بی۔اے سکرٹری انجمن ترقی اردو۔ حجم ایک سو صفحات سے زائد کتابت طباعت عمدہ قیمت فی جلد مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے۔ یہ تذکرہ اُنہیں قائم کا لکھا ہوا ہے جن کی نسبت آزاد کی رائے تھی کہ ان کا دیوان ہرگز میر و میرزا کے دیوان سے نیچے نہیں رکھ سکتے۔ یہ ۱۱۶۸ھ میں تالیف ہوا اور اس میں قائم سمیت ۴۸ شعرا کا ذکر کیا گیا ہے۔ قائم نے اس میں تین طبقے مقرر کئے ہیں۔ طبقۂ اول میں متقدمین کا، طبقۂ دوم میں متوسطین کا اور طبقۂ سوم میں متاخرین کا ذکر ہے۔ ہر طبقے کے شروع میں مختصر طور پر اس طبقے کی خصوصیات لکھی ہیں۔ بعض بعض شعرا کے کلام کے متعلق رائے کا اظہار بھی کیا ہے۔ اور چونکہ وہ خود شاعر تھے اس لئے اُن کی رائے اکثر صائب ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اہل ذوق اس نایاب تذکرے کی قدر کریں گے۔ ملنے کا پتہ، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد (دکن)

کردار اور افسانہ مصنفہ مولوی عبد القادر صاحب سروری ایم۔اے، ایل ایل بی۔ یہ کتاب دنیائے افسانہ کے مفید سلسلہ کی دوسری کڑی ہے۔ اس میں کردار یا اشخاص قصّہ کی سیرت و جبلت پر بحث کی گئی ہے اور کردار نگاری کے اصول بیان کر کے اُن اصول کے مطابق اردو کے قدیم و جدید مشہور قصّوں کے کرداروں کی تنقید کی گئی ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کردار کا بیان قصّے کے لئے کتنی اہمیت رکھتا ہے اور اس کو نمایاں کرنے کے لئے اُس کے کون کون سے افعال مدِنظر ہونے چاہئیں۔ افسانہ نگاروں کے لئے خصوصًا اور اُن لوگوں کے لئے عمومًا یہ کتاب بہت مفید ہے جو افسانے کا مطالعہ فنی نقطۂ نظر سے کرنا چاہتے ہیں۔ انداز تحریر دلچسپ ہے حجم ۲۳۲ صفحے قیمت مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے۔ مینیجر کتبۂ ابراہیمیہ، اسٹیشن روڈ، حیدر آباد (دکن) سے طلب فرمائیے۔

منکران خدا سے خطاب مولوی سید علی اختر صاحب اختر کی بصیرت افروز نظم ہے جس میں انہوں نے عجیب حکیمانہ انداز سے منکرین حق کو خدا کی ہستی کا قائل کیا ہے ابتدا میں مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی فلسفیانہ تقریب بھی شامل ہے۔ حجم ۴۰ صفحے قیمت ۴؍ ناشر مطبع عہد آفریں۔ ترپ بازار، حیدر آباد (دکن)

مولودِ نبوی اور مسئلہ تعلیم مصنفہ حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب رئیس دتاولی۔ اس کتاب میں ثابت کیا گیا ہے کہ مسلمان از روئے مذہب مجبور ہے کہ تعلیم کے حصول سے کسی وقت غافل نہ رہے اور یہ اسلام میں تعلیم کا دوامی اور مستحکم انتظام ہے حجم ۸ صفحات قیمت ۸؍ پتہ مسلم نیشنل سکول خورجہ ضلع بلند شہر۔

تصحیح التاریخ۔ مصنفہ قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم اس کتاب میں اُن اعتراضات کے جواب دیئے گئے ہیں جو مخالفین اسلام ہندوستان کے اسلامی فرمانرواؤں پر کرتے ہیں۔ کتاب بڑی محنت اور تحقیق سے لکھی گئی ہے اور تائید کے لئے زیادہ تر غیر مسلم مورخین کی سند پیش کی گئی ہے کتاب کا بڑا حصہ اورنگ زیب عالمگیر کے متعلق ہے۔ چونکہ اسلامی فرمانرواؤں میں سب سے زیادہ مطعون بھی یہی ہیں اس لئے ضرورت بھی اسی کی تھی۔ حجم ۸۷ صفحات لکھائی چھپائی اور کاغذ معمولی قیمت آٹھ آنے۔ پتہ قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم، مکان مولوی فیض الدین صاحب وکیل، محلہ عابد شاپ حیدر آباد دکن۔

فلسفۂ موسیقی۔ تیس صفحے کے اس رسالے میں حکیم عبدالقوی صاحب لکھنوی کا وہ لکچر شائع کیا گیا ہے جو انہوں نے مسلم ایکاڈمی لکھنؤ کے لئے لکھا۔ اس میں موسیقی کی حقیقت اور اُس کے اثرات و نتائج سے بحث کی گئی ہے قیمت ۴ر۔ پتہ۔ اعجاز بک ایجنسی، بارہ بنکی

حکایات شرلک ہومز۔ سر کانن ڈائل کے مشہور و مقبول افسانوں کا ترجمہ ہے جس میں جاسوس شرلک ہومز کا کردار انسانی ذہانت و ذکاوت کا حیرت انگیز نمونہ ہے۔ ترجمہ منشی محمد یعقوب صاحب کلام بی اے نے کیا ہے۔ حجم ۲۵۰ صفحے سے زائد۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اچھا۔ قیمت ایک روپیہ۔ پتہ، مینجر صدیق بک ڈپو لکھنؤ۔

زبانِ داغ۔ اس چھوٹے سے خوبصورت مجموعے میں مرزا داغ دہلوی کا منتخب کلام جمع کیا گیا ہے انتخاب میں ذوقِ سلیم سے کام لیا گیا ہے۔ پتہ۔ راؤ بہادر حاجی عبدالحمید خاں صاحب نظر، باغپت، ضلع میرٹھ

پیمانۂ محبت۔ یہ منشی مولا بخش صاحب ہمدم کی غزلیات و قطعات کا مجموعہ ہے جس کے شروع میں "سرمستیٔ غالب" کے نام سے ایک باب کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس میں غزلیاتِ غالب پر تضمین ہے تضمین ہمارے خیال میں کوئی اچھی صنفِ شعر نہیں ہے لیکن ہمدم صاحب نے اس میں بھی اچھے اچھے شعر نکالے ہیں۔ اُن کی غزلیات اور قطعات کے بعض اشعار بہت اچھے ہیں اور قابلِ غور ہیں۔ حجم ۱۲۸ صفحات۔ قیمت درج نہیں۔ پتہ۔ مینجر اخبار "ملت" سٹار بلڈنگ، لارنس روڈ کراچی۔

پیامِ نور۔ عبدالوہاب صاحب تکی کی پُرجوش نظم ہے جس میں مسلمانوں کی کامیابی کے لئے دستور العمل پیش کیا گیا ہے۔ حجم ۳۲ صفحے۔ قیمت دو آنے، پتہ۔ عبدالوہاب صاحب تکی، محلہ بسون گڑھی، محمڈن بلاک، بنگلور۔

دوزخ والوں کو فرشتۂ بہشت کا پیغام

اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ بیماری اور کمزوری کی زندگی بھی دوزخ کی سی تکلیف رساں ہے اگر آپ بیمار اور کمزور ہیں تو آتنگ نگرہ گولیوں کا استعمال کریں۔ یہ گولیاں فرشتۂ بہشت کا کام کریں گی چندہی ایام میں قبض بدہضمی خون اور مادہ تولید کی خرابی وغیرہ کی تکالیف سے نجات دلاکر اعلیٰ درجہ کی طاقت و توانائی عطا کرکے لذتِ بیوی سے مالامال کردیں گی اور آپ پوری صحت و تندرستی حاصل کرکے بہشت کی سی مسرت حاصل کریں گے قیمت فی ڈبیہ ۳۲ گولیاں صرف ایک روپیہ پانچ ڈبیاں چار روپیہ علاوہ محصول ڈاک

امرتار نو او لیہہ یعنی بحر آبحیات نحیف الجسم ضعیف الدماغ و قوئ کیلئے یہ اولیہہ (لعوق) ہمہ صفت موصوف ہے جسم سے گرمی کی زیادتی دور کرکے خون کی تپش کو دور کرکے دل دماغ اور معدہ کو اعلیٰ درجہ کی قوت دیتا ہے۔ خون کو زیادہ کرکے جسم کو معقول فربہی دے کر قبل از وقت کی ضعیفی کو دور کرکے قوی الجسم بنا دیتا ہے۔ مرد۔ عورت۔ بچے۔ نوجوان۔ بڈھے استعمال کرکے یکساں فائدہ اٹھاتے ہیں، دماغی کام کرنے والوں کیلئے واقعی آبحیات ہے، نہایت مقوی آیورویدک جڑی بوٹیوں، لذیذ اور پرذائقہ ہوتا ہے۔ صبح ایک ایک تولہ بطور ناشتہ نوش کرسکتے ہیں قیمت فی ڈبیہ ۲۰ تولہ والی صرف دو روپیہ (عہ)

بال متر گولیاں (ہمدرد اطفال) بچوں کی ناساز طبیعت سے والدین کو سخت تکلیف ہوتی ہے اور گھر بے رونق ہوجاتا ہے لیکن یہی نونہالان تندرستی کی حالت میں ہر ایک کی مسرت کو دوبالا کردیتے ہیں جو شخص لڑکپن سے ہی بیمار ہے اسکی جوانی کیسی ہوگی اور کیا کرسکے گا اس لئے بیمار بچوں کو تندرست اور تندرست بچوں کو طاقتور بنانے کیلئے بال متر گولیوں کا استعمال کرادیں۔ یہ گولیاں بچوں کی جملہ شکایتوں دست کا زیادہ آنا۔ قے کا ہونا شکم کا بڑھنا جسم کا زرد پڑجانا تپ سستی کاہلی، دبلاپن وغیرہ دور ہوکر پوری صحت اور تندرستی چستی چالاکی حاصل ہوتی ہے قیمت فی ڈبیہ تین سو گولیوں کی صرف ایک روپیہ

ملنے کا پتہ وید شاستری منی شنکر گووندرام جی جام نگر کاٹھیاواڑ + لالہ بھگت رام پوری اینڈ سنز (ایجنٹ) سوتر منڈی لاہور

مخزن نعمت

جس میں ہر قسم کے ماکولات مثلاً ہر قسم کے سالن ہر طرح کی سبزیاں۔ رشید گیو قسم قسم کے پلاؤ زردہ، متنجن، بریانی، دوپیازے قسم قسم کے کباب۔ بھرتے والیں مچھلی بڑے وغیرہ انواع اقسام کے مقوی حلوے کئی قسم کی کھیریں اور پھرنیاں، سویاں پڑنگ قسم قسم کے نان پراٹھے روٹی پوری کتلمہ۔ باقرخانی بھیلنی کیک۔ بسکٹ۔ طرح طرح کی خستہ اور لذیذ مٹھائیاں مثلاً بالوشاہی، جلیبی، شکرپارہ، کھجور، گلاب جامن قسم قسم کے لڈو۔ گلگلے پیڑے، برفی قلاقند۔ ریوڑی گزک۔ رس گلے۔ الائچی دانے۔ اکبریاں۔ اولے۔ اندرسہ وغیرہ اور انواع اقسام کے مقوی اور خوش ذائقہ شربت بادام، سیب، انار، خشخاش، شہتوت، لیموں، صندل، نیلوفر، گلاب، بنفشہ، عناب، سکنجبین تیار کرنے کی ترکیبیں درج ہیں ہر قسم کے اچار اور ہر طرح کے مربے تیار کرنا نیز بگڑتے ہوئے کھانوں کو درست کرلینا مچھلی کا کانٹا گلانے کی ترکیب تازہ اور باسی دودھ کی پہچان۔ گندے انڈوں کی شناخت مکھن گھی اور پنیر کے متعلق ہدایات، کھانا کھلانے اور کھلانے کے پسندیدہ طریقے اور آداب درج ہیں قیمت ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصول وغیرہ

دفتر مخزن نعمت۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۳ لاہور

قیمت ایک روپیہ چار آنے علاوہ محصول
فوقی کتب خانہ ریلوے روڈ
لاہور

شائقین

دیوانِ گرامی کی ترتیب و اس

عرصہ سے ملک الشعرا مولانا غلام قادر صاحب گرامی مرحوم منصبدار حضور نظام دکن کے دیوان کی اشاعت کا۔
اب شائقین شعر و ادب کو اطلاع دی جاتی ہے کہ دیوان کی ترتیب مکمل ہو چکی ہے اور کتابت عنقریب شروع ہو۔
کہ کتابت و طباعت کے تمام مراحل انشاء اللہ تین چار ماہ میں طے ہو جائیں گے اور ماہ نومبر میں کتاب شائقین تک پہنچ

دیوان قریباً ڈھائی ہزار اشعار پر مشتمل ہوگا جس میں غزلیات، مثنویات، رباعیات اور قصائد وغیرہ سب شامل ہیں۔

کتابت و طباعت علامہ سر محمد اقبال مدظلہ کے مشورہ سے ہوگی۔ کتابت ہندوستان کے بہترین خوشنویس منشی عبدالمجید صاحب پروین رقم کریں گے۔ کاغذ اور طباعت بھی اعلیٰ ہوگی اور ہر طرح سے کوشش کی جائے گی کہ کتاب باطنی خوبیوں کے علاوہ ظاہری لحاظ سے بھی لاجواب ہو۔ اس اطلاع کے ساتھ ہی دلدادگانِ طرزِ گرامی کو ان کے فرض کی طرف توجہ دلانا چاہتی ہوں

خاکسار

اقبال بیگم اہلیہ مولانا گرامی مرحوم۔ گرامی منزل ہوشیارپور

... یال

... رہے۔ اپنی طرف سے

... جدوجہد ہوگی۔ لیکن پبلک کی سرپرستی

... ہمارے ملک و قوم کی اعانت کے بغیر یہ بیڑا پار کیونکر لگیگا۔ نمونہ کی تقسیم اور معاصرین کی امداد سے جس قدر مستقل معاون بہم پہونچے ہیں وہ رسالہ کی ضروریات زندگی کے کفیل نہیں ہو سکتے۔ ایسے اعلیٰ درجہ کے میگزین کی اشاعت ہزاروں سے کم رہے تو یہ کیا کام کر سکیگا۔ اگر اسکو اپنے پاؤں ہی پر کھڑا ہونا مشکل ہوگا تو یہ آگے کیا چلیگا۔ اس لئے علم و ادب کے شائق اور اتحاد و اتفاق کیساتھ مجلسی اصلاح اور ہر گونہ ترقیوں کے دلدادہ پبلک سے خواہش کیجاتی ہے کہ وہ چاند (اردو) کا دائرہ اثر وسیع اور وسیع تر بنائے اور اسے خرید فرما کر ہمیں حسب منشا خدمتگزاری کا موقع دے۔

ایڈیٹر منشی کنھیا لال ایم اے، ایل ایل، بی ایڈوکیٹ

— نوٹ —

خاص نوٹ۔ مضامین نظم و نثر اور دیگر ایڈیٹوریل مضامین کے بابت مراسلات بنام ایڈیٹر چاند (اردو) ہونا چاہیئے۔

امریکن سیڈ اینڈ نرسری کمپنی تخم فروشان و ذخیرہ فروشان
کوٹھی نمبر ۸۸ میکلوڈ روڈ
لاہور

رسالہ
مشیر باغبانی
لاہور

نمونہ مفت
چندہ صرف ایک
روپیہ سالانہ

مفت
بیرہ جات
فہرست تخم

دربھنگہ مشہور ترین قلمہائے انبہ و لیچی

ہر اقسام کے آموں اور لیچیوں کی قلمیں نہایت ہی شاداب و جلد بار فی درجن بحساب جو اس سال ثمردار ہونگی ۳ سہ سالہ ۲۵ دو سالہ ۲ یک سالہ ۱۳ محصول بذمہ خریدار۔ **نوٹ:۔** بغیر زر پیشگی تعمیل فرمائش نہ ہوگی۔ فہرست کارخانہ مفت طلب فرمائیے

مینجر گریفٹ مین نمبر ۴۳ لہریا سرائے (بہار)

دہلی کے کھنڈروں سے ایک صدا

شاہجہان آباد اُجڑ چکا مگر اس کے کھنڈر اب تک مٹنے والوں کے کارنامے سنا رہے ہیں اور شہر کے در و دیوار اس وقت بھی اپنے مہمانوں کا مرثیہ پڑھ رہے ہیں۔ آج سے ستّر سال پہلے دلّی کیا تھی۔ بادشاہوں کا جلوس قلعہ معلّٰی کی بہاریں۔ شاہی جھمگھٹے۔ میلوں تماشوں کے رنگ دربار کی کیفیت۔ قطب صاحب کے مقبرے۔ عید شاہ بڑے اور کوٹلہ کے جشن۔ شہر آبادی کی چہل پہل ہندو مسلمانوں کی معاشرت۔ رمضان۔ عید۔ سلونو سالگرہ کے تزک و احتشام۔ شادی بیاہ کی رسوم۔ غرض دورِ گزشتہ کی بہار دیکھنی ہو تو مصور غم **علامہ راشد الخیری** کی تصنیف **نوبت پنجروزہ** و **داع ظفر** ملاحظہ فرمائیے جس میں آخری تاجدار مغلیہ کی پانچ نوبتیں اس قدر درد انگیز پیرایہ میں لکھی گئی ہیں کہ خون کے آنسو رلوادیں گی۔ پانچویں نوبت وہ ہے جب دلّی نے بادشاہ کو وداع کیا۔ غدر ۵۷ء کے واقعات۔ مجرموں کا ظلم۔ مظلوموں کی حالت زار مردوں کی بربادی۔ عورتوں کی تباہی اور بادشاہ کے مہیب مصائب۔ ناممکن ہے کہ آپ آنسو بہائے بغیر پڑھ سکیں۔ بادشاہ کی تصویر اور تین نادر عکسی تحریریں بھی دی گئی ہیں۔ نوبت پنجروزہ دورِ حاضرہ کے مایہ ناز اردو مصنف کی بہترین تصنیف ہے اور دھڑا دھڑ نکل رہی ہے **قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ** (عہ۸)

انگریزوں کی بپتا — غدر ۵۷ء میں انگریزوں پر ان کے بچوں پر ان کی عورتوں پر کیا گزری انگریز بچے کس طرح جلائے گئے انگریز کس طرح قتل کئے گئے اور کس طرح دہلی چھوڑ کر کرنال وغیرہ بھاگے۔ بڑی مؤثر کتاب ہے۔ **قیمت آٹھ آنے** (۸/)

نوحہ زندگی

بیوہ کے نکاح ثانی پر علامہ محترم کی مشہور تصنیف۔ رسم و رواج میں پھنس کر مسلمان کس طرح تباہ ہوتے اس کتاب سے معلوم ہو یہاں ایسا قبرستان ملیگا جہاں عصمت کی لاج رکھنے والی بیوی اور عزت پر قربان ہونیوالی ماں دائیں بائیں اپنے دو معصوم بچوں کے لیے گہری نیند سو رہی ہے۔ نہایت موثر کتاب ہے۔ ساتویں مرتبہ چھپی ہے قیمت بارہ آنے

ایک لاکھ بک چکی ہے

بلا مدد استاد کے گھر بیٹھے اگر آپ انگریزی پڑھنا بولنا چاہتے ہیں تو آج ہی انگلش ٹیچر منگا لیجئے۔ ایک ماہ میں انگریزی آجائیگی طالب علم کے لئے از حد مفید ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

اس کے علاوہ ہر قسم کی کتابیں منگانے کا پتہ:۔

رحمان بک ڈپو۔ کٹرہ دینا بیگ۔ دہلی

چاند

الہ آباد کے ہندی سالہ چاند کا اردو ایڈیشن

چاند کی ٹھنڈی اور خوشگوار روشنی کی طرح اس کی پالیسی بھی گرما گرمی سے پاک ہے۔ روشنی عیوب اور خوبیوں کو یکساں دکھاتی ہے چاند بھی تاریک اور چمکدار تمام اشیا کو روشنی میں لاتا ہے مگر محض اصلاح اور خیر خواہی کی ٹھنڈک کے ساتھ، عداوت اور اعتراض کی شر فشانی اس میں نہیں ہوتی یہی سبب ہے کہ سچے بہی خواہاں ملک و قوم اور معاونین اصلاح و اتحاد اس نے چاند کا بڑے تپاک سے خیر مقدم فرما رہے ہیں اور دل و جان سے اس کے مشتری بنتے جاتے ہیں۔ اس ضرورت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ آج ہمارا بد قسمت ملک سینکڑوں مختلف خیالات کا اکھاڑہ بنا ہوا ہے۔ انسانی خیالوں کا جدا ہونا ایک قدرتی بات ہے لیکن یہ نیرنگی تعصب اور بدنیتی سے خالی اور خود پرستی اور خود غرضی سے عاری ہو تو باعث رحمت ہے ورنہ موجب زحمت ہے رنج و عداوت کا بیج ہر سے (؟) رہتی قوم کا ترقی (؟)

چاند اس مشن کو لیکر جلوہ ریز ہوا ہے کہ ہندو مسلم اور دیگر اقوام ہند کو گنگا جمنا اور سرسوتی کے سنگم کی طرح باہم ملا دے۔ جو روانی میں ایک دوسرے سے ممتاز ہونے کے باوجود دور تک پہلو سے پہلو ملا کر بہتا اور باہم کوئی مزاحمت نہیں دکھاتا۔ گویا یہ سنگم اس امر کا قدرتی سبق ہے کہ گنگا اور جمنا کا پانی رنگ و روپ اور مقدار و اثر میں مخالف، مگر فیاضی اور سیرابی کے وصف میں یکساں ہے، اور آپس میں مل کر ایک دوسرے سے مخلوط ہوتے بغیر آشتی اور محبت کے ساتھ بغلگیر ہو جاتا ہے۔ کیا غافل انسان اس سے سبق نہ سمجھے گا۔

چاند یہ چاہتا ہے کہ اس کی اشاعت کا دائرہ جلد سے جلد اس کے ہندی ایڈیشن کی طرح وسیع ہو جائے اور اس کو اقصائے ہند میں کامل نور افشانی کا موقع مل سکے اور وہ کسی قسم کے زوال کا نشانہ بننے سے محفوظ ہو جائے۔ اس کی یہ خواہش قدرتی اور جائز ہے اس لئے بار بار اہل ملک کے کانوں تک اپنی صدا پہنچاتا اور ان کی اعانت و سرپرستی کی امید کرتا ہے۔

سوا سو صفحوں سے زائد عمدہ کاغذ نفیس چھپائی و بکثرت رنگین سادہ عکسی تصاویر اور کارٹون کے ساتھ ہر مہینہ میں پندرہ تاریخ تک پورا ہو کر چمکتا اور چندر لوک الہ آباد سے برآمد ہوتا ہے نمونہ کی رونمائی ۸ اور سالانہ نذر اعانت ۸ روپیہ ہے ششماہی پانچ روپے مقرر ہیں کیا آپ نے ابھی اس کو نہیں دیکھا براہ کرم زیادہ تامل نہ کریں اور جلد سے جلد اس کو ملاحظہ فرمائیں پھر آپ خود ہی اسکی سرپرستی کے دلدادہ ہو جائیں گے۔

ایڈیٹر منشی کنہیا لال ایم اے ایل ایل بی ایڈووکیٹ

نام نامی بلا توقف مندرج فہرست خریداراں کرائیے

"چاند" اردو میں اشتہارات دینا کامیابی کا وسیلہ معقول ہے مفصل کیفیت منیجر دفتر "چاند" اردو ایڈیشن چندر لوک الہ آباد سے دریافت کیجئے۔

خاص نوٹ۔ مضامین نظم و نثر اور دیگر ایڈیٹوریل مضامین کے بابت مراسلات بنام ایڈیٹر "چاند" (اردو) ہونا چاہئے۔

قواعد

۱۔ "ھُمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی وادبی، تمدنی واخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پُورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جاسکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم ازکم بہتر صفحے ماہوار اور ساڑھے نوسو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہئے
اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتہً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ۱؍ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیئے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے، ششماہی تین روپے (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۸؍ نمونہ ۶؍

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجیئے۔

۱۱۔ خط وکتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۳۔ لارنس روڈ لاہور

سید عبداللطیف مینیجر رسالہ ہمایوں نے مسلم پرنٹنگ پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۶۳

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگار علامہ فضیلت مآب آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہُمایُوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: منصور احمد

فہرستِ مضامین

جلد ۱۲ — نمبر ۴

بابت ماہِ اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ء

تصویر:- طاقِ کسریٰ

جہاں نما

جدید ترکی ادب

ڈاکٹر جولیس جرمنوس جنہیں حضور نظام نے "وسوا بھارتی" کے ادارہ میں شعبۂ اسلامیات تفویض کر رکھا ہے موجودہ تحریکاتِ اسلام پر تبصرہ کرتے ہوئے ترکی ادب میں جدید تحریک کی نسبت لکھتے ہیں :-

گزشتہ نصف صدی کے دوران میں یا اُس وقت سے جب کہ پہلی مرتبہ نوجوان ترکی اہلِ قلم کی تصانیف وجود میں آئیں ترکی ادب نے ایک طویل منزل طے کی ہے ۔ یہاں تک کہ نامک کمال ، ضیا پاشا اور عبدالحق حمید کے پُرتکلف فقرے بھی گراں گزرنے لگے ۔ اور انہوں نے عوام کی بے تکلف زبان کے لئے جگہ خالی کر دی ۔ ترکی قومیّت نے اپنے آپ کو زمانۂ ماضی کے تمام بندھنوں سے آزاد کر لیا ۔ عربی زبان کی بزرگی زائل ہو گئی اور غیر زبانوں کے بے معنی الفاظ متروک ہو گئے ۔ ترکی زبان پھر خیالات کے اخفا کی بجائے اُن کے اظہار کا ذریعہ بن گئی ۔ پرانے ادبیات میں ترکوں کے لئے روز بروز اجنبیّت بڑھنے لگی اور اُن سے کم از کم دلچسپی لی جانے لگی ۔ فضولی ۔ ندیم اور باقی کے حوالے جدید تصانیف میں باقی رہے لیکن خود اُن کی تصانیف کا رواج کم ہو گیا بدلنے والے زمانے نے نئے خیالات اور نئی طرزیں پیدا کیں ۔ بجائے غزل کے جس میں مضمون کی یکسانیت گراں گزرنے لگتی ہے ۔ یورپی شاعری اپنے بے پایاں تنوع کے ساتھ لوگوں کے دلوں کو گرمانے لگی ۔ یورپی طرزوں کا سب سے بڑا علم بردار اکرم ہے جو خوبصورت ترین ترکی انداز کا بھی مالک ہے ۔ ڈراما لکھنے والوں میں ترکی نے عبدالحق حمید ایک غیر معمولی قابلیت کا انسان پیدا کیا ، جو اپنے نثری ڈراموں کے طفیل بقائے دوام کی منزل تک پہنچ چکا ہے ۔ فرانسیسی ادبی تحریکات ترکی شاعروں پر نہایت سرعت سے اثر انداز ہوئیں ، اور جدت پسندوں نے جلد ہی توفیق فکرت اور جناب شہاب الدین کے کلام میں اس کے نمونے دکھا دئیے ۔ نثری ادب میں ترکی ناول نے ایک نئی چیز پیدا کی جسے ملی ناول کا نام دیا گیا کیونکہ اس میں قومی و معاشرتی باتیں ہوتی تھیں ۔ اور متعدد مصنفین نے یہ خاص قسم کے جدید ترکی افسانے لکھنے شروع کئے جن میں قومیّت ، رومان اور تالّم کے عناصر موجود تھے ۔ ظریفانہ ادب نے بھی بہت جلد ترقی کی کیونکہ اسے ترکی فطرت سے ایک خاص مناسبت تھی ۔ یہ تمام ادبی پیداوار بتا رہی ہے کہ صدیوں کی نیند کے بعد ترکی روح ، گو آہستہ

آہستہ لیکن یقینی طور پر بیدار ہوگئی ہے۔ اس دوران میں ہر نیا ادبی کارنامہ بدیسی بندشوں سے اپنی زبان کو چھڑانے کی ایک کوشش تھا، اور اس کے ساتھ ہی ایک آئینہ تھا ایشیائی اور یورپی اقتدار سے ترکی کو آزاد کرانے کی کشمکش میں ترقی کا۔ شاعر اپنے دل کے گیت لوگوں کی زبان میں گانے لگے، افسانہ نگار قومی افراد کی زندگیوں کے حالات ایک عام انداز میں بیان کرنے لگے اور سیاست دان آخر کار قوم کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرنے لگے۔ قدیم الفاظ اور قدیم جملے جو قدیم مذاق اور قدیم کانوں کو بھلے معلوم ہوتے تھے یک قلم منسوخ ہوگئے اور اُن کی جگہ اناطولیہ کے کسانوں کی زبان نے لے لی۔ ترکوں کے لئے ایک نیا ترکی ادب اُن کی اپنی زبان میں پیدا کیا گیا۔

ماسکو کی سرکاری دکانیں

برلن کے ایک ہفتہ وار اخبار نے ماسکو کی روزانہ زندگی کے متعلق ایک دلچسپ مضمون شائع کیا ہے اسی سلسلے میں اُس نے بتایا ہے کہ ماسکو میں تمام بڑی بڑی تجارتی کوٹھیوں اور دکانوں کا انتظام حکومت کے ہاتھ میں ہے اور لوگوں کی ذاتی دکانیں وہاں نہیں پائی جاتیں۔ وہ لکھتا ہے:-

سوویٹ دارالحکومت کی سرہابت برلن جیسی ہے مگر اس کے باوجود اِس سے قطعاً مختلف ہے۔ اس مضحکہ خیز پہیلی کا مطلب بھی سمجھ لیجئے۔ مثال کے طور پر ہم تجارت کو لیتے ہیں۔ گودام بالکل ایسے ہیں جیسے ہمارے ہاں موجود ہیں اور اسی انداز سے سجے ہوئے ہیں۔ فوٹوگرافی کی دکانیں، پھولوں کی دکانیں، شراب کی دکانیں، ڈبل روٹی اور بسکٹ کی دکانیں غرض کہ ہر چیز کی دکانیں وہاں موجود ہیں۔ شہر کے مرکزی حصے میں تمام سرکاری گودام پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی بڑی بڑی نمائشی کھڑکیاں ہمارے ہاں کی طرح سجی ہوتی ہیں۔ ماسکو میں گھومنے کے لئے آسانی سے کرایہ کی موٹریں مل جاتی ہیں۔ بازار برلن ہی طرح امریکی موٹر کاروں سے بھرے رہتے ہیں۔ صرف فرق اتنا ہے کہ یہ تمام اعلیٰ درجے کی دکانیں یہ تمام گاڑیاں اور موٹر کاریں افراد کی ملکیت نہیں ہوتیں بلکہ روسی حکومت، ماسکو کے شہر اور تجارتی اتحادات کی ملکیت ہوتی ہیں۔ ماسکو کی ننانوے فی صدی تجارت پیشہ افراد کے قبضے سے نکال لی گئی ہے۔ اب صرف چند دورافتادہ چھوٹی چھوٹی دکانیں ایسی رہ گئی ہیں جو غیر سرکاری ہیں، اور جو اکثر موچی، درزی وغیرہ کی ہیں۔ کاروبار کے لئے محکمے قائم ہیں۔ ماسکو کی تمام تجارتی کوٹھیوں اور گوداموں کا تقریباً تین چوتھائی حصہ تین یا چار محکموں کی ملکیت ہے،

اس لئے جدھر نگاہ اٹھاؤ وہی نام بار بار نظر آتے ہیں ۔ جو محکمہ زراعتی پیداوار کا کاروبار کرتا ہے اس کا نام موسل پرومٔ ہے ۔ اس کی تقریباً پانچ سو دوکانیں ہیں ، جن میں چاکولیٹ ، کیک ، بیر ، واڈ کا ، سگریٹ اور ہر قسم کی گھر کی ضروریات مل جاتی ہیں ۔ دوسرا نام کوموز ہے ۔ اس کی بھی اتنی ہی دکانیں ہونگی ۔ یہ کپڑا ، جوتے ، ٹوپیاں وغیرہ فروخت کرتے ہیں ۔

اِن تجارتی انجمنوں کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ باوجود عظیم تنوع کے یہاں کسی چیز کا معیار گرنے نہیں پاتا ۔ اِسی طرح قیمتوں کا معیار بھی ایک ہی ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اچھی بُری اور مہنگی سستی کا جھگڑا ہی چُک گیا ہے ۔ کتابوں کی بھی یہاں بے اندازہ دکانیں ہیں ۔ ان میں اکثر بہت بڑی ہیں اور اُن کی نمائشی کھڑکیاں جدید ترین اصول پر سجائی گئی ہیں ۔ شاید اسی لئے لوگوں کا ہجوم اُن کے دروازوں پر جمع رہتا ہے ماسکو میں کتابیں بہت سستی ہیں ۔ لیکن ایک چیز کی یہاں بہت کمی ہے ۔ قہوہ خانے یہاں بالکل نہیں ہیں ۔ انسان تفریح کے لئے کچھ کھا پی نہیں سکتا ۔ روسیوں نے ان کی بندش کو شراب کے امتناع کا ایک ذریعہ بنایا ہے ، لیکن یہ ایک عجیب ذریعہ ہے ۔ امتناع دراصل منظرِ عام میں پینے کا ہے ۔ گھر پر پینے کے لئے جتنی شراب کوئی چاہے حکومت کے شراب خانوں سے مل جاتی ہے محتسب را درونِ خانہ چہ کار ۔

پانچ ہزار سال پہلے کی طب

شکاگو یونیورسٹی پریس نے حال ہی میں ایک کتاب شائع کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سے ۴۷۰۰ سال قبل مصری اطبا کا طریقِ علاج کیا تھا ۔

یہ دنیا کی پہلی طبی کتاب ہے جسے تقریباً تین ہزار برس قبلِ مسیح کے فراعنہ کے درباری طبیب اِم ہوتپ نے لکھا ۔ یہ قدیم مصری طبیب اُسی زمانے میں اُن طبّی انکشافات سے واقف نظر آتا ہے جنہیں ہم گذشتہ صدی سے منسوب کرتے ہیں ۔

اِم ہوتپ پہلا وہ شخص ہے جس نے انسانی امراض کے علاج کے معاملہ میں توہم پرستی کو بالائے طاق رکھ کر ایسے حقائق پیش کئے جن سے امراض کی تشخیص ہوسکتی تھی ۔ یہی وہ شخص ہے جس نے علم الاعضا میں لفظِ "دماغ" کا اضافہ کیا اور بتایا کہ انسان کے جسم میں دوران کا ایک سلسلہ قائم ہے جس کا مرکز قلب ہے ۔

اِس حکیم کی کتاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُسے دماغ کے افعال اور اُس کے اثرات کے تعیّن کا بھی علم تھا۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کو پُورے طور پر صرف موجودہ نسل ہی سمجھ سکی ہے۔ وہ اپنے مشاہدے کے رُو سے بیان کرتا ہے کہ دماغ کے جس پہلو کو صدمہ پہنچتا ہے جسم کا بھی وہی پہلو بےحس ہوتا ہے۔

یہ کتاب جسے اب شکاگو یونیورسٹی پریس نے شائع کیا ہے سب سے پہلے قدیم مصری کاغذ کے ایک لمبے قطعے پر لکھی گئی تھی جس کا طول پانچ گز سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ جراحی کے متعلق اس میں چیپ دار فیتوں، مختلف قسم کی پٹیوں، پہنچیوں اور زخموں کو سینے کا ذکر ہے۔ لیکن جراحی کے صرف ایک اوزار کا نام لکھا ہے، اور وہ لوہے کی ایک سلائی ہے جسے گرم کرکے زخم کو داغا جاتا تھا۔

اِس کتاب کے مسودے کی قیمت اور اس کے مطالعے اور ترجمے کی اُجرت پر تین لاکھ ڈالر صرف ہوئے ہیں۔

مغرب کی ایک جھلک

ایک ہندی مسلم خاتون اپنے ایک خط میں بلینکن برگ (بلجیم) سے لکھتی ہیں :-

جس ہوٹل میں قیام ہے یہ ایک ایسی جگہ واقع ہے کہ باہر نہ بھی جاؤ تو ہر دم گھر بیٹھے سیر ہو رہی ہے۔ سمندر کے بالکل اوپر بنا یا ہوا ہے۔ ہزاروں آدمی نہاتے اور ریت پر لیٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سینکڑوں بچے کھیل رہے ہیں۔۔۔۔ یہاں بہت خوش ہے صبح سے بچوں کے ساتھ سمندر کے کنارے پر جا کر کھیلتا رہتا ہے۔ ریت اور پانی دونوں میں مل کر کھیلتے ہیں۔ کل ہم آسٹنڈ گئے تھے۔ ٹریم پر ایک گھنٹے میں جا پہنچے۔ پیاری بہن! یہ شہر ایک چھوٹا سا پیرس ہے۔ ایک تفریح گاہ میں گئے۔ ایک بہت بڑا گول ہال جس میں آٹھ دس ہزار کرسیاں پڑی تھیں درمیان میں ہے۔ ایک کونے پر بینڈ کی جگہ ہے اور دوسری طرف تمام شیشوں کی دیوار ہے اور اُس کے باہر سمندر۔ چھوٹے چھوٹے جہاز سمندر میں آتے اور جاتے رہتے ہیں۔ ہال میں سرخ پتھر کے جگہ جگہ ستون ہیں اور ہزاروں جھاڑ فانوس چھت پر سے لٹک رہے ہیں۔ ایسی خوبصورت عمارت میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ جس وقت ہم گئے ہیں ہال لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ ارگن بج رہا تھا۔ ایک طرف موسیقی کا بحر نا پیدا کنار دوسری طرف نیگوں سمندر۔ ہزاروں آدمیوں کی مجلس میں اس قدر خاموشی۔ غرض ایک ایسا سماں تھا کہ جس نے دل پر بےحد اثر کیا۔ باجے میں سے رہ رہ کر انسانی جذبات کی صحیح تصویر موسیقی میں کھینچ رہی تھی دل اور دماغ میں ایک تلاطم پیدا ہوتا تھا اور پھر ایک سکون سا طاری ہو جاتا تھا۔ میں اس قدر محو ہوئی کہ والدہ صاحبہ نے جب چائے کا پیالہ ہاتھ میں دیا تو ہنس پڑیں اور کہا کہ جاگو!

طاقِ کسریٰ

ساسانیوں کے پہلے بادشاہ نے دریائے دجلہ کے کنارے اپنا نیا دارالحکومت المدائن تعمیر کیا۔ اس شہر کے جنوب مشرق کی طرف شاہ پور نے وہ عالی شان اور وسیع محل بنوانا شروع کیا جو ایوان کسریٰ کے نام سے مشہور ہے اور جس کی تکمیل پیروز کے بیٹے ہرمز کے زمانے میں ہوئی۔ یہ ساسانی شہر خوب پھلا پھولا اور چار صدیوں تک مشرقی دنیا کی دولت کا مرکز رہا۔ یہاں اتنا مال و دولت جمع تھا کہ جب سعد کے زیر قیادت عرب اس شہر پر حملہ آور ہوئے تو ساٹھ ہزار سپاہیوں میں سے ہر ایک کے حصے میں بارہ ہزار درہم آئے۔

اس عظیم الشان ساسانی محل میں سے اب وہ کھنڈر باقی رہ گیا ہے جسے عام طور پر مگر غلط طور پر طاقِ طیسفون کہتے ہیں۔ اس کا دوسرا نام تختِ خسرو یا طاقِ خسرو ہے اور یہی نام زیادہ موزون ہے۔ یہ طاق یا محراب تقریباً ایک سو فیٹ بلند ہے اور اسکی چوڑائی تقریباً اسی فیٹ ہے۔ اسکی حالت بہت اچھی ہے اور اسے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی سالہا سال تک قائم رہے گا۔ محراب کے دونوں طرف دو عمارتیں تھیں جن میں ایک غالباً ۱۸۸۳ء میں منہدم ہوگئی۔ دوسری جو جنوب کی طرف ہے ایک سو بیس فیٹ بلند اور چالیس فیٹ لمبی ہے، اور کافی شکستہ حالت میں ہے۔ لیکن اس شکستگی اور مشرقی عمارت کے انہدام کے باوجود اس کھنڈر کی شوکت و شان کا دل پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ اس میں ایک ایسا رعب اور وقار پایا جاتا ہے جو ان اطراف کی دوسری عمارتوں میں مفقود ہے۔ اس کی ایک ایک اینٹ نہایت اچھی طرح بنی ہوئی اور پکی ہوئی ہے۔ ہر اینٹ اوسطاً ایک ایک مربع فٹ کی اور تین انچ موٹی ہے۔ جنوبی عمارت ڈیڑھ سو فیٹ مغرب کی جانب پھیلی ہوئی ہے۔ اس سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ غالباً طاقِ کسریٰ ایوانِ کسریٰ کا مرکزی ہال تھا جو نوشیرواں کے عہد میں شاہی دعوتوں یا ملاقاتوں کے لئے مخصوص تھا۔ جنوبی عمارت کے کھنڈر ظاہر کرتے ہیں کہ پہلے اس میں بہت سے کمرے تھے جہاں بڑے بڑے ارکانِ سلطنت اور شاید حرم کی عورتیں بھی رہتی تھیں۔

منصور احمد

پپیہا

کیا سہانی شام ہے کیا دامنِ کہسار ہے — کیا کھلے ہیں پھول کیسی کثرتِ اشجار ہے

ہر طرف پھیلی ہوئی ہے ہائے کیا جوہی کی بو — کیا سماں ہے کیسی کیفیت ہے کیا گلزار ہے

کس قدر پرلطف ہے یہ آبشاروں کی صدا — اللہ اللہ کیسی پیاری نہر کی رفتار ہے

ہو رہے ہیں جمع کیا طائر بسیرے کیلئے — ہائے کیا نغمے ہیں ان کے اور کیا چہکار ہے

لو سماں بدلا ہوئی شب چاند نکلا یک بیک — کوہ کی چوٹی پہ کیسی بارشِ انوار ہے

کیا سکوتِ شب ہے کیا نکھری ہوئی ہے چاندنی — ٹھنڈی ٹھنڈی یہ ہوا کس درجہ فرحت بار ہے

رات آدھی ہو گئی خاموش ہے سارا جہاں
لیکن اے پیارے پپیہے بولتا ہے تو کہاں

ہے گلوں کے کنج میں بیٹھا ہوا یا نخل پر — چاندنی میں بھی نظر آتا نہیں تو ہے کدھر

ہے کنارے نہر کے یا محو ہے پرواز میں — کس طرف سے آرہی ہے یہ صدائے پُر اثر

دل کو کیا تڑپا رہی ہے تیری غم آگیں صدا — ہے تو اک پی ہو مگر اس میں اثر ہے کس قدر

ہے رگِ موجِ ہوا میں دوڑتا اک درد سا — آرہی ہے یا تری آواز اے تفتہ جگر

دل کے جھرنوں کی صدائیں جب کبھی آتی ہے یہ — اے پپیہے اور ہی کچھ دل پہ ہوتا ہے اثر

پر یہاں نالوں کو تیرے سننے والا کون ہے — اس گپھا میں ہے لینے والا کون ہے تیری خبر

کون سُنتا ہے سندیس اے طائرِ پُر غم ترا

کس سے پی پی کہہ رہا ہے کون ہے پیتم ترا

کیا وہی سُندر ہے تیرا جو مہِ کامل میں ہے	جلوہ گر جو انجمِ رخشندہ کی محفل میں ہے
برق میں جس کی چمک بادل میں ہے جس کی گرج	جس کی قوت مستتر ہر شے کی آب و گِل میں ہے
لہر جس کی نہر میں، طوفان جس کا بحر میں	موج میں جس کی تڑپ جس کا سکوں ساحل میں ہے
دشت میں جس کا سماں، کہسار میں جس کی فضا	جس کی رونق ہر جگہ ہر بام ہر منزل میں ہے
جس کی نکہت پھول میں جس کی ہے زینت سرو میں	محتجب جو ناشگفتہ غنچہ کی محمل میں ہے
جس کی رنگت لعل میں جس کی جھلک الماس میں	نور جس کا مرتعش ہر جوہرِ قابل میں ہے
جو ہر اک مسرور کی خوشیوں میں رہتا ہے شریک	جو ہر اک بے مونس و بے یار کی مشکل میں ہے
اُس کے شوقِ وصل میں کیا اس قدر مضطر ہے تُو	جو مری آنکھوں میں سینہ میں جگر میں دل میں ہے

آہ اُس کی شان تو ہر شے میں ہے جلوہ نما

پر کسی نے آج تک پایا نہیں اُس کا پتا

میر سعادت حسین منو نجیب

دوستوں کی قسمیں

دنیا میں صرف دو چیزیں ایسی ہیں جن کی قسموں کی انتہا نہیں ——— مرض اور دوست!

جس طرح امراض کی گوناگونی کے متعلق ہمارا نتیجۂ تحقیق اس سے آگے نہیں بڑھتا کہ زکام سے لے کر تپ دق اور سل تک ہر کیفیت مرض میں داخل ہے اسی طرح دوستوں کے تنوع کی بابت بھی ہم اس سے زیادہ نہیں جانتے کہ صورت شناسی سے شروع ہو کر محبت اور وارفتگی تک جملہ تاثرات پر دوستی کی وسعت یکساں طور پر چھائی ہوئی ہے جس طرح امراض کی ان گنت قسمیں کسی منطقی حیثیت سے مکمل احاطہ کے ماتحت نہیں آسکتیں، اسی طرح دوستوں کی قسمیں بھی انسانی قوتِ تحدید و تعیین سے بالاتر ہیں۔ جس طرح لاکھوں امراض کے نام گنانے کے بعد بھی ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا استقراء تام ہے۔ اسی طرح دوستی کے بھی قریب قریب ہر "نمونے" کو جمع کر لینے کے بعد ہم مطمئن نہیں ہو سکتے کہ تھوڑی سی اور دقتِ نظر سے کام لینے کے بعد کچھ اور نمونے برآمد نہ ہو جائیں گے۔ مگر بہر حال چند اہم قسموں کا مطالعہ کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ اس مضمون کی غرض تحریر یہی ہے۔

بعض اہل رائے کا خیال ہے کہ دوستی فی الحقیقت "مرض" سے علیحدہ کوئی چیز نہیں یعنی اُن کے نزدیک "دوستی"، "مرض" کی بے شمار قسموں میں سے ایک بہت بڑی قسم ہے جس کے عموم نے اس کا خوف لوگوں کے دلوں سے نکال دیا ہے۔ وہ حضرات اِس مفروضہ بیماری کی علت ضعفِ دماغ بتاتے ہیں۔ اُن کے اعتقاد میں جب انسان خود اعتباری اور خود اختیاری کھو دیتا ہے تو یہ متعدی بیماری اُسے آ چمٹتی ہے اور اگر سہل انگاری برتی جائے تو ناقابلِ علاج بن جاتی ہے۔ وہ مشاہدے سے استدلال کرتے ہوئے یہ نظریہ بھی قائم کرتے ہیں کہ جس قدر زیادہ یا کم انسان کا دماغ کمزور ہو گا، اُسی قدر زیادہ یا کم اس کا حملہ شدید ہو گا۔ زیادہ صاف لفظوں میں یوں کہئے کہ جن چیزوں کو ہم دوستی کی قسمیں سمجھتے ہیں۔ وہ انہیں ایک ہی بیماری کے مختلف درجات سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان ماہرانِ فن کا تجربہ ہے کہ اس بیماری کا اثر عموماً ابتدا میں نامعلوم حد تک خفیف ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ مریض مایوس العلاج ہو جاتا ہے۔ کبھی ابتدا ہی میں نہایت شدید ہوتا ہے اور دماغ کو یک قلم معطل کر دیتا ہے۔ عام طور پر یہ بیماری ہر فردِ انسانی میں باستثنائے چند پائی جاتی ہے۔ اکثر لوگ اس کو خود پیدا کرتے ہیں۔ مگر معمولی حالات میں دو تین درجوں سے آگے نہیں بڑھتی۔

ان حضرات کی رائے سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ "دوستی" کی طرف انسان کا محتاج ہونا، انسانی کمزوری سہی، مگر غذا جیسی "غیر ملکوتی" چیز کی طرف بشری احتیاج کے مقابلے میں بہر حال یہ احتیاج بہت کم لائقِ ملامت ہے۔ پھر یوں بھی اس "پیشۂ بے محنت" سے زندگی میں بہت سہولتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ممکن ہے کبھی کبھی دوستی کی شدت مرض میں تبدیل ہو جائے، "بالکل جس طرح مرض کا دوام دوستی بن جاتا ہے"۔ لیکن اس کے متعلق کوئی کلیہ نہیں قائم کیا جا سکتا۔

خیر ——— اصل بحث سے میں دور ہٹ گیا۔ میرا مدعا دوستی کی ماہیت معلوم کرنا نہیں ہے بلکہ اس کی قسموں میں سے چند کو چھانٹ کر ان پر غور کرنا ہے۔ اور چونکہ یہ اک بدیہی بات ہے کہ دوستی کا تنوع یکسر موقوف ہے دوستوں کے تنوع پر اس لئے یہ دیکھنا چاہئے کہ دوستوں کی کتنی قسمیں ہیں؟

سب سے پہلے اس کی تحقیق کریں کہ دوست حاصل کس کس طرح کئے جاتے ہیں؟ اپنے کمرے میں بیٹھ کر ذرا اپنی کتابوں کی الماری پر نظر ڈالئے۔ فلسفیوں نے ان کو بہترین دوست بتایا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ انہوں نے کن وجوہ کی بنا پر ان کو دوستوں سے مشابہت دی ——— اگر یہ درست نہیں کہ وہ کتابوں سے زیادہ کسی چیز کو دوستوں کے تنوعِ اقسام کی توضیح کے لئے مناسب نہ سمجھتے تھے ——— اور یہ واقعہ ہے۔

الماری میں چنی ہوئی کتابوں میں سے ہر ایک کو فرداً فرداً دیکھ کر یاد کیجئے کہ یہ آپ تک کس طرح پہنچی۔ آپ دیکھیں گے کہ بعض کتابیں آپ کی (۱) خریدی ہوئی ہیں (۲) بعض قرض لی ہوئی ہیں (۳) بعض بدلی ہوئی ہیں (۴) بعض بخشی ہوئی ہیں (۵) بعض ورثے میں ملی ہوئی ہیں (۶) بعض پائی ہوئی ہیں (۷) بعض غصب کی ہوئی ہیں (۸) اور بعض چرائی ہوئی ہیں۔ اس کے بعد غور کیجئے کہ کیا دوستوں کے حصول کے طریقے بھی بعینہ یہی نہیں ہیں؟ اس حقیقت کے انکشاف سے شاید آپ کے حواس میں کچھ انتشار اور سراسیمگی پیدا ہو۔ لیکن صبر سے پھر غور کیجئے۔ دیکھئے۔

(۱) جب آپ بازار جاتے ہیں اور کسی کتاب کو دیکھ کر اُسے پسند کرتے ہیں۔ تو اُس کو خریدنے سے قبل، ذہناً یا عملاً آپ اپنی جیب کا امتحان کرتے ہیں اور اگر ممکن ہوتا ہے تو اس کو خرید لیتے ہیں۔ یہی مثال بعض دوستوں پر صادق آتی ہے۔ جب آپ کسی شخص سے ملتے ہیں اور اس کی پاکیزگیٔ وضع، لطافتِ ذوق، شیرینیٔ کلام، تفوقِ علمی، شگفتگیٔ ذہن، اجتماعی برتری یا کسی اور خصوصیت سے متاثر ہو کر چاہتے ہیں کہ اُس کے ساتھ ربط پیدا کریں تو آپ کی یہ خواہش آپ کو اپنی ذات کا جائزہ لینے پر مجبور کرتی ہے۔ آپ اپنی ہر صفت کو اک ناقدانہ نظر سے دیکھتے ہیں، اپنی شخصیت کا اس کی شخصیت سے مقابلہ کرتے ہیں اور جب یہ اطمینان کر لیتے ہیں کہ آپ "تہی مایہ"

نہیں ہیں تو پھر اپنے ان محاسن کا اظہار کرنا شروع کرتے ہیں جو آپ کے خیال میں اس شخص کو حاصل کرنے کے لئے کافی ہوں۔ چنانچہ اس ایثار اور قربانی کے بعد اگر سودا بن جائے تو وہ شخص آپ کو مل جاتا ہے یا دوسرے لفظوں میں آپ کا دوست بن جاتا ہے۔

فطرت ہے کہ قیمتہً حاصل کی ہوئی چیز بہت عزیز ہوتی ہے۔ اسی لئے خریدے ہوئے دوستوں سے بہت گہری دلچسپی ہوتی ہے۔ ان کو بہت احتیاط سے رکھا جاتا ہے دوسرے لوگوں کو بہت کم عاریتہً دیا جاتا ہے اور اگر شومئ قسمت سے وہ کھو جاتے ہیں تو سخت صدمہ ہوتا ہے۔ آپ کے اکثر دوست آپ کی کتابوں کی طرح خریدے ہوئے ہونگے اور چونکہ اُن کے لئے آپ کو مختلف پیمانے کی قیمتیں دینی پڑی ہونگی۔ اس لئے انہیں قیمتی مراتب کے موازی آپ کے دل میں ان کی محبت اور وقعت کے مراتب ہونگے۔

آپ کو اکثر تجربہ ہوا ہوگا کہ کبھی نہایت ارزاں چیز غیر معمولی طور پر گراں، اور کبھی بے حد گراں چیز بہت زیادہ ارزاں ہو جاتی ہے۔ جس طرح ان اشیا کی گرانی اور ارزانی کا انحصار اُن کی فراوانی، کمیابی، یا نایابی پر ہوتا ہے بالکل اسی طرح دوستوں کی گرانی اور ارزانی موقوف ہوتی ہے سوسائٹی کی حالت پر۔ آپ کے بعض دوست ایسے ہونگے جن کے لئے آپ نے اُن کی اصلی قیمت سے زیادہ قیمت دی ہوگی۔ اور ایسے بھی ہونگے جن کو آپ نے حسن اتفاق سے نہایت سستے داموں خرید لیا ہوگا۔

پھر جس طرح معمولی خرید و فروخت میں نہایت ہوشیاری اور تیز نظری کی ضرورت ہے۔ اسی طرح دوستوں کے معاملے میں بھی اس کے بغیر چارہ نہیں۔ انجان اور بھولے لوگوں کی دونوں جگہ خرابی ہے۔ ان کو بہت جلد دھوکا دیا جا سکتا ہے اور بہت جلد پھسلایا جا سکتا ہے۔ بارہا ہوتا ہے کہ جس شخص کو بہت بلند طبیعت اور شریف سمجھ کر حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور بہت کچھ صرف کرکے حاصل کر لیا جاتا ہے وہ انجام کار نہایت بدطینت آدمی ظاہر ہوتا ہے۔ اس وقت اتنا ہی صدمہ ہوتا ہے جتنا نقلی ہیرے کو اصلی ہیرے کی قیمت پر خریدنے کے بعد۔

بعض لوگ کتاب پڑھنے کے شائق ہوتے ہوئے بھی کتاب خریدنا گوارا نہیں کرتے اور لوگوں سے مانگ مانگ کر کارروائی کرتے ہیں۔ اُن کی وقعت رفتہ رفتہ جاتی رہتی ہے اور لوگ انہیں کتاب دینے سے گھبرانے لگتے ہیں۔ اسی طرح بعض لوگ دوستوں سے ملنے کے آرزومند ہوتے ہوئے بھی ان کو خریدنے سے بچتے رہتے ہیں۔ کوئی قربانی، کوئی ایثار جائز نہیں رکھ سکتے۔ مگر آہستہ آہستہ سوسائٹی میں ان کا وقار جاتا رہتا ہے، اور لوگ بہت بد دل ہوتے ہیں اگر ایسا کوئی شخص ان کی صحبت میں پہنچ جاتا ہے۔ اس لئے ہر آدمی کا فرض ہونا چاہئے کہ وہ اپنی ضرورت

کی کتابیں اور اپنی مرضی کے دوست جہاں تک ممکن ہو سکے خرید کر رکھتے۔

(۲) مگر ظاہر ہے کہ ہمیشہ ایسا نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ہر کتاب خریدی جا سکتی ہے نہ ہر دوست۔ فرض کیجئے آپ کو تاریخ سے دلچسپی نہیں ہے لیکن اکبر کے حالات پر آپ کو مجبوراً تبصرہ کرنا ہے اور اس غرض کے لئے اکبری زمانے کی اک تاریخ مطلوب ہے جو آپ کے کسی دوست کے پاس ہے۔ آپ کا پہلا خیال یہی ہوگا وہ کتاب کچھ وقت کے لئے مستعار لے لی جائے اور کام نکال لیا جائے۔ چنانچہ آپ وہ کتاب قرض لے لیتے ہیں اور جب ضرورت ختم ہو جاتی ہے تو شکریے کے ساتھ واپس کر دیتے ہیں۔ بالکل یہی حالت دوستوں کے معاملے میں ہوتی ہے۔ کبھی کبھی آپ مجبور ہوتے ہیں کہ دوستوں کے دوستوں کو حاصل کیا جائے۔ مثلاً آپ کو کسی بڑے آدمی کی ضیافت کرنی ہے۔ لازماً اس کی دلچسپی کے لئے آپ اُس کے ہم مذاق مہمان جمع کریں گے۔ لیکن اگر آپ کے دوستوں میں کوئی شخص بھی ایسا نہ ہو تو آپ کو دوستوں کے دوستوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اور اگر کسی مناسب آدمی پر نظر پڑ جاتی ہے تو درخواست کر کے اُس کو حاصل کر لیا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں سے بظاہر بڑے تپاک سے ملنا پڑتا ہے۔ اُن کی خاطر و مدارات کرنی پڑتی ہے اور "حاجت روائی" کے بعد نہایت احتیاط سے واپس کر دیا جاتا ہے۔

جس طرح بعض بڑے بڑے لوگ رفاہ عام کی غرض سے لائبریریاں کھول دیتے ہیں کہ ہر مستحق تنگ دست اُن سے استفادہ کرے۔ اسی طرح بعض فیاض حضرات اپنے گرد نہایت کثرت سے دوستوں کو جمع کر لیتے ہیں تا اگر ان کے کسی دوست کو ضرورت لاحق ہو تو وہ اس کے حسب دلخواہ دوست کچھ وقت کے لئے فراہم کر سکیں۔ آپ قوالی کیجئے تو صوفی اور درویش مل سکیں گے۔ مجلس وعظ قائم کیجئے تو بڑے سے بڑا مولوی آپ کو میسر ہو سکے گا۔ شادی اور بیاہ کے موقع پر معزز ترین حضرات تقریب میں شرکت کریں گے۔ بزم مشاعرہ برپا کیجئے تو تکیوں سے لیکر سحر طراز شاعروں تک رونق افزائی کریں گے۔ سب کچھ ہوگا اگر آپ کسی ایسے شخص سے واقف ہیں جو دوستوں کی لائبریری رکھتا ہے۔ اس اصول پر عمل کرتے ہوئے کہ "داشتہ آید بکار، گرچہ بود زہر مار"

لیکن اس طرح سے حاصل کئے ہوئے دوستوں کو نہایت سنبھال کے رکھنا پڑتا ہے۔ جو لوگ بے احتیاطی کرتے ہیں اپنا اعتبار اور حق تلف کر دیتے ہیں۔

(۳) یہ اکثر ہوتا ہے کہ دو آدمی آپس میں اپنی اپنی ضرورت کی کتابیں بدل لیتے ہیں۔ اور یہ بھی اکثر ہوتا ہے کہ دو شخص آپس میں اک دوسرے کے ہم مذاق دوست بدل لیتے ہیں۔ اگر کسی شاعر کو فلسفی دوست کہیں سے مل جائے اور وہ اُس سے نجات حاصل کرنا چاہے تو اُس کے لئے اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے اس

فلسفہ زدہ دوست کو ہم مذاق فلسفی کے حوالے کر کے اُس کے عوض اک شاعر دوست حاصل کرے۔

اس قسم کے مبادلوں میں، فریقین مبادلہ کرنے سے پہلے اپنی اپنی جنس کی قیمتوں کا موازنہ کرتے ہیں اور یہ دلچسپی ہو جاتے ہیں کہ کچھ زیاں نہیں معاملہ طے ہو جاتا ہے۔ مگر ان مبادلوں میں اک قباحت یہ ہوا کرتی ہے کہ تکمیل مبادلہ کے چند روز بعد ہی آپ میں اک ردّ عمل شروع ہوتا ہے اور جس دوست کو آپ اک مرتبہ اپنے لئے نامناسب قرار دے کر دوسرے کے حوالے کر چکے تھے، اس کے متعلق آپ اپنے دماغ کے چند گوشوں میں پسندیدگی کے جذبات مستور پاتے ہیں۔ اور جب اُسی دوست کو دوسرے کے ساتھ مسرور اور شاداں دیکھتے ہیں تو اپنی قوتِ فیصلہ کی کمزوری اور اُس دوست کی مزعومہ بے وفائی کا خیال آپ کو بہت اذیت پہنچاتا ہے مگر یہ جذبہ بہت جلد گذر جاتا ہے۔ اِس خفیف سی دقت سے قطع نظر کر کے اگر دیکھا جائے تو یہ سودا ہوتا بہت دلچسپ ہے، فریقین میں سے ہر شخص بیک وقت دو احساسات سے لطف اٹھاتا ہے۔ اک یہ کہ وہ اپنے ناملائم طبع دوست سے آہستہ آہستہ دور جا رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ اپنے موافق طبع دوست سے آہستہ آہستہ قریب ہوتا جا رہا ہے۔ اور جب بدلے ہوئے دوست یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ جس شخص کے پہلے دوست تھے اب اُس کے دوست نہیں رہے بلکہ حالات میں ایک بڑا تغیر ہو گیا ہے تو وہ خود بھی کافی لطف اندوز ہوتے ہیں۔

(۴) لیکن اگر کوئی شخص اپنے دوست کو بدلنا چاہے اور نہ بدل سکے یعنی اُس کا عوض مطلوب اُس کے دوستوں میں سے کسی کے پاس بھی نہ ہو تو پھر اس کو چار و ناچار اس دوست کو تحفۃً پیش کرنا پڑتا ہے۔ شاید آپ کو کبھی ایسا اتفاق پیش آیا ہو کہ آپ کا کوئی دوست اپنے ہمراہ کسی اجنبی کو لائے اور آپ سے متعارف کرا دے اور جب آپ اس اجنبی اور نو متعارف دوست کے ساتھ کچھ دلچسپی لینے لگیں تو آپ کا اصلی دوست غیر معلوم طریقے پر اپنا قدم درمیان میں سے نکال لے۔ اگر کبھی ایسا اتفاق ہوا ہے تو سمجھ لیجئے کہ دوستوں کی یہی قسم ہے جس کو بخشے ہوئے دوست سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سچ پوچھئے تو زیادہ صحیح نام "گلے منڈھے ہوئے دوست" ہونا چاہئے۔ لیکن بر بنائے تہذیب میں اُن کو بخشے ہوئے دوست کہتا ہوں۔

اس کے علاوہ دوست بخشنے کی اک اَور شکل بھی ہوتی ہے۔ جب آپ کسی کتاب کے قدردان سے خوش ہو کر اُس کو تحفہ پیش کرنا چاہتے ہیں تو کوئی قیمتی کتاب (صورت کے اعتبار سے ہو یا مضمون کے لحاظ سے) آپ اُس کے لئے انتخاب کر کے اُس کی نذر کرتے ہیں۔ اس قسم کی کتابیں معمولی استعمال کے لئے نہیں ہوتیں بلکہ الماری کے کسی نمایاں گوشے میں لگا دی جاتی ہیں کہ آرائش و زینت کا کام دیں۔

یہی کیفیت بخشے ہوئے دوستوں کی ہے۔ اُن کو روزمرہ کے استعمال میں نہیں لایا جاتا بلکہ خاص خاص موقعوں کے لئے محفوظ رکھا جاتا ہے کہ وقت پر عزت افزائی کے کام آئیں۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ اگر آپ کا کوئی بارسوخ وکیل دوست ہو اور وہ آپ کی قابلیت سے متاثر ہو کر (آپ کی "دوست طلبی" کو مدِنظر رکھتے ہوئے) آپ کو کسی بڑے جج سے ملا دے! اس جج کو آپ ہر وقت کام میں نہیں لائیں گے بلکہ جب کبھی ضرورت ہوگی کہ خاص طور پر اپنے مرتبہ اور رسوخ کی نمائش کی جائے تو ان سے آپ استفادہ کریں گے۔

آپ نے سنا ہوگا کہ پہلے زمانے کے بادشاہ غریبوں سے خوش ہو کر انہیں عطیہ میں ہاتھی دے دیا کرتے تھے۔ یہ ہاتھی اُن غریبوں کے لئے قیامت سے کم نہیں ہوتے تھے اس لئے کہ نہ اُن کا پالنا ممکن ہوتا تھا نہ اُن سے دست بردار ہو جانا۔ اور اس طرح یہ فیضِ شاہی اُن کے لئے پیغامِ اجل ثابت ہوتا تھا۔ دوستوں کے معاملہ میں بھی کبھی کبھی یہی خوفناک صورت پیش آجاتی ہے۔ بسا اوقات بخشش میں آپ کو اپنے سے بہت بڑا دوست مل جاتا ہے اور اُس کو نہ آپ رکھ سکتے ہیں اور نہ الگ کر سکتے ہیں کہ اس طرح تباہی ہوتی ہے اور اُس طرح اک محسن دوست کی ناراضگی۔

(۵) اگر آپ کے فوت شدہ رشتہ داروں میں کسی شخص کو کتاب پڑھنے کا شوق رہا ہوگا تو یقیناً اُس نے آپ کے لئے کچھ کتابیں چھوڑی ہونگی۔ یہ کتابیں اکثر و بیشتر آپ کے ذاتی مذاق سے دور ہونگی۔ ممکن ہے اُن میں سے بعض آپ کے لئے دلچسپ یا کارآمد ہوں لیکن اُن سب کا ایسا ہونا محال ہے۔ تاہم آپ کو وہ کتابیں رکھنی پڑتی ہیں۔ اُن کو فروخت کرنا، یا تحفۃً پیش کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ بالکل یہی صورت ورثہ میں ملے ہوئے دوستوں کی ہوتی ہے۔ اُن کی طبیعت اور آپ کی طبیعت میں بُعد المشرقین بھی ہو تو آپ ان کو عزت واحترام کے ساتھ رکھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ آپ اپنے خود حاصل کردہ دوستوں کی خوش مذاقی یا بدمذاقی کے ذمہ دار ٹھیرائے جاتے ہیں لیکن موروثی دوستوں کی طبائع کے متعلق آپ سے کسی قسم کی باز پرس نہیں ہوتی۔ اگر آپ کسی ہوش گم کردہ شخص سے (جو آپ کو ورثہ میں ملا ہو) دوستی رکھتے ہوں اور آپ کے دوستوں میں سے کوئی شخص آپ سے پوچھے کہ ایسے بیکار محض دوست سے آپ کے ربط رکھنے کے کیا معنی؟ تو آپ کا صرف یہ جواب کہ آپ کے مرحوم چچا نے ان کو ورثہ میں چھوڑا ہے، نہایت مسکت اور تشفی بخش ثابت ہوگا۔ مردہ لوگوں یا مردہ لوگوں کے دوستوں کا مضحکہ نہیں اڑایا جا سکتا۔

بعض اوقات ورثے میں ایسے ایسے قیمتی دوست مل جاتے ہیں جن کو خریدنا یا کسی اور ذریعہ سے حاصل کرنا

آپ کے لئے ناممکن نہیں تو کم از کم بے حد مشکل ضرور ہوتا ہے۔ اس قسم کے دوست بیک وقت یادگار بھی ہوتے ہیں اور کار آمد بھی۔ صحیح معنی میں ورثہ پانے کی خوشی ایسے ہی دوستوں کو پاکر ہوتی ہے۔

یہ سب کچھ درست مگر پھر بھی میرے خیال میں کسی شخص کو ورثے میں کتابیں یا دوست نہیں چھوڑنے چاہیئں کتاب اور دوست اپنی اپنی جگہ اپنے مالک کی مخصوص دماغی کیفیت کا پتہ دیتے ہیں جس طرح آپ کسی شخص کے ذوق کا علم اُس کی زیرِ مطالعہ کتابوں سے حاصل کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اُس کے دوستوں سے بھی اُس کے ذوق کا سراغ مل سکتا ہے۔ پھر یہ کون سی عقلمندی ہے کہ ورثے میں کتابیں یا دوست چھوڑ کر اپنے مخصوص ذوق کو رسوا کیا جائے!

(۶) شاذونادر ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ کو کسی ایسی جگہ پڑی ہوئی اک کتاب مل جاتی ہے جہاں اس کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس طرح سے پائی ہوئی کتابیں فی الحقیقت دلچسپ ہوں یا نہ ہوں، مگر ان کا ان غیر معمولی حالات میں دستیاب ہونا، اک استعجاب پیدا کرتا ہے اور وہ استعجاب اک کاذب دلچسپی کی شکل اختیار کر لیتا ہے پائے ہوئے دوستوں کے متعلق یعنی اُن دوستوں کے متعلق جن کو آپ نے بغیر کوشش کے غیر معمولی حالات میں پالیا ہو، یہ کلیہ اتنا ہی صحیح ہے جتنا پائی ہوئی کتابوں کے متعلق۔

مگر اتنا ظاہر کئے بغیر میں نہیں رہ سکتا کہ جس طرح پڑی ہوئی کتابوں کو اٹھا کر "اپنا لینا" معیوب ہے اسی طرح پڑے ہوئے دوستوں سے ربط پیدا کرنا نامہذّب اور نامناسب ہے! ریل کے سفروں، صبح یا شام کی چہل قدمیوں دعوتوں اور ضیافتوں میں پاتے ہوئے دوست اس ضمن میں آسکتے ہیں!

(۷) آپ کسی شخص کے پاس کوئی کتاب دیکھ کر بے تاب ہو جائیں اور وہ شخص خود برضا و رغبت اس کتاب کو جدا کرنے کے لئے تیار نہ ہو تو مجبوراً اس کو بیسویں صدی کے انسان سے پیچھے ہٹ کر زمنۂ وسطیٰ کے انسان کی خصوصیات اپنے میں پیدا کرنی پڑتی ہیں۔ آپ بزور اور بجبر اس کتاب کے حاصل کرنے پر تل جاتے ہیں اور اگر کامیاب ہو جائیں تو وہ کتاب غصب کی ہوئی کہلاتی ہے۔

کبھی یہی صورت دوستوں کی دنیا میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر آپ کے کسی واقف کے پاس ایک نہایت "قیمتی" دوست ہو اور وہ واقف بھی خود اس کا بہت حریص ہو تو بجز غصب کرنے کے اور کوئی راہِ حصول کھلی نہیں ہوتی۔ پھر اک خاموش جنگ شروع ہوتی ہے۔ فریقین اپنی اپنی قوت کا انتہائی مظاہرہ کرتے ہیں غاصب اپنے جملہ آلات و حیل کے ساتھ حملہ کرتا ہے۔ اصلی مالک پوری طاقت سے مدافعت کرتا ہے اور

یہ سلسلہ بعض اوقات بہت طویل ہو جایا کرتا ہے لیکن چونکہ ہر چیز کا اک نتیجہ ہے اس لئے یہ کشمکش کبھی ضرور ختم ہوتی ہے اور فتح یا مالک کی ہوتی ہے یا غاصب کی۔ پہلی شکل سے ہم کو چونکہ کوئی واسطہ نہیں ہے اس لئے اس کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ دوسری شکل میں مالک کو غاصب کی قوت اور برتری کا اعتراف کرنا پڑتا ہے اور اس کے بعد سے وہی وجہ نزاع دوست اپنی جگہ تبدیل کر لیتا ہے!

اِن حالات میں مفتوح کی طرف سے فاتح کے خلاف کوئی فریاد، یا دادطلبی نہیں کی جاتی نتیجہ جنگ اٹل ہوتا ہے اور ناقابل تبدیل۔

آپ نے اگر کبھی اس طرح سے کوئی دوست حاصل کیا ہوگا تو شاید آپ اُن جذبات کو محسوس کریں جو اس قسم کی فتح سے وابستہ ہوتے ہیں! اپنی قوت کو دشمن کے مقابلے میں تولنا، نہایت ہوشیاری اور ثابت قدمی کے ساتھ جنگ کو جاری رکھنا اور پھر فتح کے بعد مفتوح کے ساتھ نہایت فراخ دلی کا برتاؤ روا رکھنا، ایسی مُسکرمسرتیں ہیں کہ انسان خود کو فرطِ نشاط میں فراموش کر دیتا ہے۔

غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کسی قیمتی جوہر کو اس جاں فشانی سے حاصل کر لینے کے بعد انسان اپنی ساری قوت اس کو اپنے پاس رکھنے کے لئے صرف کر دیتا ہے!

(۴) مگر یہ طریقۂ حصول صرف بہادر اور جری لوگوں کے لئے ہے۔ وہ جو عیاری میں فنِ حرب کی بہ نسبت زیادہ ماہر ہوتے ہیں، اک نیا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ جب کسی کتاب یا دوست پر ان کی نیت آجاتی ہے تو وہ علی الاعلان نہیں بلکہ چوری چھپے اُس کے حصول کے لئے اپنے جال بچھاتے رہتے ہیں۔ فریق ثانی اس سے قطعاً بے خبر رہتا ہے مگر جب یہ چور اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ چونکتا ہے ——— صرف ماتم کرنے کے لئے! اگر غصب کرنے کے لئے شجاعت اور ہمّت کی ضرورت ہے تو چرانے کے لئے ذہانت اور فطانت کی۔ ہر شخص کا اک جداگانہ فن ہے اور کسی کو حق نہیں کہ وہ دوسرے کو اُس کے فن پر طعن و ملامت کرے۔ غاصب اور چور ——— اپنی اپنی جگہ دونوں تعریف کے حق دار ہیں۔ پھر خصوصاً دوستی کے معاملے میں تو ایسے لوگوں سے بیک وقت ڈرا بھی جاتا ہے اور محبت بھی کی جاتی ہے جو "غصابی" یا چوری کے فن میں ماہر ہوتے ہیں۔

جب لوگ اپنے دوستوں کو اِن سے ملاتے ہیں تو نظر ہی نظر میں یہ التجا کرتے ہیں کہ "ہم پر رحم کرنا" ہماری یہ ساری پونجی ہے جو آپ کے سامنے ہے۔ آپ اِس کو امانت تصوّر فرمائیے گا" اور پھر چونکہ

فراخ دلی اک شریف چور یا غاصب کی لازمی صفت ہے اس لئے اس امانت میں خیانت نہیں کی جاتی۔ چور اور غاصب غریبوں اور نہتّوں پر ظلم نہیں کرتے!

اب آپ تھک گئے، مگر اک مرتبہ کتابوں کی الماری کو اور دیکھئے! کیا ان کتابوں سے بڑھ کر کوئی اور چیز دوستوں کی رنگارنگی کو واضح کرسکتی ہے؟ کس قدر مشابہت ہے کس قدر یکسانی ہے ایک کتاب اور ایک دوست میں!

مگر نہیں ـــــ ایک فرق ہے! اگر آپ کبھی کتابوں سے گھبرا جائیں تو ان کو الماری میں نہایت آسانی سے مقفل کرسکتے ہیں۔ لیکن دوستوں کے لئے ایسی کوئی الماری نہیں!

انیس احمد رُشدی

غزل

لیتے ہیں مستعارِ غمِ عشرتِ جاوداں سے ہم ‏ ‏ ‏ دردی ہو جو بے نیاز، لائیں وہ دل کہاں سے ہم

ہر رگِ دل ہی بے قرارِ جلوۂ حسن کے لئے ‏ ‏ ‏ کرنے چلے ہیں باخبر برق کو آشیاں سے ہم

آئے تھے محشرِ نشاط، دل میں بپا کئے ہوئے ‏ ‏ ‏ جاتے ہیں سوزِ غم لئے آپ کے آستاں سے ہم

شمع جلی تو ایک رات سوز و گدازِ عشق سے ‏ ‏ ‏ آہ کہ بجھ کے رہ گئے پہلے ہی امتحاں سے ہم

اوتائی کی کہانی

(ایک جاپانی افسانہ)

بڑے عرصے کی بات ہے کہ نائی گاتا کے شہر میں ایک شخص ناگو رہتا تھا۔

ناگو ایک طبیب کا بیٹا تھا اور اُس نے بھی اسی پیشے کی تعلیم حاصل کی تھی بچپن ہی سے وہ ایک لڑکی کے ساتھ منسوب تھا جس کا نام اوتائی تھا۔ وہ اُس کے باپ کے ایک دوست کی بیٹی تھی اور دونوں گھرانوں نے یہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ ناگو کی تعلیم ختم ہوتے ہی شادی کر دی جائے گی۔ لیکن اوتائی کی صحت کچھ زیادہ اچھی نہ تھی، اُس نے پندرھویں سال میں قدم رکھا تو ایک جانکاہ مرض نے اُس پر حملہ کر دیا۔ جب اُسے اپنی موت کا یقین ہو گیا تو اُس نے آخری ملاقات کے لیئے ناگو کو اپنے پاس بلایا۔

وہ آکر اُس کے بستر کے قریب کھڑا ہو گیا تو اوتائی نے کہا:

"ناگو ساما، بچپن ہی سے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کر دیئے جانے کا عہد ہو چکا تھا، اور اس سال کے اختتام پر ہماری شادی ہونے والی تھی۔ لیکن اب میں مر رہی ہوں۔ دیوتا ہی خوب جانتے ہیں کہ ہمارے لیئے کیا بہتر ہے۔ اگر میں کچھ دیر اور زندہ رہتی تو میں دوسروں کے لئے صرف رنج اور تکلیف کا باعث ہوتی۔ اس کمزور و ناتواں جسم کے ساتھ میں ایک بیوی کے فرائض بھی اچھی طرح انجام نہ دے سکتی، اور اس لئے تمہارے لیئے میرا زندہ رہنا بھی میری ایک خود غرضانہ خواہش ہوتی۔ میں اب مرنے پر بالکل راضی ہوں اور میں چاہتی ہوں کہ تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم میری موت کا غم نہ کرو گے۔ ۔ ۔ اس کے علاوہ میں تمہیں یہ بھی بتانا چاہتی ہوں کہ ہم پھر ایک دوسرے سے ملیں گے۔"

ناگو نے پُرحسرت لہجے میں کہا "یقیناً ہم پھر ملنے والے ہیں، اور اُس پاک سرزمین میں جہاں پھر جدائی کا کوئی کھٹکا نہ ہوگا"۔

اوتائی نے آہستہ سے کہا "نہیں، نہیں! میرا مطلب اُس سرزمین سے نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم اسی دنیا میں پھر ملیں گے۔ اگرچہ کل مجھے دفن کر دیا جائے گا"۔

ناگو اُس کے متبسّم چہرے کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اوتائی نے اپنی شیریں اور خواب آگیں آواز میں کہا۔

"ہاں، میری مراد اِسی دنیا سے ہے ـــ تمہاری اسی زندگی میں ناگو ساما... بشرطیکہ تمہاری بھی یہی خواہش ہو۔ بس اسی مقصد کے لئے میں پھر ایک لڑکی بن کر پیدا ہونگی اور بڑی ہوکر عورت بنوں گی۔ اس لئے تمہیں انتظار کرنا ہوگا۔ پندرہ ـــ سولہ سال: یہ ایک طویل عرصہ ہے... لیکن میرے موعود شوہر تمہاری عمر ابھی انیس سال کی ہے"۔

زندگی کے آخری لمحات میں اُسے تسکین پہنچانے کے لئے ناگو نے نرم آواز میں کہا۔

"میری منسوبہ، تمہارا انتظار کرنے میں مجھے ایک فرض ادا کرنے کی سی خوشی حاصل ہوگی۔ ہم سات زندگیوں کے لئے ایک دوسرے سے وابستہ ہو چکے ہیں"۔

اوتائی نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "لیکن کیا تمہیں اس میں شک ہے؟"

ناگو نے جواب دیا "میری جان، مجھے یہ شک ضرور ہے کہ دوسرے جسم میں اور دوسرے نام سے میں تمہیں پہچان بھی سکوں گا یا نہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ تم مجھے کوئی نشانی بتا دو؟"

لڑکی نے کہا "نہیں، میں تمہارے پاس ضرور آؤں گی۔ صرف خدا کو اور بدھ مہاتماؤں کو معلوم ہے کہ کیسے اور کہاں ہم ملیں گے، لیکن مجھے یقین ہے، پختہ یقین، کہ اگر تمہیں مجھ سے ملنے میں انکار نہ ہوا تو میں ضرور تم تک پہنچ جاؤں گی... میرے اِن الفاظ کو یاد رکھو"۔

وہ خاموش ہوگئی اور اُس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ وہ مر چکی تھی۔

ناگو کو اوتائی سے حقیقی محبت تھی۔ اُسے اُس کی موت کا سخت رنج تھا۔ اُس نے اوتائی کے نام کا ایک کتبہ لکھوایا اور اپنے گھر کے مندر میں رکھ دیا۔ وہ ہر روز اُس کے سامنے نذر پیش کیا کرتا تھا۔ اُسے اُن عجیب و غریب باتوں کا بڑا خیال تھا جو اوتائی نے اپنی موت سے پہلے اُس سے کہی تھیں۔ چنانچہ اُس کی روح کو خوش کرنے کے لئے اُس نے ایک عہد نامہ لکھا کہ اگر وہ دوبارہ اس دنیا میں آئی تو وہ ضرور اس سے شادی کرے گا۔ اس تحریر کو اُس نے اپنی مہر لگا کر بند کر دیا اور اوتائی کے کتبے کے پاس مندر میں رکھ دیا۔

مگر چونکہ ناگو اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اس لئے یہ ضروری بات تھی کہ وہ شادی کرے۔ جلد ہی اُس کے خاندان کی خواہشات نے اُسے مغلوب کر لیا، اور اُسے اپنے باپ کے انتخاب کی ایک بیوی کو قبول کرنا پڑا۔ شادی کے بعد بھی اُس نے اوتائی کے کتبے پر نذر چڑھانے کا سلسلہ جاری رکھا اور اُس کی یاد کو اپنے دل سے کبھی فراموش نہ کیا لیکن بتدریج اوتائی کی صُورت اُس کے ذہن سے اتر تی گئی ـــ جیسے ایک خواب ہو جس کا تصوّر نہ کیا جا سکے۔ اسی طرح برسوں گزر گئے۔

اِس عرصے میں اُس پر کئی مصیبتیں آئیں ۔ اُس کے والدین کا انتقال ہوگیا ۔ پھر اُس کی بیوی اور ایک بچہ بھی چل بسا ۔ اب وہ دنیا میں اکیلا رہ گیا ۔ اُس نے اپنے سنسان گھر کو خیرباد کہی اور غم غلط کرنے کے لئے ایک طویل سفر کے ارادے سے چل کھڑا ہوا ۔

اثنائے سفر میں وہ ایک دن ایکاؤ میں وارد ہوا ۔ یہ ایک پہاڑی گاؤں ہے جو اپنے بہاریں مناظر اور نواح کی خوبصورتی کے لئے اب بھی مشہور ہے ۔ اس گاؤں کی سرائے میں جہاں اُس نے قیام کیا ایک نوجوان لڑکی اُس کی خدمت پر مامور ہوئی ۔ پہلی ہی دفعہ اُسے دیکھ کر ناگو کا دل اِس طرح اچھلا کہ اس سے قبل کبھی اُس کی یہ حالت نہ ہوئی تھی ۔ اُس کی صورت اوتائی سے اس درجہ مشابہت رکھتی تھی کہ ناگو نے یہ یقین کرنے کے لئے کہ یہ خواب نہیں بیداری ہے اپنے بدن کی زور سے ایک چٹکی لی ۔ کھانا وغیرہ لے کر اُس کے آنے جانے میں ، کمرے کی اشیا کو ترتیب دینے میں ، غرض ہر حرکت اور ہر ادا میں ناگو کو ایک ایسی بات نظر آتی تھی جس نے اُس کے حافظے میں اُس لڑکی کی محبوب یاد تازہ کردی جو جوانی کے زمانے میں اُس سے منسوب تھی ۔ جب وہ اُس سے بات کرتا تو وہ اُس کا جواب نہایت نرم و شیریں لہجے میں دیتی اور یہ شیرینی اُس کے دل میں گزشتہ دنوں کے غم کو بیدار کردیتی ۔

پھر فرطِ حیرت سے مجبور ہو کر اُس نے لڑکی سے کہا :

"محترم بہن ، تمہاری صُورت میری ایک عزیزہ سے جسے اس دنیا سے رخصت ہوئے مدتیں ہوگئیں اس قدر ملتی ہے کہ پہلی دفعہ جب تم کمرے میں داخل ہوئیں تو میں حیران و ششدر رہ گیا ۔ اس لئے مجھے معاف کرنا اگر میں تم سے پوچھوں کہ تمہارا وطن کون سا ہے اور تمہارا نام کیا ہے ؟"

بلا تامل اُس نے یوں جواب دیا :

"میرا نام اوتائی ہے اور تم ناگو ہو ، جس سے میری شادی کا عہد ہو چکا ہے ۔ سترہ سال ہوئے میں نائی گاتا میں مرگئی تھی ۔ اس کے بعد تم نے ایک عہد نامہ لکھا کہ اگر میں ایک عورت بن کر پھر اس دنیا میں آؤں تو تم مجھ سے شادی کروگے ، اور تم نے اپنی مہر اس عہد نامے پر لگائی اور اس کو میرے نام کے کتبے کے پاس گھر کے مندر میں رکھ دیا ۔ چنانچہ اسی لئے مَیں اب آئی ہوں ۔"

یہ کہتے ہوئے وہ گر پڑی اور بے ہوش ہوگئی ۔

ناگو نے اُس سے شادی کرلی اور اُن کی شادی بڑی خوشگوار ثابت ہوئی لیکن اوتائی کو وہ ماجرا تمام عمر یاد نہ آسکا جو ایکاؤ میں گزرا تھا ، نہ اسے اپنی پہلی زندگی کے کسی واقعہ کا علم ہو سکا ۔ پہلی زندگی کی یاد جو ایکاؤ کی ملاقات میں عجیب پُراسرار طریقہ سے پیدا ہوگئی تھی پھر محو ہوگئی اور اُس کے بعد کبھی پیدا نہ ہوئی ۔

منصور احمد

نورِ محبّت

جلوہ کہاں وہ آئینۂ مہر و ماہ میں
جلوہ ہے جو کہ دوست کی پیاری نگاہ میں

شیرینیاں ہیں دوست کی ایک ایک بات میں
رنگینیاں ہیں دوست کی اِک اِک نگاہ میں

معمور ہو کبھی جو نہ محبوب کے سوا
ایسی خلا ہے دورۂ شام و پگاہ میں

دنیا کی رسم و راہ سے دِل مضمحل ہوا
لے روحِ کائنات! اسے اپنی پناہ میں

طوفانِ درد، وادیٔ عزلت، شبِ فراق
کیا کیا مشقتیں ہیں محبت کی راہ میں!

ہستی ہے کیا، درست ہے کیا نادرست کیا؟
کھو جاؤں کیا میں آہ اِسی اشتباہ میں؟

ان بندشوں کو توڑ کے اے روح چل نکل
اِک عمر کٹ گئی ہے ثواب و گناہ میں!

خلوت میں دل کی عکسِ رخِ دوست دیکھ لے
دونوں جہاں کو چھوڑ محبت کی چاہ میں

روشن ہوں ساری ظلمتیں شمعِ ضمیر سے
بارش ہو نورِ عشق کی قلبِ سیاہ میں

رنگِ کمال۔ بوئے حقیقت۔ بہارِ حسن
کیا کیا مسرتیں ہیں محبت کی راہ میں!

اے زار دیکھتا ہوں ہمیشہ خدا گواہ
جلوہ خدا کا دوست کی پیاری نگاہ میں

ب ل

کرنیں

اپنا دوست آپ بن پھر دوسرے بھی تیرے دوست ہیں۔ صرف دوسروں کی دوستی کا سہارا لے اور زندگی کی کشتی کو ڈگمگاتا اور ڈوبتا ہؤا دیکھ لے۔ جو آپ اپنا نہیں کوئی دوسرا چاہے بھی تو کیونکر اس کا بن سکے ؛ جو آپ اپنا نہیں کوئی دوسرا کیا خدا بھی اُس کا نہیں۔ خدا کی راہ روح کے اندر دل کے رستے سے ہے اور جس میں دل کی دیری نہ رہی اُس نے اِس پہاڑی رستے کو گویا صاف نہ رکھا آنے والے کے لئے !۔۔۔ اگر تُو چاہتا ہے کہ یہ دنیا اور وہ دنیا تجھ تک آئیں تو اپنی دنیا ایک آپ بنا۔ تُو اپنا ہو تو سب تیرے ہی ہیں !

مَیں چاہتا ہوں اپنے دل کی اپنے نفس کی اپنی روح کی وسعت قوت عظمت ! لیکن میں کمزور ہوں ! میں جھلکیاں دیکھتا ہوں لیکن کبھی کبھی ! آ زندگی کے جنگل میں ان گنجان شاخوں ان خار دار جھاڑیوں کی کاٹ چھانٹ کریں میں اور تو کہ ہمیں وہ تارے وہ چاند وہی آسمان پھر صاف صاف دکھائی دینے لگے مجھے اور تجھے ! ہلال کب کا نکل چکا لیکن مجھے نظر نہ آیا۔ اے ہلالِ ابرو آ دیکھ اور دکھا اپنی پیشانی پر، خدا کے آسمان پر آرزو کا ہلال جستجو کا بدر الدجےٰ !

تُو چودھویں کا وہ چاند ہو جو مہینے میں ایک بار نظر آتے ! تُو وہ نکہت ہو جو ہمالیہ کے کسی دور خاموش جنگل میں ایک نایاب پھول کے دل سے نکل کر ہوا میں تیرتی پھرے ! تُو وہ موتی ہو جو اپنی اَن دیکھی گہرائیوں میں لہروں کے ہنڈولے میں سویا ہے اور جسے میری غوّاص روح اپنے خاص آسمانی لمحوں میں محض کبھی کبھی دیکھ سکے !

تُو وہ ٹمٹمانے والا تارا ہو جسے صرف میری رات بھر بیدار آنکھیں گھنٹوں دیکھتی رہیں ! تُو وہ سمندر کی پری ہو جو کسی دور دراز جزیرے کے کنارے صرف اِک مجھ جیسے آوارہ مسافر کو نظر آئے ! تُو وہ ربانی تحفہ ہو جسے میری بے قرار روح کسی مسرور سرزمین میں آسمان کے ہاتھوں وصول کرے اور مسکرا اٹھے !

ل ب

اختلافِ ذہنیت

ارباب فکر قدیم ترین زمانہ سے آج تک مرد اور عورت کی نفسیاتی خصوصیتوں کے متعلق غور کرتے رہے ہیں تاہم میرے خیال میں علمی حیثیت سے یہ موضوع ابھی تک تشنۂ تکمیل ہے اور ضرورت ہے کہ اس کے متعلق مزید تحقیقات کرکے نظریئے قائم کئے جائیں تاکہ بحث و مباحثہ کے بعد صحیح طور پر فیصلہ کیا جا سکے کہ درحقیقت دونوں کی نفسیاتی کیفیات میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟ اکثر خواص و عوام اس جانب مائل ہیں کہ دونوں صنفوں کی ذہنیت میں تباین پایا جاتا ہے، دونوں میں سے ہر ایک دوسری صنف کی تکمیل کرتا ہے اور اس طرح انسانی تاریخ بنتی رہتی ہے۔ اس موضوع کے اہم مسائل کی تدوین سے اُن لوگوں کو کافی مدد ملے گی جو "مردوں اور عورتوں کی مشترکہ تربیت" کو اپنا موضوعِ بحث قرار دیں، یا جو اجتماعیات میں سے خاص طور پر زندگی میں عورتوں کے فرائض، حقوق اور عمل سے بحث کرنا چاہیں۔ ضرورت ہے کہ اربابِ قلم اور ناظرین ان محققین کی طرح صبر اور کوشش کے خوگر ہو جائیں جو صحیح ترین فیصلہ تک پہنچنے کے لئے متعدد واقعات معلوم کرنے، انہیں ثابت کرنے اور کثیر التعداد جزئیات کے اقتباس سے کبھی نہیں تھکتے، تاکہ دونوں قسم کے احکام کو باہم مطابقت دے سکیں اور اس موضوع پر روشنی ڈال سکیں۔

۱۹۰۷ء میں جنیوا کے ابتدائی مدارس میں سات، آٹھ اور دس سال کے طلبا اور طالبات کے متعلق تجربے کئے گئے۔ ان تجربوں سے، جو سوال و جواب کی صورت میں تھے، یہ مقصد تھا کہ دونوں صنفوں کے چھوٹے بچوں کے تخیلات و احساسات معلوم کئے جائیں کہ ان میں سے ہر ایک صنف دوسرے کے متعلق کیا رائے رکھتی ہے، اسے کیا سمجھتی ہے، اور اس کے لئے کیا فیصلہ کرتی ہے۔ ان تجربات کا دائرہ اسی حد تک وسیع کیا گیا جس حد تک ان نونہالوں کی سادہ اور نوخیز ذہانت ساتھ دے سکے۔ فروری ۱۹۰۸ء میں ان تجربوں کے نتائج شائع کئے گئے جن کا خلاصہ یہ تھا کہ لڑکے اپنی ہم سبق لڑکیوں میں مرعوبیت اور خوف کا جذبہ زیادہ نمایاں پاتے ہیں، وہ بہت غصیلی ہوتی ہیں اور جلد برافروختہ ہو جاتی ہیں، وہ آپس میں بہتر برتاؤ نہیں کرتیں، اپنی ملکیت کے پس انداز کرنے میں بخیل ہوتی ہیں، وہ قصور وار ہمجولیوں کی عیب جوئی سے پرہیز نہیں کرتیں،

ذرا ذراسی بات پر رونے لگتی ہیں، باتونی ہوتی ہیں، غیبت اور چغلخوری ہیں انہیں کوئی تکلف نہیں ہوتا اور اپنے بناؤ سنگار کے معاملہ میں فضول خرچ ہوتی ہیں۔

چھوٹی لڑکیوں کا چھوٹے لڑکوں پر یہ اعتراض ہے کہ وہ بے ضرورت چیختے ہیں، سختی اور ظلم کی طرف مائل ہوتے ہیں، ضابطہ کا احترام نہیں کرتے، لباس پر توجہ صرف نہیں کرتے، اور لاابالی اور بے پروا ہوتے ہیں۔

یہ غیر مصنوعی اور معصوم نظریات بتاتے ہیں کہ صنفِ لطیف اور صنفِ کرخت دونوں کا بچپن ہی سے یہ خیال ہوتا ہے کہ عورت اور مرد کی ذہنیتیں اور نفسی کیفیات باہم مختلف ہوتی ہیں۔ اگر اس معاملہ میں عورت اور مرد کی نفسیات معلوم کرنا چاہیں تو ان نظریوں کی سادگی کے باوجود ان سے بہتر اور صحیح آرا دستیاب ہونا غیر ممکن ہے۔

علاوہ ازیں اگر نوعمر بچوں کے نظریات سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مردوں اور عورتوں میں سے کثیر التعداد مقتدر اور ذمہ دار افراد کی، جو علم اور تجربہ میں کافی بلند مرتبہ رکھتے ہیں، یہ رائے ہے کہ ذہنیتوں میں نمایاں اور قابلِ غور فرق پایا جاتا ہے۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں مس مارگیرٹ نے جو "اخلاقِ شباب" کے موضوع پر بحث کرنے میں خاص طور سے مشہور ہیں، کسی رسالہ میں ایک مضمون شائع کیا تھا جس میں دونوں صنفوں کی ذہنیتوں میں فرق پایا جانا ثابت کیا تھا، لکھا ہے:۔

> "عطوفت کا میدان عورت کے لئے مخصوص ہے۔ مشہور فلسفی کنٹ نے صنفِ لطیف کو شدتِ انفعال اور صنفِ کرخت کو شدتِ ارادہ سے متصف کیا ہے . . . عورت کی ساکن زندگی اُس کی جسمانی ساخت، اور اُس کے اعصاب کی نرم و نازک فطرت کو تاثر کی قابلیت میں خاص دخل ہے . . . نفسی رجحانات جن کا انسان کے عام افکار، میلانات، اور ارادہ پر بڑا اثر ہوتا ہے عورت اور مرد کی مشترکہ زندگی میں بھی خصوصیت سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ تقریباً ۲۵۱۳ شخصوں کی حیاتِ وجدانی کا تجربہ کرنے سے معلوم ہوا کہ اس کا اظہار عورت میں ۵۹ فی صدی اور مرد میں ۴۵ فی صدی پایا جاتا ہے۔ خطوں کے ذریعہ تجربہ سے معلوم ہوا کہ مردوں میں ۶۶ فی صدی اور عورتوں میں ۷۳ فی صدی حساسی پائی جاتی ہے۔ عورتوں کو جو نفسی امراض لاحق ہوتے ہیں ان کی ابتدا اکثر ایسے مواقع سے ہوتی ہے جن میں حیاتِ وجدانی کی تاثیر زیادہ نمایاں ہو۔ اس کے برخلاف مردوں کو اس قسم کے جو امراض لاحق ہوتے ہیں ان میں ۳/۴ اجتماعی اسباب پر مبنی ہوتے ہیں جن میں غور و فکر

کا عنصر غالب ہوتا ہے ... مرد کی بہ نسبت عورت میں ایثار بہت زیادہ ہوتا ہے معقولاتِ مجردہ اور اصولی و نظری علوم سے مرد کو زیادہ مناسبت ہوتی ہے۔ مگر اجتماعی زندگی کے معاملات اور اُن کی تطبیق مثلاً حقوق کے احساس، فرائض کی ادائی، اور حقیقت کی محبت میں عورتیں مردوں سے زیادہ فائق ہیں۔ عورت رسم و رواج اور عادات کی زیادہ پابند ہوتی ہے اور دینداری اور مذہبیات سے متعلقہ امور مثلاً علمِ غیب کے مسائل یا معجزات و الہامات کی جانب اُس کا میلان زیادہ پایا جاتا ہے۔"

امریکہ کے دو مشہور علما "پورٹ" اور "آر۔ ایس۔ مور" نے بھی اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ ۱۹۱۲ء میں امریکہ کے ایک علمی رسالہ میں اُن کے مباحث شائع ہوئے تھے جن کا ماحصل یہ تھا کہ نفسیاتی اختلاف پایا تو ضرور جاتا ہے لیکن علمی زندگی میں وہ چنداں اثر انداز نہیں ہوتا۔ مرد اور عورت میں جو جسمانی تغایر پایا جاتا ہے اس کے مقابلہ میں یہ اختلاف کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ خفیف اختلاف جب سادہ ترین مظاہرِ نفسیہ مثلاً حس، اور پیچیدہ ترین مظاہرِ نفسیہ مثلاً تفکیر میں تدریجی ترقی کی حیثیت سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جیسے جیسے ہم سادگی سے پیچیدگی کی طرف بڑھتے جاتے ہیں یہ اختلاف ضعیف اور کمزور ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ قریب قریب مفقود ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ پورٹ اور مور کی رائے میں عورت اور مرد کے نفسیاتی اختلافات صرف کمیت (مقدار) میں پائے جاتے ہیں کیفیت پر اُن کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ دونوں صنفوں میں سے ایک بھی دوسری صنف کی صفات و خصائل سے پُورے طور پر خالی نہیں ہے۔ مذکورۂ بالا مباحث کی تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ عورت کو سادہ حسیات کے شعور کی شدّت کے لحاظ سے مرد پر امتیاز و تفوق حاصل ہے۔ اور مرد مختلف احساسات کے اختلافات معلوم کرنے میں عورت سے زیادہ ذکی الحس اور ممتاز ہے۔ عورت رنگ و بُو، آواز اور احساسِ طلب کے معاملہ میں (یعنی اُن سادہ حسیات میں جن کا تعلق عالمِ خیال اور جذبات سے ہے) مرد کی بہ نسبت زیادہ حساس ہوتی ہے۔ اور مرد کا شعور مرکب احساسات میں جو عملی زندگی پر براہِ راست اثر ڈالتے ہیں مثلاً حرکت، اوزان، اور سطوح کی حس میں عورت سے زیادہ قوی ہوتا ہے۔ عورت نئی باتوں کے یاد کرنے کی قابلیت میں مرد سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے اور مرد اس حیثیت سے عورت پر فائق ہے کہ جو امور اُس کے حافظہ میں موجود ہوتے ہیں اُن کو اظہار کے وقت لطافت سے ترتیب دیتا ہے اور فوراً بروئے کار لے آتا ہے۔ عورت ارادہ، غور و فکر، انفعال اور اثر کی شدّت میں مرد سے ممتاز ہے اور مرد و فورِ فطانت، حصرِ قوائے عقلی

اور فکر و نظر کے لئے انہیں ایک مرکز پر جمع کر دینے میں عورت پر فوقیت رکھتا ہے۔

تشریحِ ابدان کی حیثیت سے مذکورہ بالا علماء کی رائے ہے کہ مرد اور عورت کی دماغی ساخت میں نازک فرق ہوتا ہے۔ مرد کے دماغ کا اوپرا حصہ اپنی تکوین میں زیادہ واضح ہوتا ہے۔ اور عورت کی گدی کا اعصابی مرکز (جو دماغ کے اندرونی نچلے حصّہ میں ہوتا ہے) اپنی بناوٹ میں مرد کی بہ نسبت زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ دماغ کے اوپرے حصّہ کے فرائض میں "تمیزِ حسّی" اور اس قسم کے دوسرے امور شامل ہیں اور دماغ کا اندرونی حصہ "شعورِ حسّی" اور انفعالات کے فرائض ادا کرنے سے قریب تر ہوتا ہے۔ اس لئے زیادہ قرینِ قیاس یہ ہے کہ عورت کی ذہنیت تاثرِ انفعالات سے نزدیک تر ہو۔ برخلاف مرد کی ذہنیت کے جو فکر و نظر سے متاثر ہونے کی زیادہ صلاحیت رکھتی ہے۔ جیسا کہ سطورِ بالا میں عرض کیا جا چکا ہے۔

اوپر کی تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ امورِ حیات اور حالاتِ زندگی میں دونوں صنفوں کی استعدادات کے اندر واضح فرق پایا جاتا ہے۔ کم سے کم یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ فرق عورت کو وجدانیات، جذبات، اور اُن کے متعلقہ امور سے کافی حصّہ عطا کرتا ہے اور مرد کو منطق اور اُس کے متعلقات سے بہرہ اندوز کرتا ہے۔ عورت اکثر عصبی قوت اور صبر کے معاملہ میں خوش نصیب ہوتی ہے اور مرد نظامِ عضلات کی پختگی اور لوچ کی حیثیت سے کامیاب سمجھا جاتا ہے۔

اِس بیانِ اختلافات کا یہ مطلب ہرگز نہیں سمجھنا چاہئے کہ صنفین میں سے کسی ایک کو مطلقاً ترجیح دے دی جائے یا ایک کو دوسرے سے کمتر ثابت کیا جائے۔ اسی طرح اِن اختلافات کا یہ منشا بھی نہیں ہے کہ کسی ایک صنف کو چھوڑ کر دوسری صنف کے تمام حقوق و فرائض کا دائرہ تنگ یا کشادہ کر دیا جائے۔ نیز اُن کا یہ بھی مقصد نہیں ہے کہ اجتماعی حالات میں صنفین کے کاموں کے لئے مختلف متضاد اور تنافر انگیز راستے قائم کر دیئے جائیں۔ بلکہ ان استعدادات کا مفاد یہ ہو کہ مربی دونوں صنفوں کے ساتھ اس طرح برتاؤ کرے کہ وہ ترقی کے راستہ میں فطری استعدادات کے دوش بدوش چل سکیں تاکہ بہترین نتائج کا حصول ممکن ہو۔ علاوہ ازیں مربی بعض اوقات اُن اختلافات کے علم سے یہ فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے کہ صنفین کے ملکوں میں ضعیف پہلوؤں کو خارجی طریقوں سے تقویت دی جائے تاکہ سب کے قوائے نفسیہ بقدر امکان ایک متناسب سطح پر آ جائیں۔ اس قسم کی دراست سے جس طرح تربیت کے معاملہ میں فائدہ اُٹھایا جاتا ہے اسی طرح کبھی اجتماعی فوائد بھی

حاصل کئے جاتے ہیں یعنی صنفین کے درمیان بہترین طریقہ سے تقسیم عمل کے اصول متعین کئے جا سکتے ہیں۔

بہرحال خواہ صنفین کے اختلافات کے متعلق ارباب فکر کے نظریے قابل قبول ٹھیریں یا اُن لوگوں کی رائے کو ترجیح دی جائے جو افراط و تفریط میں مبتلا ہیں اور جنہوں نے "مرد اور عورت" کے موضوع پر اس حیثیت سے نظر ڈالی ہے کہ کسی ایک صنف سے کچھ حقوق و فرائض سلب کر کے دوسری صنف کے سر منڈھ دیئے جائیں نتیجہ کے اعتبار سے صرف فطرت بہترین فیصلہ کر سکتی ہے، وہ کسی کے قول و عمل کی پروا نہیں کرتی اور کسی کے جذبات سے متاثر نہیں ہوتی، وہ ہر صنف ـــــ بلکہ ہر فرد ـــــ کو ایسے راستہ پر چلاتی ہے جو اُس کی ہستی کے لئے سب سے بہتر ہوتا ہے اور جسے حیاتِ اجتماعی اور زندگی میں مقابلہ کی قدرت اس کے لئے متعین کر دیتی ہے۔ ابو سلیمان منطقی نے کیا خوب کہا ہے:-

"ہم اپنے فرائض ادا کرتے ہیں اور اپنے حقوق کے لئے جد و جہد کرتے ہیں لیکن زمانہ ہماری خوشی اور ناخوشی کی پروا کئے بغیر اپنا ناطق فیصلہ صادر کر دیتا ہے ـــــــ!"

منظور سروش (بھوپالی)

کیوپڈ اور زہرہ

گرمی کا موسم اور سہ پہر کا وقت تھا۔ زہرہ ندی میں کھڑی شوخ موجوں سے کھیل رہی تھی۔ کیوپڈ بھی ایک ہاتھ میں کمان اور دوسرے میں ترکش لئے خراماں خراماں اُدھر آ نکلا۔

معاً اُس نے ترکش سے ایک تیر نکالا۔ پیکاں کو سان پر تیز کیا، کمان میں جوڑا اور اپنی پوری طاقت سے چلایا ـــــ آہ! زہرہ کا صاف شفاف سینہ چھد گیا!

"اُف میں مری!" زہرہ چلائی "ظالم تو نے اسی دن کے لئے تیر اندازی کی مشق کی تھی ـــــ غضب خدا کا تو نے اپنی ماں کا سینہ فگار کر دیا ـــــ بے رحم! ماں کا قاتل!"

"اماں!!" کیوپڈ سر پیٹنے لگا "زہرہ! میری پیاری اماں، میری جان اماں! میں اندھا ہوں ـــــ اندھا!"

(ترجمہ) سید بادشاہ حسن

بہار اور فراق

بہار پھولوں کا جوبن نکھارنے آئی
چمن کے رخِ رنگیں کو سنوارنے آئی

ضعیف ہو کے ہوئی ہے جواں عروسِ بہار
بنی ہے زینتِ بزمِ جہاں عروسِ بہار

ہوئے ہیں باغ میں نغمہ سرا خوشی سے طیور
ہر ایک غنچہ تبسّم فشاں ہے اور مسرور

لگاؤں سینے سے کیوں نرگس و سمن کو مگر؟
مروں میں اُن پہ جو ہوتے ہیں خندہ زن مجھ پر؟

یونہی فراق نصیبوں کو چھیڑتی ہے بہار
کہاں نصیب ہے دل سوختوں کو جائے قرار؟

سمن بروں کی نہیں ہے کوئی ہوس مجھ کو
یہ رنگ رنگ کے ہیں پھول خار و خس مجھ کو

کتابِ حُسن کی یہ دلفریب تفسیریں
ترے جمال کی ہیں نا تمام تصویریں

(شیکسپیر)

عطاء اللہ کلیم

سَتی

ابانی اور سریندر دو نادار دوست تھے وہ ایک ہی گاؤں کے رہنے والے تھے اور بچپن کی بے فکری کا زمانہ یکجا بسر کرنے کے بعد ایک ہی مدرسے اور پھر ایک ہی کالج میں داخل ہوئے تھے۔ لیکن اب وہ ایک دوسرے سے جدا ہوگئے تھے، اس لئے کہ تلاش معاش نے انہیں جدا ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ سریندر وطن کو خیرباد کہہ کر بہار چلا گیا مگر ابانی کلکتہ ہی میں رہا۔

لیکن پوجا کی تعطیلات وہ مل کر گزارا کرتے تھے، چنانچہ اس مرتبہ بھی سریندر حسب معمول کلکتہ آیا۔ اُس کی بیوی بچوں کو لے کر اپنے والدین کے گھر چلی گئی تھی اور اس لئے سریندر اپنے دوست کی صحبت سے کامل آزادی کے ساتھ لطف اندوز ہو سکتا تھا۔

ایک روز صبح کے وقت وہ دونوں چاء پی رہے تھے اور اُن کے سامنے میز پر کچھ اخبار پھیلے ہوئے تھے کہ آبانی نے ایک گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

”جب تک خود کسی کے دل میں اصلاح کی خواہش پیدا نہ ہو، قانون اُس کی اصلاح نہیں کر سکتا۔ لوگ بین الاقوامی شادی اور عمر کے تعین کے لئے مختلف قوانین نافذ کر رہے ہیں، کیا تمہارا خیال ہے کہ اس سے کوئی مفید نتیجہ نکلے گا؟ کوئی ان پر ذرا بھی توجہ نہ کرے گا“

سریندر بولا ”ان کو توجہ کرنی پڑے گی۔ قانون گو کامل طور پر ان کی اصلاح نہ کرے لیکن اس سے رسوم و رواج کے بُرے نتائج کی کس حد تک روک تھام ضرور ہو سکے گی۔ تم کو ہرگز یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ ساری کی ساری قوم ایک ساتھ اصلاح کی ضرورت محسوس کرنے لگے گی، لیکن وہ چند ہستیاں جن کو احساس پیدا ہو چکا ہے اب اپنے ان احساسات کو عملی جامہ پہنا سکتی ہیں۔ قانون اس اصلاح کو دوسرے لوگوں کے لئے بھی لازم قرار دے دیگا۔ اس کے علاوہ لوگ خود بھی ان کی تقلید کریں گے۔ تمام اصلاحات رفتہ رفتہ اسی طرح رواج پذیر ہوئی ہیں۔“

ابانی نے کہا ”لیکن بچپن کی شادی وغیرہ آہستہ آہستہ خود ہی مفقود ہوتی جا رہی ہیں اور چند سال میں پوری طرح ان کا تدارک ہو جائیگا۔ اس لئے ہمارے گاؤں والوں کو اس کی ضرورت نہیں کہ ان لوگوں میں شریک ہو کر دنیا میں

اپنی تحقیر کرائیں۔"

سرپیدر نے جواب دیا "مجھے اس سے اختلاف ہے۔ یہ عیوب اور گمراہیاں ہماری فطرت میں بہت گہری بنیاد ڈال چکی ہیں اور اب انہیں آسانی سے نہیں اکھاڑا جاسکتا۔ ہم کیوں دو چار سال اور انتظار کریں، جب کہ ان بری رسوم کو اب بھی ترک کرسکتے ہیں۔ جو اصلاح ہم دس سال کو شروع کرنے والے ہیں اگر آج ہی شروع کردیں تو دس ہزار لڑکیوں کو خطرات سے بچا سکتے ہیں۔"

ابانی نے کہا "واقعی انسان کی زندگی ہر قیمت سے بالا ہے۔ ہم محض ایک بُری رسم کی خاطر بے شمار جانوں کی قربانی نہیں کرسکتے لیکن میں یہ پسند نہیں کرتا کہ قانون ہمارے اخلاقی معاملات میں دخل دے۔ کیونکہ اس وقت قانون سازی اور قانون شکنی غیر ملکیوں کے ہاتھ میں ہے اور ہم سیاسی حقوق سے محروم ہیں، اگر ہم انہیں اپنے لئے اخلاقی قانون بنانے کی طرف متوجہ کریں گے تو ہم غلاموں سے بھی بدتر ہو جائیں گے۔"

سرپیدر نے سگرٹ جلایا اور دیا سلائی پھینکتے ہوئے بولا "اصلاح کے لئے ہمیں ایک کم برائی کو اختیار کرلینا چاہیئے۔ غلامی ایک بُری چیز ہے لیکن خودکشی بدترین شے ہے۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ ہمیں ستی جیسی رسم اور مذہب پر اپنی عورتوں اور بچوں کی قربانی کو روکنے کے لئے بھی قوانین کی ضرورت نہیں ؟"

ابانی نے جواب دیا "مجھے اتنی دور جانے کی ضرورت نہیں۔ جہاں انسان کی زندگی کا سوال پیدا ہو، وہاں اس کو ہر امر پر ترجیح دی جاسکتی ہے۔"

سرپیدر نے پُوچھا "مگر کیا تمام عمر رنج والم میں زندہ رہنا اس سے کم تکلیف دہ ہے کہ کوئی اپنے آپ کو نذرِ آتش کردے۔"

ابانی چند لمحوں تک ساکت رہا پھر بولا "میں ستی یا بچوں کی قربانی کو جائز نہیں سمجھتا۔ لیکن ان کے متعلق ایک بات ضرور کہوں گا کہ ان رسوم و رواج نے محبت اور مذہبی جوش کے اثرات کا بہت کافی ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ قانون نے ان سب کو موقوف کردیا ہے، اب کوئی ستی یا بچوں کی قربانی کا خیال نہیں کرسکتا۔ مگر کیا تم سمجھتے ہو کہ اس طرح انسان کے دل سے تعلق رکھنے والی قربانی کو کس قدر محدود کردیا گیا ہے ؟"

سرپیدر نے کہا "جاہلانہ باتیں نہ کرو۔ قانون انسان کی فطرت نہیں بدل سکتا۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ موجودہ زمانے میں جو خواتین اپنے شوہروں سے محروم ہو جاتی ہیں اُن میں سے کوئی اپنے شوہر سے محبت نہیں کرتی یا وہ اُس کے لئے وہ تمام قربانیاں نہیں کرسکتی جو عہدِ گذشتہ کی خواتین نے کی ہیں ؟"

ابانی نے جواب دیا "مجھے اس میں شبہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ سمجھ ہی نہیں سکتیں کہ پہلے زمانے کی عورتوں نے کیسے کیسے بہادرانہ کارنامے کئے ہیں؟"

سربندر بولا "یقیناً وہ سمجھ سکتی ہیں۔ اگر تمہیں فرصت ہو تو میں تمہیں اپنا ایک واقعہ سناؤں"

ابانی نے کہا "مجھے بھلا کب انکار ہو سکتا ہے"

سربندر مذاق سے بولا "مگر تم اپنی بیگم صاحبہ کو بھی کیوں نہیں بلا لیتے۔ یہ واقعہ وفا شعاری کا ایک بہترین درس ہے"

ابانی نے کہا "اُسے کھانے پکانے ہی میں مشغول رہنے دو۔ اطاعت گزاری کا یہ اُس سے بہتر درس ہے"

سربندر بولا "جیسی تمہاری مرضی ہو ۔۔۔ مجھے کہنا یہ ہے کہ شاید تمہیں یاد ہوگا جب میں نے یہاں وکالت شروع کی تھی تو مجھے بے حد مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اُس وقت میرے پاس کچھ نہ تھا۔ والدین نے بھی کوئی جائداد نہ چھوڑی تھی جس سے گزر اوقات ہو سکتی اور سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ میں کہیں باہر جا کر قسمت آزمائی کروں۔ لیکن جانا کہاں چاہئے اس کا جواب میرے دماغ سے نہ بن پڑتا تھا۔ میں انہی تفکرات میں گھرا ہوا تھا کہ مجھے سورنجن کا ایک خط ملا۔ تم اُسے جانتے ہو گے؟ تمہیں یاد ہے تعلیم میں وہ مجھ سے چند سال آگے تھا؟ لیکن کسی زمانہ میں ہم دونوں بڑے دوست تھے، پھر میں نے سنا کہ وہ وکالت کا امتحان پاس کر کے بہار چلا گیا ہے اور وہاں چین کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس کے بعد کئی برس تک مجھے اس کی نسبت کچھ معلوم نہ ہوا۔

خط دیکھ کر مجھے تعجب ہوا کہ اُس نے کیوں مجھے اچانک یاد کیا ہے۔ میں نے خط کو کھول کر پڑھا۔ اُس نے مجھے بہار آنے کی دعوت دی تھی۔ اور لکھا تھا کہ میری بجائے آ کر وکالت کرو۔ میرے لئے یہ نہایت مسرت انگیز خبر تھی لیکن رنج دہ بات یہ تھی کہ وہ بیمار ہو گیا تھا اور سخت تکالیف میں مبتلا تھا۔ اُس کی علالت نے اُسے کام کرنے سے معذور کر دیا تھا اور وہ بے حد مقروض ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں وہاں چلا جاؤں اور اُس کی بجائے وکالت شروع کر دوں تو اس کی دوستانہ مدد بھی کر سکوں گا۔ اس لئے میں نے جلدی سے بستر باندھا، کچھ قرض مہیا کیا اور روانہ ہو گیا۔ میں نے تار کے ذریعہ سے اُس کو اپنی روانگی کی اطلاع بھی دے دی، گو مجھے اس کی توقع نہ تھی کہ وہ ضرور میرے استقبال کے لئے اسٹیشن پر موجود ہوگا، کیونکہ وہ بہت زیادہ علیل تھا۔

ای۔ آئی۔ آر کی ایک معمولی مسافر گاڑی میں ایک طول طویل اور خوشگوار سفر کے بعد میں اپنی منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ حسب توقع اسٹیشن پر میں نے کہیں اپنے دوست کو موجود نہ پایا، اس لئے خود ہی اُس کی قیام گاہ کو

تلاش کرنے کا ارادہ کر لیا۔ ایک قلی کے سر پر سامان رکھ کر میں اسٹیشن سے باہر آیا۔ میں ایک گاڑی میں بیٹھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ ایک لڑکا دوڑتا ہوا میرے پاس آیا، اور میرا خیال ہے کہ چونکہ میں ہی ایک اکیلا بنگالی مسافر تھا اس لئے اُس نے بلا پس و پیش مجھ سے سوال کیا۔ "کیا سریندر بابو آپ ہی ہیں؟"

میں نے جواب دیا۔ "ہاں میں ہی ہوں۔ لیکن تم کون ہو، مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے تمہیں کبھی دیکھا ہو۔"

اُس نے کہا "آپ نے نہ دیکھا ہوگا، میں منورنجن بابو کے مکان کے قریب ہی رہتا ہوں۔ چونکہ بابو صاحب خود نہ آ سکتے تھے اس لئے اُن کی بیوی نے مجھے آپ کی رہنمائی کے لئے روانہ کیا ہے۔"

"اچھا آؤ، گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔" میں نے لڑکے سے کہا اور ہم تقریباً آدھ گھنٹے میں منورنجن کے مکان پر پہنچ گئے۔ شہر کے ایک غلیظ گوشے اور ایک سنسان گلی میں اس کا مکان تھا۔ تمام گلی میں ایک بھی خوبصورت یا نیا مکان نظر نہ آتا تھا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ میں یہاں زیادہ عرصہ تک قیام نہ کر سکوں گا۔ گھر کے فاقے یہاں کی زندگی سے بدرجہا بہتر تھے۔ لڑکے نے کوچبان سے گاڑی روکنے کو کہا اور خود اُتر کر ایک نہایت کہنہ اور بوسیدہ دروازے کو کھٹکھٹا کر پکارا "چچی اماں؟"

دروازہ کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ کھلا اور میں نے ایک خاتون کو گھونگٹ نکالے ہوئے دروازے کے قریب کھڑا پایا۔ میں نے دیکھا کہ گھر میں کوئی ملازم نہیں ہے، اس لئے کوچبان ہی سے سامان نیچے اتارنے کو کہا۔ اور پھر ہم دونوں اسباب اٹھا کر اندر لے گئے۔ میں نے لڑکے کو ایک روپیہ دیا کہ وہ گاڑی کا کرایہ ادا کر دے۔

وہ خاتون اب اندر چلی گئی تھی۔ میں خاموش کھڑا ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں کہ اتنے میں منورنجن کی نحیف آواز آئی۔ "سیدھے چلے آؤ۔ میں اس قدر کمزور ہوں کہ تمہارے استقبال کو نہیں آ سکتا۔"

میں اندر چلا گیا۔ وہاں صرف ایک تخت بچھا ہوا تھا، اور اُس پر ایک شخص بلا حس و حرکت پڑا تھا۔ میں نے اسی کو منورنجن سمجھا۔ اِس وجہ سے نہیں کہ میں نے اُسے پہچان لیا تھا، بلکہ اس لئے کہ اس کے سوا گھر میں اور کوئی بھی موجود نہ تھا۔ اُس منورنجن سے اُسے کوئی نسبت نہ تھی جس کو میں جانتا تھا۔ میں اُس کے قریب ہی تخت پر بیٹھ گیا۔ کیونکہ وہاں بیٹھنے کے لئے اور کوئی چیز موجود نہ تھی۔

وہ نحیف آواز میں بولا "تو آخر تم آ ہی گئے ... مجھے امید ہے کہ تمہارا یہ سفر نہایت خوشگوار رہا ہوگا۔"

مَیں نے کہا "ہاں کچھ ایسا ہی تھا لیکن تمہاری اس متغیر حالت کو دیکھ کر مجھے سخت تعجب اور پریشانی ہے۔ کیوں حالات اِس قدر ناخوشگوار ہو گئے؟ ہم سب کا تو ہمیشہ یہ خیال رہا کہ تم یہاں آرام اور چین سے اپنی زندگی گزار

رہے ہو۔"

"ہاں میں آرام ہی سے زندگی گزار رہا تھا۔ اور آج سے ایک سال قبل مجھے ایسی بُری صورت حالات کا خواب و خیال بھی نہ تھا، مگر اس کے بعد میں بیمار ہوگیا اور اب میں حیران ہوں کہ میری حالت کس قدر گر گئی ہے۔ بخار ایک لمحے مجھے نہیں چھوڑتا۔ ممکن ہے کہ یہ ملیریا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ دق ہو۔"

میں نے پُوچھا "لیکن کیا تم کسی ڈاکٹر کا علاج نہیں کر رہے ہو؟"

اُس نے جواب دیا "جب تک میرے پاس پیسہ تھا میں نے شہر کے ہر ڈاکٹر کا علاج کیا، لیکن اب تو میں اپنی غذا تک مہیا کرنے سے عاجز ہوں۔"

میں نے کہا "پھر تم گھر کیوں نہیں چلے گئے، کم از کم وہاں تمہیں روٹی کی طرف سے تو بے فکری ہو جاتی۔"

اُس نے جواب دیا "میں نے اس کا خیال کیا تھا لیکن یہاں میرا کام سنبھالنے والا کوئی نہ تھا۔ اس کے علاوہ میرے رشتہ دار بیچارے آپ غریب ہیں اِس لئے میں یہیں پڑا رہا، اور ابھی معلوم نہیں کب تک پڑا رہوں گا۔"

میں نے کہا "لیکن اب ڈاکٹر کا انتظام جلد کرنا چاہیئے۔ میں اس نازک حالت میں تمہیں اس طرح نہیں چھوڑ سکتا۔"

اُس نے کہا "ہاں، ہاں، مگر عجلت کی ضرورت نہیں۔ پہلے کچھ کھا پی لو۔ پھر جو تمہارا جی چاہے کرنا۔"

پھر اُس نے اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر کہا "تم کہاں جا کر چھپ گئی ہو۔ اب اس طرح کام نہیں چلے گا۔ ہمارے پاس درجنوں ملازم نہیں ہیں۔ سربند رمیرے چھوٹے بھائی کے برابر ہے، تمہیں اس سے پردہ کرنے کی ضرورت نہیں۔"

منورنجن کی بیوی یہ سن کر آہستہ آہستہ آنے والی رات کی طرح کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس نے اپنا گھونگھٹ چہرے پر سے اٹھا دیا تھا۔ اُس کا چہرہ غضب کا حسین تھا اور وہ صرف خوبصورت اور روح پرور ہی نہ تھا بلکہ اس میں بعض ناقابلِ بیان کیفیات مستور نظر آتی تھیں۔

منورنجن نے کہا "یہ میری بیوی ہے۔" میں جھٹ اُٹھ کھڑا ہوا، اور اُس کے سامنے جھک کر میں نے اس کے پاؤں کی مٹی اٹھالی۔ اگرچہ وہ مجھ سے کئی سال چھوٹی تھی، لیکن میں نے محسوس کیا کہ اِس وقت اُس کی تعظیم مجھ پر فرض ہے اور اِس تعظیم کے اظہار کی ضرورت ہے۔

میں نے کہا "میرے سامنے آنے سے شرماؤ نہیں۔ مجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھو۔"

وہ ایک پُرمتانت اور حیا پرور انداز سے مسکرا پڑی۔

منورنجن نے کہا "سروجا، ابھی ناشتا تیار ہُوا کہ نہیں!"

سروجا بولی "بالکل تیار ہے۔ یہ اشنان کرلیں تو میں لاکر چُن دوں"

منورنجن پرہیزی غذا کھاتا تھا، اس لئے نہانے کے بعد میں نے تنہا کھانا کھایا۔ غذا بہت سادہ تھی، لیکن مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ایسی خواہش سے میں نے اس سے پہلے بھی کبھی کچھ کھایا ہو۔ سروجا میزبانی کی خدمت انجام دے رہی تھی میں نے اس کا چہرہ دیکھا اور مجھے محسوس ہُوا کہ میں اسے جانتا ہوں چند لمحوں کے بعد میں نے اپنے جذبات کی ماہیّت کو سمجھا۔ میں نے سروجا کو پہلے کبھی نہ دیکھا تھا، لیکن اس کے چہرے کی ہوبہو کیفیت میں نے اپنی دیویوں لکشمی اور اَن پورنا وغیرہ میں پائی تھی۔ یہ لڑکی موجودہ تہذیب و تمدّن کے زمانے میں سانس لے رہی تھی، لیکن اس کی ہر بات ہرادا وید یا مہا بھارت کے زمانے کی معلوم ہوتی تھی۔ اُسے نہایت آسانی سے دمینتی اور ساوتری کہا جاسکتا تھا۔ اور یہ بالکل محسوس نہ ہوتا تھا کہ وہ کامل طور پر دنیاوی زندگی بسر کررہی ہے۔ اس کی نصف زندگی ماضی کے کسی فراموش شدہ عہد میں سانس لیتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ وہ ایک قابلِ پرستش ہستی تھی، وہ نسائی خوبیوں کا ایک لائق سجود مجسمہ تھی۔ محبت کئے جانے سے اس کا مرتبہ افضل تھا۔ مجھے حیرت ہُوتی تھی کہ منورنجن ـــ ایک انسان اُسے اپنی بیوی کس طرح خیال کرتا تھا۔

دوسرے دن میں نے کام شروع کردیا۔ قریب ہی ایک مکان خالی تھا جس میں منورنجن پہلے رہا کرتا تھا میں نے اپنی قسمت پر بھروسا کرکے اُسے کرایہ پر لے لیا۔ اپنے نام کا ایک بڑا سا بورڈ لگایا، اور دفتر کو بھی اچھے فرنیچر سے سجایا لیکن اندرونی مکان کے تمام کمرے سنسان اور ویران پڑے رہے۔ منورنجن کے پاس قانونی کتب کا ایک مفید ذخیرہ تھا جس میں دیمک لگ رہی تھی، میں نے ان سب کتابوں کو صاف کرکے اپنے کمرے میں جما دیا۔ منورنجن نے مجھے بعض نہایت ممتاز موکلوں کے نام خطوط دیئے، جن کے ذریعہ سے میں نے اُن لوگوں سے ملاقات کی۔

میری قسمت میں انقلاب رونما ہوچکا تھا اس لئے میری تمام کوششیں کامیاب رہیں۔ ابتدا ہی سے میرے پاس موکلوں کا جمگھٹا رہنے لگا۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ میں لکھ پتی بن گیا، مگر میں اپنے اخراجات کے علاوہ منورنجن کی اعانت کے قابل بھی ہوگیا۔ میں نے اس کے ہاں نئے ڈاکٹر کو بلا بھیجا۔ اور اُس سے کہا کہ منورنجن کا علاج خوب دل لگا کر کرو، سارے اخراجات کا میں ذمہ دار ہوں۔

میں دن میں کسی وقت ضرور منورنجن کو دیکھنے جاتا تھا اور اپنے ساتھ پھل وغیرہ بھی لے جاتا تھا اور سودا سلف

اور دیگر اوپر کے اخراجات کے لئے بھی روپیہ دیا کرتا تھا۔ اُسے یہ سب کچھ لے لینے میں کوئی ذلت یا ندامت محسوس نہ ہوتی تھی۔ اور وہ کبھی اُن کے لینے میں عذر نہ کرتا تھا۔ اُس نے مجھ بے روزگار کو زر کمانے کا ذریعہ بتایا تھا اور اس لئے وہ اس کا بلکہ اس سے زیادہ کا حق دار تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس قدر علیل اور خود فراموش ہوگیا تھا کہ اُسے ایسی ادنیٰ باتوں کا احساس بھی نہ ہوتا تھا۔ لیکن سروجا کے پُر ملال چہرے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اس خیرات طلبی سے اُسے قلبی نفرت ہے۔

ایک روز اُس نے مجھ سے یکایک دریافت کیا "کیا تم اپنے بیوی بچوں کو یہاں نہ لاؤ گے؟"

میں نے جواب دیا "ابھی جلدی نہیں ہے۔ وہ اپنے گھر میں آرام سے ہیں اور خوش ہیں۔ میں جب تک یہاں بالکل مطمئن نہ ہو جاؤں انہیں بلانے کا خیال نہیں کر سکتا۔"

پھر اُس نے پوچھا "لیکن تم نے اتنا بڑا مکان کیوں لے رکھا ہے۔ کئی ایک کمرے خالی پڑے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ نصف حصّہ ہمیں کرایہ پر دے دو۔ آخر یہاں بھی کچھ کرایہ دینا پڑتا ہے۔ اگر ہم وہاں آجاؤں تو تمہیں باورچی کی بھی ضرورت نہ رہے گی۔"

میں نے کہا "اگر آپ لوگ وہاں آجائیں تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہے گی۔ اب گھر ایک ویرانہ معلوم ہوتا ہے، اور مجھے تنہا رہنے سے وحشت ہوتی ہے لیکن خدا کے لئے کرایہ کا نام نہ لیجئے ورنہ اس طرح مجھے کچھ بھی خوشی نہ ہوگی۔ اور اگر میں مہا راج (باورچی) کے رنگ برنگ کھانوں سے رہائی پاؤں تو اپنے آپ کو بہت خوش نصیب تصوّر کروں گا۔"

میرا خیال نہیں کہ یہ معاملہ سروجا کی عین طبیعت کے مطابق تھا لیکن منورنجن کو اس پر بہت طیش آیا، اور بیچاری سروجا کو مجبوراً خاموش ہو جانا پڑا۔ لیکن دو روز کے بعد وہ میرے گھر میں آگئے۔

گھر میں یقیناً ایک امن و آسائش کی فضا پیدا ہوگئی۔ ایک رونق سی ہر طرف چھا گئی۔ اور کھانے بھی نہایت لذیذ پکنے لگے۔ لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس سے ہماری مسرت میں بھی کچھ اضافہ ہوا۔ منورنجن اس قدر کمزور اور بیمار تھا کہ اُس سے مسرت اور خوش اخلاقی کی توقع رکھنا ہی عبث تھا۔ وہ ہر وقت کراہتا رہتا۔ اور سروجا ایک غلام کی طرح اُس کی خدمت میں مشغول رہتی۔ اُسے بات کرنے کا موقع بھی دقّت سے ملتا۔ یہاں وہ پہلے سے زیادہ غمگین اور کبیدہ خاطر نظر آتی تھی۔ حتیٰ کہ اُس نے اپنے ہونٹوں کو تبسم کوشی سے بھی محروم کر دیا تھا۔

میں اُس کے اِس غم و سکوت کو نہ سمجھ سکتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اُس کا شوہر بیمار تھا مگر یہ نئی بات تو نہ تھی۔

وہ دونوں یہاں نسبتہً آرام سے رہتے تھے۔ پھر آخر اس سوگ اور غم میں ترقی کی کیا وجہ ہو سکتی تھی؟

اس کا سبب مجھے اتفاقیہ طور پر معلوم ہوا۔ میرے مکان کے متصل ایک شخص رہتا تھا۔ میں اکثر اُسے آتے جاتے دیکھتا تھا۔ وہ ایک جوان آدمی تھا۔ مگر مجھے اس کا علم نہ تھا کہ وہ کون ہے اور کیا کاروبار کرتا ہے۔ لیکن بعد میں مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ ایک مصوّر ہے اور خوب دولت کما رہا ہے اُس کے متعلق اِس سے زیادہ اور کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ یہ شخص تن تنہا اس مکان میں رہتا تھا۔

منورنجن کی خوابگاہ کی کھڑکی میں سے مصوّر کے تصویر خانہ کا کچھ حصہ نظر آتا تھا۔ پہلے یہ کھڑکی اکثر بند رہتی تھی۔ لیکن اب جب کبھی میں منورنجن کے پاس جاتا اِس کھڑکی کو کھلا پاتا۔ سروجا اس قدر حسین تھی کہ کوئی شخص اس پر نگاہ ڈالے بغیر رہ نہ سکتا تھا۔ اور خصوصیت سے ایک مصوّر کے لئے یہ بات ناممکن تھی۔ اس لئے میں نے اس غریب کی طرف سے کوئی بدگمانی دل میں پیدا نہ کی۔ اس کے علاوہ میں سروجا کو نیکی اور وفاشعاری کی دیوی سمجھتا تھا اور یہی سبب تھا کہ اس کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف زیادہ توجہ نہ کرتا تھا۔

ایک روز میں عدالت سے غیر معمولی طور پر جلد واپس آ گیا۔ میں اپنے ساتھ منورنجن کے لئے دوا کی ایک شیشی بھی لایا تھا اس لئے سیدھا اُس کے کمرے میں پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ وہ سو رہی ہے اور سروجا کھلی ہوئی کھڑکی کے سامنے کھڑی ہے۔ مصوّر کے کمرے کی کھڑکی بھی کھلی ہوئی تھی اور وہ بھی وہاں موجود تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ باتیں کر رہے تھے یا نہیں، کیونکہ میں نے کوئی لفظ نہیں سنا۔ لیکن یہ منظر دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں پتھر کا ہو گیا ہوں۔

سروجا میری طرف پشت کئے کھڑی تھی اور اس لئے پہلے جس کی نگاہ مجھ پر پڑی وہ مصوّر تھا۔ اُس نے ایک اشارہ کیا اور فوراً وہاں سے غائب ہو گیا۔ سروجا نے اپنا رخ بدلا اور مجھے دیکھتے ہی موت کی سی افسردگی اُس کے چہرے پر طاری ہو گئی۔ لیکن وہ بھی جلد ہی بغیر کچھ کہے وہاں سے چلی گئی۔ ان کی اس حرکت نے میرے شکوک کو اور زیادہ مستحکم کر دیا۔ میں اِس قدر متعجب نہ ہوتا اگر کوئی اور عورت اس فعل کی مرتکب ہوتی۔ لیکن سروجا کی یہ حرکت یقیناً استعجاب و اضطراب افزا تھی۔ اس کے علاوہ میں نے سوچا کہ اگر وہ دونوں کسی گناہ کے مجرم نہ تھے تو کیوں اس طرح بھاگ گئے۔ اُنہیں کھڑے رہنا چاہئے تھا۔

اس واقعے کے بعد سروجا نے مجھ سے بات چیت ترک کر دی۔ تمام واقعات کسی قدر میری سمجھ میں آ گئے لیکن اب مجھے کیا کرنا چاہئے تھا؟ میرے پاس کوئی پختہ ثبوت موجود نہ تھا اور اس لئے میں مصوّر کے پاس جا کر اُسے برا بھلا نہ کہہ سکتا تھا۔ اور نہ اُسے مجرم ٹھہرا سکتا تھا۔ میں سروجا سے بھی کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ اُس کے شوہر سے

اس امر کا تذکرہ کرنا حقیقت میں اس کا خون کرنے کے برابر تھا۔ ان تمام حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے مجبوراً مجھے خاموش ہو جانا پڑا۔

علالت کے اِس طویل زمانہ میں منورنجن نے اَن گنت قرض خواہ پیدا کر لئے تھے اور وہ سب قرض وصول کرنے کے لئے بہت بے چین نظر آتے تھے۔ پہلے طعن و تشنیع کے خطوط وصول ہوتے رہے۔ اس کے بعد چپڑاسی اور ملازم اور پھر خود قرضخواہ حضرات یکے بعد دیگرے تشریف لا کر عزت افزائی فرمانے لگے۔ گھر میرا تھا اور منورنجن کو اپنی خطرناک علالت کی وجہ سے باہر قدم رکھنا بھی دوبھر تھا اس لئے قرضخواہ اُس سے اپنا قرض وصول کرنے میں کامیاب نہ ہوتے تھے۔ لیکن ان خونخوار درندوں کی خوفناک اور لرزہ براندام کر دینے والی چیخ پکار گھر کے کونے کونے میں تیر کی طرح پیوست ہوتی اور ان غمزدہ ہستیوں کے دماغوں میں اتر جاتی۔

اب وکیلوں کے سمن بھی آنے لگے۔ پہلے سروجا ان تمام خطوط کو کھول کر پڑھتی اور پھر منورنجن کو دیتی۔ ایک دن اُس نے ایک خط کھولا لیکن اُس کی انگریزی عبارت دیکھ کر میرے پاس لائی تاکہ اُسے پڑھ کر سنا دوں۔

یہ پہلا موقع تھا کہ سروجا نے گذشتہ ناگوار واقعے کے بعد مجھ سے گفتگو کی تھی۔ میں اس قدر بے چین تھا کہ میں اُس کو دیکھنا بھی گوارا نہ کر سکتا تھا۔ میں نے خط پڑھ کر اس کا مطلب سمجھا دیا۔ سن کر وہ ایسی ساکت ہو گئی جیسے منجمد برف۔

اب مجھے یہ عورت ایک معمّا معلوم ہونے لگی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر کامل اعتماد تھا لیکن میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں اسے مجرم کیونکر سمجھ لوں۔ اس لئے کہ میں نے اس کی وفاشعاری اور شوہر پرستی کے محبت آمیز اور پاک مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ وہ دن رات اس کی اطاعت اور خدمت میں مشغول رہتی۔ دنیا منورنجن پر حملے کرتی اور سروجا سپر بن کر اُن کا جواب دیتی۔ پھر کیا ایک ایسی بیوی بے وفا بھی ہو سکتی ہے؟ شاید حقیقت میں وہ بالکل بے گناہ تھی۔ ایک وکیل ہونے کی حیثیت سے میں جانتا تھا کہ جرم کا چہرہ ہمیشہ مجرم ہونے کا اظہار نہیں کرتا۔ میں اپنے خیال میں اسے مجرم نہ ٹھہرا سکتا تھا، کیونکہ اب تک کوئی قابلِ وثوق ثبوت مجھے نہ ملا تھا۔

لیکن ہم تقدیر کی فسوں ساز زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ یہ معاملہ آئندہ چند روز میں ترقی کرتا گیا۔ آخر کار اس کی غمناک انتہا بھی جلد نظروں کے سامنے آ گئی۔

میرا ملازم چھوکرا روزانہ میرا لیمپ صاف کر کے میرے کمرے میں آیا کرتا تھا۔ ایک شام وہ حسبِ معمول لیمپ لے کر داخل ہوا۔ مگر اس کے بعد واپس جانے کی بجائے وہ دروازے کے قریب کھڑا ہو گیا۔

میں نے پوچھا "رگھو! کیوں کھڑے ہو؟"

لڑکے نے ہاتھ جوڑتے ہوئے جواب دیا" حضور میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ آپ میرے مالک ہیں، میرے مائی باپ ہیں، اور میں نہیں چاہتا کہ آپ کی شان میں کوئی دھبا آئے۔"

میں نے کسی قدر سختی سے پوچھا۔" تو کیا بک رہا ہے؟ صاف صاف بول۔"

رگھو نے کہا:" جب آپ چلے جاتے ہیں اور یہ بیمار صاحب سو جاتے ہیں تو دیوی جی ہمسایہ کے مکان میں چلی جاتی ہیں، اور تقریباً آدھ یا ایک گھنٹے میں لوٹتی ہیں۔"

میرا دل چاہا کہ میں اُس کا سر قلم کر دوں۔ لیکن میں نے ضبط سے کام لیا لڑکے پر الزام عاید نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اُس نے مجھے صرف اُس امر کی خبر دی تھی جسے اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ لیکن ابھی اُس نے سروجا کے متعلق کچھ نہ کہا تھا۔ میں نے اپنے دل میں کہا، کیا کسی انسان کا چہرہ اس قدر جھوٹا بہروپ بھر سکتا ہے؟ سروجا شیو دیوتا کی بیوی معلوم ہوتی ہے، کیا وہ ایسی وفا شکن ہو سکتی ہے؟

میں نے پوچھا:" تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

لڑکے نے جواب دیا" ہر روز مجھے دیوی جی گھنٹہ بھر کے لئے باہر چلے جانے کو کہہ دیا کرتی تھیں۔ کل میرے سر میں درد تھا اس لئے میں باہر جانا نہ چاہتا تھا۔ باہر جانے کی بجائے میں یہاں آ کر سو گیا۔ دیوی جی کو یہ معلوم نہ تھا۔ سونے کے بعد جب میں اٹھا تو بڑی پیاس معلوم ہوئی اور میں باورچی خانہ میں پانی پینے گیا۔ میں نے دیکھا کہ عقب کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی اور جیسے ہی میں نے چاہا کہ اُسے بند کر دوں، میں نے دیکھا کہ دیوی جی اُسی گھر کے ایک چور دروازے سے نکل کر آ رہی ہیں۔ اس سے قبل کہ وہ مجھے دیکھ پاتیں میں فرار ہو گیا!"

میں نے پھر دریافت کیا:" کیا یہ پہلا موقع تھا جو تم نے انہیں وہاں جاتے دیکھا؟"

لڑکے نے جواب دیا:" نہیں میں نے کل بھی دیکھا تھا اور پرسوں بھی۔ وہ ایک بجے جاتی ہیں اور دو بجے واپس آتی ہیں۔"

میں نے اُس کو تاکید کر دی کہ یہ واقعہ کسی سے نہ کہے، اور ارادہ کیا کہ میں خود اس معاملہ کی تحقیقات کروں گا۔ لیکن پھر وہی سوال میرے سامنے تھا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ سروجا پر میرا کوئی حق نہ تھا۔ میں اُس سے اس واقعے کے متعلق کوئی استفسار نہ کر سکتا تھا۔ صرف اُس کا شوہر ایک جائز شخص تھا جو اس معاملہ میں دخل دے سکتا تھا۔ لیکن وہ تقریباً بستر مرگ پر پڑا تھا، اور اُس سے اس بات کا اظہار اُس کے قتل سے کم حیثیت نہ رکھتا تھا۔ اس لئے مجبوراً میں نے سروجا سے اس راز کو دریافت کرنے کا خیال کیا۔ لیکن پھر میں نے سوچا کہ

مجھے ایک ملازم کی بات پر کامل یقین نہ کر لینا چاہئے۔ میرا ارادہ تھا کہ اگر اور کچھ مجھ سے نہ ہو سکا تو میں اس شوقین مزاج مصوّر کو تو کوڑے مار مار کر سیدھا کر دوں گا۔

دوسرے روز میں عدالت نہ گیا۔ اگرچہ حسبِ معمول ۱۰ بجے گھر سے باہر چلا گیا۔ میں نے لڑکے سے کہا کہ دروازہ کھلا رہنے دے کیونکہ میں ایک گھنٹے کے بعد واپس آ جاؤں گا۔

میں تقریباً ۱۱ بجے واپس آیا۔ رگھو نے مجھے بتایا کہ سروجا کو گئے تھوڑی دیر ہو گئی ہے، اور وہ جلد ہی واپس آئے گی۔ میں ایک ایسے گوشے میں چھپ کر بیٹھ گیا جہاں سے میں سروجا کی نقل و حرکت کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔

جلد ہی مصوّر کے مکان کا چور دروازہ کھلا اور اُس میں سے سروجا برآمد ہوئی اور باورچی خانہ کے دروازے سے گھر میں داخل ہو گئی۔ میں اس ناجائز حرکت کا سبب دریافت کرنے کے لئے اپنے مقام سے نکل کر باہر آنے ہی والا تھا کہ اُس کا چہرہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا۔ اُس سے ایک ایسی بے چینی اور درد کا اظہار ہو رہا تھا کہ اِس سے قبل میں نے کسی انسان کے چہرے پر یہ کیفیت نہ دیکھی تھی۔ اُس کی ساری صورت متغیر ہو رہی تھی۔

میں یہ دیکھ کر پریشان سا ہو گیا۔ اس کا کیا مطلب ہو سکتا تھا؟ سروجا کے اندر چلے جانے کے بعد میں وہاں سے نکل کر اپنے دفتری کمرہ میں چلا گیا اور واقعات پر غور و خوض کرنے لگا۔ آخر میں نے مصوّر کے پاس جانے کا تہیّہ کر لیا۔ میں نے سوچا کہ کل جب سروجا اپنے دوست کے پاس جائے گی تو میں بھی اس کا تعاقب کروں گا۔ اور ان مجرموں کو مناسب سزا دوں گا۔ میں اس غیر موزوں سلسلۂ ملاقات کا خاتمہ ہی کر دوں گا۔ مگر میری تدابیر بروئے کار نہ آ سکیں۔ میں نے ایک بجے عدالت سے واپس ہونے کا ارادہ کیا تھا، لیکن مجبوراً دیر ہو گئی، اور جیسے ہی میں گھر میں داخل ہوا منورنجن کے کمرے سے ایک نہایت دردانگیز اور پُرسوز آواز سنائی دی۔ میں دوڑ کر اندر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ منورنجن سروجا کو ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ہے اور اُس نے ایک شورِ محشر بپا کر رکھا ہے اُس کے منہ سے جو گالیاں نکل رہی تھیں اُن سے میرے کان زخمی ہو رہے تھے۔

میں نے اُسے پکڑا اور کھینچ کر بستر پر لٹا دیا۔ "تم کیا کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔ "کیا تم اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالنا چاہتے ہو؟ اور مجھے بتاؤ تو سہی تم اتنے وحشت زدہ کیوں ہو رہے ہو؟"

اُس نے غصّہ سے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔ "آہ اب زندہ رہنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ بہتر ہے کہ اب میں مر جاؤں۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس وقت میری وفا شعار بیوی مجھے مرتا ہوا چھوڑ کر کہاں گئی تھی؟ وہ سامنے کے مکان میں اپنے عاشق سے ملاقات کرنے گئی تھی۔ میری نظروں سے اسے دور کر دو ورنہ میں

اس کی جان لے لوں گا۔ مجھ میں ابھی اتنی طاقت موجود ہے۔ میرے دماغ میں آگ لگی ہوئی ہے۔ میرے دل میں زہر کی ندیاں ابل رہی ہیں۔ میں اس عورت پر فرشتوں سے زیادہ اعتماد رکھتا تھا۔"

میں نے سروجا سے کہا "تم آجاؤ تمہاری موجودگی سے اس کا غصہ زیادہ بھڑکتا ہے، اور یہ اس کے لئے خطرناک ہے۔"

بدنصیب شوہر نے چلاکر کہا "نکل جا۔ اگر تو جا سکتی ہے تو اس دنیا سے نکل جا۔ آئندہ اپنا منہ کسی مرد کو نہ دکھانا۔ بس صرف موت ہی ایک تیرا ٹھکانا رہ گیا ہے۔"

سروجا نے اپنے آپ کو ایک لمبی چادر میں لپیٹا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

میں نے دیکھا کہ سروجا فی الحقیقت گھر چھوڑنے پر تیار ہوگئی تھی۔ میں نے اُس کا راستہ روک کر کہا۔ "تم کیا کر رہی ہو؟ تمہارا شوہر دیوانہ ہوگیا ہے، تمہیں اس کا خیال نہ کرنا چاہیئے۔"

وہ بولی "خدا کے لئے مجھے جانے دیجئے۔ مجھے اب روکنا بالکل فضول ہے۔"

میرے دل میں سروجا کے لئے بڑی عزت تھی۔ میں نے کس مسرت سے اُسے یہاں آنے کی دعوت دی تھی، اور اب وہ کس ذلت کے ساتھ گھر سے نکالی جا رہی تھی۔

میں نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس کمرے میں ٹھہرو۔ تمہارے شوہر کو اس امر کی اطلاع کی ضرورت نہیں۔ گو بظاہر واقعات نہایت تکلیف دہ ہیں تاہم میں تم کو مجرم قرار نہیں دے سکتا۔"

وہ ایک حقارت آمیز ہنسی ہنس کر بولی "تم کیوں قرار نہیں دے سکتے۔ ایک عورت کو بہت آسانی سے مجرم قرار دیا جا سکتا ہے، اور ہمارے ملک میں اُس کے جرم پر آسانی سے یقین کر لیا جا سکتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "خیر جو کچھ ہوا وہ ہوا۔ لیکن اب میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ تم نہ جاؤ۔ منورنجن کو ذرا خاموش ہو جانے دو اور پھر تم اپنا بیان دینا۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے پاس اس امر کو غلط ثابت کرنے کا کافی ثبوت ہوگا۔"

اُس کا جواب سن کر میں حیران رہ گیا جب اُس نے کہا "میرے پاس نہ کوئی بیان ہے نہ ثبوت۔ آپ نے میرے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ میرا حقیقی بھائی بھی شاید اس سے زیادہ نہ کرتا اور اب براہ کرم یہ آخری درخواست بھی قبول کر لیجئے۔ مجھے جانے دیجئے میں اب یہاں ایک لمحہ بھی نہیں ٹھہر سکتی۔"

میں نے کہا "تاہم یہ تو بتا دو کہ تم جا کہاں رہی ہو؟ اگر خدا کی عنایت سے یہ جھگڑا جلد طے ہوگیا، اور ہو جائیگا

جیسی کہ مجھے امید ہے تو میں جا کر تمہیں واپس لے آؤں گا۔

"بہت خوب،" وہ بولی، "تم اُس لڑکے کو جانتے ہو جو تمہیں اسٹیشن پر لینے گیا تھا؟ اُسے میرا پتہ معلوم ہو جائیگا تم اس سے پوچھ لینا" یہ کہہ کر آہستہ آہستہ بہنے والی ندی کی طرح وہ وہاں سے بڑھی، اور سامنے کے دروازے میں سے باہر نکل گئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ جا کر ایک گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اور بہت جلد نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

منورنجن نے خاموش رہنے کی قسم کھالی۔ وہ برابر گالیاں دیتا رہا اور شور مچاتا رہا۔ میں نے رگھو سے اُس کے پاس رہنے کو کہا اور خود مصور کے مکان کی طرف روانہ ہوا۔ ایک تو جا چکا تھا، لیکن دوسرا ابھی موجود تھا، جسے ان خوفناک واقعات کی بہت بھاری قیمت ادا کرنی تھی۔ میں نے اپنے ساتھ ایک موٹا ڈنڈا بھی لے لیا۔

سامنے کا دروازہ بند تھا بار بار پکارنے اور کھٹکھٹانے کے بعد ایک ضعیف آدمی نے دروازہ کھولا میں نے پوچھا "تمہارا مالک کہاں ہے؟" اُس کا مالک کہیں باہر گیا ہوا تھا اور اُسے معلوم نہ تھا کہ کب تک واپس آئیگا۔ یا وہ لوٹے گا بھی کہ نہیں۔ کیونکہ بعض اوقات وہ ہفتوں باہر رہا کرتا تھا۔ میں نے پھر پوچھا "وہ اپنے ساتھ کوئی سامان بھی لے گیا ہے کہ نہیں؟" لیکن بڈھا اس کا کچھ جواب نہ دے سکا۔ اس لئے میں مجبوراً اپنے گھر واپس آگیا۔

منورنجن نے مجھے بالکل دیوانہ بنا دیا۔ اُس نے کھانے پینے اور سونے سے قطعاً انکار کر دیا۔ اگر میں اسے دوا پلانے کی کوشش کرتا تو وہ لکڑی لے کر مجھے مارنے دوڑتا۔ رگھو اس کے قریب جانے سے بھی گھبراتا تھا چونکہ میں تمام دن اُس کی حفاظت کے لئے گھر میں نہ بیٹھ سکتا تھا۔ اس لئے مجبوراً مجھے اس کے اعزہ کو لکھنا پڑا۔ چند روز کے بعد منورنجن کے چچا زاد بھائی آکر اُسے لے گئے۔

منورنجن کی طرف سے اطمینان ہو جانے کے بعد میں نے سروجا کی تلاش شروع کی۔ میں اُس لڑکے کے پاس گیا جس سے ملنے کے لئے سروجا نے مجھ سے کہا تھا۔ لیکن اُس نے بتانے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کے دوسرے رشتہ داروں نے بھی یہی کہا کہ انہیں کچھ معلوم نہیں۔ اگرچہ اُن کے چہرے حقیقت کا اظہار کر رہے تھے لیکن میں ان کو سچ کہنے پر مجبور نہ کر سکتا تھا۔ میں نے اُن سے ہزار کہا کہ میں سروجا کا ایک خیر خواہ دوست ہوں اور اُس کا پتہ دریافت کرنے سے میرا مقصد محض اس سے ہمدردی کرنا ہے، مگر وہ سب پتھر کی طرح ساکت رہے۔

میں اُس کی تلاش میں پیہم مصروف رہا۔ میں نے اخباروں میں اشتہار دیا، سراغ رساں مقرر کئے لیکن کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا۔ آخر کار کچھ عرصے کے بعد مجھے مایوس ہو کر سب تدابیر ترک کر دینی پڑیں۔ میں اپنے آپ کو ہر وقت کام میں مصروف رکھنے کی کوشش کرنے لگا تاکہ یہ سب کچھ بھول جاؤں، لیکن گھر کے ویران کمروں کو دیکھ کر میرے دل میں ایک

درد اُٹھنے لگتا تھا۔ اس قلیل عرصے میں سروجا مجھے اپنی بہن کی طرح عزیز ہو گئی تھی۔

تقریبًا ایک مہینہ گذر گیا۔ اب میں واقعات کو کچھ کچھ بھُولنے لگا تھا، مگر اچانک ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے ان دردانگیز حالات کی پوری تاریخ پھر میرے دل میں دہرادی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک روز صبح کی ڈاک سے کچھ خطوط منورنجن کے نام وصول ہوئے۔ میں ان کو منورنجن کے پاس بھیجنے ہی والا تھا کہ یکایک ایک خیال نے مجھے ان کے کھولنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے سوچا وہ ایک قابلِ رحم مریض ہے اُس کو وکیلوں اور قرضخواہوں کے تقاضوں سے پریشان نہ کرنا چاہئے۔

لیکن تم نہیں سمجھ سکتے کہ میری حیرت کی کیا کیفیت تھی جب میں نے لفافوں میں نوٹسوں اور بلوں کی بجائے قرض کی وصولی کی رسیدیں دیکھیں کسی نے پوشیدہ طور پر منورنجن کا سارا قرض ادا کر دیا تھا۔

ایک خوفناک شک میرے دل میں پیدا ہو گیا۔ کیا یہ سروجا تو نہیں؟ اگر وہ نہیں تو اور کون ہے جس نے اس ناکارہ اور قریب المرگ انسان کے لئے اتنی مصیبت برداشت کی ہے؟ کیا اُسی نے اپنے شوہر کا قرض ادا کرنے کے لئے اپنی زندگی قربان کر دی تھی؟ کیا کوئی وفا شعار عورت ایسا کر سکتی تھی؟ شاید وہ کر سکتی تھی۔ میں حیران تھا کہ سروجا کی اس حرکت کو گناہ کہوں یا قربانی۔ مگر اُس نے اپنے شوہر کو قرض کے عذاب سے نجات دلانے کے لئے اپنی عصمت تو یقینًا فروخت نہ کی ہوگی۔ مجھے اس وقت اس کی وہ بے چینی یاد آ گئی جو میں نے کئی دفعہ اُس کے حسین چہرے پر دیکھی تھی۔ کیا وہ کسی قلبی کشمکش کا نتیجہ تھی؟ خدا کے سوا اور کوئی نہ جانتا تھا۔

بہرکیف میں نے ان خطوط کو منورنجن کے پتہ پر روانہ کر دیا۔ اور خیال کیا کہ منورنجن کو اب کچھ سکون حاصل ہو جائے گا اور وہ بھی اس دریادل مددگار کی اعانت کو تعجب کی نظر سے دیکھے گا۔ شاید وہ خیال کرے کہ یہ سب قرض میں نے ادا کر دیا ہے۔ اس کے بعد بہت دن گزر گئے اور عدالت اکتوبر کی تعطیلات میں بند ہو گئی۔ میرے دوست احباب جو اپنے بیوی بچّوں کے ساتھ رہتے تھے، اپنے اپنے گھروں کی پُرلطف زندگی میں مستغرق ہو گئے۔ مجھے گھر میں تنہا بیٹھا رہنا اچھّا معلوم نہ ہوتا تھا۔ میں تمام دن اِدھر اُدھر گشت لگایا کرتا تھا۔ اس اثنا میں کئی کانفرنسیں اور جلسے ہوئے اور اس لئے میرا وقت بآسانی گزر جاتا تھا۔

ان تمام جلسوں کے ساتھ ساتھ ایک نمائش بھی منعقد کی گئی تھی۔ میں بھی ایک روز اپنے ایک دوست کے ساتھ دیکھنے کے لئے گیا۔ جہاں یہ نمائش ہو رہی تھی۔ وہ جگہ میرے مکان سے کافی فاصلہ پر تھی اس لئے ہم نے ایک موٹر کرایہ پر لے لی۔

نمائش گاہ میں لوگوں کا ہجوم زیادہ نہ تھا۔ اس لئے ہم نہایت اطمینان سے تصاویر وغیرہ دیکھتے پھر رہے تھے۔ آہستہ آہستہ ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ یکایک میں نے اپنے دوست کو اپنا نام لے کر پکارتے سنا۔ میں اُس کے پاس گیا اور پوچھا "کیا بات ہے؟"

اُس نے ایک تصویر کی طرف اشارا کرتے ہوئے کہا "اس تصویر کو دیکھو۔ کیا تم نے کل نہیں کہا تھا کہ ہندوستانی مصوّر اچھی تصویر نہیں بنا سکتے؟ کیا یہ تصویر شاندار اور جاذب نظر نہیں ہے؟ اگر یہ تصویر انگلستان میں ہوتی تو ہزاروں آدمی اسے دیکھنے کے لئے آتے۔

میں مشکل سے اُس کی باتیں سن رہا تھا۔ میں نے بڑے خوف اور وحشت سے اس تصویر کو دیکھا۔ اس کا نام "ستی" تھا۔ اس میں ایک سنسان دریا کے کنارے ایک بڑی سی چِتا جل رہی تھی اور اُس کے بیچ میں ایک عورت اپنے شوہر کی نعش اپنی گود میں لئے ہوئے بیٹھی تھی۔ عورت کا چہرہ سروجا کا چہرہ تھا۔ اور وہ بے چینی اور تکلیف جو میں نے بارہا اُس کے چہرے پر دیکھی تھی، پردہ کی تصویر پر صاف نظر آرہی تھی۔ وہ ایک دیوی معلوم ہو رہی تھی۔ مصوّر کا نام بھی آشنا سا تھا۔ یہ میرے ہمسایہ مصوّر کا نام تھا۔

میرے دوست نے مذاق سے کہا "تم تو معلوم ہوتا ہے اس میں گڑ گئے ہو۔ کیا یہ قابلِ قدر نہیں ہے؟ اگر میرے پاس روپیہ ہوتا تو میں ضرور اسے خرید لیتا۔ . . لیکن یہ تو پہلے ہی کسی مہاراجہ کے ہاتھ چار ہزار میں فروخت ہو چکی ہے"۔

میں نے کہا "ہاں، نہایت دلکش اور خوبصورت ہے۔ اس میں کوئی ہرج تو نہیں اگر میں تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں۔ مجھے کچھ سستی اور حرارت سی محسوس ہو رہی ہے"۔ اور بغیر جواب کا انتظار کئے میں وہاں سے چل دیا۔

نمائش سے تعلق رکھنے والے بعض سربرآوردہ لوگوں سے میں واقف تھا۔ اور اُن کی مدد سے میں نے جلد اُس مصوّر کا پتہ معلوم کر لیا۔ میں نے اپنے دماغ میں ایک لرزا دینے والی تقریر ترتیب دی اور اُس کے گھر کی طرف روانہ ہؤا۔

وہ اُس وقت چا ختم کر چکا تھا اور سگرٹ سلگا رہا تھا جب میری غیر معمولی آمد نے اُسے چونکا دیا۔ وہ سگرٹ پینا بھول گیا اور مجھے خاموشی سے گھورنے لگا۔ میں نے جھک کر سلام کیا اور پوچھا "کیا آپ مجھے پہچانتے ہیں؟ آپ کسی زمانہ میں میرے ہمسائے رہ چکے ہیں"۔

اُس نے اپنے پراگندہ ہوش وحواس یک جا کرتے ہوئے کہا "اوہ! کیا وہ آپ ہی ۱۵ نمبر کان میں رہا کرتے تھے؟ اس عزت افزائی کی وجہ کیا ہوسکتی ہے؟"

میں نے کہا "میں نے آپ کی تصویر "ستی" نمائش میں دیکھی ہے۔ بلا مبالغہ ایک کامیاب تصویر ہے میں اُسے دیکھ کر آپ سے ملاقات کئے بغیر نہ رہ سکا۔"

اُس نے مجھ پر ایک مشکوک نگاہ ڈالی اور چپ رہا۔ میں نے پُوچھا:

"لیکن کیا آپ کو دوسرا نمونہ نہ مل سکتا تھا؟ آپ نے ایک غریب آدمی کا گھر کیوں تباہ کیا؟"

اب مصوّر نے اپنے جذبات اور ہوش وحواس پر قابو پالیا تھا۔ اُس نے بے پروائی سے کہا "ہاں مجھے دوسرا نمونہ مل سکتا تھا۔ مگر "ستی" کے لئے نہیں ـــــ لیکن جناب میں نے گھر کس کا تباہ کیا؟ آپ مجھے کس بات کا مجرم ٹھہراتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اُس نے آپ سے یہ تو نہ کہا ہوگا کہ میں نے اُس کی خدمات کا مناسب معاوضہ نہیں دیا۔"

میں نے غضب ناک لہجہ میں کہا "اس قدر معصوم بننے کی کوشش نہ کرو۔ زر کھوئی ہوئی عزت کو واپس نہیں لاسکتا۔

وہ ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا اور چلّا کر بولا "سنئے میں لغو اور مہمل باتوں میں اپنا وقت ضائع نہیں کرسکتا۔ اگر آپ یہ ثابت کرسکتے ہیں کہ میں نے اس کے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی، یا اُس کے مرتبہ سے کوئی گری ہوئی بات کی ہے یا یہ کہ میں نے اسے موعودہ معاوضہ نہیں دیا تو میں آپ کی باتیں سننے کے لئے تیار ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مجھے اس معاوضہ کے عوض اُسے سخت تکلیف دینی پڑی، لیکن وہ خود اس کے لئے رضامند ہوگئی تھی۔

"تکلیف؟" میں نے خوف وہراس سے پُوچھا۔ کس قسم کی تکلیف؟"

"خیر اگر آپ جاننا ہی چاہتے ہیں تو مجھے بتانے میں کوئی عذر نہیں۔ میں اُس کے چہرہ پر انتہائی رنج اور تکلیف کے آثار نمایاں کرنا چاہتا تھا، اور اس لئے مجھے اُس کی پشت گرم لوہے سے داغنا پڑتی تھی۔"

میں یہ سُن کر خوف و دہشت سے تقریباً بدحواس ہوگیا۔ میں یہ خیال بھی نہ کرسکتا تھا کہ موجودہ تہذیب یافتہ زمانے میں ایسا ظلم بھی جائز سمجھا جاسکتا ہے۔ آہ غریب ہرو جا! ہم اُس کے پاؤں کی خاک بھی بننے کے قابل نہ تھے چہ جائے کہ ہم نے اُس کے ان محبت آمیز افعال کو قانون کی نظر سے دیکھنا چاہا اور اسے مجرم قرار دیا۔

وہاں اب زیادہ دیر ٹھہرنا میرے لئے ناممکن تھا۔ میں یہ کہتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا "قانون مجھے اس کا حق

نہیں دیتا ورنہ میں تبر سے اس اعلیٰ درجہ کے مصورانہ دماغ کو اس ڈنڈے سے پاش پاش کر دیتا۔ میں ایسا ضرور کروں گا خواہ مجھے قید ہی میں کیوں نہ جانا پڑے، مگر ابھی مجھے اس سے کئی گنا اہم ایک اَور کام سرانجام دینا ہے اس لئے میں رخصت ہوتا ہوں۔"

اُس نے ایک بے کیف تبسّم کے ساتھ اپنے ہونٹوں کو جنبش دی اور میں وہاں سے چلا آیا۔

سرینیدر ٹھہر گیا اور پھر اُس نے تھوڑی دیر کے بعد پوچھا "کیا تم کہہ سکتے ہو کہ یہ لڑکی ستی نہ ہو گئی ہوگی"

ابانی نے جواب دیا "نہیں میں نہیں کہہ سکتا۔ مگر یہ واقعہ ایسا عجیب و غریب ہے کہ سچ نہیں معلوم ہوتا"

سرینیدر نے کہا "ہاں ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ داستان اپنی تمام المناکیوں کے ساتھ سچی ہے۔"

ابانی نے پوچھا "مگر کیا سروجا کو تم نے اس کے بعد کبھی نہیں دیکھا؟"

سرینیدر نے کہا "دوست، تم ہمیشہ ایک مسرتناک انجام کے متمنی رہتے ہو۔ تمہاری ذہنیت بالکل ایک مدرسے میں پڑھنے والی لڑکی کی سی ہے ۔۔۔ مگر ہاں ہم نے سروجا کا پتہ لگا لیا۔"

محشر عابدی

تڑکا

ہوا کا ایک تیز جھونکا دریا پر سے ہو کر آیا اور بولا "اے کہرا میرے لئے رستہ چھوڑ!"

جہازوں کے بادبانوں میں گھستے ہوئے پکارا "اے ناخدا! رات ختم ہو گئی، جہاز کے لنگر اُٹھاؤ"

تمام روئے زمین پر سے چادر ہٹاتے ہوئے آواز دی "اے نیند کے متوالو! اُٹھو!"

جنگل کی طرف آیا اور درختوں کے کان میں کہا "اپنے سبز جھنڈوں کو ہوا میں لہراؤ!"

گھونسلوں میں داخل ہو کر پرندوں کے پروں کو چھوتے ہوئے بولا "اے پرندے اُٹھ! اور اپنے چہچہوں سے سارے بن کو سر پر اُٹھا لے!"

سبزہ زاروں میں آواز دینے لگا "او مرغِ سحر! پروں کو پھڑپھڑا اور قرنا پھونک! کیونکہ صبح کی ملکہ رونق افروز ہوا چاہتی ہے!"

کھیت کے پودوں سے سرگوشی کی "اپنے طروں کو خم کرو اور صبح کی ملکہ کی خدمت میں تسلیم بجا لاؤ!"

گھنٹہ گھر میں پہنچ کر آواز دی "اے گھنٹے! چونک اور سحر کی آمد کا اعلان کر!"

مگر جب شہرِ خموشاں پر سے گذرا تو ٹھنڈا سانس بھر کر بولا "نہیں ابھی نہیں! تم ابھی سوتے رہو!"

سیّد بادشاہ حسن

(لانگ فیلو)

غزل

حیاتِ انساں کی سرتا پا زیاں معلوم ہوتی ہے
یہ دنیا انقلابِ آسماں معلوم ہوتی ہے

مکدّر ہے خزاں کے خوف سے عیشِ بہارِ گل
خزاں کی رُت بہارِ بے خزاں معلوم ہوتی ہے

مجھے ناکامیِ پیہم سے مایوسی نہیں ہوتی
ابھی امید میری نوجواں معلوم ہوتی ہے

کوئی جب نالہ کرتا ہے کلیجا تھام لیتا ہوں
فغانِ غیر بھی اپنی فغاں معلوم ہوتی ہے

کمالِ درد و غم دیکھو، صدائے سازِ عشرت بھی
اُتر جاتی ہے جب دل میں فغاں معلوم ہوتی ہے

چمن میں عندلیبِ زار کی فریاد اے اختر
دلِ ناداں کو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے

اختر
انصاری دہلوی

جذبات

جان دینا مرا ہنسی ہی سہی | دل لگی ہے تو دل لگی ہی سہی

رو دیئے آپ انتہا یہ ہے | عشق کی ابتدا ہنسی ہی سہی

آپ تو اپنے وعدے سے نہ پھریں | میری تقدیر میں کجی ہی سہی

تشنہ کامیِ شوق تو دیکھو | دیدۂ تر نمائشی ہی سہی

آزمائش ہے ظرفِ واعظ کی | میرے حصّے میں کچھ کمی ہی سہی

شکوۂ ربطِ غیر کیا معنی؟ | ہم نے مانا کہ دوستی ہی سہی

میری بیچارگی کی داد تو دو | تم سزاوارِ بندگی ہی سہی

نہ بجھاؤ مرا چراغِ وفا | رونقِ بزمِ مدّعی ہی سہی

اپنی ہستی کی کچھ خبر ہے تپش

نہ سہی بےخودی ہی سہی

عبداللطیف تپش

منظر کا خواب

منظر کے لبوں پر تبسم کھیل رہا تھا۔ وہ اچھلتا کودتا لارنس گارڈن سے واپس آرہا تھا۔ آج اُس کی نویں سالگرہ تھی اور امّاں نے اُسے نئی اچکن پہنائی تھی۔ اس پر بڑے بڑے سرخ پھول تھے، جن کو دیکھ دیکھ کر وہ پھولا نہ سماتا تھا۔ اُس کا ننھا سا دل جوش سے پُر تھا، اور لمبی لمبی پلکوں والی سیاہ آنکھیں چمک رہی تھیں، کیونکہ آج شام کو اس نے اپنے سب دوستوں کو چائے پر مدعو کیا تھا۔ جب وہ اُس خوبصورت سالگرہ کے کیک کا خیال کرتا جو اُس کے ابّا جان نے بنوایا تھا تو اُس کے نازک لب گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح کھل جاتے "کیک پر چھوٹے چھوٹے خرگوش اور تلیاں بنی ہیں،" اُس نے اپنے دل میں سوچا۔ "اور نیلے حرفوں میں میرا نام لکھا ہے۔ سب بچّے دیکھ دیکھ کر رشک کریں گے۔ کتنا پیارا کیک ہے۔ کس قدر میٹھا ہوگا..."

اتنے میں اُس نے کسی کو کہتے سنا۔ "ایک پیسہ دے دیجئے۔ بھوکا ہوں۔ یتیم ہوں۔ اللہ آپ کا بھلا کرے گا۔"

منظر نے مڑکر ایک غریب بچّے کو دیکھا، جو پھٹے پرانے کپڑے پہنے سڑک کے کنارے بیٹھا تھا۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور بادامی آنکھیں جن کے نیچے نیلے حلقے پڑے تھے حسرت کی نگاہ سے منظر کی طرف دیکھ رہی تھیں "صرف ایک پیسہ دے دیجئے۔" اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں پھر التجا کی۔ اور ڈرتے ڈرتے لرزتے ہوئے ہاتھ سے منظر کے پاؤں کو چھوا...

اتنے میں منظر کے نوکر نے آکر کہا "میاں جلدی گھر چلو، یہاں کیوں کھڑے ہو؟" منظر نے بے پروائی سے لڑکے کے ہاتھ کو جوتے سے پرے کر دیا اور خوش خوش گھر کی طرف چل دیا۔

اندھیری رات تھی۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ چاروں طرف خاموشی چھا رہی تھی۔ منظر پھٹے ہوئے کپڑوں میں سڑک کے کنارے بیٹھا سردی کے مارے ٹھٹھر رہا تھا۔ وہ سارے دن کا بھوکا تھا۔ اور اب اس میں اتنی ہمّت نہ تھی کہ گرتا پڑتا تھکے ہوئے پاؤں سے سڑک کی بتّی تک ہی پہنچ جائے۔ یا سرد نیلا ہاتھ اٹھا کر آنکھوں سے آنسو ہی پونچھ لے۔ اُس نے ستاروں کی طرف دیکھا لیکن اُن کی آنکھیں سرد و بے رحم معلوم ہو رہی تھیں...

اُسے نیند آ رہی تھی لیکن ڈر کے مارے سو بھی نہ سکتا تھا . . . سڑک پر دو آدمی گزر رہے تھے۔ منظر نے ناتواں آواز سے کہا "ہائے میری مدد کیجیئے"۔ لیکن انہوں نے سر پھیر لیا اور اُس کی کوئی پروا نہ کی۔

جھاڑیوں میں کچھ آہٹ ہوئی۔ منظر نے مڑ کر دیکھا —— یا اللہ! یہ کیا کالی کالی چیز اس کی طرف آ رہی تھی۔ وہ خوف سے کانپنے لگا۔ زمین گھومنے لگی . . . کالی کالی چیز برابر اُس کی طرف چلی آ رہی تھی۔ اُس نے چاہا کہ اُس طرف نہ دیکھے۔ لیکن اُس کی آنکھیں وہیں جم گئیں۔ ہزار کوشش کی لیکن سر نہ پھیر سکا . . . .

کالی کالی چیز برابر اُس کی طرف چلی آ رہی تھی . . .

کسی نے اُس کے کان میں کہا "تم نے غریب بچے کی مدد نہ کی۔ اب کوئی تمہاری مدد نہ کریگا"

منظر نے مٹھیاں کس لیں اور چاہا کہ زور سے چیخے لیکن ڈر کے مارے اُس کی آواز نہ نکلی . . . کالی کالی چیز برابر اُس کی طرف چلی آ رہی تھی . . . ہائے اب وہ بالکل قریب تھی . . . وہ آئی . . . وہ آئی . . . اور اُس کو پکڑ لیا۔

منظر نے چیخ ماری اور چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ اپنے نرم بستر پر لیٹا تھا۔

اَماں بھاگی بھاگی آئیں۔ اور "میرے چاند تمہیں کیا ہؤا؟ صبح صبح کیوں چیخ رہے ہو" کہہ کر منظر کو گلے لگا لیا۔

منظر نے رو کر کہا "اَماں جان اب میں ہمیشہ غریبوں کی مدد کروں گا"

"کلی"

رباعی

خود کو جو برے سے غم میں مٹا جاتے ہیں
جاتے ہوئے یاد اپنی دلا جاتے ہیں
اچھا ہے اگر جہان فانی تو یہی
اک درد کی دنیا تو بسا جاتے ہیں

فراق

تجلّیات

زیرِ نقاب بھی تو بہت بے نقاب ہو
ہو جاؤ بے نقاب کہ تم آفتاب ہو

ہے فصلِ برشگال میں رندوں کی آرزو
مطرب ہو دَورِ مے ہو شبِ ماہتاب ہو

رحمت کے ابر جھوم کے آئے ہیں مے کشو!
سجدے میں اب گرو کہ دعا مستجاب ہو

اُس مست کیلئے کوئی تعزیر کیوں نہیں؟
بڑھ کر شرابِ ناب سے جس کا شباب ہو

رنگین و پُر بہار گزر جائے زندگی
یہ خواب ہے اگر تو محبّت کا خواب ہو

تسکیں کو رو رہے تھے بہت اضطراب میں
اب دل کو اضطراب ہے پھر اضطراب ہو

زاہد کو کھا گیا ہے اثرؔ مے کشوں کا غم
قسمت اپنی تو کوئی، کسی کو عذاب ہو

اثرؔ صہبائی

شاہانِ سلف کے اعلاناتِ جنگ

علم ادب کی تاریخ میں ایک زمانہ وہ بھی گزر چکا ہے جس میں انتہا درجہ کے اہم کاموں میں بھی نظم سے کام لیا جاتا تھا۔ اعلانِ جنگ کرنا ایسا خطرناک امر ہے کہ اس میں انسان کی ذہنیت خواہ مخواہ طبیعت میں سنجیدگی اور متانت پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن کئی صدیاں عہدِ عروجِ اسلام میں ایسی گزری ہیں کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران اور ترکی میں بھی شعر نگاری کا ایسا غلبہ طبائع پر مسلّط تھا کہ مہلک رسل و رسائل میں بھی اس کے بغیر تسکین نہ تھی اور اظہارِ خیالات کے لئے نظم ہی کو بہترین ذریعہ خیال کیا جاتا تھا۔ اس کی اکثر مثالیں ملیں گی۔ میں محض تفریحِ طبعِ ناظرینِ ہمایوں کے لئے ایک مثال نمونتاً تینوں مذکورہ بالا ممالک سے پیش کرتا ہوں۔

(جلال)

(۱) نامۂ سلطانِ روم بنام نادر شاہ شاہِ ایران۔

اے شبان!

ترا منصبِ پاسبانی گریست — تمنائے شاہنشہی بہرِ چیست
مرا خود بایں لشکر و ایں سپاہ — الم ست و قرآں گواہ
چو خواہی کہ ما را نظارہ کنی — بباید نظر بر ستارہ کنی
اگر آلِ عثماں بساطم دہد — ز دستِ فرنگی نجاتم دہد
چنانت بکوبم بگرزِ گراں — کہ یکسر روی تا بہ ماژندراں

(۲) جوابِ نادر شاہ بہ سلطانِ روم۔

شبانی بدنیا مگر بود عیب — چرا گشت موسیٰ شبانِ شعیب
تو گفتی کہ ما را نظارہ کنی — بباید نظر بر ستارہ کنی
چو صبحِ سعادت نماید طلوع — ستارہ بہ پیشش ندارد رجوع

دو مرد از خراساں سپاہ بہ | دو گرگ از بیابان و پانصد رمہ
عقاب شکاری نترسد ز بوم | دو تن مرد ایراں و دو صد مرد روم
اگر آلِ حیدر دہد رو نظم | بقسطنطنیہ زند بیرقم
چناں ات بتازم ایاز حلب | کہ یکسر گریزی بہ شام و حلب

(۳) سلطان ظہیر الدین محمد بابر شاہِ ہند نے تسخیرِ بیانہ کا قصد فرمایا جو اُس وقت تک (صوبۂ آگرہ) کا صدر مقام اور مستحکم دار النظام تھا تو اُس کے گورنر کے نام بطورِ تنبیہ مندرجہ ذیل دو اشعار (بطورِ قطعہ) لکھ کر بھیجے تھے جن کا آخری مصرعہ مقبولِ عام ہو کر ایک ضرب المثل بن گیا۔ واقعی "عیاں را چہ بیاں"، کو بیانہ کی نسبت سے کیسا خوبصورتی سے کھپایا ہے۔ وہو ہذا

با ترک ستیزہ مکن اے میرِ بیانہ | چالاکی و فرزانگیِ ترک عیان ست
گر بیش نیائی و اطاعت نہ کنی زود | واں را کہ عیان ست چہ حاجت بہ بیان ست

(۴) بابر کے جانشین ہمایوں نے مالوہ کا رخ کیا۔ چتوڑ کا قصد تھا لیکن معلوم ہوا کہ بہادر شاہ والیِ گجرات نے اس کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ ہمایوں اپنا کمپ نصب کر کے نتیجہ کے انتظار میں خاموش ہو رہا۔ اسی دوران میں بہادر شاہ کو حسبِ ذیل قطعہ ارسال کیا اور بہت سخت جواب پایا۔

ہمایوں

اے کہ ہستی غنیمِ شہرِ چتوڑ | کافراں را چہ طور می گیری
بادشاہے رسید بر سرِ تو | تو نشستہ چتوڑ می گیری

بہادر شاہ

من کہ ہستم غنیمِ شہرِ چتوڑ | کافراں را بجور می گیرم
ہر کہ بکند حمایتِ چتوڑ | تو بہ بیں کس چہ طور می گیرم

محمد جلال الدین

غزلیات

(۱)

کٹے جاتے ہیں دل اس ابروئے پیوستہ جوہر سے
کسی بانکے نے کیا خنجر کو ٹکرایا ہے خنجر سے

سند اس کی نہیں پہلو سے اُٹھ کر مسکراتے ہو
مزا جب ہے ہماری گود میں پھولوں کا مینہ برسے

یہی دن ہیں دعا لے لو کسی کے قلبِ مضطر سے
جوانی آ نہیں سکتی مری جاں پھر نئے سر سے

کرشموں نے اگر رہ رہ کے دل پر تیر مارے ہیں
تو غمزے نے بھی اک بھرپور چمکائی برابر سے

عرق آلود میں رخسار سینے پر ذرا رکھ دو
کبھی ہم بھی کلیجہ سینک لیں اس آتشِ تر سے

آغا شاعر دہلوی

(۲)

لے کے دل مجھ سے وہ بیزار بنے بیٹھے ہیں
بھولے بھالے مری سرکار بنے بیٹھے ہیں

رعبِ حسن ایسا ہے محفل میں عدو کیا بولیں
فرطِ حیرت سے وہ دیوار بنے بیٹھے ہیں

راہ چلنا تو ذرا دیکھ کے چلنا اے دل
سنتے ہیں وہ سرِ بازار بنے بیٹھے ہیں

مہرباں کتنے تھے جب دل نہ لیا تھا مجھ سے
لے چکے دل تو دل آزار بنے بیٹھے ہیں

جو ادا اُن کی ہے وہ تیغِ دو دم ہے رونق
آج وہ بزم میں تلوار بنے بیٹھے ہیں

علی حسن رونق

(۳)

اُن کے چہرے سے عیاں رنگِ بہارِ حُسن ہے
حسن خود بیں آپ ہی آئینہ دارِ حُسن ہے

پھر موافق ہو رہی ہیں آسماں کی گردشیں
مائل لطف و کرم وہ تاج دارِ حُسن ہے

اشک کے قطرات میں ہے جلوۂ رنگیں ترا
دیدۂ خونبار گویا ہم کنارِ حُسن ہے

آہ پھر ہونے لگا ہے مندمل زخمِ جگر
میرے پہلو میں یہی اک یادگارِ حُسن ہے

محو ہوں کیفی! خیالِ زلف و رخ میں آج کل
میری آنکھوں میں وہی لیل و نہارِ حُسن ہے

محمد علی کیفی

خمخانۂ ریاض

وعدہ کبھی سچّا کوئی کرتا ہی نہیں ہے — اندیشۂ فردا تو گذرتا ہی نہیں ہے
دامن کی شکن دُور سے لیتی ہے بلائیں — بل یار کے ابرو کا اُترتا ہی نہیں ہے
دل سے تو مرے سینے کے پھر داغ ہی اچھے — کمبخت ابھارے سے ابھرتا ہی نہیں ہے
سب بھول گئے اُس کو ترے عہدِ ستم میں — اب شکوۂ گردوں کوئی کرتا ہی نہیں ہے
جو اُڑنے کی طاقت نہیں رکھتے ہیں قفس سے — پر ایسوں کے صیّاد کترتا ہی نہیں ہے
اک خُم ہے کہ سو بار اُبل جاتی ہے جس سے — اک جام ہمارا ہے کہ بھرتا ہی نہیں ہے
کیا چیز ہے اے بادہ کشو موسمِ گُل بھی — اِس دور میں توبہ کوئی کرتا ہی نہیں ہے
اپنے ستم و جور اسے لاکھ سکھاؤ — درباں سے تمہارے کوئی ڈرتا ہی نہیں ہے
آلودۂ تہمت ہو وہ کیا رنگِ حنا سے — جو ہاتھ کبھی خون سے بھرتا ہی نہیں ہے
الجھن کبھی مٹتی نہیں یہ دل ہے کہ یا رب — گیسو ہے کسی کا کہ سنورتا ہی نہیں ہے
پھسلا ہی کئے اے آہ ملائے تو اثر کو — ڈرتا ہے وہ گردوں سے اترتا ہی نہیں ہے

نکھرا ہوا جب تک نہ کوئی بام پر آوے
رنگِ شفقِ شام نکھرتا ہی نہیں ہے

ریاض

محبّت
(ایک انوکھے نقطۂ نظر سے)

"ساقی"

اے بدنصیب آدم کے بیٹے! تو کیوں رو رہا ہے؟ تجھے بتایا گیا ہے کہ تو وحشی ہے، ظالم ہے خونخوار ہے، تو نے اپنے بھائی کا گلا کاٹ ڈالا اور اُس کے گھر میں آگ لگا دی! تو گمراہ ہے، تجھے تیرے ازلی دشمن شیطان نے ورغلایا ہے!"

تجھے سکھایا گیا ہے۔ کہ "تو عشق کے لئے پیدا ہوا، تیری زندگی الفت ہے، تیرا مقصود محبت ہے، تیرا رہنما خدا ہے"
یہ تیرا استاد کوئی افیمی تھا، یا اس کی ماں ہی ماں تھی باپ کوئی تھا ہی نہیں؟

تجھے شیطان نے ورغلایا؟ خوب! اُس تیز داڑھوں والے شیر کو کس نے ورغلایا کہ سیاہ آنکھوں والی ہرنی

کے بچے کا گلا دبوچے۔

تجھے شیطان نے ورغلایا؟ خوب اُس تیز پنجوں والے شاہیں کو کس نے ورغلایا کہ کبوتر کا سینہ چیرے؟

تو عشق کے لئے پیدا ہوا؟ تیری زندگی انس ہے؟ تیرا مقصود محبت ہے؟ تیری رہنما محبت ہے؟ جھوٹ! محبت صرف اس لئے پیدا کی گئی کہ تو اپنے بھائی کا گلا کاٹ سکے۔ محبت صرف اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ شیر ہرنی کو پھاڑ سکے۔ محبت صرف اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ شاہیں چڑیا کو چیر سکے؟

تیری ماں کو تیرے بھائی سے محبت تھی اُس کا کیا حشر ہوا؟ ہرنی کو اپنے بچے سے محبت تھی اُس کا انجام کیا ہے؟ کبوتری کو اپنے بچے سے محبت تھی اُس کا کیا حال ہے؟

تجھے تیری ماں نے بھائی کا گلا کاٹنے کے لئے نہیں پالا؟ شیر کو شیرنی نے ہرن کے بچے پھاڑنے کے لئے نہیں پالا؟ شاہیں کبوتروں کے سینے چیرنے کے لئے محبت کی گود میں نہیں پلا تھا؟

محبت؟ محبت وحشت ہے! محبت ظلم ہے!! محبت خونخواری ہے!!!

"اور خدا؟" آہ: یہ شیطان سے پوچھو!

نٹشے

"خیالستان"

میں اور تم

تم تیز رفتار، اٹکھیلیاں کرنے والی ندی کی طرح ہو، جب چلتی ہو تو قدم قدم پر رقص، موسیقی اور خندہ پھوٹ پھوٹ پڑتا ہے۔

میں ساحل کی طرح خوددار ہوں ——— تنہا بت بنا کھڑا رہتا ہوں۔ اور تمہاری طرف تکتا رہتا ہوں۔۔۔

میں ایک بہت بڑے طوفانِ باد کی طرح ہوں جو احمقانہ ندی کے ساتھ دفعتہً اُٹھتا ہے اور جوش و خروش کی حالت میں دنیا کو محیط کر لیتا ہے۔ پھر اچانک خود ہی فرو ہو جاتا ہے۔ میں جذبات و احساسات کا ایک بگولا ہوں، کچھ دیر شور مچانے کے بعد فنا ہو جاؤں گا"

لیکن ———

تم ایک برق ہو ——— تیز اور نازک ——— دل کی گہری تاریکی کو پھاڑ دیتی ہو۔ اور ایک منوّر خندہ پیدا کرتی ہوئی غائب ہو جاتی ہو!

"نیرنگِ خیال"

نئی کتابیں

تاریخ الامت حصہ ہفتم۔ مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری کی تاریخ اسلام کا یہ حصہ سلاطین و خلفائے عثمانیہ کے ابتدا سے لے کر آج تک کے حالات پر مشتمل ہے، اور یہ اس کتاب کا آخری حصہ ہے۔ اردو زبان میں غالباً ایک اسلم صاحب ہی کی تاریخ اسلام ہے جسے مکمل کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اسے نہایت محنت اور تحقیق سے اور قومی تعلیمی مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر لکھا ہے۔ پہلے حصوں کی طرح اس حصے میں بھی انہوں نے اختصار سے کام لیا ہے، لیکن جہاں تک سیاسیات کا تعلق ہے تقریباً تمام ضروری واقعات اس میں آگئے ہیں۔ زبان صاف اور سلیس ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ حجم ۱۲۰ صفحے قیمت ایک روپیہ۔ مکتبۂ جامعہ، قرول باغ دہلی سے طلب فرمائیے۔

افاداتِ سلیم، مرتبہ جناب محمد سردار علی صاحب ایڈیٹر تجلّی۔ یہ پروفیسر وحید الدین سلیم مرحوم کے اُن معرکۃ الآرا مضامین کا مجموعہ ہے جن کا تعلق اُردو ادب اور شاعری سے ہے۔ مثلاً ہندوستان کی عام زبان، اصلاحِ زبانِ اردو، ہمارے شاعروں کی نفسیات، سودا کی ہجویہ نظمیں، عہدِ میر کی زبان، میر کی شاعری، دکن میں ایک رباعی گو شاعر اور تلمیحات۔ ان میں سے ہندوستان کی عام زبان اور تلمیحات تو ایسے مضامین ہیں جو ایک مستقل تصنیف کی شان رکھتے ہیں۔ حجم ۲۳۴ صفحے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ پتہ مینیجر تجلّی کتب خانہ مسجد چوک، حیدر آباد (دکن)

گلشنِ گفتار، مصنفہ خواجہ خان حمید اورنگ آبادی مرحوم، جسے مولوی سید محمد صاحب ایم۔ اے نے ترتیب دیا ہے اور شروع میں ایک مبسوط دیباچہ لکھا ہے۔ یہ تذکرہ اب تک شعرائے اُردو کا قدیم ترین تذکرہ شمار کیا جاتا ہے۔ اس میں قدیم دکنی شاعروں کے علاوہ شمالی ہند کے صرف وہ شعرا مذکور ہیں جو ۱۱۶۵ھ میں وسیع شہرت کے مالک تھے۔ حاشیہ میں دوسرے قدیم تذکروں کے بیانات بھی درج کر دیئے گئے ہیں جن سے معلومات میں خاص اضافہ ہوتا ہے۔ شعرائے اردو کے تذکروں میں یہ تذکرہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ حجم ۸۸ صفحات۔ قیمت بارہ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ ابراہیمیہ امدادِ باہمی محدود، اسٹیشن روڈ، حیدر آباد (دکن)

ثریا، مصنفہ محترمہ نذر سجاد حیدر صاحبہ۔ ایک اصلاحی ناول ہے جس میں ہندوستان کی معاشرتی زندگی اور ازدواجی تعلقات کے نقائص بیان کیے گئے ہیں۔ افسانہ مؤثر اور دلچسپ ہے۔ حجم ۱۱۰ صفحات۔ قیمت بارہ آنے۔ مولوی انعام اللہ صاحب ایڈیٹر دورِ جدید لاہور سے طلب فرمائیے۔



نگاہِ لطف کے امیدوار ہم بھی ہیں

چاند (اردو) کے دوسرے نمبر کو ایک ہزار زائد شائع کیا گیا اور تیسرا نمبر اور بھی ایک ہزار بڑھایا گیا۔ مگر نمونہ کی مانگ کے لئے کافی نہ ہو سکا اس سے یہ تو ضرور معلوم ہو گیا کہ پبلک کو "چاند" پسند آیا۔ لیکن چاند کے نور بیز رہنے کے لئے اس کی سخت اور جلد تر ضرورت ہے کہ اس کے مستقل معاونین کی تعداد کافی ہو جائے تاکہ یہ رسالہ اپنے زندہ رہنے کی امید پاکر نور افشانی اور خدمت گزاری ملک و قوم میں بیش از بیش سرگرمی دکھا سکے۔ اس وقت ہم ذیل میں چند علم دوست اصحاب کی معزز آراء کا کچھ خلاصہ دیتے ہیں۔ اس سے پبلک کو چاند (اردو) کے متعلق صدائے تحسین بلند ہونے کا گونہ علم ہو جائیگا اور وہ اس کی خدمات سے مستفید ہونے کیلئے اس کے قائم و باقی رکھنے کی سرپرستانہ کوشش فرمائینگی۔ کیونکہ کوئی رسالہ یا جریدہ جب تک وہ اپنی حیات کی ضمانت نہ پا جائے کبھی مفید خدمت انجام ہی نہیں دے سکتا۔ اور خدانخواستہ اُس کا ابتدائی عمر میں ناکام و معدوم ہو جانا تو اور بھی برا ہے۔ اس سے نہ صرف پبلک کا اعتبار جاتا رہتا ہے بلکہ قوم و ملک کے دامن شہرت پر بھی بدنما دھبا لگتا ہے۔ کہ اس کے تغافل سے ہونہار خدمتگزار پنپ نہیں پاتے۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے ناظرین قدر دانی اور اعانت سے کام لینگے اور بہت جلد چاند کی مستقل اشاعت اس قدر بڑھا دینگے کہ وہ (دور از حال) غروب و زوال کی زد میں نہ آسکے چند آراء کا خلاصہ حسب ذیل ہے:-

ناظرین کی قدر شناسی

حضرت خنجر لکھنوی: خدا اس چاند کو بدر کی طرح مطلعِ صحافت پر درخشاں رکھے۔ مضامین نہایت مفید ہیں۔ میری دلی خواہش ہے کہ خدا آپکو اپنے مفید مقاصد میں کامیاب کرے۔

ڈاکٹر جانکی پرشاد صاحب: چاند بہت ہی عمدہ اور دلچسپ رسالہ نکلا۔"

حضرت ثاقب کانپوری: خدا کرے یہ آج کا دوج آسمانِ ادب پر ہمیشہ چاند بنکر ضو افشانی کرتا رہے۔"

منشی وشنو شنکر صاحب وشنو لکھنوی: "جتنے اردو میگزین اب تک میری نظر سے گذرے آپکا "چاند" سب سے افضل ہے۔"

مولنا کیفی چریاکوٹی: "بہت بڑا کام آپنے کیا ہے۔ ملک و قوم اُسکی عزت کرینگی۔"

ڈاکٹر اعظم کریوی: چاند کی کوشش صنفِ لطیف کی رعایت میں قابلِ ستائش ہے۔

حضرت شباب سیتاپوری: صاف کہتی ہے یہ اس کی روشنی پر ضیا
ہے عوام الناس کی خاطر یہ چشمہ فیض کا
"ضو فشاں دنیا پہ چمکے چاند مثلِ آفتاب"

بابو گریش چند صاحب منصف: "آپ کا چاند سوشیل کمزوریوں کو خلائق کے پیش نظر کرتا ہے۔"

مسز خاور صاحبہ: اردو چاند ہماری جنس کا بہی خواہ ثابت ہوگا۔ (تعریف)

نذیر احمد صاحب علیگ ایڈیٹر کشاف: اصلاح تمدن و معاشرت و خدمت زبان اردو میں یہ رسالہ نمایاں حصہ لیگا۔

حضرت مولنا ناصری مدظلہ: "آپ نے بڑا گرانقدر کام کیا ہے۔"

منیجر صاحب ڈسٹرکٹ گزٹ بجنور: "یہ رسالہ ملک کے لئے بڑا مفید ثابت ہوگا۔"

(بہت سی آراء کا خلاصہ باقی رہ گیا ہے)

ایڈیٹر منشی کنھیا لال ایم اے ایل ایل بی ایڈوکیٹ الہ آباد

چندہ سالانہ آٹھ روپیہ۔ ششماہی پانچ روپیہ۔ فی پرچہ ایک روپیہ۔ نمونہ بلا قیمت نہ جاری ہوگا نام نامی بلا توقف مندرج فہرست خریداران کرا لیجئے۔

چاند (اردو) میں اشتہارات دینا کامیابی کا معقول ذریعہ ہے۔ مفصل کیفیت منیجر دفتر چاند (اردو ایڈیشن) چندلوک الہ آباد سے دریافت کیجئے۔ ٹیلیفون نمبر ۲۰۵۔

خاص نوٹ: مضامین نظم و نثر اور دیگر ایڈیٹوریل مضامین کی مراسلت بنام ایڈیٹر "چاند" (اردو) ہمیں اردو اور فارسی کی کتابوں کی ضرورت ہے پتہ "چاند"

اکمل سرپ یعنی سبز شربت رجسٹرڈ

اس کی پہلی ہی خوراک ہر ایک قسم کی کھانسی کو دبا دیتی ہے۔ کف کو پتلا کرتی ہے۔ بری کھانسی جس کے ساتھ خون بلغم۔ پیپ۔ کف آتا ہو۔ اور ساتھ ہی دم بھی پھولتا ہو۔ اور نیز نزلہ ہو یا زکام۔ خونی دست آتے ہوں۔
ننھے بچوں کی کمزوری کو جو سبز رنگ کے دستوں سے دانت نکالنے کے زمانے میں یا کسی اور سبب سے اور دماغی کام کرنے والوں کو جن کو نزلہ یا زکام اکثر ستاتا ہو۔ سبز شربت کے استعمال سے بالکل آرام ہو جاتا ہے۔ اور زیادہ خوبی یہ ہے۔ کہ ہر ایک طبیعت کے موافق ہے۔ گرم بالکل نہیں ہے۔ بلکہ معتدل سبز شربت بہت ہی خوش ذائقہ اور لذیذ ہے۔ بچوں اور بوڑھوں سب کے موافق ہے۔ کیونکہ ہندوستان کی ادویات سے تیار کیا ہوا ہے۔ ہم دعویٰ سے کہتے ہیں۔ کہ جتنا مفید سبز شربت مذکورہ بالا امراض کو مفید ثابت ہوا ہے۔ دوسرا نہ ہوگا۔ پرچہ ترکیب استعمال ہمراہ ہوگا۔ (قیمت فی شیشی خورد ۶/ر۔ قیمت فی شیشی کلاں عہ/ر۔ علاوہ محصول ڈاک۔

ملنے کا پتہ: منیجر اکمل یونانی شفاخانہ۔ باغیچہ صمد و اکبری دروازہ لاہور



مردہ عزیزوں سے

ملاقات اور بات چیت گھر بیٹھے کر لو

یہ نو ایجاد آلہ سپرٹ ورکنگ پلانچٹ جس کے ذریعہ ہم خود اکیلے ہر ایک سوال کا جواب لے سکتے ہیں۔ ایک امریکن دماغ کی اختراع ہے۔ آلہ کے استعمال میں کسی دوسرے آدمی کی ضرورت نہیں۔ جونسی روح آپ چاہیں آلہ میں حاضر ہو کر آپ کے سوالوں کا جواب درست دیگی۔ معمولی لکھا پڑھا ہر عمر ہر مذہب کا آدمی لے سکتا ہے۔ نہ کچھ پڑھنا پڑتا ہے۔ اور نہ ہی کسی چلہ کشی کی ضرورت ہے۔ عالم بالا کے حالات معلوم کرنا گمشدہ کا پتہ لگانا۔ چوری کا سراغ معلوم کرنا۔ دشمن سے بدلہ لینا۔ مقدمات میں فتح پانا۔ سخت سے سخت حاکم سے حسب منشا کام نکلوانا دور دراز فاصلہ پر ایک سیکنڈ میں خبر بھیجنا۔ حسب دلخواہ نوکری یا روزگار حاصل کرنا۔ بند لفافوں کی عبارت پڑھنا۔ مقفل صندوق یا مکان کے اندر کی اشیاء معلوم کرنا وغیرہ ہزاروں کام ہو سکتے ہیں۔ اس نایاب چیز کا ہر گھر میں ہونا لازمی ہے۔ اصل قیمت پانچ روپیہ لیکن تھوڑے عرصہ کیلئے معہ محصول ڈاک صرف تین روپے آٹھ آنے لئے جاویں گے۔ ہدایات مفت ارسال ہونگی۔ اپنا پتہ صاف انگریزی یا اردو میں لکھیں۔

کیمیکلز سنڈیکیٹ (H) جالندھر شہر (پنجاب)

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۶۳

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگارِ علامۂ فضیلت مآب آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہُمایُوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: منصور احمد

فہرستِ مضامین

جلد ۱۸ — نمبر ۵

بابت ماہِ نومبر ۱۹۳۰ء

تصویر:- بہار

جہاں نما

ترکی سیاسیات

تقریبًا چھ سال کی یک جماعتی حکومت کے بعد ترکی سیاسیات نے پھر بحث کا رنگ اختیار کیا ہے عصمت پاشا کے طریق کار پر بعض ذمہ دار لوگوں کی طرف سے اعتراضات کئے گئے ہیں اور وہ بھی مصطفےٰ کمال صدرِ جمہوریہ کی اجازت سے لیکن ابھی یہ اعتراضات باقاعدہ طور پر پیش نہیں کئے گئے اور ان کی حیثیت فی الحال غیر مرتب شکایات کی سی ہے۔ یہ مخالفت ترکی کے ایک سابق وزیر فتحی بے کے زیرِ اہتمام ترتیب پا رہی ہے اور آیندہ اسمبلی کے اجلاس میں اس کا مظاہرہ ہونے کی امید ہے لیکن عصمت پاشا نے اس مظاہرے سے قبل ہی اپنا جواب اور بریت پیش کر دی ہے، غلط فہمیوں کے ازالہ کے لئے انہوں نے انگورہ سیواس ریلوے کے افتتاح کی تقریب کو موزوں موقع سمجھا کیونکہ مخالفین نے خاص طور پر ان کے ریلوے تعمیر کرنے کی پالیسی کی شکایت کی تھی۔ ان کا خیال ہے کہ عصمت پاشا موجودہ ترکی نسل پر بہت زیادہ بوجھ ڈال رہے ہیں اور ملک کا روپیہ خرچ کر کے اُسے سخت اقتصادی مشکلات میں پھنسا رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں ابھی توقف کرنا چاہئے، ہمیں اُس وقت تک انتظار کرنا چاہئے جب تک کہ غیر ملکی سرمایہ ہمارے اِن عظیم کاموں کو سرانجام دینے کے لئے نہ آجائے۔"

عصمت پاشا کا جواب جو انہوں نے اپنی اس زبردست تقریر میں دیا یہ تھا کہ "انتظار کا نتیجہ جدید ترکی کی ہلاکت ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ مشرقی سرحد پر تین مرتبہ کردوں نے حملہ کیا ہے اور ابھی کل کی بات ہے کہ وہ پھر ہمارے سر پر آپہنچے تھے کیونکہ آمد و رفت کا وہ ذریعہ جس سے ہم ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں ہمارے پاس موجود نہ تھا۔ سات سال گزرے کہ مغربی تہذیب کے یہ مادی ذرائع انگورہ پر آکر ختم ہو جاتے تھے۔ آج وہ سیواس تک پہنچ چکے ہیں، گویا اس سے چھ سو کلو میٹر آگے۔ آج غیر ملکی ریشہ دوانیاں اور وہ شرارتیں جو پانچ سال سے ہماری مشرقی سرحد پر ہو رہی تھیں اپنی آدھی طاقت کھو بیٹھی ہیں اور روز بروز اُن کی طاقت اور کم ہوتی جائے گی۔ ترکوں کو چھوڑ کر ترکی میں کوئی قابلِ ذکر اقلیت ایسی نہیں جسے الگ ایک آزاد قومی حیثیت قائم کرنے کا حق ہو۔ جب ہماری ریل کی سڑکیں مشرقی سرحدوں تک پہنچیں گی تو یہ بات خود بخود ظاہر ہو جائے گی اور کسی کو اس کے ماننے میں تامل یا سازشوں سے متاثر ہونے کی مجال نہ ہوگی۔"

عصمت پاشا نے بتایا کہ سیواس میں ریلوے کی آمد سے ترکی مدافعت ہر سرحد پر پہلے سے دگنی آسان ہوگئی ہے۔ اگر ترکی

پر کوئی حملہ ہوا تو وہ جلد تر اور کم تر نقصانات پر ختم ہو جائیگا۔ ملک کی قوت آج سات سال قبل کی بہ نسبت دگنی ہے قوم نے انگورہ کو صحیح طور پر اپنا دار الحکومت بنایا تھا، لیکن انگورہ اناطولیہ کے مرکز میں نہیں تھا اس لئے ہمارا پہلا فرض یہ تھا کہ ہم یہاں سے مختلف سمتوں میں خصوصاً مشرقی سمت میں ریلوے تعمیر کریں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اس سے ہمیں محض فوجی اور دفاعی فوائد حاصل نہیں ہوئے بلکہ اقتصادی فوائد بھی ہوئے ہیں۔ ترکی کے آباد ترین اور زرخیز ترین علاقے ایک دوسرے کے ساتھ مل گئے ہیں اور دور و دراز مقامات کے فاصلے آدھے رہ گئے ہیں۔ انہوں نے اپنے سامعین کو یاد دلایا کہ جنگِ آزادی کے دوران میں مشرقی سرحدوں سے سامانِ جنگ وغیرہ چھ مہینے میں فوج تک پہنچتا تھا۔ اگر ترکوں کے پاس اس وقت آج کی طرح ریلیں ہوتیں تو دشمن کو کبھی اُن کے ملک میں داخل ہونے اور ان کے ساتھ محض ایک غیر منظم قبیلہ کا سا سلوک کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔

اس خیال کے خلاف کہ ترکی کو ان اخراجات کے اٹھانے میں ابھی توقف کرنا چاہئے تھا عصمت پاشا نے کہا کہ ریلوے قومی اتحاد، اقتصادی کامیابی اور ملکی حفاظت کے لئے ایک لابدی چیز ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس وقت پیشِ نظر کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن قومی اتحاد کے لئے خطرے ہمیشہ چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ غیر متوقع طور پر ظاہر ہو جایا کرتے ہیں ہمیں ان کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہئے۔

انہوں نے پوچھا "کیا تم سمجھتے ہو کہ قوم کے لئے ایک اعلیٰ اور ترقی یافتہ تہذیب کے مقام پر پہنچ جانا بچوں کا کھیل ہے جو یہ بار نہ صرف موجودہ نسل پر پڑا ہے بلکہ ایک سو سال تک آنے والی تمام نسلیں اس سے متاثر ہونگی۔ جدید ترکی اب آگے بڑھ کر پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ ریلوے، آبپاشی اور بجلی پر تین کروڑ پونڈ سالانہ صرف ہوا کریں گے ہم نے اس طرف بے سوچے سمجھے اور جلد بازی میں قدم نہیں بڑھایا بلکہ اس کی ضرورت محسوس کر کے اور دنیا کے سامنے ترکی کی قوت کا ثبوت پیش کرنے کے لئے بڑھایا ہے۔ اگر گزشتہ سات سال میں ایک لمحہ بھی ضائع کیا جاتا تو ہم سب کچھ کھو بیٹھتے اور ترکی پھر قعرِ مذلت میں جا گرتا"

آخر میں انہوں نے اس الزام کی تردید کی کہ ایسے عظیم الشان کام کے لئے قرض حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ انہوں نے سامعین سے پوچھا کہ کیا تم لوگ مجھ کو اتنا ہی احمق خیال کرتے ہو کہ مجھے باہر سے اچھی شرائط پر روپیہ ملتا اور میں اُسے واپس کر دیتا؟ حقیقت یہ ہے آج تک مجھے کوئی ایسا سرمایہ دار نہیں ملا جس نے مجھے قابلِ قبول شرائط پیش کی ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ روپیہ پیش کیا گیا مگر اس کی تہ میں سازشیں کام کر رہی تھیں۔ وہ ملک کے جسم میں زہر پھیلانے کی کوششیں تھیں۔ بعض سرمایہ دار عجیب مضحکہ خیز شرائط پر ترکی کی تعمیر شدہ ریلوے کو اپنے قبضے میں لانا چاہتے تھے ہوشیار رہو اگر تم ایسی غلطی کر بیٹھے تو ترکی قوم ہمیشہ کے لئے تم پر لعنت بھیجا کرے گی۔

مسلم خواتین کی بیداری

حال ہی میں دمشق میں خواتینِ مشرق کی ایک کانگرس منعقد ہوئی ہے جس میں تمام بلادِ اسلامیہ کی عورتیں شامل تھیں۔ اس میں بڑی بحث وتمحیص کے بعد ایک تجویز یہ منظور ہوئی کہ

پردہ منسوخ کر دیا جائے اور عورتوں کو بے نقاب باہر آنے جانے کی اجازت ہو۔

یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ

دولہا اور دلہن کو شادی سے پہلے ایک دوسرے کو دیکھ لینے کی اجازت دی جائے۔

جہیز شادی کے لئے ضروری نہ ہو۔

مسئلۂ طلاق کی اصلاح کی جائے اور خاوند کی طرح بیوی کو بھی اس کا حق دیا جائے۔ موجودہ حالات میں خاوند کو اس معاملہ میں غیر محدود اختیارات حاصل ہیں۔

شادی کے لئے قانونی طور پر کم از کم اٹھارہ سال کی عمر مقرر کی جائے

دونوں اصناف کے بچّوں کے لئے ابتدائی تعلیم لازمی ہو۔

چودہ سال سے کم عمر کے بچوں کو کام میں نہ لگایا جائے۔

عربی تعلیم اور صنعت کو وسیع پیمانہ پر ترقی دی جائے۔

ہندوستان میں مسز شریفہ حامد علی نے مسلم خواتین کے حقوق کے متعلق مندرجہ ذیل شذرہ مؤتمرِ خواتینِ ہند کی ممبروں کو بھیجا ہے جو خواتین اس مجلس میں شامل ہیں میں اُن کی توجہ خاص طور پر اس امر کی طرف مبذول کرنا چاہتی ہوں کہ ایک مسلم خاتون ظلم، بدچلنی وغیرہ وجوہ کی بنا پر نہ صرف اپنے شوہر کو طلاق دے سکتی ہے بلکہ ایک طریق سے تعددِ ازدواج کو روک بھی سکتی ہے: اُسے حق حاصل ہے کہ وہ اپنے نکاح کے معاہدے میں یہ شرط لکھوا لے کہ اُس کا شوہر دوسری شادی نہیں کرے گا۔ تعددِ ازدواج کا خاتمہ ہو جائیگا کیونکہ شرط ٹوٹ جانے پر پہلی شادی منسوخ ہو جائے گی۔

ہمیں چاہئے کہ ہم اسلامی قانون کی تعلیم کو پھیلائیں تاکہ ہر اسلامی شادی کے موقع پر دلہن اور اُس کے رشتہ دار بہ نظرِ احتیاط ضروری شرائط پر مُصر ہو سکیں جس طرح دلہن کو "مہر" کا حق دیا گیا ہے بالکل اسی طرح اسے طلاق کا حق بھی ملنا چاہئے۔ مثلاً ان صورتوں میں کہ (ا) شوہر دوسری شادی کر لے (ب) بیوی پر ظلم کرے (ج) بدچلنی اختیار کرے (د) اُن ازدواجی فرائض کے ادا کرنے سے انکار کرے جو اسلام نے اس پر عائد کر رکھے ہیں۔

عظمائے ثلاثہ کی ضروریاتِ تحفظ

اسلحہ کے متعلق ایک مؤتمرِ عمومی میں برطانیۂ عظمیٰ، فرانس اور جاپان کی ضروریاتِ تحفظ کا خاکا امیر البحر سر ہربرٹ

یورپ میں وسطِ ایشیا کا تعارف

تیرھویں صدی ختم ہو رہی تھی کہ ایک روز شام کے وقت وینس کی خوبصورت بندرگاہ پر ساحلِ لبنان سے واپس آنے والے ایک جہاز سے تین آدمی اتر کر شہر کی طرف روانہ ہوئے۔

اُن کی شکستہ حالی اُن کے پھٹے ہوئے کپڑے، اُن کی عجیب و غریب وضع اُن کے سنولائے ہوئے چہرے غرض ہر چیز ظاہر کر رہی تھی کہ برسوں کے سفر کے بعد وطن کی طرف واپس آئے ہیں۔ ان میں دو معمر تھے جن کی آنکھیں گوناگوں مناظر دیکھ دیکھ کر پتھرائی ہوئی نظر آتی تھیں، اور تیسرا جوان تھا جس کا کشیدہ قامت، دراز زلفیں، سیاہ لمبی داڑھی اور بےچین متجسس نظریں دیکھنے والوں کو بے اختیار اپنی طرف متوجہ کر رہی ہیں۔

چوبیس سال کی طویل مدت کے بعد ان کو وینس کی دلفریبی میں کوئی کمی محسوس نہ ہوتی تھی۔ بازارگاہِ پیاز سے گزرتے ہوئے انہوں نے دیکھا کہ قسطنطنیہ سے آئے ہوئے چاروں عالیشان سنگین گھوڑے اپنی قدیم جگہ پر قائم تھے۔ عکرہ سے آئے ہوئے مرمریں ستون بھی وہیں نصب تھے جہاں یہ لوگ ان کو چوبیس سال قبل چھوڑ کر گئے تھے۔ ریشمی کپڑا بننے والوں، جوہریوں، آئینہ سازوں، عاج تراشوں، شمشیر سازوں اور صیقل گروں کی دکانیں بدستورِ سابق اپنی پوری آب و تاب پر تھیں۔ گرم مسالوں کی تیز خوشبوؤں سے ہوا معطر تھی اور وینس کی منڈی میں جزائرِ شرق الہند سے اِس نئی تجارت کی ابتدا کا پتہ دے رہی تھیں۔ شہر کے اندر بےشمار نہروں پر سینکڑوں کشتیاں مالِ تجارت سے لدی ہوئی دور دراز ممالک سے چلی آ رہی تھیں اور مختلف مقامات پر اپنا مال اتار رہی تھیں۔ ایک جنگی بیڑا جنیوا پر حملہ کرنے کے لئے روانگی کے احکام کا انتظار کر رہا تھا۔

اب آفتاب غروب ہو چکا تھا اور وینس کے خوبصورت چہرے پر تاریکیٔ شب کا نقاب پڑ چکا تھا گر جا بجا نہروں پر کشتیوں کی روشنیاں بےشمار کرمہائے شب تاب کی طرح جگمگا رہی تھیں۔

ہمارے تینوں مسافر فی الحقیقت شہرۂ آفاق تاجرانِ وینس اور سیاحانِ ایشیا موسوم بہ "پولو" ہیں۔ جوان کا نام مارکو پولو ہے اور دونوں بوڑھوں میں سے ایک اُس کا باپ نکولو پولو اور دوسرا چچا میفیو پولو ہے۔ یہ تینوں وینس کی شاہراہوں سے گذرتے ہوئے بالآخر ایک عالی شان مکان کے سامنے ٹھہرے۔ انہوں نے اپنی

قیام گاہ کو پہچان کر اندر داخل ہونا چاہا مگر نوکروں نے اُن کو دروازے ہی پر روک دیا۔ اِدھر یہ باآواز بلند مکان پر اپنی ملکیت کا دعویٰ پیش کر رہے تھے اُدھر نوکروں کو انکار پر اصرار تھا۔ ہمسائے بھی یہ شور وغل سُن کر جمع ہو گئے۔ اُن کی چوبیس سال کی غیر حاضری کے دوران میں ان کا ایک دور کا رشتہ دار اُن کے مکان پر قابض ہو چکا تھا اس شور وشغب نے اُس کو بھی اس ہنگامہ کی طرف رجوع کیا۔

"مارکو تو سترہ سال کا ایک لڑکا تھا۔ یہ شخص جس کو تم مارکو بتاتے ہو چہل سال معلوم ہوتا ہے"

"ہم کو وینس چھوڑے چوبیس سال ہو چکے ہیں، کیا اس عرصہ میں مارکو کو چہل سال نہ ہو جانا چاہئے؟"

"چوبیس سال تک تم کہاں دھکے کھاتے رہے کہ آج یہاں آکر مکان کے دعوے دار بنتے ہو؟"

اس سوال کے جواب میں مارکو پولو نے اپنی طویل سیاحت کا ذکر کرتے ہوئے بیسیوں لمبے شہروں کے نام لئے جو وینس کے باشندوں کے لئے پرستان کے شہروں سے کچھ کم عجیب وغریب نہ تھے۔ مگر جب انہوں نے غیر ممالک میں سفر کرنے کے پروانے دکھلائے اور بدخشاں کے لعل اور ترکستان کے یاقوت اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کئے تو مکان کے اندر داخل ہونے کی اجازت مل گئی۔

چند ہی روز میں تمام وینس ان سیاحوں کی حیرت انگیز داستانوں سے گونج رہا تھا۔ ملّاحوں، قلیوں، دباغوں نداؤں میں شب و روز یہی چرچے تھے۔ ایک ایک واقعہ بار بار بیان کیا جاتا تھا۔

"میاں کچھ اَور بھی سنا؟ یہ لوگ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے ایسی بھیڑیں دیکھی ہیں جن کی دُمیں بیس بیس سیر کی ہوتی ہیں!"

"بھئی ہمیں تو یقین آتا نہیں۔ یہ بھی تو بیان کرتے ہیں کہ چین میں لوگ زمین سے پتھر کھود کر جلاتے ہیں۔ تاتاری اپنے محلات کو پہیوں پر لڑھکاتے پھرتے ہیں۔ نمک کا پہاڑ انہوں نے بچشم خود دیکھا ہے اور ایسے چشمے دیکھے ہیں جن کا پانی تیل کی طرح جلتا ہے۔ ایسی اُون دیکھی ہے جو آگ میں جلتی نہیں۔ ایسے سانپ دیکھے ہیں جو تیس تیس فٹ لمبے ہوتے ہیں"

"کل تو ان میں سے ایک بیان کر رہا تھا کہ چین میں گرم شراب پیتے ہیں"

"مگر ان میں سب سے زیادہ حیرت خیز وہ واقعات ہیں جو یہ خاقانِ چین کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ اُس کے پاس لاکھوں سپاہی ہیں۔ اُس کے باغات لاکھوں میل میں پھیلے ہوئے ہیں۔ لاکھوں خادم اُس کی خدمت کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ ہر چیز لاکھوں کی تعداد میں اُس کے پاس موجود ہے۔ اُس کی عظمت کا معیار یہ بتایا جاتا ہے

کہ تمام سلطنت میں صرف بارہ آدمی اُس کی ملاقات کا شرف حاصل کر سکتے ہیں۔ مارکو کہتا ہے کہ خاقان نے اُس کو اپنا سفیر بنا کر مختلف ممالک میں بھیجا۔ اور پھر ایک شہر کا حاکم مقرر کیا"۔

جب لوگوں کا اشتیاق حد سے تجاوز کر گیا تو ایک روز انہوں نے باشندگانِ وینس کو دعوت دی، اور اس تقریب پر اپنے مکان کو خوب آراستہ کیا۔ لوگ کھانا کھانے کے لئے ہاتھ دھو چکے تو تینوں سیاح ایک شہ نشین پر لوگوں کے سامنے قرمزی ساٹن کی قبائیں پہن کر نمودار ہوئے۔ پھر ان کو اتار کر قینچی سے پارہ پارہ کر ڈالا اور ٹکڑوں کو حاضرین میں تقسیم کر دیا۔ اس کے بعد قرمزی رنگ کی حریری قبائیں پہن لیں۔ پھر ان کو بھی چاک چاک کر کے ان کے ٹکڑے سب میں تقسیم کر دیئے۔ اس دفعہ انہوں نے نہایت خوبصورت مخمل کی قبائیں زیبِ تن کیں لیکن تھوڑے سے وقفہ کے بعد ان کو بھی کاٹ کر دھجیاں کھانا کھانے والوں میں بانٹ دیں اور خود وینس کے رائج الوقت لباس میں ملبوس ہو گئے۔ لوگ کھانے سے فارغ ہو چکے تو ہمارے تینوں سیاح پھر کمرے کے اندر آ گئے اور وہی پھٹے پرانے عجیب الوضع کپڑے پہن کر نمودار ہوئے جن کو وہ جہاز سے اترتے وقت پہنے ہوئے تھے۔ حاضرین کے استعجاب کی انتہا نہ رہی۔ جب انہوں نے ان کپڑوں کی سلائیاں چاقو سے کھول ڈالیں اور اُن کی تہوں سے لعل ہائے درخشاں سینکڑوں کی تعداد میں بکھر گئے۔ یہ جواہرات اس خوبی سے تہوں کے اندر سلے ہوئے تھے کہ ایک لمحے کے لئے بھی کسی کو یہ شبہ نہ ہو سکتا تھا کہ ان گدڑیوں میں اس قدر لعل پوشیدہ ہونگے۔ اس دعوت نے آخر پوری طرح ثابت کر دیا کہ یہ لوگ واقعی وینس کے جوہری پولو ہیں۔ مگر لوگوں نے مارکو پولو کے اِس بیان پر مشکل سے اعتبار کیا کہ یہ بے شمار اور بیش بہا جواہر اس طرح حاصل ہوئے تھے کہ جو دولت قبلائی خان نے ان کو عطا کی تھی وہ انہوں نے جواہرات کی شکل میں تبدیل کر لی تاکہ اس کا لے جانا دشوار نہ ہو۔

لباس اور جواہرات کی اس نمائش کے بعد مارکو نے اپنے سفر کے تحیر خیز واقعات تفصیل کے ساتھ یوں بیان کئے ہونگے کہ وہ یورپ کا پہلا باشندہ ہے جس نے ایشیا کے وسیع طول وعرض میں اِدھر سے اُدھر تک سفر کیا، کوہستانِ پامیر کے خطرناک دروں کو عبور کیا، بارہا خونخوار خانہ بدوش اقوام سے جان بچا کر لے گیا، بدخشاں کی سنسان گھاٹیوں سے گذرا اور صحرائے گوبی کے بے آب ودانہ میدانوں کو پامال کیا۔

اس کے بعد مارکو نے الف لیلہ کے بغداد، پُر اسرار منگولیا، ختن کے جواہر خیز دریاؤں، افغانستان کی بلند سطوحِ مرتفع وغیرہ ایسے امور کے متعلق ذکر کیا ہوگا جن سے اُس وقت یورپ کے لوگ قطعاً ناآشنا تھے۔

پھر مارکو نے تبت کی گندگی، جاپان کی غرابت، برہما کے مندروں اور ہندوستان کے جواہرات کی کانوں

کے متعلق عینی شہادت پیش کی ہوگی۔

پھر اُس نے چین کے بڑے شہروں، چوڑے دریاؤں اور عجیب پیداواروں کا ذکر کیا ہوگا۔ سب کے بعد یہ بھی ضرور بتایا ہوگا کہ قبلا۔ئی۔خاں دنیا کا سب سے بڑا اور با اقتدار بادشاہ ہے جس کی وسیع سلطنت تمام ایشیا پر دیلائے والگا سے دریائے زرد تک اور سائیبریا کے برفانی میدانوں سے پنجاب کے زرخیز میدانوں تک پھیلی ہوئی ہے۔

"جب یہ خاقان شکار کے لئے جاتا ہے تو دو امیر اُس کے ہمرکاب ہوتے ہیں۔ اور اُن میں سے ہر ایک کے ماتحت دس ہزار سپاہی ہوتے ہیں۔ اِن فوجوں میں سے ایک سرخ وردی پہنے ہوتے ہوتی ہے اور دوسری اُودی۔ جب خاقان کی سواری روانہ ہوتی ہے تو ان امیروں میں سے ایک مع اپنے دس ہزار سپاہیوں اور پانچ ہزار کتوں کے داہنی طرف ایک قطار بنا کر چلتا ہے۔ اور دوسرا اسی طرح بائیں طرف چلتا ہے۔ یہ دونوں فوجیں شانہ سے شانہ ملائے پورے ایک دن کی مسافت میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں اور کوئی جانور ایک دفعہ ان کے حلقے میں آکر پھر باہر نہیں جاسکتا۔ ایسے موقع پر اس شکار کے جلوس کا شان وشکوہ قابل دید ہوتا ہے۔ ایک طرف کتوں کا ایک غول کسی ریچھ کے پیچھے بھاگا جاتا ہے۔ دوسرا غول ایک کالے ہرن کو گھیر رہا ہے۔ خود خاقان ایک لکڑی کی عالی شان عماری پر سوار ہے جس کو چار ہاتھی اپنی پشت پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ عماری کی سنہری دیواریں سورج کی روشنی میں دیکھنے والوں کی نظروں کو خیرہ کر رہی ہیں۔ خاقان کے پاس ایک درجن بڑے بڑے شکاری باز عماری کے اندر موجود ہیں جوں ہی شکار نظر آیا بادشاہ نے عماری کی چھت کھلوا کر ایک باز اُڑایا اور بادشاہ کی نظروں کے سامنے شکار پکڑا گیا۔"

اسی رات مارکو نے مندرجہ ذیل حکایت بھی بیان کی ہوگی جس کی وجہ سے اُس کے تمام سابقہ بیانات ناقابلِ یقین قرار دیئے گئے ہونگے۔

"خاقان کے محل کے گرد جو پیکن میں واقع ہے دیواروں کی ایک بھول بھلیاں ہے۔ جو درحقیقت ایک چینی چیستان کی طرح ناقابلِ فہم ہے۔ بیرونی دیوار کے ایک ایک ضلع کا طول آٹھ آٹھ میل ہے۔ اس دیوار اور خندق اور اندرونی دیوار کے درمیان چھاونی ہے۔ دوسری دیوار کے اندر آٹھ بڑی بڑی عمارتیں ہیں جن میں سامانِ حرب رکھا جاتا ہے۔ مثلاً ایک میں زین لگام ورکاب اور دیگر نیزہ بازی کا سامان رہتا ہے اور دوسری میں تیر کمان ترکش زرہ تیر اندازی کا سامان اور کچھ اور متفرق چیزیں۔ دوسری دیوار کے بعد ایک تیسری ۲۵ فٹ اونچی دیوار حائل ہے جس کے اندر آٹھ عمارتیں ہیں۔ ان میں بادشاہ کا توشہ خانہ رہتا ہے۔ اس تیسری دیوار کے پیچھے

ایک چوتھی دیوار ہے جس کے اندر شاہی محلات ہیں۔ یہ محلات اپنی عظمت کے لحاظ سے صفحۂ عالم پر عدیم المثال ہیں اور سنگِ مرمر کی ایک بلند اور وسیع کرسی پر تعمیر کئے گئے ہیں۔ محل کے کمروں کی دیواروں پر طلائی ملمع کیا گیا ہے اور پتھر تراش کر اژدھوں، درندوں، چڑیوں، سپاہیوں کی شکلیں اور گوتم بدھ کی مورتیں بنائی گئی ہیں۔ اسی طرح مرتفع چھتیں بھی روپہلی اور سنہری بیل بوٹوں سے مرصع ہیں، اور محلات تک پہنچنے کے لئے ہر طرف مرمریں زینے بنے ہوئے ہیں۔

"ان محلات کے سب سے بڑے ہال کی وسعت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ خاقان اس ہال میں چھ ہزار مہمانوں کو ایک وقت میں کھانا کھلا سکتا ہے۔ اس ہال کے چاروں طرف بے شمار چھوٹے چھوٹے ہال اور کمرے بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک طرف کے کمرے صرف بادشاہ کے خزانے رکھنے کے کام آتے ہیں، جن میں سونے چاندی کی اینٹیں اور برتن، جواہرات اور موتی، بیویاں اور لونڈیاں رہتی ہیں۔ محل کی چھتوں پہ باہر کی طرف سرخ، سبز، فیروزی اور بنفشئی روغن بھرا ہوا ہے۔ سورج کی شعاعوں کے انعکاس سے یہ چھتیں بلور کی طرح چمکتی ہیں اور میلوں کے فاصلے سے نظر آتی ہیں۔ اسی طرح کھڑکیوں کے شیشے بھی اسی قسم کی رنگ آمیزی سے سجائے گئے ہیں۔

"خاقان کے محلات و باغات کا انتظام اور اس کی وسیع سلطنت کے نظم و نسق میں محض وحشیانہ شان و شوکت ہی نہیں۔ بلکہ اس کے دیکھنے سے ایک اعلیٰ تہذیب و تمدن کا پتہ چلتا ہے۔ فصیلوں کے درمیان کے میدانوں میں جابجا درخت لگائے گئے ہیں جن میں شکار کھیلنے کے لئے ہرن چھٹے ہوئے ہیں۔ سڑکیں سرسبز میدان سے تین تین فٹ بلند ہیں اور ان پر پتھر کا ہموار فرش بنا ہے تاکہ بارش کا پانی یا کیچڑ ان پر نہ ٹھہرے بلکہ اِدھر اُدھر کی زمین میں بہہ کر اس کو زرخیز بنائے۔

"یہاں قابلِ دید چیزوں میں سے ایک وسیع اور بلند ٹیلا تھا۔ خاقان جہاں کہیں عمدہ درخت کی خبر سنتا تھا اس کو وہاں سے اکھڑوا کر اور ہاتھیوں پر مع شاخ و بُن اٹھوا کر اس ٹیلے پر نصب کرا دیتا تھا۔ اس ٹیلے کی چوٹی پر ایک خوبصورت عمارت بنی ہوئی تھی جہاں سے کوسوں دور تک کا منظر نظر آتا تھا۔ جن مقامات سے یہ درخت منتقل کئے گئے تھے وہاں کی زمین کھد کر بڑے بڑے تالاب بن گئے تھے، اور ان ہی تالابوں میں سے ایک میں خاقان کی مچھلیوں کے ذخائر رہتے تھے۔"

وینس کے لوگوں نے ان واقعات کو سن کر مبالغہ خیال کیا۔ مگر جب مارکو پولو نے یونان (چین) سیام، سماترا،

جاوا، لنکا کا ذکر شروع کیا تو سب یہ سمجھ کر ہنس دیئے کہ محض من گھڑت افسانے سنا کر سامعین کو خوش کرنا مقصود ہے۔ لطف یہ ہے کہ وینس کے بازاروں میں گولکنڈے کے ہیروں، لنکا کے موتیوں اور جاوا کے گرم مسالوں کی خرید و فروخت ہر وقت جاری تھی۔ امرا چین کے ریشم پہن کر ہم چشموں میں فخر کرتے تھے اور ایران کے اونی قالینوں سے وینس کے بیشتر محلات آراستہ تھے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ وینس بحیرۂ روم میں ان اشیا کی تجارت کا آڑھتی تھا جو اقصائے مشرق سے آتی تھیں اور یورپ میں کثیر نفع پر فروخت ہوتی تھیں۔ وینس کے تاجر ان چیزوں کو فلسطین اور شام کی بندرگاہوں پر مسلمان تاجر قافلوں سے خرید کرتے تھے یا اسکندریہ کی بندرگاہ پر خریدتے تھے جہاں ممالیکِ مصر اس قدر زبردست ٹیکس وصول کرتے تھے کہ ان چیزوں کی اصلی قیمت پر دو سو فی صدی کا اضافہ ہو جاتا تھا۔

مارکو پولو کے قابلِ یادگار سفرِ چین نے یورپ کی جغرافیائی معلومات میں جس قدر اضافہ کیا باستثنائے کولمبس کسی ایک سیاح نے نہیں کیا۔ اس سفر کا باعث قبلائی خان کی رواداری اور بلند نظری ہوئی۔ اسی کی بدولت مارکو نے وسطِ ایشیا کے ہولناک بیابانوں اور خونخوار قبائل کے باوجود اپنی سیاحت کو ممکن بلکہ کامیاب بنایا۔

نکولو پولو اور میفیو پولو نے اول بار سنہ ۱۲۶۰ء میں قبلائی خاں سے ملاقات کی۔ قبلائی خاں نے ان کو دعوت دی کہ وینس جا کر اپنے ہمراہ ایک سو عیسائی مبلغین لے آئیں تاکہ وہ تاتاریوں میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کریں۔ مگر یہ دونوں سوداگر وینس آکر دو سال تک تو نئے پوپ کے انتخاب کا انتظار کرتے رہے اور بالآخر صرف دو عیسائی پادریوں کو اپنے ہمراہ تاتار جانے پر آمادہ کر سکے اور یہ بھی آرمینیا کے فسادات کی خبر سن کر راستے ہی سے واپس چلے گئے۔ عیسائی دنیا آج تک کفِ افسوس ملتی ہے کہ کاش سو عیسائی مبلغین اُس وقت بھیج دیئے جاتے اور آج تمام چین عیسائی ہوتا۔

بہر حال مارکو، نکولو اور میفیو تینوں جوہریوں نے اپنا یہ بڑی سفر بندرگاہ ایاس سے جو ساحلِ لبنان پر واقع ہے شروع کیا۔ اور مشرقی ترکی یا اناطولیہ سے گذرتے ہوئے انہوں نے چاندی کی کانیں دیکھیں پھر کوہِ جودی کے گرد گھومتے ہوئے جارجیا میں داخل ہوئے تو انہوں نے ایسے قدرتی چشمے دیکھے جن سے بجائے پانی کے تیل برآمد ہوتا تھا جو کھانے کے کام تو نہ آتا تھا مگر جلانے کے کام آتا تھا یا خارش کے مریض اونٹوں کے جسم پر ملا جاتا تھا۔

زمانۂ حال کی عکسی تصاویر مارکو کے اس بیان کی تصدیق کرتی ہیں کہ جارجیا کے لوگ نہایت قوی ہیکل ہوتے

ہیں اور تاریخیں دربند کی آہنی دیوار کے متعلق اُس کے بیانات کی سچائی پر شاہد ہیں۔

پھر اس سفر کے دوران میں مارکو تفلس میں ریشمی کپڑے کی صنعت اور موصل میں سوتی کپڑے کی صنعت کا ذکر کرتا ہے۔

یہ لوگ تبریز کے مقام پر ایران میں داخل ہو کر قزوین پہنچے اور وہاں سے یزد کا سفر کیا، جو موجودہ زمانے کی طرح اُس وقت بھی ریشم بافی کا مرکز تھا۔ مارکو نے یہاں کی عورتوں اور لڑکیوں کے بنے ہوئے ریشمی کپڑوں کی خوبصورتی، نرمی، چمک اور مرصع کاری کی تعریف کی ہے۔ یزد سے ہمارے مسافر کرمان پہنچے جہاں تلوار، خنجر، تیر اور کمان خوب بنتے تھے۔

انہوں نے کرمان اور ہرمز کی وادی دیکھی جہاں کھجور اور پستے کے درخت بے شمار اُگے ہوئے تھے۔ یہاں انہوں نے ایک قسم کا تیتر دیکھا جس کے پر سفید و سیاہ تھے اور پنجے اور چونچ سرخ تھی۔ یہیں انہوں نے پہلی بار کوہان والے بیل دیکھے اور ایسی بھیڑیں دیکھیں جن کی دُمیں بیس بیس سیر کی تھیں (یعنی دنبے)

یہاں قصبوں کے گرد مارکو نے اونچی اونچی مٹی کی دیواریں دیکھ کر سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس علاقے میں ڈاکے بکثرت پڑتے ہیں۔ ڈاکو ایک خاص وحشی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جو کچھ ایسے منتر جانتے ہیں کہ ان کے پڑھنے سے ایک تند و تاریک آندھی اُن کے پیش پیش چلتی ہے اور اس طرح یہ لوگ اچانک قصبوں اور قریوں پر حملہ کرتے ہیں۔ بوڑھوں کو قتل کر دیتے ہیں اور جوانوں کو غلام بنا کر بیچ دیتے ہیں۔ بعد کی تحقیق سے ثابت ہوا کہ اس قسم کی آندھیاں بکثرت اس وادی میں چلا کرتی ہیں اور یہ ڈاکو خود ان کو پیدا نہ کرتے تھے بلکہ ان سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

ہرمز کی بندرگاہ پر انہوں نے ایک نئے شہر کی بنیاد پڑتے دیکھی۔ یہاں ہندوستان سے بیش بہا اسباب تجارت بالکل ٹوٹے پھوٹے جہازوں میں آتا تھا ان میں سے اکثر راستے ہی میں غرقاب ہو جاتے تھے۔ ان جہازوں کے اجزا کیلوں سے نہ جوڑے جاتے تھے بلکہ ناریل کے ریشوں کی رسیوں سے بندھے ہوتے تھے۔ ان میں صرف ایک مستول اور ایک بادبان اور ایک پتوار ہوتا تھا۔ ان پر چھت بھی نہ ہوتی تھی۔ سامانِ تجارت لاد کر اوپر سے ایک چمڑے کی چادر سے ڈھک دیتے تھے[1]

---

[1] اس قسم کی کشتیاں آج کل بھی کراچی کی بندرگاہ میں نظر آتی ہیں۔ اور ان میں سے بعض ساحل کے کنارے کنارے خلیج فارس تک مالِ تجارت لے جاتی ہیں۔

ہمارے سیاح ہرمز سے شمال کی طرف روانہ ہوئے اور دشتِ لوط سے گذرے جس میں سینکڑوں کوس تک درخت، سبزے یا پانی کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ اور جو تھوڑا بہت پانی کہیں دستیاب ہوتا ہے وہ سخت کڑوا اور زہریلا ہوتا ہے۔

یہاں سے یہ لوگ خراسان اور مغربی افغانستان سے گذرتے ہوئے بدخشاں کے مہیب دروں میں داخل ہوئے اور پہلی بار نمک کا پہاڑ دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئے۔ انہوں نے ایک اور عجوبۂ روزگار جانور دیکھا جس کے جسم پر بجائے بالوں کے لمبے لمبے کانٹے ہوتے ہیں اور بحالتِ غضب یہ کانٹے کھڑے ہو کر آلۂ حرب کا کام دیتے ہیں۔

اہلِ بدخشاں کے متعلق مارکو پولو بیان کرتا ہے کہ یہ ایک خونخوار اور مردم آزار قوم ہے۔ یہ لوگ بہت اچھے شکاری ہیں۔ مرد جانوروں کی کھالیں بجائے لباس کے پہنتے ہیں اور سر کے گرد پیچ در پیچ ایک رسّی لپیٹے رکھتے ہیں اکثر غاروں کے اندر زندگی بسر کرتے ہیں مگر کانوں میں بیش بہا جواہرات کے آویزے لٹکائے رکھتے ہیں۔

اس علاقے میں جو آج تک غیر دریافت شدہ ہے اور ہمیشہ دنیا کی تاریخ سے علیحدہ رہا ہے مارکو ایک سال تک مقیم رہا۔ اس لئے یہاں کا حال بہت زیادہ شرح و بسط کے ساتھ تحریر کرتا ہے۔ دورِ جدید تک یہ بیانات ناقابلِ یقین سمجھے جاتے تھے، مگر کپتان جان وڈ نے اس علاقہ میں سفر کرتے ہوئے جو بیانات شائع کئے ہیں ان سے مارکو کے بیانات کی پوری پوری تصدیق ہوتی ہے۔ چنانچہ مارکو نے اس علاقہ میں ایک عظیم الجثہ مینڈھے کا ذکر کیا ہے جس کے سینگ چھ چھ بالشت لمبے ہوتے ہیں۔ کپتان مذکور نے اس مینڈھے کے سینگ ناپے اور معلوم کیا ان میں سے بعض ایک گز لمبے تھے۔ مارکو نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ سطحِ مرتفع پامیر پر آگ کی گرمی کم ہو جاتی ہے اور کھانا آسانی سے نہیں پکتا۔ موجودہ تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ سطحِ سمندر پر پانی ۲۱۲ درجے حرارت پر جوش کھاتا ہے مگر اس قدر بلندی پر پہنچ کر ۱۸۰ درجے ہی پر جوش کھا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پانی ابلنے لگتا ہے مگر کھانا نہیں پکتا۔

اس کے بعد ہمارے مسافر ریگستانِ گوبی میں داخل ہوتے ہیں جس کے متعلق عجیب اور دہشت انگیز واقعات سن کر لوگوں کے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ قافلہ سے پیچھے رہ جانا یہاں غضب ہے۔ تنہائی میں انسان طرح طرح کی آوازیں سنتا ہے اور عجیب عجیب مناظر دیکھتا ہے۔ تشنگی کی حالت میں اس کو ایک موج زن دریا نظر آتا ہے۔ کبھی آوازِ جرس کانوں میں آتی ہے اور کبھی بانگِ دُہل سنائی دیتی

ہے - دورِ جدید کے سیاحوں نے لفظ بلفظ اس کی تصدیق کی ہے -

ہمارے سیاح اس دشتِ مصائب سے گذر کر چین کی سرحد پر شہر کنچاؤ میں داخل ہوئے اور اس وسیع اور خوبصورت شہر میں تین کلیسا دیکھ کر سخت متعجب ہوئے - یہ علاقہ چنگیزی مغلوں کا اصلی مرکز ہے - یہ لوگ بڑے بڑے گلّے پالتے ہیں اور اُن کے لئے نئی چراگاہوں کی تلاش میں نقلِ مکان کرتے رہتے ہیں - اُن کے خیمے سیاہ بانات کے بنے ہوئے مدور شکل کے ہوتے ہیں - اور جہاں کہیں نصب کئے جاتے ہیں اُن کے دروازے جنوب کی جانب رکھے جاتے ہیں - بحالتِ سفر ان کو بجنسہٖ گاڑیوں پر رکھ لیتے ہیں جن کو بائیس بائیس بیل یا اونٹ کھینچتے ہیں - ان گاڑیوں کے بیس بیس پہیئے ہوتے ہیں اور دُھروں کا طول ۲۰ فٹ ہوتا ہے -

عورتیں امن و امان کے زمانے میں ہر قسم کی خدمت کرتی ہیں، مگر دورانِ جنگ میں مرد ہر قسم کی سختیاں بخوشی برداشت کرتے ہیں - بحالتِ سفر ہر سوار کے پاس مندرجہ ذیل سامان ہوتا ہے :- دو چرمی بوتلوں میں جما ہوا دودھ کھانا پکانے کے لئے ایک مٹی کی ہنڈیا اور ایک مختصر سا خیمہ - یلغار کی حالت میں دس دس روز مسلسل گھوڑے کی پشت سے ایک لحظہ کے لئے بھی جدا نہیں ہوتے - سپاہیوں کو گھوڑے کی پشت پر ہی سونے کی عادت ڈالی جاتی تھی -

مارکو تاتاری عورتوں کی عصمت کی تعریف کرتا ہے - وہ کہتا ہے کہ ایک ایک آدمی کی سو سو بیویاں ہوتی تھیں مگر پہلی بیوی کی بڑی عزت کی جاتی تھی -

گھوڑی کا دودھ یہ لوگ بکثرت استعمال کرتے تھے - امرا ریشم، زری اور سمور کا لباس پہنتے تھے - گھوڑے، اونٹ، بیل، گائے تمام مویشیوں پر نشان لگایا جاتا تھا، اور گھوڑے کے چور کی سزا قتل سمجھی جاتی تھی -

یہاں کے جانوروں میں بالخصوص یاک اور مشک آہو کا ذکر کرتا ہے - اور مشک کے نکالنے کا طریقہ یوں بیان کرتا ہے :-

"جب پورا چاند نظر آتا ہے تو اس جانور کی ناف میں ایک غدود پیدا ہوتا ہے، جس کو کاٹ کر دھوپ میں خشک کر لیا جاتا ہے - اس کے اندر کا خون جم کر عمدہ خوشبو بن جاتا ہے"

وینس سے روانہ ہونے کے چار سال بعد ہمارے سیاح شہر شانڈو جا پہنچے اور شاہی پارک میں داخل ہوئے جس کے گرد ۱۶ میل لمبی دیوار محیط تھی اور جس کے اندر بے شمار فوارے اچھلتے اور نہریں اور دریا بہتے تھے - سرسبز چراگاہیں پھیلی ہوئی تھیں اور انواع و اقسام کے چرند و پرند چھٹے ہوئے تھے - اس پارک کے وسط میں ایک مرمریں قصر غیرتِ باغِ ارم تھا جس کی ہر دیوار طلائی نقش و نگار سے آراستہ تھی - اس کے قریب ایک اور محل تھا جو تمام بید کا

بنا ہؤا تھا اور اُس پر بھی طلائی روغن چڑھا ہؤا تھا - یہ مقام موسم گرما میں خاقان کی قیام گاہ تھا - یہاں دس ہزار گھوڑے
اور گھوڑیاں رہتی تھیں - اسی محل میں پہلی بار مارکو پولو نے خاقان کے دربار میں شرفِ باریابی حاصل کیا - اور خاقان
کو بہت جلد اپنے حسنِ قابلیت اور جادو بیانی کا گرویدہ بنا لیا - خاقان نے مارکو کے سپرد یہ خدمت کی کہ تمام ممالک
محروسہ میں سفر کر کے وہاں کے دلچسپ حالات خاقان کے سامنے پیش کرے - اس سفر کے حالات دنیا کے دلچسپ
ترین سفرناموں میں سے ہیں - مارکو نے اپنا بیان خاقان کے دربار کے حالات سے شروع کیا ہے، اور ابتدا ہی میں
ایک جنگ کا حال یوں درج کیا ہے:-

"خاقان ایک پہاڑی پر ایک خوبصورت چوبی عماری میں ایک شاندار ہاتھی کی پشت پر بیٹھا جنگی نقل و
حرکت کا معائنہ کر رہا تھا - اُس کے اوپر اُس کا شاہی پرچم لہرا رہا تھا اور نیچے اُس کی افواج تیس تیس ہزار کے
ٹکڑوں پر منقسم کھڑی تھیں - ہر سوار کے پیچھے ایک ایک پیدل سپاہی بھی نیزہ لئے کھڑا تھا طبلِ جنگ بجتے ہی
افواج نے پُرجوش حملہ کیا"۔

مارکو بیان کرتا ہے کہ خاقان کی چار بیویاں ہیں جو ملکہ کہلاتی ہیں - ان میں سے ہر ایک کا دربار جداگانہ
اور نہایت شاندار ہے - ان درباروں میں علاوہ خواجہ سراؤں اور غلاموں کے تین تین سو حسین اور نوخیز لڑکیاں
رہتی ہیں - ہر ایک دربار میں خدام کی تعداد دس ہزار ہے - علاوہ ان بیویوں کے بے شمار حرم ہیں - ایک خاص قبیلہ
سے جس کی عورتیں حسن و جمال میں شہرتِ عام رکھتی ہیں ہر سال سو عورتیں حرم بننے کے لئے خاقان کے دربار میں
بھیجی جاتی ہیں -

خاقان کے سرمائی محل واقع پیکن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، اور اسی سلسلہ میں اُس ہال کا ذکر بھی ہو چکا ہے جس
میں چھ ہزار آدمی ایک وقت میں کھانا کھاتے تھے - دعوت کے موقعوں پر خاقان کی نشست اس قدر بلند ہوتی تھی
کہ خاقان کے پیر اور حاضرین کے سر ایک سطح میں ہوتے تھے - مدعوئین کو مناسب مقامات پر بٹھانے کے لئے چند
امرا مقرر کئے جاتے تھے، اور ہر دروازے پر دو دو قوی ہیکل سپاہی لاٹھیاں لئے کھڑے رہتے تھے - اگر اندر آتے ہوئے
کوئی شخص چوکھٹ پر پیر رکھ دیتا تھا تو اُس کی کپڑے اتار کر تذلیل کی جاتی تھی - مگر باہر جاتے وقت اس قاعدہ کی پابندی
نہ ہوتی تھی - جو خدام خاقان کے سامنے کھانا چنتے تھے - اُن کے منہ اور ناک پر ڈھاٹا بندھا رہتا تھا تاکہ اُن کے
منہ کی بدبو خاقان تک نہ پہنچے - ہر امیر جو اس ہال میں کھانا کھانے آتا تھا اپنے ہمراہ ایک پیک دان بھی لاتا تھا۔

اِن دعوتوں میں سب سے زیادہ شاندار خاقان کی سالگرہ کی تقریب ہوتی تھی - اُس روز خاقان ایک زرنگار

مرصع کار ریشمی لباس زیب تن کرتا تھا اور اُس کے بارہ ہزار امرا بھی اسی قسم کا لباس پہنتے تھے۔ ایسے لباس ان امرا کو بادشاہ کی طرف سے سال میں تیرہ دفعہ ملتے تھے۔

نوروز کی دعوت میں لباس کا رنگ سفید ہوتا تھا۔ اُس روز ہر امیر خاقان کے روبرو نذر پیش کرتا تھا اور سونے چاندی کی مورتیوں اور جواہرات ریشم اور سفید گھوڑوں کے تحفے دیتا تھا۔ اس طرح اُس روز ایک لاکھ سفید گھوڑے مع بیش قیمت ساز و یراق کے جمع ہو جاتے تھے۔ اُس روز خاقان کے پانچ ہزار ہاتھیوں کا جلوس بھی نکلتا تھا۔ کھانے کے بعد مداری تماشے دکھا کر حاضرین کو محظوظ کرتے تھے پیکن کے متعلق مارکو بیان کرتا ہے کہ شہر ایک دریا کے اوپر آباد تھا۔ ایک ہزار جوان اُس کے بارہ دروازوں کی حفاظت کرتے تھے۔ رات کے وقت ایک بڑا گھنٹہ بجتا تھا جس کے بعد شہر میں کسی کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ مگر بیمار یا زچہ کی ضروریات کیلئے نکلنے کی اجازت تھی۔ شہر کے باہر کی آبادی اندر کی آبادی سے بھی زیادہ تھی۔ اور ممالک غیر سے آنے جانے والے تجار کے قیام کے لئے بے شمار سرائیں بنی ہوئی تھیں۔ اسی حصہ میں پچیس ہزار طوائف بھی آباد تھیں پیکن میں حفظانِ صحت کا انتظام نہایت معقول تھا مُردے شہر سے باہر بہت دور لے جاکر جلائے یا دفن کئے جاتے تھے۔ مارکو بیان کرتا ہے کہ یہاں سکّے کے بجائے شہر میں کاغذ کے نوٹ چلتے تھے۔ ان نوٹوں کا کاغذ شہتوت کے درخت کی چھال سے بنایا جاتا تھا۔ قانوناً اگر کوئی شخص اس کاغذی سکّے کے لینے سے انکار کرتا تو سزائے موت کا مستحق ہوتا۔ ان کاغذ کے ٹکڑوں کو چھاپ کر ٹکسال کے حکام دستخط کرتے تھے پھر شاہی خزانچی ان پر شاہی سرخ مہر لگا دیتا تھا تین فی صدی بٹہ دے کر پرانے نوٹ بدل دیئے جاتے تھے۔ خاقان ہر سال اپنے سونے چاندی کے ذخائر میں سے ایک بڑی مقدار رعایا کے ہاتھ فروخت کر کے نوٹ واپس لے لیتا تھا۔ اس طرح ان نوٹوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

خاقان کی ڈاک کا انتظام بھی نہایت قابلِ تعریف تھا پیکن سے تمام شہروں تک پختہ سڑکیں بنی ہوئی تھیں اور ان سڑکوں پر پچیس پچیس میل کے فاصلہ پر ڈاک چوکیاں بنی ہوئی تھیں جن میں بعض بعض جگہ چار چار سو گھوڑے رہتے تھے۔ جن علاقوں میں سڑکیں نہ تھیں وہاں بھی ڈاک چوکیاں موجود تھیں۔ دو ڈاک چوکیوں کے درمیان پیدل ہرکاروں کے لئے قیام گاہیں بنی ہوئی تھیں۔ ان ہرکاروں کی پیٹیوں پر گھنٹیاں لگی ہوتی تھیں جن کی آواز دور سے سنائی دیتی تھی اس ڈاک سے نہ صرف خط جاتے تھے، بلکہ پارسل بھی جاتے تھے۔ اور کم وقت میں ڈاک پہنچنے کا انتظام بھی تھا چنانچہ پیکن میں صبح کے توڑے ہوئے پھل زانڈو میں شام کے کھانے کے ساتھ دسترخوان پر چنے جاتے تھے۔ حالانکہ عام حالتوں میں ڈاک دس دن میں پہنچتی تھی۔ ڈاک لے جانے والے سوار دن میں دو تین سو میل سفر کرتے تھے اور رات کو بھی اسی رفتار سے چلتے رہتے تھے۔ ہر چوکی پر سوار گھوڑا لئے ڈاک کا منتظر رہتا تھا اور ڈاک لیتے ہی روانہ ہو

جاتا تھا۔ اِن ڈاک کے سواروں کو معقول تنخواہیں ملتی تھیں۔ سفر کرتے وقت یہ سوار اپنے سر سینہ اور پیٹ کو پٹّیوں سے مضبوط باندھ لیتے تھے۔

چونکہ یورپ میں ڈاک کا انتظام عمدہ نہ تھا اس لئے مارکو یہ حالات دیکھ کر ششدر رہ گیا۔

چین میں اُس زمانے میں قحط بہت پڑتے تھے۔ ان کے اثرات کو روکنے کے لئے خاقان نے یہ انتظام کیا تھا کہ جب غلّہ سستا ہوتا تو خود اس کی بہت بڑی مقدار خرید کر مختلف صوبجات میں شاہی ذخائر کر لیتا تھا جب فصل نہ ہوتی تھی یا ٹڈیاں فصل خراب کر دیتی تھیں تو ان ذخائر سے غلہ نکال کر معمولی نرخ پر فروخت کیا جاتا تھا۔

اشیائے خوردنی و پوشیدنی کے تیار کرنے والوں سے جنس کی صورت میں ٹیکس لیا جاتا تھا، اور یہ اشیا پھر غربا میں تقسیم کر دی جاتی تھیں۔ اس طرح روزانہ تقریباً تیس ہزار آدمیوں کو غذا اور خوراک مفت ملتی تھی۔

بیس برس چین کے عجائب و غرائب مشاہدہ کرنے کے بعد بالآخر پولو وطن کی یاد سے بے چین ہونے لگے مگر دربار سے رخصت نہ ملتی تھی، یہاں تک کہ ایران کے ایلخانی سفیر یہ خبر لائے کہ غازان خاں کی ملکہ مر چکی ہے اور اس کی آخری وصیت کے مطابق غازان خاں چاہتا ہے کہ اس کی نئی ملکہ منگولیا سے بھیجی جائے۔ چونکہ ترکستان میں جنگ چھڑ چکی تھی۔ بری راستہ بند تھا۔ اس لئے یہ تجویز ہوئی کہ ایلخاں کی نئی ملکہ "کوکا چین" پولو کی معیت میں بحری راستہ سے ایران بھیجی جائے۔ خاقان نے تیرہ جہاز تیار کرائے اور اُن میں دو سال کی خوراک اور دیگر سامانِ ضروری بار کیا۔ پھر بادلِ ناخواستہ تینوں وینس کے جوہریوں کو رخصت کیا۔ علاوہ ملّاحوں کے چھ سو آدمی ان کے ہمراہ تھے۔ ان میں سے صرف تیرہ آدمی منزلِ مقصود تک زندہ پہنچے۔ دو سال کے بعد اُن کے جہاز ساحلِ ایران پر لنگر انداز ہوئے اور "پولوؤں" نے شہزادی "کوکا چین" کو ایلخانی دربار میں بعافیت پہنچا دیا۔ شہزادی نے ان کو باچشمِ نم رخصت کیا۔

۱۲۹۵ء میں یہ لوگ وینس جا پہنچے۔ تین سال تک عیش و آرام سے زندگی بسر کرتے رہے۔ ۱۲۹۸ء میں وینس والوں نے جنیوا پر حملہ کیا۔ مارکو بھی اس بحری مہم کے ہمراہ تھا۔ باشندگانِ وینس کو شکست ہوئی، اور ۷۰۰۰ قیدیوں کے ہمراہ مارکو بھی جنیوا کے جیل میں مقید ہو گیا۔ قید خانے میں اس کا تعارف ایک ادیب پیسان سے ہوا، جس نے مارکو کے سفر کے حالات بڑی دلچسپی سے سنے اور اُن کو قلمبند کرتا رہا۔

آج کل ایک سیاح کے حالاتِ سفر اس کی مراجعتِ سفر کے چوبیس گھنٹے بعد تمام دنیا میں شائع ہو جاتے ہیں مگر مارکو کے حالاتِ سفر ۱۴۷۷ء تک شائع نہ ہو سکے، اور جب تک موجودہ سیاحوں کے بیانات نے ان واقعات کی حرف بحرف تصدیق نہ کی لوگ ان کو محض افسانہ سمجھتے رہے۔

محمد بدر الاسلام فضلی

ہندِ قدیم اور صنفِ نازک

عہدِ عتیق اور قرونِ وسطیٰ میں عورت کو عموماً ایک قسم کی ملک سمجھا جاتا تھا۔ اخلاقاً اس کی موافقت کیلئے کوئی تیار نہ تھا۔ اس کو نفسِ امارہ کی "طلب" اور شیطان کا "دامِ فریب" تصور کیا جاتا تھا۔ قیمتاً اس کی خرید و فروخت ہو سکتی تھی۔ چنانچہ ایتھنز والے اس کو عاریتاً بھی لے لیتے تھے۔ بہادر اور جوانمرد لوگ اس کو قوتِ جوانمردی کے لئے سمِ قاتل سمجھتے تھے۔ معاشرةً وہ ایک قسم کا کھلونا تھی۔ اہلِ اسپارٹا کو اس بات پر فخر تھا کہ ان کے یہاں قانونی اور نصف قانونی بیویاں بھی مل سکتی ہیں۔ اہلِ روم میں عورتوں کا ادل بدل بھی ہو سکتا تھا۔ ہنود اس کو جوئے میں ہار جیت سکتے تھے۔ قدیم عرب اس کو ترکے میں لے سکتے تھے اور زندہ دفن کر سکتے تھے، اور قدیم اہلِ مصر اس کو دریائے نیل کے کنارے لے جا کر بطورِ قربانی ذبح بھی کر سکتے تھے۔

تعددِ ازواج کی یہ حالت تھی کہ بابل اور اسیریا کے مہذب لوگ جتنی عورتیں چاہتے اپنی زوجیت میں لاتے، کوئی مذہبی، قانونی یا معاشرتی روک نہ تھی۔ ایرانیوں میں ایک شوہر کے جتنی زیادہ بیویاں ہوں اتنا ہی زیادہ انعام ملتا تھا۔ فنیشیا والے اور بگڑے ہوئے بنی اسرائیل نکاح اور بیاہ کی رسم کو بالکل غیر ضروری سمجھے ہوئے تھے۔ مذہب نے بھی اس کو اسی نگاہ سے دیکھا جس نگاہ سے اخلاق نے دیکھا۔ حتیٰ کہ حضرتِ عیسیٰ نے گو شادی کو منع نہیں کیا مگر برا ضرور بتایا۔ مسیحی تاریخ میں دیکھیئے تو سینٹ پال نے اپنی تعلیم کے بموجب اس کو انسانیت سے بھی گرا دیا۔ سینٹ جروم نے اس کو تمام خرابیوں اور برائیوں کی جڑ قرار دیا۔ اور سینٹ آگسٹائن کے قول کے مطابق اُمُّ البشر جو اسے پیدا کرنے کی غرض و غایت صرف یہ تھی کہ وہ آدم علیہ السلام سے اللہ کے حکم کی نافرمانی کرانے میں شیطان کی معاون ہوں۔

الغرض عہدِ قدیم میں کوئی قوم ایسی نظر نہیں آتی جس نے عورت کی حمایت میں کچھ بھی کیا ہو۔ کسی نے اُس کو شیطان کا دروازہ بتایا اور کسی نے ناگن سے زیادہ زہریلی۔ مگر فطرت نے اہلِ نظر کی نگاہوں میں اس کی قیمت قائم رکھی۔ صنفِ نازک کی بے بسی پر اگر کسی کو رحم آیا تو دنیا میں صرف دو مقدس ہستیوں کو۔ اُن میں سے ایک

---

[1] Demosthenes.

[2] مہابھارت۔

شاندار ہستی کرشن اعظم کی ہے، دوسری مقدس ذات پیغمبر اسلام محمد صلعم کی۔ کرشن جی نے عورت کی عزت و حرمت برقرار رکھنے کے لئے پانڈو کو مہا بھارت کی لڑائی لڑنے پر آمادہ کیا اور ہندو میں عورت سے محبت کرنے کا احساس پیدا کیا اور پیغمبر اسلام نے سب سے پہلے اس غریب جنس کو انسانیت کے دائرے میں شامل کیا۔ اس کو زندہ درگور ہونے سے بچایا، اس کو دریائے نیل کی قربانی بننے سے روکا اور اس کو ناموس و وفا ثابت کر کے نفس پرستوں کے پنجوں سے چھڑایا۔ اس کے حقوق کی نگہداشت شرعاً سب پر فرض کی، اُس کے لئے ترکہ مقرر کیا اور اولادِ نرینہ کی موجودگی پر بھی وہ اپنے باپ کی جائداد میں سے حصہ پانے کی مستحق قرار دی گئی۔ رقم "مہر" ایک ایسی ایجاد ہے جس سے عورت کو تقویت ہی نہیں دی گئی بلکہ شوہر کو اس کی پاسداری پر مجبور کیا گیا ہے۔ برخلاف اس کے عہدِ قدیم میں اور نیز زمانۂ حال میں ہر قوم نے ازروئے قانون و مذہب، بہ موجودگیِ اولادِ نرینہ عورت کو محجوب الارث قرار دیا اور اس کی وجہ سے وہ باپ کے گھر سے بھی محروم رہی کیونکہ شوہر کے گھر سے تو اس کو کبھی بھی امید نہ تھی۔

اس مختصر تمہید کے بعد اگر قدیم ہندوستان کی معاشرت کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ قدیم ہندو سوسائٹی میں عورت ایک مقدس وجود سمجھی جاتی تھی جس کی تصدیق رگ وید سے ہوتی ہے۔ آریہ لوگ مذہبًا اور معاشرۃً اس کو محبت اور احترام کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ گو مرد کے مقابلے میں اس کو برتری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا تھا اور عمومًا مرد کی وجہ سے اس کو طرح طرح کی آزمائشوں میں پڑ کر اپنی پاک دامنی کا ثبوت دینا پڑتا تھا۔ تاہم اس تمام اطاعت اور فرمانبرداری کے باوجود وہ اپنے شوہر اور خاندان کے بزرگوں سمیت عبادت و قربانی وغیرہ کے رسوم میں شرکت کرتی تھی اور سب ساتھ مل کر دیوتاؤں کے سامنے دعائیہ گیت گاتے تھے۔

پوجا وغیرہ کی تیاری کے لئے آریہ عورتوں کا یہ فریضہ تھا کہ دیوتاؤں پر چڑھانے کے لئے "سوم رس" پہلے سے تیار کر رکھیں۔ اس زمانہ میں بھی عورتیں زبانی علوم حاصل کرنا فرض سمجھتی تھیں۔ اور ان میں سے اکثر شاعرہ بھی ہوتی تھیں جو عمومًا دعائیہ گیت نظم کرتی تھیں۔ البتہ رسمیں اُس وقت ایسی بھی جاری تھیں جو آج کل اخلاقًا بری سمجھی جائینگی مگر ان رسموں سے کسی کو عار نہ تھا، گو اخلاقًا ہی نہیں بلکہ فطرۃً بھی یہ رسمیں اچھی نہ تھیں۔ ان رسموں میں سے ایک "بیوی اور کئی شوہر" کی رسم جس کو ہم "تعددِ شو" کہیں گے "تعددِ زن" کے دستور کے مطابق مگر اس کے بالکل برعکس تھی۔ باوجود اس دستور کے قدیم ہندو عورتیں اپنے خاوند کی اطاعت میں مساوات اور احترام کا یکساں لحاظ رکھتی تھیں اس رسم کی بابت یہ بھی مشہور ہے کہ اس کا رواج شاہی خاندانوں تک محدود تھا۔ غرض ایسی چند رسوم کے سوا وہ

پارسائی اور پاک دامانی کا زمانہ تھا۔ یہ وہی عہدِ جاہلیت تھا جس پر آج کل کی سینکڑوں تہذیبیں قربان کر دینے کے قابل ہیں۔

اس پاک زمانہ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ستی کی بُری رسم رائج ہوگئی۔ نہیں معلوم کس ظالم ہستی نے اس ہلاکت آفریں رواج کو قائم کیا۔ کہا تو یہ جاتا ہے کہ زن وشوہیں "پریم" کی انتہائی قوتوں کی وجہ سے شوہر کی وفات پر عورت خود موت کو زندگی پر ترجیح دیتی تھی لیکن عورت کے لئے تو یہ رسم وفاداری اور مروت کے پردے میں ایک قسم کی زبردستی اور ستم ثابت ہوئی۔ اس بُرے رواج کا دھبّا آریہ قوم پر نہیں آسکتا کیونکہ یہ ان کے زمانہ کے بعد رائج ہؤا ہے۔ آریہ لوگ عورت کو گھر کی زینت سمجھتے تھے۔ اس کی پاکدامانی کی دعائیں مانگی جاتی تھیں اور خواہش کی جاتی تھی کہ دیوتا اُس کو صاحبِ اولاد کریں۔ وہ گھر میں ایک باحرمت رانی سمجھی جاتی تھی۔ رگ وید میں لکھا ہے:۔

"اے بخشش کرنے والے اِندر اس عورت کی گود سعادت مند اولاد سے بھر دے اور اس کے شوہر کو گیا ہوا دیوتا بنا[۱]"

شادی کے بعد جب نئی دلہن گھر میں آتی تو اس سے مخاطب ہو کر کہا جاتا تھا:۔

"اے عروسِ پاک دامن اپنی خوش دامن خسر اور شوہر کے بہن بھائیوں پر حکومت کر۔ تو گھر کی رانی ہے[۲]"

عورت کے متعلق سب سے اچھی رسم جو آریوں کے زمانے میں رائج تھی وہ "سوئمبر" یعنی "انتخاب شوہر" ہے جس کو آج کل ایک قسم کی "فوری کورٹ شپ" کہنا چاہئے۔ نہیں معلوم یہ رسم ہنود سے بہت جلد کیوں اٹھ گئی۔ گو یہ راجوں مہاراجوں کے حلقہ تک محدود تھی تاہم اس کے محاسن کا احساس اس زمانہ میں بھی ہوتا ہے۔

آریوں کی معاشرتی زندگی میں وہ وقت نہایت دلچسپ ہوتا تھا جب اپنے گھرانے کے ساتھ عورت بھی سرخیٔ شفق کی عبادت کرتی تھی۔ اُس وقت حسنِ فطرت کی رنگینیوں سے اُس کی پاک خوبصورتی اور بھی دوبالا ہو جاتی تھی۔ وہ سماں کیا ہی دلفریب ہوگا جب شفقِ صبح کی سرخی اور اس کے بعد نکلتے ہوئے سورج کی نازک کرنوں سے اُس کے حسین جسم پر ایک زریں عکس پڑتا ہوگا اور وہ سریلی آواز میں شفق کو مخاطب کر کے یہ مقدس گیت گاتی ہوگی:۔

سما کی دیوی فلک کی ملکہ ۔۔۔ اِدھر بھی ہو اک نگاہ تیری
یہ سرخ چادر اُڑھا دے مجھ کو ۔۔۔ کہ چاہتی ہوں پناہ تیری

---

[۱] رگ وید باب دہم ۸۵ ۔ [۲] رگ وید باب دہم ۴۵-۴۶

تجھی سے دولت تجھی سے برکت　　تجھی سے سب آن بان اپنی
یہ آرزو ہے، رہے حکومت　　ہمیشہ شام و پگاہ تیری
نہ دیر کر منتظر ہے دنیا　　کہ ہو فلک پر ظہور تیرا"
ہے تیرا آنا بہت ضروری　　ہر ایک شے میں ہو نور تیرا[۵۱]

قدیم آریوں میں کوئی عورت ایسی نظر نہیں آتی جو نام آور ہو یعنی کسی نہ کسی اعتبار سے نمونۂ کمال ثابت ہو کہ ہم اس کو یہاں بطور مثال پیش کر سکیں۔ شاید وہ رشی منی کے مدارج تک پہنچنے سے قاصر سمجھی گئی اور اس کو بالکل شوہر اور اُس کے خاندان کے ماتحت رکھا گیا۔ عہدِ جاہلیت کے عربوں کی طرح لڑکی پیدا ہونے سے آریہ بھی خوش نہ ہوتے تھے۔ غرض عورت اپنے شوہر کی اطاعت سے کبھی اغماض نہیں کر سکتی تھی، لیکن زمانہ گذرنے پر شوہر اُس کو اپنی دولت یا جائداد سمجھنے لگا۔ اور رفتہ رفتہ وہ طرح طرح کی آزمائشوں کا شکار ہو گئی، کیونکہ اُس کو دریائی دیوتاؤں پر قربان کیا جا سکتا تھا۔ اور وہ جیتی اور ہاری جا سکتی تھی۔ وہ خاوند کی دولت تھی اور اپنی اس حالت میں تمام تکالیف برداشت کرنے کے لئے تیار رہتی تھی۔

تاریخِ ہند میں ہار جیت کی زندۂ جاوید مثال رانی درو پدی ہے اور تکالیف و مصائب کا نمونۂ کمال صبر و استقامت کی دیوی سیتا جی کی مقدس ہستی ہے۔ آگے ایک نمونۂ محبت یعنی رادھا کا بھی مختصر سا ذکر کیا جائے گا۔ کیونکہ کرشن اعظم کی مقدس ذات نے غریب جنسِ نازک پر وشنو صفت عنایتیں ہی نہیں کیں بلکہ اس کو "حسن و محبت" کا ایک قدرتی مظہر بھی ثابت کر دیا۔

الغرض جب درو پدی کو "پانڈو" جوئے میں ہار گئے۔ اور وہ غریب خاوندوں کو وعدہ خلافی کے برے نتائج سے بچانے کے لئے "کورو" کے پاس جانے پر مجبور ہوئی تو کرشن اعظم نے اس بداخلاقی کو منظور نہ کیا اور پانڈو سے کہا کہ تم اپنے اخلاقی حق کے لئے لڑو کیونکہ

"جو ناخواستہ لڑائی آپڑے وہ سرگ کا دروازہ ہے اور صرف خوش نصیب کشتریوں کو ایسی لڑائی میسر ہوتی ہے"[۵۲]

اس پر پانڈو میں سے ایک بہادر نوجوان "ارجن" نے کہا کہ:-

"اے کیشو سب شگون برخلاف دیکھتا ہوں کیونکہ یگانوں کو مار کر بہتری دکھائی نہیں دیتی"[۵۳]

---

[۵۱] رگ وید باب اول - ۴۸ (۱)　[۵۲] گیتا دوسرا ادھیائے ۳۲-　[۵۳] گیتا پہلا ادھیائے ۳۱

ارجن کے اِس کہنے پر کرشن جی نے نہایت متانت اور سنجیدگی سے فرمایا:-

لڑائی ہے عزت کی جی مت چھپاؤ ۔۔۔ جو غیرت ہے تو آج میدان میں آؤ
بگانوں کی حرمت پہ جو ہاتھ ڈالے ۔۔۔ یگانہ وہ دشمن ہے دھوکا نہ کھاؤ

لڑو یہ لڑائی کہ عزت ملے گی
اگر جان جائے تو جنت ملے گی[51]

اس طرح کرشنِ اعظم کی کوششوں سے قدیم آریوں کے سپوت عورت کی عزت وحرمت برقرار رکھنے کے لئے بھارت ماتا کی چھاتی پر سب سے پہلے آمادۂ پیکار ہوئے اور کرشن اعظم کی مقدس تائید سے فتح یاب بھی ہو گئے۔

بہ اعتبارِ وفاداری و آزمائش قدیم ہندوستان میں سیتا جی سے بڑھ کر عورتوں میں کوئی نمونۂ کمال نہیں۔ راجہ جنک کی یہ نازک اندام "راج کنیا" چودہ سال تک جنگلوں میں پھری۔ راون کے مظالم سہے۔ جلتے توؤں پر برہنہ پا چلنے پر مجبور کی گئی اور نہیں معلوم کیسی کیسی سخت آزمائشوں کا سامنا کیا، مگر ہمیشہ ان صبر آزما امتحانوں میں کامیاب رہی۔ جب رام چندر جی بن باس ہو رہے تھے اور سیتا کی بابت یہ رائے قرار پائی تھی کہ وہ محل ہی میں قیام کرے تو سیتا نے کہا کہ نہیں میں اپنے گھر بار، دولت و ثروت اور اعزہ تک کو خیرباد کہتی ہوں۔ عورت کا فرض ہے کہ وہ اپنے خاوند کی تکلیف کے وقت اُس کے آرام کے اسباب بہم پہنچانے کی کوشش کرے کیونکہ:-

یہ فرض ہے مجھ پر دنیا میں ۔۔۔ میں ساتھ نہ چھوڑوں شوہر کا
گر رام رہیں گے جنگل میں ۔۔۔ ہے پاپ مجھے رہنا گھر کا
گر سچا بیٹا راگھو کا ۔۔۔ بن باس ہوا تو سیتا بھی
ہے سایہ اپنے شوہر کا ۔۔۔ یا پرچھائیں جو ساتھ رہی

ہے رام ہی میرے دل کا راجہ، رام ہی ہی سرتاج مرا
ہے رام کی قسمت قسمت میری، رام کے دم تک راج مرا[52]

عورتوں کی اِس پاک اور مقدس محفل میں بہ اعتبارِ عشق و محبت رادھا کا مرتبہ بھی بہت بڑا ہے۔ اُس کی محبت لاانتہا ہی تھی۔ محویت کے عالم میں بعض اوقات وہ اپنے ہوش و حواس میں بھی نہیں رہتی تھی۔ اس کی غذا

---

[51] گیتا دوسرا ادھیائے ۔ ۳۱ ۔ [52] رامائن

کنھیا جی کی محبت اور اُن کی یاد میں صرف اشعار پڑھنا تھی، گوکل کے کسی باغ میں گوپیاں اُس کو پھولوں سے لدے درخت کی شاخ پکڑے ہوئے دیکھتی تھیں اور رادھا کیف و محبت میں یہ اشعار پڑھتی ہوئی سنائی دیتی تھی ؎

نہیں اظہار ہو سکتا زباں سے دل کی حالت کا ــــ یہ میرا دل نہیں ہے ایک پیکر ہے محبت کا

مری اِس زندگی، اور موت، اور عہدِ تناسخ میں ــــ تمنا ہے نہ ہو خاموش دل میں سازِ الفت کا

تمہیں رہتے ہو گوکل میں، تمہیں ہو آسمانوں پر

تمہارا ہی مقدس نام ہے سب کی زبانوں پر[1]

المختصر قدیم ہندو تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عورت اپنے شوہر پر جان دیتی تھی۔ وفاداری، فرمانبرداری اور صبر و تحمل میں وہ نمونۂ کمال تھی۔ مرد اپنی عزت اور اپنی ذات و خاندان کی عزت پر فدا تھے۔ اس لئے عورت کو بھی تقدیس اور عزت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ محبت کا جذبہ عموماً عورت میں زیادہ ہوتا تھا۔ لٹریچر میں بھی عورت ہی سچی عاشق مانی گئی ہے۔ مرد اپنی مردانگی کے زعم میں مست تھے۔ اُن کو نہ اُس کی نزاکت کی پروا تھی نہ حسن کا خیال۔ حتیٰ کہ زمانہ گذرنے پر منوجی نے اپنی کتاب "منوسمرتی" میں عورت کی عزت اُس کی پاسداری اور حرمت پر تاکید کرتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ :-

"باپ، بھائی یا شوہر سے عورت کو کبھی علیحدگی نہ حاصل ہونا چاہئے۔ کیونکہ اس کی حسب خواہش علیحدگی اس کے شوہر کے خاندان پر دھبا لگاتی ہے"

دھرم شاستر میں عورت کی تنبیہ و تاکید پر بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر ہم یہاں مقدس رشی کے یہ الفاظ لکھنا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں کہ "جس خاندان میں عورت کا دل دکھایا جاتا ہے اور اُس کو پریشان کیا جاتا ہے وہ تباہ ہوگا اور جس گھرانے میں اس کی عزت اور پاسداری کی جاتی ہے وہ سرسبز ہوگا"[2]

ہم آج بھی ہندوستان میں ہندو عورت سے زیادہ صابر و شاکر کسی قوم کی جنسِ نازک کو نہیں پاتے اُس کے خاندان اور اس کے ماں باپ پر اب بھی "رقمِ ازدواج" اور "جہیز" کے بے بار ڈالے گئے ہیں۔ اس کو ایک شادی کے بعد دوسری شادی سے محروم کیا گیا ہے۔ شادی کے وقت اُس کے ماں باپ کے یہاں بارات کیا آتی ہے گویا "ڈاکوؤں" کا ایک گروہ آتا ہے جو اس کے والدین کو قرضدار ہی نہیں بلکہ فقیر بھی کر

---

[1] گیتا گووند　[2] منوسمرتی

دیتا ہے۔ اس بارِ گران کو برداشت کرنے کے خوف سے اکثر شریف گھرانوں میں اب بھی لڑکی بڑھاپے کی سرحد تک پہنچ جاتی ہے۔ مگر شادی نہیں کی جاتی۔ ابھی ۱۹۱۴ء کا واقعہ ہے کہ ایک شریف مگر غریب بنگالی خاندان کی لڑکی "رسم ورواج کی ملعون زنجیروں سے عاجز آ کر" اور خصوصاً اس قسم ازدواج سے ماں باپ کو بچانے کیلئے جل کر مرگئی[1]۔

غرض محبت اور وفاداری کی سینکڑوں مثالیں ہندو عورتوں نے دنیا کے لئے چھوڑی ہیں۔ اُن کی پاکدامنی کی تصدیق چندر گپت موریا کے عہد میں مگاستھنیز کی زبان سے یونانیوں نے کی، ان کی عفت وعصمت کی مدح دشنا فاہیان کی زبان سے چینیوں نے کی، اُن کی محبت اور وفاداری کو دیکھ کر ابنِ بطوطہ کی زبان سے اہلِ اسلام نے آفرین کہی۔ سچ ہے جمالِ حقیقت کی جھلک ہماری مادی آنکھوں کے سامنے عموماً "لباسِ مجاز" ہی میں ظاہر ہوتی ہے۔ ایسے ہی مظاہر کی ایک قسم جنسِ نازک کا حسن بھی ہے اور چونکہ یہ حسن طبعی اور فطرتی ہے اس لئے صنفِ نازک سے جو گہوارۂ حسن وجمال ہے محبت کرنا، حقیقت کی پرستش کرنا، اور قانونِ فطرت پر قائم رہنا ہے۔

مقبول حسین
احمد پوری

[1] "الہلال" مارچ ۱۹۱۴ء۔

عدم

طلسمِ اعتبارِ خوبئ تدبیر قائم ہے
ابھی ہم اپنی بربادی کو قسمت تو نہیں کہتے

وہ آتے ہیں تو دل میں کچھ خلش معلوم ہوتی ہے
میں ڈرتا ہوں کہیں اس کو محبت تو نہیں کہتے

وقارِ عشق پروانوں کی جانبازی سے قائم ہے
جوانمردی کو اہلِ ہوش وحشت تو نہیں کہتے

سفینہ غرق ہی ملاح نذرِ موج دریا ہے
مرے مولا اسے طوفانِ رحمت تو نہیں کہتے

نکات

اللہ ربّی و ھو حسبی

اس سے خواہش کروں کہ اس سے مانگوں
کچھ بھی حاصل نہیں ہے جب سے مانگوں
پہلے مجھے حق کیا ہے اگر کچھ ہے بھی
حق اپنا سوائے حق کے کس سے مانگوں

وللآخرۃ خیر لک من الاولیٰ

ہر وقت فضائے دل آراستہ دیکھتے ہو
صحرا و چمن ارض و سما دیکھتے ہو
مخلوق میں ہیں نیرنگی خالق دیکھو
قرآن پڑھو جلد کو کیا دیکھتے ہو

الیس اللہ بکاف عبدہٗ

ہر چیز مسبب سبب سے مانگو
منت سے خوشامد سے ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو
بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

حتیٰ یاتیک الیقین

اے حجلہ نشیں ذرا اٹھا دے پردے
دامان نظر تجلیوں سے بھر دے
ہر ذرے میں شان کبریائی دیکھوں
اس چھوٹی سی آنکھ کو کلاں بیں کر دے

امجد
سید احمد حسین

کون!

"یا اللہ، ذرا جی نہیں لگتا، ہر طرف اُداسی چھائی ہے"۔ زہرہ خانم نے ایک کھنڈر کے کنگورے پر سے جھکتے ہوئے اپنے موتی کی طرح چمکنے والے دانتوں کی پوری جلوہ نمائی کرتے ہوئے اپنے دل سے کہا "کیا یہ سہ پہر کبھی ختم نہ ہوگی"؟ اُس کی بے صبر نگاہیں ایک طویل سفید سڑک پر جمی ہوئی تھیں جو سبز پوش بلندیوں اور پستیوں پر سے سانپ کی طرح رینگتی اور بل کھاتی ہوئی آفتابِ عالمتاب کی قدمبوسی کے لئے جا رہی تھی۔ "دِن ڈھلتے ہی اُن کو یہاں سے گذرنا تھا" وہ بولی۔ "یقیناً اب دِن ڈھل چکا ہے"۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ چمکدار آنکھیں چیل کے درختوں کی نازک اور سبز چوٹیوں سے الجھتی ہوئی نیلگون آسمان کے بحرِ ناپید کنار میں تیر رہی تھیں۔ وہ دور جنگل کے سیاہی مائل سبزہ زار کے دامن میں گرد کا ایک ہلکا سا ابر ابھرتا ہوُا دیکھنا چاہتی تھیں، جو لوہے کی جھنکار، پاؤں کی چاپ اور انسانوں کے شور و غل کا پیش خیمہ ہو۔

صبح ایک رضا کار نے اعلان کیا تھا کہ آج بعد از دوپہر اُس کے گاؤں میں سے فوج کا گذر ہوگا۔ خوراک کی ضرورت ہوگی اور شاید رات کو آرام کے لئے بھی بندوبست کرنا پڑے۔ اِس آنے والی دردِ سری سے زہرہ بچ نکلی تھی۔ گاؤں کی لڑکیوں کا اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر سیبوں اور نان و روٹیوں کا اٹھا کر لانا، ماؤں کی جھڑکیاں اور تیز و تند باتیں اُسے ناپسند تھیں، وہ صرف فوجِ ظفر موج اور اُس کے پُرجلال ہلالی علم دیکھنے کی منتظر تھی۔ زندگی میں صرف تین چار بار اس نے دو دو تین تین چار چار سپاہی اپنے گھر کے آگے سے گذرتے دیکھے تھے، مگر اب وہ عساکرِ ملیہ کی اُودی گھٹائیں دیکھنے کی منتظر تھی جن کے خون کی موسلا دھار بارش سے نخلِ ملت پھر شاداب ہو رہا تھا۔ ابھی آفتاب نے بمشکل پہلی منزل طے ہوگی کہ وہ چپ چاپ چوری چوری تیس چالیس کھیت پار گاؤں سے چند میل دُور، عالمِ سکوت میں تنہا، کسی خار دار جھاڑی، کسی کھنڈر، یا کسی درخت کی اوٹ میں چھپ چھپا کر کوچ کرتی ہوئی فوج کے نظارہ سے لطف اندوز ہونے کے لئے چل کھڑی ہوئی۔

آخر لمبی سفید سڑک سے گرد کا ایک ہلکا سا بادل اٹھا، مگر بجائے فوج کے معاً ایک چھوٹی سی موٹر گاڑی نمودار ہوئی۔ چھوٹی سی خاکی موٹر گاڑی، جس کے آگے ایک بالشت بھر کا ہلالی پرچم رقص کر رہا تھا اور خاکی وردی

پہنے ایک شکیل وجمیل نوجوان اُسے چلا رہا تھا۔ زہرہ کو دیکھتے ہی اس نے اپنی بادرفتار گاڑی کو کھڑا کر لیا۔ دوشیزہ کو ایسا محسوس ہُوا گویا اُس کے چہرہ پر رونق آ گئی ہے۔ بجلی کی طرح لپک کر وہ گاڑی سے باہر آیا اور اُس درخت کے پاس پہنچا جس کے پیچھے زہرہ چھپی کھڑی تھی +

"بہن! ہزار معافی کا خواستگار ہوں"۔ اُس اجنبی نے زہرہ کو جھک کر سلام کرتے ہوئے اور متبسم نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ زہرہ کی سحر آفرین آنکھیں اور بلوریں رخسار ایسے نہ تھے کہ انہیں دیکھ کر کوئی شگفتہ خاطر نہ ہو جائے +

"بہن! معافی ـــــ ہزار معافی کا خواستگار ہوں۔ میں راستہ بھول گیا ہوں۔ پتہ نہیں صبح میں نے کس انداز سے نقشہ دیکھا تھا کہ مجھے اپنی جائے قیام تک بھول گئی ہے"۔

"تم کہاں جانا چاہتے ہو؟" زہرہ نے اُس کے خوب صورت چہرے اور سیاہ مونچھوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا اُس نے اپنے قوی کندھوں کو جنبش دیتے ہوئے جواب دیا "کسی جگہ ـــــــ ہر جگہ بہن! تاکہ فوج سے میری مڈبھیڑ نہ ہو جائے"۔

"تم قومی افواج کو دیکھنا پسند نہیں کرتے!" زہرہ موسمِ خزاں کے سنہری پتوں کے درمیان سے اسکی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں بہن! مجھے زمانۂ امن میں ترکی افواج کو دیکھ کر دلی مسرت ہوتی تھی مگر آج نہیں"۔

"میں نہیں سمجھی" زہرہ کے دِل میں ایک چھوٹا سا شبہ حرکت کرنے لگا۔ وہ لوگوں کو جاسوسوں کی بابت باتیں کرتے کئی بار سن چکی تھی +

"یہ تو سمجھتا ہوں" اس سرو قد نوجوان نے محبت آمیز نگاہوں سے اُسے گھورتے ہوئے کہا "میں اُن بدنصیب ہستیوں میں سے ہوں جو دورانِ جنگ میں خبر رسان کہلاتے ہیں"۔

"تم اخبارات کے نامہ نگار ہو؟" وہ چھوٹا سا شبہ ساکن ہو گیا، اور زہرہ کی آنکھوں میں محبت کی شراب چھلکنے لگی

"یا کم از کم اس کوشش میں ہوں" اجنبی نے قہقہہ لگا کر کہا "مگر دورانِ جنگ میں اخبارات مجھ سے بہت زیادہ قابل ادیبوں کی خدمات قوتِ زر سے حاصل کر لیتے ہیں۔ میرے لئے وہاں گنجائش کہاں، میں تو آئے دن یہ دھمکیاں سنتا ہوں کہ مجھے تاریک زندان میں پھینکا جائے گا"۔

"زندان!" زہرہ کے دِل سے ترکی لشکر کی عظمت محو ہونے لگی۔ وہ سرنگوں ہو گئی "یہ کس قدر بے انصافی ہے"

"ہاں ایسے حالات میں ایسی مشکلات ناقابل برداشت ہوتی ہیں" اجنبی نے سگرٹ روشن کیا" اور تمہیں علم ہے ہمیں دوران جنگ میں فوج پر نکتہ چینی نہیں کرنی چاہیئے"+

"مجھے اس میں تامل ہے" زہرہ نے سوچتے ہوئے جواب دیا" تاہم" وہ چلائی "میں بھول گئی—— وہ ابھی یہاں آیا چاہتے ہیں"+

"وہ! ——— کون" ؟ نوجوان یکدم مستعد ہوگیا+

"ترکی عساکر" زہرہ نے کہا - اور وہ حیران تھی کہ وہ کیوں خوف زدہ ہو رہی ہے" وہ غروب آفتاب کے قریب یہاں سے گذریں گے"

"احمق" یہ لفظ طمنچہ کی گولی کی طرح اجنبی کے منہ سے نکلا، اور زہرہ اچھل کر پیچھے ہٹ گئی" مجھے تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا! اور اس کی بجائے مجھ سے باتیں کرتی رہی ہو؟ بتاؤ اب کس طرف جاؤں" ؟ نوجوان کی حالت بالکل بدل گئی - چہرہ زرد ہوگیا آنکھیں خوف زدہ نظر آنے لگیں+

ایک اور سیخ سے زیادہ سرد شبہ زہرہ کے سینے میں بل کھاتا ہوا رینگنے لگا+

"کون ——— کون ——— ہو ——— تم" اس نے رک رک کر کہا - پھر غور سے دیکھا تو اس کے سینہ پر ایک خوفناک پستول لٹک رہا تھا - اور اس کا دل اونی قمیص کے نیچے دھک دھک کر رہا تھا وہ اب بھی تیز و تند آواز میں بول رہا تھا" بتاؤ جلدی بتاؤ ——— کس طرف جاؤں"

"تم کیا معلوم کرنا چاہتے ہو" ؟ اس کے کانپتے ہوئے لبوں سے بمشکل یہ الفاظ نکلے+

"ننھی احمق" وہ غرا کر بولا" مجھے صرف سلامتی کا راستہ درکار ہے" اس کی آنکھیں سفید سڑک کی پیمائش کرنے لگیں - ایک لمحے کے لئے زہرہ کی آنکھیں بھی اسی طرف اٹھ گئیں - پھر اس نے انگلی سے اس سڑک کی طرف اشارہ کیا جو اس کے گاؤں کو جاتی تھی+

"اس طرف سے" اس نے مستعدی سے کہا" وہ آئیں گے"+

"بس" ایک لمحے کے لئے اس نے زہرہ کو کچھ اس طرح دیکھا، گویا اس کی آنکھیں روح کی گہرائیوں تک جا رہی ہیں - مگر وہ ان متجسس نگاہوں کے سامنے ذرا متزلزل نہ ہوئی+

آخر اجنبی نے آنکھیں جھکا لیں - گویا اسے تشفی ہوگئی ہے" مجھے واپس جانا چاہیئے" وہ لپک کر اپنی گاڑی تک پہنچ گیا جس پر ترکی علم ہوا سے تھرتھرا رہا تھا - گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی اس طرف روانہ ہوگئی جس

طرف زہرہ کی آنکھیں لگی تھیں۔ زہرہ کی سیاہ آنکھوں نے دُور تک اُس کا تعاقب کیا۔" اللہ جانے کیا ہوگا۔ یہ جاسوس فوج کے قابو آجائے گا۔ سپہ سالار کے پیش کیا جائے گا، اور وہ اُسے ———" +

ننھی زہرہ کے دماغ میں کئی خیال گھوم رہے تھے مگر ابھی فوج نہ آئی تھی +

آفتاب سیاہ پہاڑوں کے پیچھے غائب ہوگیا اور خون آلود آسمان سے سیاہ سائے برسنے لگے۔ وہ گوری سڑک سانولی پڑگئی۔ زہرہ کے کانوں میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی سی خفیف آواز آئی۔ جنگل میں سے گرد کے چھوٹے چھوٹے بادل ابھرنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد یہ بھنبھناہٹ پاؤں کی چاپ بن گئی اور پھر فوج زلفِ پیچاں کی طرح بل کھاتی ہوئی سامنے سے گذرنے لگی۔ اس کی آنکھیں گرد آلود سپاہیوں کو نہ دیکھتی تھیں نہ کان اُن کے ہنسی مذاق کو سنتے تھے۔ اس کے دل میں صرف حسین اجنبی کا تصور تھا۔" انہوں نے اس سے کیا سلوک کیا ہوگا" اور ابھی یہ خیال اُس کے دل میں چٹکیاں لے رہا تھا کہ وہ بھی اُس کے سامنے سے گذرا +

آنکھیں زمین میں گڑی ہوئی تھیں، اور چہرے پر موت کی سی مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ دونوں ہاتھ پشت پر بندھے تھے، اور دونوں پہلوؤں پر مسلح پہرہ دار چل رہے تھے، پیچھے خالی موٹر کار بھی، زیرِ حراست تھکی ماندی مکھی کی طرح بمشکل رینگ رہی تھی۔

سب سامنے سے گذر گئے۔ یکایک زہرہ کی سیاہ آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک دریا بہ نکلا۔" میری رائے میں جاسوس ایسے خوشرو نہیں ہونے چاہئیں"۔ زہرہ نے درخت کے سخت تنے پر اپنی نازک پیشانی رکھ کر روتے ہوئے جی میں کہا:۔

اس کے ایک سال بعد زہرہ اپنے مکان کے دروازے میں کھڑی اُسی سڑک کے دلفریب منظر سے لطف اندوز ہو رہی تھی کہ سامنے سے خط رساں نمودار ہوا ——— زہرہ نے لرزتی ہوئی انگلیوں سے خط کھولا +

" اناطولیہ

میری بہن زہرہ۔

میں تمہیں اپنی چھوٹی بہن سمجھ کر ایک ہزار پونڈ کا نوٹ بھیجتا ہوں۔ مجھے امید ہے تم قبول کر لوگی۔ یہ تمہاری اُس قومی خدمت کا حقیر ترین انعام ہے جو تم نے ایک جاسوس کو گرفتار کراکے ادا کی تھی اور وہ جاسوس میں ہی تھا +

تمہارا بھائی
مصطفےٰ کمال"

خواجہ عبدالکریم

سکوتِ نیم شب

گذر گئی نِصف شب ستارے اُسی طرح جھلملا رہے ہیں
فلک کے زرّیں نگار خانے میں اپنے جلوے دکھا رہے ہیں

فضاؤں میں منجمد ہیں نغموں کے سیل آشوبِ حُسن بن کر
ہواؤں کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے بہارِ جنت لُٹا رہے ہیں

سکوت کی بے پناہ محویّتوں میں ڈوبی ہوئی ہے دُنیا
سکوت کے میٹھے میٹھے نغمے جہاں کو بے خود بنا رہے ہیں

یہ معرفت پردۂ طلسمِ جمال بن کر ڈھلک رہی ہے
کہ فرش پر عرش کے مکیں چاندنی کی نہریں بہا رہے ہیں

وہ چرخ کی نیلی نیلی جھیلوں میں چاند کا زر نگار بجرا
وہ چشمۂ نور جس کے سیلاب میں فرشتے نہا رہے ہیں

وطن سے دُور ایک اجنبی سر زمین میں یہ جمیل منظر
مری نگاہوں سے خواب کی مستیوں کا جادو اڑا رہے ہیں

خیال کی سحر کار کیفیتوں میں معدوم ہو گیا ہوں
خیال مضراب بن کے دِل کا حسین بربت بجا رہے ہیں

کوئی ستمگار یاد آ کے دِل میں نشتر چبھو رہا ہے
خبر نہیں جس کو یاد کرتا ہوں جاگتا ہے کہ سو رہا ہے

عدمؔ

گدھے

ایک گیہوں کے کھیت پر گدھوں کا ایک جھنڈ اُترا۔

میں اس غول کے سب سے بڑے اور بزرگ صورت گدھے کے پاس پہنچا اور ہمکلام ہوا۔ بدقسمتی سے یہ گدھا فلسفی نکلا۔ گول گول آنکھیں اس کے عمیق غور و فکر کا اظہار کر رہی تھیں۔ بڑا سا گنجا سر، پچکے ہوئے رخسار، بھدی اور نامطبوع خمیدہ چونچ اور لبوں پر تبسم کے فقدان نے مجھے اچھی طرح یقین دلا دیا کہ ایک روکھے فلسفی سے پالا پڑا ہے۔ متوقع طور پر اس فلسفی کی گفتگو بھی غیر دلچسپ اور اکتا دینے والی تھی +

میں نے مسکرا کر بوڑھے گدھے سے کہا: "کہتے ہیں کہ گدھوں کی عمریں بہت بڑی بڑی ہوتی ہیں۔ علماءِ تاریخِ طبعی نے آپ کی عمروں کے بڑے بڑے تخمینے لگائے ہیں۔ خدا تمہیں نظرِ بد سے بچائے اپنی عمر تو بتاؤ"؟

دانشمند گدھے نے مجھے اپنی گہری سنجیدہ نظروں سے بہت دیر تک دیکھا۔ پھر سر کو ایک فلسفیانہ جنبش دی اور حکیمانہ انداز میں کہا "میری عمر تین سو اسی برس کی ہے!"

میں ہکا بکا ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا، اور فرطِ تعجب سے بولا "تین سو اسی برس! اوہ! پناہ بخدا! میں نے اتنی عمر کسی کی نہیں سنی! کاش یہ "عمرِ خضر" مجھے مل جاتی! میں ان چار صدیوں میں کیا کیا کچھ نہ کرتا! دنیا کو اپنی قابلیت سے مرعوب کر دیتا اور اتنا روپیہ کماتا کہ شمار میں نہ آسکتا!

میں ذرا ٹھیر گیا۔ میرا سر چکرا رہا تھا +

"اے گدھوں کے جدِ امجد! بتا تو نے اس طویل فرصت کا کیا کیا"؟

بوڑھے گدھے نے اپنے نظری استغنا اور سنجیدگی سے جواب دیا "حضرتِ انسان! میں نے اس مدت میں کچھ نہیں کیا! کھایا، پیا، سویا اور افزائشِ نسل میں مشغول رہا!

میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی اور چلایا۔ ہائے کمبخت تو نے کیا کیا! اتنا عرصہ دنیا میں رہا اور سوائے نفس پرستی کے تو نے کچھ نہیں کیا! افسوس! لعنت ہو تجھ پر! تو جیسا جاہل پیدا ہوا تھا ویسا ہی عمر بھر کندۂ ناتراش رہا!

میں چپ ہو گیا اور فرطِ غضب میں میرے گلے سے آواز تک نہ نکلتی تھی +

گدھے نے اپنے سر کو اٹھایا اور گوشت کے اس بھاری بھرکم لوتھڑے کو جنبش دے کر کہا "اے انسان!

عقل ودانش و علم اور حکمت کا تعلق عمر سے نہیں تعلیم و تربیت سے ہے۔ دور کیوں جاؤ اسی چین کو دیکھو کتنے عرصہ سے دنیا میں ہے مجھ سے تو زیادہ عمر رسیدہ ہے۔ مگر کتنا جاہل ہے۔ آج تک کو دن لوگوں کا مسکن ہے ﴿

بوڑھے گدھ کا جواب معقولیت پر مبنی تھا، اور میرے خاموش کرنے کو کافی، مگر میں بیحد برافروختہ ہو رہا تھا اور جوش کی وجہ سے دماغ کو اس قدر سکون میسر نہ تھا کہ کسی غور طلب مسئلہ پر کچھ سوچ سکے، اس لئے میں نے بوڑھے گدھ کو حاسدانہ نظروں سے دیکھا، اور دانت پیس کر کہا "تین سو اسی" کاش میں تیری جگہ ہوتا! اتنی عمر کسے نصیب ہوتی ہے! ایک لا متناہی زندگی! عرفانی اور ارضی فردوس! میں اگر تیری عمر پاتا تو دنیا کے ہر علم و فن کا ماہر ہو جاتا۔ کم از کم تیس مرتبہ تو شادی کرتا۔ کوئی صنعت نہ ہوتی جس میں میرا دخل نہ ہوتا۔ کوئی وقیع اور بڑا عہدہ نہ ہوتا جسے میرے قدم سے شرف نصیب نہ ہوتا۔ غرض اتنی دولت کا مالک ہوتا کہ کسی کے خواب میں بھی نہیں آسکتی! بیوقوف و بدنصیب گدھ تیری حالت پر افسوس بلکہ تف ہے! تو بیٹھا ہؤا سر کیا ہلا رہا ہے، احمق! اگر تو کسی بنک میں ایک روبل بھی جمع کرا دیتا اور اس پر سود در سود لیتا تو ۲۸۳ سال بعد تیرے پاس دس لاکھ روبل ہو جاتے! اُف! خیال کر ذرا، تیرے دماغ میں، معلوم ہوتا ہے، گوڈر بھرا ہؤا ہے، ذرا زور نہیں ڈالتا، سوچ اگر اتنا روپیہ آج تیرے پاس ہوتا تو تُو کھیتوں میں دانے کے لئے نہ ترستا پھرتا۔ شرم ہے بڈھے احمق! ﴿

مجھے گدھ کی چونچ کے گرد ایک ہلکی سی سُرخی دکھائی دی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ غیرت کے غصے کی سرخی ہے اور اسے میری بات بُری معلوم ہوئی ہے ﴿

اُس نے سر ہلایا اور کہا "ہرگز نہیں! حضرتِ انسان! آپ ہم پر غلط الزام رکھتے ہیں۔ میں نے اپنی چار سو سال کی زندگی میں گدھوں میں حماقت کے اتنے مظاہرے نہیں دیکھے جتنے حضرت انسان اپنی ساٹھ سال کی عمر میں قدم قدم پر کرتے ہیں میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ گدھوں نے باہمی جنگ کی ٹھانی ہو، اور ایک دوسرے کے خلاف ریشہ دوانیاں یا اعلاناتِ جنگ کئے ہوں، فوجیں مرتب کی ہوں اور خون بہایا ہو ———
خون بہایا ہو اور اپنے ہم جنسوں کو غلام بنایا ہو! افسوس! تم ہی انصاف سے جواب دو کہ زندگی کا کونسا سال بغیر لڑے بھڑے چلا جاتا ہے! ہماری قوم میں نہ چور ہیں نہ ڈاکو نہ قاتل۔ ہم میں نہ حسد ہے نہ بغض و کینہ، اور نہ ہم نے شاعری، ادب اور انشا پردازی کا کبھی جھوٹا دعویٰ کیا ہے۔ ہم میں سے کوئی کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ اس تین سو اسی برس کی عمر میں میں نے کبھی نہیں سنا کہ کسی کی بیوی نے اپنے شوہر سے بیوفائی کی ہو۔ خیانت

کی ہو، اور اُس کی زندگی تلخ کی ہو"!

لیکن تم انسانوں کا کیا حال ہے۔ گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو۔ باوجود علم وحکمت کے ان بلند بانگ دعووں کے تم ظالم ہو جابر ہو اور اپنی نسل پر ایک لعنتِ پائدار، ایک ابدی سوز! دیکھو خدا نے ہمیں ان تمام برائیوں سے بچایا اور اپنے حفظ وامن میں رکھا۔ مگر تم ہمیشہ ان میں مبتلا ہو، ہماری قوم غداروں، جھوٹوں، منافقوں اور ظالموں سے یکسر خالی ہے۔ ہم میں کوئی مذہبی پیشوا نہیں۔ ہمارے درمیان خدا کے نام پر لڑائی نہیں ہوتی۔ ہم مراقبہ اور خداترسی میں اپنی زندگی چپ چاپ گذار دیتے ہیں۔ مگر تم..........."

بوڑھا گدھ ابھی یہیں تک کہنے پایا تھا، کہ پشت پر سے ایک آواز آئی "دادا جان! ذرا یہاں آنا دادی اماں بُلا رہی ہیں"!

آواز سنتے ہی گدھ اُڑ گیا اور میں متحیر کھڑا رہ گیا +

(چیخوف)

ظفر قریشی دہلوی

زندگی

ایک دن میں زندگی سے دوچار ہُوا
وادیٔ تاریک میں
"زندگی"! میں نے چلّا کر کہا
"میں تجھ سے بیزار ہوں
اور تیرے ابدی شباب سے بھی۔
دیکھ!
تُو ابھی نوجوان اور حسین ہے
اور میں ——— میں ضعیف و بدشکل۔
سنگدل عمر نے اپنے بے رحم اور سخت گیر
ہاتھوں سے میرے چہرے پر غم کی جھریاں ڈال دی ہیں
اور افکار کے بوجھ نے میری کمر خم کر دی ہے +

اے زندگی!
اب میں تیرے ساتھ ہرگز نہ چلوں گا
شوق کے پر لگے ہوئے قدموں سے ——— اُس رستے پر
جو کبھی "سنہری لمحوں" کے میدان سے ہو کر گزرتا تھا
جا!
کیوں کہ میں اب تجھ سے تنگ آ چکا ہوں،
اور موت کی ملاقات کا خواہشمند ہوں"
زندگی نے حیران آنکھوں سے میری طرف دیکھا
"میں موت ہوں" وہ بولی
اور میں اُس کے قدموں پر گر پڑا
اُس کی روشنی سے چندھیا کر۔

تنویر قریشی

نوائے مضطر

آج قصّہ تمام کرتا ہوں
اُن سے قطعِ کلام کرتا ہوں

میری جانب بھی ہو نگاہِ کرم
بندہ پرور سلام کرتا ہوں

میں کہاں اور کہاں وصال اُن کا
آرزو ہائے خام کرتا ہوں

اب وہ ملتے بھی ہیں تو میں مضطر
دُور ہی سے سلام کرتا ہوں

شکوۂ جور کا خیال نہ کر
عشق کی روح پائمال نہ کر

تو جو راضی ہے تو مجھے کیا غم
میرے غم کا ذرا ملال نہ کر

عرصۂ حشر میں ذلیل نہ ہو
اے گنہگار! انفعال نہ کر

بخدا ہم پہ ترکِ اُلفت کا
بھول کر بھی تو احتمال نہ کر

وہی حاجت روا ہے اے مضطر
تو کسی اور سے سوال نہ کر

رام رتن مضطر

نغمۂ انسانیت

تُو میرا بھائی ہے، چینی ہو یا عربی، بودی ہو یا یہودی، دوست ہو یا دشمن، نیک ہو یا شریر، صالح ہو یا طالح....

تُو میرا بھائی ہے . . . . اور میں تجھ سے محبت کرتا ہوں، تُو خوش ہو یا ناخوش! میں تیرا بھائی ہوں اور تُو میرا بھائی ہے، اگرچہ نہ میں نے تجھ کو دیکھا اور نہ تو نے مجھ کو....

میرے دِل میں بہت کچھ بھرا ہے۔ جس کو میں تیرے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں، دُور ہوں یا نزدیک، کہنے کی جو باتیں میرے دِل میں موجزن ہیں، اگر وہ نکلنے کی کوئی راہ پائیں تو جس طرح نور فضا کے ہر گوشہ پر چھاجاتا ہے اسی طرح سارے عالم پر چھاجائیں۔

آہ! تُو میرا بھائی ہے۔ لیکن تو اس حقیقت کا اعتراف نہیں کرتا۔ تیرے دِل میں بغض وحسد کے آثار ہیں....

تُو جب اپنی مطلمئن اور آسودہ نیند میں آدھی رات کو مزیدار خواب دیکھتا ہے تو میں اُس وقت جاگتا ہوں تاکہ تجھے رات کی خاموش فضا میں یہ کہہ کر پکاروں کہ

تُو میرا بھائی ہے....

لیکن آہ! یہ کثیف پردے ——— (مادۂ عمیا کے پردے) ——— میرے دِل کی راہوں اور تیرے کانوں کے بیچ میں حائل ہوجاتے ہیں اور تُو میری اس آواز کو نہیں سُنتا۔

اے بھائی! یہی وہ کثیف اور مظلم پردے ہیں جن کی وجہ سے نہ تو مجھ کو دیکھتا ہے اور نہ میرے وجود کو محسوس کرتا ہے.......... تو یہ خیال کرتا ہے کہ ہم لوگوں کے درمیان کوئی ایسی محدود مسافت نہیں ہے جیسی مشرق ومغرب کے بیچ میں..........

آہ! تو میرا بھائی ہے.... اور وہ سب جو اس راہ پر چلتے ہیں بھائی ہیں....

جب ہم ناخوش وناراض ہوتے ہیں..

جب منفصل وجدا ہوتے ہیں..

جب تباین و تنافر ہوتے ہیں . .

تو زندگی ایک بلند ٹیلے پر چڑھ کر ہم کو عطف و مواساۃ، اخوت و محبت کی نگاہوں سے دیکھتی ہے اور ہماری حماقت پر ہنستی ہے . . . . .

ابتدا میں ہم ایک ہی اصل سے پیدا ہوئے . . . . .

ظہور کے وقت ایک ہی مظہر سے ظاہر ہوئے . . .

اور چلنے کے وقت ایک ہی راہ پر چلے . . . . .

لیکن آہ! ہم میں افتراق پیدا ہوگیا اور ہم خارجی موثرات سے متاثر ہو کر مختلف ہوگئے . . .

ایک ہی افق سے ہم سب اپنے ہاتھوں کا کنگن جوڑے ہوئے نکلے . . . .

اور ایک ہی ساتھ سب آفتاب کے گرد ایک چھوٹے سے تارے پر گھومے . . .

اور ایک ہی ساتھ مختلف اوقات میں موت کے دروازے پر رقص و سرود میں مصروف رہے . . . .

اور ایک ہی ساتھ ہم نے شعاعوں سے گرمی اور نور سے فرحت حاصل کی، اور ربیع کی نشاط انگیز بہاروں اور خریف کی مرطوب ہوا کے جھونکوں سے برابر برابر لذت یاب ہوئے . . .

اور عنقریب ہم سب ایک ہی دروازے سے یکے بعد دیگرے نکل جائیں گے . . .

اور مادرِ ارض کی گودی میں ہمارے بدن پہلو بہ پہلو لٹا دیئے جائیں گے . . .

اے بھائی! میں تنہائی میں تجھ پر بہت رویا، اِس لئے کہ میں نے تجھ کو دیکھا کہ تو ننگی تلوار لئے جا رہا ہے تاکہ اپنے پڑوسی سے جنگ کرے اور اپنے بھائی سے دشمنی . . .

رات کے سکون میں میری آنکھوں نے تجھ پر بہت آنسو بہائے اس لئے کہ میں نے دیکھا کہ تو چشموں میں گھستا اور ٹیلوں پر چڑھتا ہے تاکہ اپنے موطن کو ذبح کر ڈالے . . . . . . کیونکہ اس کا دین، تیرے دین کے علاوہ اور اُس کی رائے، تیری رائے کے خلاف ہے . . . . .

اے بھائی! اندھا حسد، بہری عداوت، گونگی دشمنی، کھوکھلا غرور، پاگل حقد یہ سب دنیا کے وہ بدترین مظاہر ہیں جن سے باز رہنے کی "انسانیت" تجھ کو ہدایت کرتی ہے . . . .

آہ! یہ حقیقت تو کب جانے گا کہ تمام بنی بشر تیرے "بھائی" ہیں؟

بدر اصلاحی

ہستی

میرے فرزند! یہ ہوگی تری سعیِ ناکام
کہ تو ثابت کرے ہستی کا وجود اور قیام
یہ بھی دشوار ہی کہنا کہ "یہ دنیا کیا ہے"
گامزن جس میں ہے تو صبح سے لیکر تا شام
"صرف اک جسم ہے" تو یہ بھی نہیں کہہ سکتا
یہ بھی ممکن نہیں ہرگز کہ "تو ہے روح تمام"
یہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ "جدا ہے ان سے
دور از فہم ہے" یہ تجھ میں ہے دونوں کا قیام

کیونکہ جو بات کہ ثابت نہیں کی جا سکتی
اسمیں کوشاں ہے کوئی تو یہ سودا ہے خام
ایسی حالت میں یہ لازم ہے بفتوائے یقیں
شبہ کے پہلوئے روشن پہ نگہ رکھ تو مدام
معتقد بلکہ تو اس ہستیِ بالا کا رہ
ہے عقیدوں کے مراسم سے اُدھر جس کا مقام

(ٹینی سن)

شاد عارفی رامپوری

طائرِ مہجور

سرمازدہ شاخ پر اکیلا
دیکھا اک غمزدہ پرندہ
تھی یاد کسی کی اُس کے دل میں
اور سر کو جھکائے چُپ تھا بیٹھا
چلتی تھی ہوائے سرد اوپر
نیچے اک بہ رہا تھا دریا
سوتے تھے درخت اور زمیں پر
سبزے کا نشان تک نہیں تھا
طاری تھا سکوت اک فضا پر
پن چکی کی وہ اُداس آواز
اس عالمِ خامشی میں گویا
لگتی تھی جگر پہ تیر بن کر
القصہ وہ غمزدہ پرندہ
بیٹھا تھا یونہی اداس تنہا

(شیلی)

حفیظ ہوشیارپوری

نئی کتابیں

تاریخ نثرِ اردو، حصّہ اوّل، مرتبہ حضرت احسن مارہروی، اردو لیکچرار مسلم یونیورسٹی، علیگڈھ، اس کتاب میں اردو نثر کی ابتدا سے لے کر اب تک کے تاریخی حالات اور مختلف انداز و اسالیبِ بیان کے نمونے بلحاظ مختلف ادوار ترتیب دیئے گئے ہیں۔ یہ نمونے ہر شعبہ کے مسلم الثبوت اور مشاہیر اہلِ قلم کی تحریروں سے اخذ کئے گئے ہیں اور کوشش کی گئی ہے کہ مذہبی، اخلاقی، سیاسی، قانونی، اخباری، تقریری اشتہاری غرض وہ تمام نمونے اس میں جمع ہو جائیں جو ایک علمی اور زندہ زبان کو وقیع بنا سکتے ہیں۔ اس کتاب کو پڑھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ اب سے ساڑھے پانچ سو برس پہلے اردو تالیفات و تصنیفات کا اندازِ تحریر کیا تھا اور عہدِ حاضر تک کیا کیا ارتقائی شکلیں پیدا ہوئیں، اور یہ ایک ایسی خصوصیت ہے کہ اردو کی تاریخ کے متعلق اس وقت تک جتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں ان میں اس کتاب کو ممتاز کرتی ہے۔ یقیناً احسن صاحب نے اس کتاب پر بڑی محنت کی ہے اور اہلِ ذوق کو چاہیئے کہ اس کی پوری پوری قدر کریں۔ حجم پونے سات سو صفحات، قیمت کاغذ قسم اوّل مجلد پانچ روپے کاغذ قسم دوم مجلد چار روپے۔ طلبہ سے قسم اوّل چار روپے۔ قسم دوم تین روپے۔ حضرتِ مصنف سے طلب فرمایئے۔

گنجینۂ تحقیق — یہ جناب سید محمد احمد صاحب بیخود موہانی، ایم۔ اے پروفیسر شیعہ کالج، لکھنؤ کے پانچ انتقادی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ابتدا کے تین مضمون غالب کے متعلق ہیں پہلے مضمون میں دیوانِ غالب کی نو شرحوں کے متعلق اجمالی رائے اور غالب کی ایک غزل کا حل ہے دوسرے میں مذکورہ مضمون پر اودھ پنچ کے اعتراضات کا مدلل جواب دیا گیا ہے، تیسرے مضمون میں کسی نقاد کے اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ غالب نے اساتذۂ ایران و ہند کے مضامین کا سرقہ کیا، چوتھے مضمون میں شرحِ قصائدِ خاقانی نوشتۂ حضرت شادان لکھنوی پر ایک نظر ڈالی ہے اور شادمان لکھنوی اور شادان بلگرامی کی شرحوں کا موازنہ کیا ہے۔ پانچویں مضمون میں "اصلاحِ سخن" مرتبہ حضرتِ شوق سندیلوی کی ایک غزل پر مبصر لکھنؤ کی تنقید کا جواب دیا ہے۔ پانچوں مضامین بڑی تحقیق اور بسط و تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔ ہمارے خیال میں "گنجینۂ تحقیق" ایک بہترین تنقیدی کتاب ہے۔ نہایت اچھی چھپی ہے۔ حجم ۳۳۵ صفحے۔ قیمت درج نہیں۔ جناب مصنف سے دستیاب ہوتی ہے۔

دنیائے راز — مولٰنا ابوالفاضل راز چاندپوری کی قدیم و جدید طرز کی منتخب نظموں کا مجموعہ ہے۔ حضرت راز کی ذات ناظرینِ ہمایوں سے کسی مزید تعارف کی محتاج نہیں، ان کی نظمیں اور غزلیں اس حلقے میں کافی مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ تاثیر دلکشی اور روانی ان کے کلام کی ایک عام خصوصیت ہے، لیکن دنیائے راز جیسا منتخب مجموعہ اردو شاعری میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ حجم ۱۱۲ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ، جنابِ طالب چاندپوری، بانس منڈی کانپور۔

افلاس اور بیکاری کی مشکل حل ہو گئی

ہم کس طرح راحت اور مسرت کی زندگی بسر کر سکتے ہیں؟

اگر آپ دولت عزت اور شہرت کے طلبگار رہیں تو ایک ایسے مشیر یا رہبر کی خدمات حاصل کیجیے جو آپ کو بیکاری اور ناداری کے روح فرسا عذاب سے بچائے اور راحت اور مسرت کے اعلیٰ مقام تک پہنچائے۔ "کامیاب زندگی" (مترجمہ چودھری غلام حیدر خان صاحب سابق مدیر ترجمان و صداقت کلکتہ) جو امریکہ کے ایک مشہور ماہر اقتصادیات کی زندگی بھر کے تجربات کا نچوڑ ہے۔ اور جس کا ہر فقرہ ہر صفحہ اور ہر بات پڑھنے والے کے دل میں قوت عمل کا ایک زبردست احساس پیدا کرتا ہے۔ آپ کو بتائیگی۔ کہ آپ کس طرح معاش کے حصول میں کامیاب ہو سکتے ہیں کس طرح اپنے کاروبار کو ترقی دے سکتے ہیں۔ کس طرح اپنی شخصیت کو نمایاں اور ممتاز کر سکتے ہیں۔ اور کس طرح اپنی روزمرہ کی مشکلات پر غالب آ سکتے ہیں۔

کامیاب زندگی میں دور حاضرہ کی جدید جد و جہد اور کشمکش سے بطریق احسن عہدہ برآ ہونے اور زندگی کو ہر شعبہ میں کامیاب بنانے کے لئے ایسے بصیرت افروز مضامین اور تیر بہدف نکتے درج ہیں، ناممکن ہے کہ آپ ان پر عمل کریں اور پھر ناکام رہیں۔ کامیاب زندگی کے مطالعہ سے یقینی طور آپ کی زندگی میں حیرت انگیز انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ آپ یہ معلوم کرنا اپنا فرض سمجھیں کہ آپ کیا ہیں اور آپ کو کیا ہونا چاہیئے؟ زمیندار، انقلاب، سیاست، مدینہ کشمیری، میونسپل گزٹ، نیرنگ خیال، ہمایوں، تعلیم و تربیت، پنجاب و شیرزی جرنل نے اس کتاب پر بہترین الفاظ میں تبصرہ کیا ہے۔ کتابت طباعت کاغذ کے لحاظ سے کتاب دیدہ زیب ہے۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۸ ضخامت تقریباً پونے تین سو صفحے قیمت بلا جلد ایک روپیہ بارہ آنے (عہ ۱۲) مجلد ۲ محصولڈاک بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ:- مینجر صداقت بک ڈپو بیرون شیراں والہ دروازہ لاہور

مخزنِ نعمت

جس میں ہر قسم کے ماکولات مثلاً ہر قسم کے سالن ہر طرح کی سبزیاں۔ شدیگ قسم قسم کے پلاؤ، زردہ متنجن۔ بریانی۔ دو پیازے قسم قسم کے کباب۔ بھرتے، دالیں پھلی بڑے وغیرہ وانواع و اقسام کے مقوی حلوے۔ کئی قسم کی کھیریں اور کھچڑیاں۔ سویاں پڈنگ قسم قسم کے نان پراٹھے۔ دوپڑ۔ پوری۔ کلچہ۔ باقرخانی پھینی، کیک، بسکٹ طرح طرح کی خستہ اور لذیذ مٹھائیاں مثلاً بلوشاہی۔ جلیبی۔ شکرپارہ۔ کھجور۔ گلاب جامن۔ قسم قسم کے لڈو۔ گلگلے۔ پیڑے برفی۔ قلاقند۔ ریوڑی۔ گزک۔ رس گلے۔ الائچی دانے۔ اکبریاں۔ اولہ۔ اندرسہ وغیرہ اور انواع اقسام کے مفرح اور خوش ذائقہ شربت بادام۔ سیب انار خشخاش۔ شہتوت۔ لیموں۔ صندل۔ نیلوفر گلاب۔ بنفشہ۔ عناب۔ سکنجبین تیار کرنے کی ترکیبیں درج ہیں۔ ہر قسم کے اچار اور ہر طرح کے مربے تیار کرنا۔ نیز بگڑے ہوئے کھانوں کو درست کر لینا۔ مچھلی کا کانٹا گلانے کی ترکیب۔ تازہ اور باسی دودھ کی پہچان۔ گندے انڈوں کی شناخت مکھن گھی اور پنیر کے متعلق ہدایات۔ کھانا کھانے اور کھلانے کے پسندیدہ طریقے اور آداب درج ہیں۔ قیمت ایک روپیہ (عصر) مع محصول وغیرہ

پتہ:- دفتر مخزنِ نعمت پوسٹ بکس نمبر ۱۳۱ لاہور

خزانہ

آپ سمجھتے ہیں کہ آپ سب کچھ
جانتے ہیں مگر وہ آدمی یقیناً بہت
زیادہ جانتا ہے جس نے ایک سو (۱۰۰)
کتابوں کے مطالعے کے علاوہ پانچ ہزار
شادی شدہ عورتوں کے تجربات اور
خیالات کو جمع کر کے ہدیت نامہ خاوند
باتصویر کے ۲۰۰ صفحوں میں سب کا
نچوڑ دیدیا ہے۔ قیمت معہ سنہری پختہ
جلد صرف ایک روپیہ ڈاک خرچ ۴/
پسند نہ آوے تو حلفیہ قیمت واپس ہوگی

کوی راج ہرنام داس بی اے لاہور

لڑکے اور لڑکیوں کا مفید اخلاقی ورزشی رسالہ

یہ رسالہ آج کل کے مخرب اخلاق مشاغل مثل سینما۔ تھیٹر۔ ناچ گانوں کی شرکت اور مخرب اخلاق لٹریچر کے مطالعہ کے نقصانات اور بیڑی سگرٹ نوشی وغیرہ جیسی تباہ کن عادات کی برائیاں ظاہر کرتے ہوئے آپ کو صحیح معنوں میں حکیم بھی بنا دیتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے وہ باتیں اور نکات معلوم ہوتے ہیں جو برسوں ڈاکٹروں اور اطبا کی خدمت کرنے سے بھی حاصل نہیں ہو سکتے۔ حکمت دواؤں میں نہیں۔ ہے نہ اندھا دھند ٹانکوں کے استعمال کرانے میں ہے۔ حکمت صرف حکمت سے اصول حفظان صحت کے مدنظر ہوا۔ غذا۔ ورزش و دیگر قدرتی وسائل کے ذریعہ صحت حاصل کرنے اور دوسرے مریضوں کا علاج کرنے میں ہے۔ جن قیمتی معلومات کا یہ رسالہ خزینہ ہے انکے لحاظ سے اس کا سالانہ عام چندہ جو تین روپیہ ہے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ یہ رسالہ مقررہ تعداد میں شائع ہو کر تقسیم ہو جاتا ہے خواہشمند احباب قبل از قبل ترسیل چندہ اپنا نام رجسٹر کرالیں تو آرڈر کی تعمیل ممکن ہے سالانہ چندہ تین روپیہ طلبا سے عہ/

مینیجر رسالہ "ورزش جسمانی" نارائن گوڑہ۔ حیدرآباد دکن

اکمل سرپ یعنی شربت سبز رجسٹرڈ

اس کی پہلی ہی خوراک ہر ایک قسم کی کھانسی کو دبا دیتی ہے۔ کف کو پتلا کرتی ہے۔ بُری کھانسی جس کے ساتھ خون۔ بلغم۔ پیپ کف آتا ہو اور ساتھ ہی دم بھی پھولتا ہو۔ اور نیز نزلہ ہو یا زکام۔ خونی دست آتے ہوں +

ننھے بچوں کی کمزوری کو جو سبز رنگ کے دستوں سے دانت نکالنے کے زمانے میں یا کسی اور سبب سے اور دماغی کام کرنیوالوں کو جن کو نزلہ یا زکام اکثر ستاتا ہو سبز شربت کے استعمال سے بالکل آرام ہو جاتا ہے۔ اور زیادہ خوبی یہ ہے کہ ہر ایک طبیعت کے موافق ہے۔ گرم بالکل نہیں ہے۔ بلکہ معتدل سبز شربت بہت ہی خوش ذائقہ اور لذیذ ہے بچوں اور بوڑھوں کے موافق ہے۔ کیونکہ ہندوستان کی ادویات سے تیار کیا ہوا ہے۔ ہم دعوےٰ سے کہتے ہیں کہ جتنا سبز شربت مذکورہ بالا امراض کو مفید ثابت ہوا ہے دوسرا نہ ہوگا پرچہ ترکیب استعمال ہمراہ ہوگا (قیمت فی شیشی خورد ۱۰؎ قیمت فی شیشی کلاں ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصول ڈاک +

ملنے کا پتہ منیجر اکمل یونانی شفاخانہ۔ باغیچی صمدو اندرون اکبری دروازہ لاہور

مردہ عزیزوں سے

ملاقات اور بات چیت گھر بیٹھے کر لو

یہ نو ایجاد آلہ سپرٹس ورکنگ پلانچٹ جس کے ذریعہ ہم خود اکیلے ہر ایک سوال کا جواب لے سکتے ہیں۔ ایک امریکن دماغ کی اختراع ہے۔ آلہ کے استعمال میں کسی دوسرے آدمی کی ضرورت نہیں جونسی روح آپ چاہیں آلہ میں حاضر ہو کر آپ کے سوالوں کا جواب درست دیگی۔ معمولی لکھا پڑھا ہر عمر ہر مذہب کا آدمی لے سکتا ہے۔ نہ کچھ پڑھنا پڑتا ہے اور نہ ہی کسی چلہ کشی کی ضرورت ہے، عالم بالا کے حالات معلوم کرنا۔ گمشدہ کا پتہ لگانا۔ چوری کا سراغ معلوم کرنا۔ دشمن سے بدلہ لینا۔ مقدمات میں فتح پانا۔ سخت سے سخت حاکم سے حسب دلخواہ کام نکلوانا۔ دور دراز فاصلہ پر ایک سیکنڈ میں خبر بھیجنا۔ حسب دلخواہ نوکری یا روزگار حاصل کرنا۔ بند لفافوں کی عبارت پڑھنا۔ مقفل صندوق یا مکان کے اندر کی اشیا، معلوم کرنا وغیرہ ہزاروں کام ہو سکتے ہیں۔ اس نایاب چیز کا ہر گھر میں ہونا لازمی ہے۔ اصل قیمت پانچ روپیہ لیکن تھوڑے عرصہ کیلئے مع محصول ڈاک صرف تین روپے آٹھ آنے (۸/۳ عہ) لئے جاویں گے، ہدایات مفت ارسال ہوں گی۔ اپنا پتہ صاف انگریزی یا اردو میں لکھیں +

کیمیکل سنڈیکیٹ (H) جالندھر شہر (پنجاب)

جدید فہرست کارخانہ مفت طلب فرمائیے ؛

لکھنؤ اعلیٰ طبقہ کی خواتین سر میں لگانے کیلئے اس کارخانہ کا تیار کردہ بادام روغن استعمال کرتی ہیں ؛



لکھنؤ دلپسند اس میں اس کارخانہ کا عطر سب سے اعلیٰ اور عطروں میں نہایت مقبول ہے ؛

یہ کارخانہ ۱۸۳۹ء سے نیک نامی کے ساتھ جاری ہے ؛

قواعد

۱۔ "ھمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور ساڑھے نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ۱؍ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیئے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے، ششماہی تین روپے (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۸؍ نمونہ ۶؍

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجئے۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۳۔ لارنس روڈ لاہور

سید عبد اللطیف مینیجر رسالہ ہمایوں نے مسلم پرنٹنگ پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگارِ علامہ فضیلۃ آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: منصور احمد

فہرست مضامین

جلد ۱۷ — نمبر ۶

بابت ماہ دسمبر ۱۹۳۰ء

تصویر۔ بڈھا باپ نیل

"ہُمایُوں"

"ہمایوں" ہر سال کے اختتام پر یا یوں کہئے کہ ہر سال کے آغاز سے اپنی کوششوں میں اضافے کرنے کے کچھ وعدے کیا کرتا ہے۔ اور یہ ایک قدرتی بات ہے کہ سال کے آغاز میں دلوں میں ضرور ایک امنگ سی پیدا ہوتی ہے کہ ہم گزشتہ زندگی سے آئندہ زندگی کو بہتر بنائیں۔ لیکن کیا "ہمایوں" کی نسبت اس "بہتر بنانے" کی تشریح الفاظ میں ہو سکتی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ مشکل ضرور ہے، کم از کم "ہمایوں" کے لئے اس واسطے کہ جب ہم سوچتے ہیں کہ کون کون سی باتیں اس میں موجود ہیں اور کون کون سی ہونی چاہئیں تو ہمیں جواب ملتا ہے کہ سب موجود ہیں اور سب ہونی چاہئیں۔ سب موجود ہیں کچھ تھوڑی تھوڑی اور سب ہونی چاہئیں کچھ زیادہ زیادہ۔ "ہمایوں" ہر قسم کا ادب پیش کر رہا ہے۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں صنفِ ادب اس میں نہیں ہے۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ فلاں صنفِ ادب کی ضرورت زیادہ ہے، تفریح کے لئے ہو یا تعلیم کے لئے لیکن اس ضرورت کا فیصلہ اکیلے ہم نہیں کر سکتے۔ ہم جن کو بعض دوست خشک فلسفی کہتے ہیں اور بعض قصے کہانیوں اور غزلوں کے طعنے دیتے ہیں۔ سو جہاں آج ہم اپنے بعض ارادوں کا یہاں اظہار کریں گے وہاں ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہمارے معاونین ہمیں بتائیں کہ وہ "ہمایوں" سے کیا کچھ چاہتے ہیں۔

نئے سال سے ہم چاہتے ہیں کہ علمی حصے کے لئے تین قسم کے مضامین بہترین طریق پر لکھے اور لکھوائے جائیں اور دوسرے مضامین سے زیادہ مرتبہ شائع ہوں۔ اول تنقیدی مضامین جن کا مقصد ذہنی انجلا ہو اور جو بتائیں کہ مطالعہ کیسے سودمند ثابت ہو سکتا ہے۔ دوسرے بڑے بڑے آدمیوں کے حالاتِ زندگی جو نہ صرف اُن کی روکھی پھیکی نقل و حرکت کو بیان کریں بلکہ جن میں اُن کے سیرت ساز کارناموں کا ذکر ہو۔ تیسرے نئی تجربات و انکشافات کے متعلق مضامین، جن سے زمانے کی رفتار کا اندازہ اور اپنی حیثیت کا احساس ہو لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمایوں پھر اپنی زندگی کا ایک "خشک" دور شروع کرنے والا ہے۔ بلکہ اس کی کوشش یہ ہوگی کہ علمی مضامین میں بھی افسانوں کی سی دلچسپی پیدا کی جائے۔ ادبی حصے میں بہترین افسانے اور دلآویز نظمیں تو بدستور ہونگی لیکن اس کے ساتھ ہی ہم چاہتے ہیں کہ اہلِ زبان حضرات کے مضامین بھی ہوں جن سے سلیس و شستہ زبان سیکھنے میں استفادہ کیا جا سکے۔ یہاں تصاویر کے متعلق بھی کچھ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ "ہمایوں" میں عموماً وہی تصاویر شائع ہوتی ہیں جن میں فن کی کوئی خوبی ہوتی ہے لیکن آئندہ ہم یہ اہتمام کرنا چاہتے ہیں کہ اُن فنی خوبیوں کی تشریح بھی کی جائے تاکہ ناظرین تصویر سے پورا پورا لطف اٹھا سکیں۔

یہ تو تھیں ہماری تجاویز۔ اب ہم آپ کی تجاویز سننے کے منتظر ہیں اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی پوچھتے ہیں کہ ان تجاویز کو بروئے کار لانے کے لئے کیا آپ ہماری ہمت نہ بڑھائیں گے؟ کیا آپ اپنی معاونت کو جاری رکھتے ہوئے ہمایوں کی توسیعِ اشاعت کی طرف توجہ فرمائیں گے۔

سالگرہ نمبر

اس پرچے کے ساتھ "ہمایوں" کی عمر نو سال ہو گئی۔ آئندہ پرچہ سالگرہ نمبر ہوگا۔ اپنی نئی تجاویز کے مطابق ہم نے اِس کے لئے ملک کے بہترین ادبا و فضلا کے مضامین نظم و نثر اور بلند پایہ مصوّروں کی تصاویر حاصل کی ہیں۔ ہم مختصراً یہ بتانا چاہتے ہیں کہ علم و ادب کے اس منتخب مرقعے میں کیسی کیسی کارآمد اور دلچسپ چیزیں ہونگی:۔

مدیر ہمایوں کے قلم سے تعلیم و تربیت کے جدید طریقوں کے متعلق ایک مفصّل و مبسوط مضمون ہوگا جس میں پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ تعلیم و تربیت کے اِن نئے طریقوں کا مطالعہ کیوں کرنا چاہئے۔ پھر نئی تعلیم و تربیت کے مفکرین کے افکار و خیالات بتا کر دکھایا ہے کہ اُن کے نظریے دراصل فطرتِ انسانی کے مطالعے پر مبنی ہیں اور اس زبردست جدید علم پر مشتمل ہیں جسے نفسیات کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد مغربی دنیا کی بعض جدید ترین تحریکات کو بیان کر کے لکھا ہے کہ تعلیم کے مقاصد کیا ہونے چاہئیں۔

ہندوستان کے ایک بہترین ظرافت نگار کے نکتہ طراز قلم سے ایک پُر کیف مضمون ہوگا جس کی زبان و بیان دونوں قابلِ ذکر ہیں۔

ایک ماہر نقاد کا ایک حکیمانہ تبصرہ ہوگا جس میں شاعری کے لئے عشقیہ مضامین کی اہمیت کو نہایت دلکش اور مدلل طریق سے ثابت کیا ہے۔

ہمارے فلک پیما نامہ نگارِ خصوصی کے شوخ فلسفیانہ قلم سے اُن کے خاص انوکھے انداز میں ایک پُر کیف مضمون ہوگا۔

ایک مصوّرِ فطرتِ عالم کا افسانہ ہوگا جس سے پڑھنے والوں پر وجد کی کیفیت طاری ہوگی۔

ان کے علاوہ دوسرے عالی پایہ مضامین دلچسپ افسانے اور دل افروز نظمیں بھی قابلِ دید ہونگی۔

سال گرہ نمبر میں مندرجہ ذیل ادبا و شعرا جلوہ افروز ہونگے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی۔ حضرتِ جوش ملیح آبادی۔ حضرتِ آزاد انصاری۔ میاں عبدالعزیز صاحب فلک پیما۔ مولانا سید حسن نظامی صاحب۔ جناب حامد علی خاں صاحب۔ سید سجاد حیدر صاحب یلدرم۔ خواجہ عبدالسمیع صاحب آثر صہبائی۔ مولوی محمد حسین صاحب ادیب ایم اے، بی ای ڈی۔ جناب شام موہن لال صاحب جگر بریلوی۔ مولانا جلال الدین صاحب اکبر۔ سید احمد حسین صاحب امجد۔ حیدرآبادی۔

سالگرہ نمبر کو اس دفعہ ہم بڑی محنت اور صرف سے چھپوا رہے ہیں۔ اس کا حجم پونے دو سو صفحات کے قریب پہنچ جائے گا۔ اس کے باوجود اس دفعہ قیمت میں اضافہ کرنے کا خیال نہیں ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ اہلِ ذوق اس سے مستفید ہو سکیں اور یہ معمولی قیمت یعنی آٹھ آنے میں دستیاب ہو سکے گا۔ یہ نمبر سال کا بہترین تحفہ ہوگا۔ ناظرین اپنے احباب کے لئے پہلے ہی سے فرمائشیں بھجوا دیں تاکہ بعد میں ان کو مایوسی نہ ہو۔

مینیجر

جہاں نما

ایک عالمگیر جنگ کی پیشین گوئی

ڈاکٹر ڈیلائیل برنز نے جو جامعۂ گلاسگو میں "شہریت" کے پروفیسر اور برطانی جماعتِ عمال کے مشیر ہونے کے علاوہ ایک مفکر کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں انسٹیٹیوٹ آف پالیٹکس میں کہا ہے کہ بڑی بڑی طاقتوں کا چھوٹی طاقتوں کو قرض اور ہتھیار مہیا کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ مغرب کی مہذب قومیں ۱۹۳۵ء اور سنہ ۱۹۴۰ء کے درمیان ایک جنگِ عظیم کے لئے تیار ہو رہی ہیں۔

پروفیسر برنز موجودہ صورتِ حالات کو اُس صورتِ حالات سے بالکل مشابہ پاتے ہیں جو یورپ کی سنہ ۱۹۰۹ء میں تھی، جب کہ اقوام دو مخاصم گروہوں میں تقسیم ہوگئی تھیں۔ ایک وہ جو کمزور تھیں اور مدد کی مستحق تھیں اور دوسری وہ جو روپے اور اسلحہ سے کمزوروں کی مدد کر سکتی تھیں۔ ڈاکٹر برنز کا خیال ہے کہ آج بھی اسی قسم کے اتحادات ہو رہے ہیں جس طرح گزشتہ جنگ میں فرانس نے سربیا کو اسلحہ خرید کر دیئے تھے اور جرمنی نے بلگیریا کی روپے سے مدد کی تھی، اسی طرح اٹلی رومانیہ کو سرمایہ بہم پہنچا رہا تھا اور ایک سمجھوتے کی رو سے ہنگری اور جرمنی سے اُس کا مفاد وابستہ تھا پس ڈاکٹر برنز کی رائے میں سنہ ۱۹۳۰ء کی صورتِ حالات سنہ ۱۹۰۹ء کے مطابق ہے، اور اقوام اس وقت جنگ سے صرف پانچ سے دس سال کی دُوری پر ہیں۔

اگر یورپی اقوام اُس رَو کو جس کا رُخ جنگ کی طرف تھا سنہ ۱۹۰۹ء ہی میں روکنے کی کوشش کرتیں تو ۱۹۱۴ء میں کبھی لڑائی نہ ہوتی۔ اگر ہم سنہ ۱۹۳۵ء کی جنگ کو روکنا چاہتے ہیں تو ہمیں اسے سنہ ۱۹۳۰ء میں روکنا چاہئے گویا ہمیں یا تو مغربی تہذیب کو منسوخ کرنا پڑے گا یا جنگ کو، کیونکہ یہ دونوں یکجا نہیں ہو سکتیں۔ مغربی اقوام آج کل ۱۹۳۵ء اور سنہ ۱۹۴۰ء کے درمیان ایک جنگِ عظیم کی طرح ڈال رہی ہیں۔ تمام حکومتیں اسی میں مصروف ہیں، یہ ناگزیر نہیں، لیکن پھر بھی وہ اس میں مصروف ہیں۔ فرانس کہتا ہے کہ وہ اس سے عہدہ برآ ہو جائے گا کیونکہ سنہ ۱۹۳۵ء تک اس کے استحکامات مکمل ہو جائیں گے۔

اگرچہ جنگ کوئی بھی نہیں چاہتا، یہاں تک کہ مسولینی کی بھی یہ خواہش نہیں لیکن پھر بھی ہم جنگ کی طرف کھنچے چلے جا رہے ہیں۔ ہمارا تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ جنگ کی تیاری ہی جنگ کی طرف اقدام ہے۔ حکومتیں بھی اپنی

تخریبی پالیسی میں زیادہ کامل ہوتی جاتی ہیں۔ جنگ کی تیاریاں ہم آج کل انحادات سے کر رہے ہیں۔ کون سا ملک کس طرف ہوگا اس کا اندازہ قرضوں اور اسلحہ سے لگایا جاسکتا ہے جو مختلف ممالک کو بھیجے جارہے ہیں۔

ڈاکٹر برنز نے کہا کہ حقیقی امن اسی وقت قائم ہوسکتا ہے جب ساری توجہ استحکامات پر صرف نہ کی جائے بلکہ حکومت کے جدید ترین فرائض، مثلاً صحت، صنعت اور تعلیم وغیرہ کی طرف خیال کیا جائے۔ یہ وہ فرائض ہیں جن کی حدود قومیت کی حدود سے وسیع ہیں اور اس لئے ان کے لئے قوموں کے اتحاد کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر برنز نے کہا کہ ہر قوم کے بہترین دماغ دوسری اقوام کو تباہ کرنے کی تیاریوں میں ضائع ہو رہے ہیں گو اپنی جگہ اُن میں سے ہر ایک یہی سمجھتا ہے کہ ہم مدافعت کی تیاری کر رہے ہیں۔

اسلحہ کی تیاری کے لئے جو وجوہ پیش کی جاتی ہیں وہ ڈاکٹر برنز کے نزدیک صحیح نہیں ہیں۔ بلکہ وہ ان کو قدیم بُری عادات کی ایک شائستہ شکل سمجھتے ہیں، اور اُن کو یقین ہے کہ یورپی اقوام کا دوسرے ملکوں کو بحری اور فوجی امداد بہم پہنچانا ایک صریح خطرے کا باعث ہے۔

ہندی عورتوں کا مطمح نظر

ہندوستان کی عورتوں نے جو ابھی گذشتہ سال تک ہی ترقی اور بالخصوص موجودہ آزادی کی تحریکات سے عملاً بے بہرہ سمجھی جاتی تھیں چند ماہ میں اپنی زبردست شخصیتوں کا اپنے قول وعمل سے حیرت انگیز طور پر ثبوت دیا ہے۔

ادھر قانونی نافرمانی کی تحریک کے سلسلے میں سینکڑوں ہندی عورتیں بخوشی کڑی قیدیں جھیل رہی ہیں بقول ڈاکٹر دلیش مکھ "وہ ملک کی لڑائی شیرنیوں کی طرح لڑ رہی ہیں" اور اُدھر بین قومی مشورت کے سلسلے میں سات سمندر پار ہندوستان وانگلستان کے قابل ترین مدبرین کے حلقے میں وہ دنیا بھر کے سامنے اپنی آزاد منشی اور ضبطِ نفس کا بہترین طریقے سے اظہار کر رہی ہیں۔

چنانچہ حال ہی میں محترمہ جناب بیگم شاہ نواز صاحبہ نے گول میز کانفرنس کے سامنے اپنی تقریر کے دوران میں فرمایا کہ یہ پہلا موقع ہے جب ہندی عورتوں کو ایک ایسی مجلس میں حصہ لینے کی دعوت دی گئی ہے اور اس لئے یہ اُن کا فرض ہے کہ وہ ماؤں بہنوں اور بیویوں کی حیثیت میں مردوں کو ٹھیک راہ دکھائیں اور ایک سیدھے رستے پر اُن کی رہبری کرتی چلی جائیں۔ ایک ترکیبی حکومت کی تجویز کی تائید کرتے ہوئے بیگم صاحبہ موصوفہ نے کہا کہ وہ یہ دیکھ کر بغایت خوش ہیں کہ والیانِ ریاست وطن کے سچے فرزند ثابت ہوئے ہیں۔ پھر یہ مانتے ہوئے کہ ہندوستان کو بھی

متعدد معاشرتی مسائل درپیش ہیں یہ ظاہر کیا کہ ہندی اب اُن کے حل کرنے میں مصروف ہیں اور توقع ظاہر کی کہ وہ بہت جلد مغربی قول و فعل کی آزادی حاصل کر کے اُسے اُس مشرقی ضبطِ نفس کے ساتھ استعمال میں لائیں گی جو ہندی عورتوں کا مطمحِ نظر ہے ۔

مہاراجہ نواں نگر نے بیگم صاحبہ موصوفہ کو اُن کی "غایت درجہ حیرت انگیز تقریر" پر جو "ایک ہندی عورت نے ایک ایسے اہم ترین موقع پر کی" مبارکباد پیش کی ۔

اور مسٹر ریمزے میکڈانلڈ وزیرِ اعظم انگلستان نے اراکینِ کانفرنس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "آپ نے اُس نئی دلکش آواز کو بھی سنا ہے (نعرہ ہائے تحسین) جو بجائے خود ایک عظیم الشان مظاہرہ ہے ، ہندوستان کی ذاتی حکومت کے ارتقا میں ایک غایت درجہ معنی خیز شے ہے یعنی ہندوستان کی عورتوں کی آواز ۔ یہ ہے اُن کے مناسب مرتبے کا اعتراف جو یہاں ہوا ہے اس سے آئندہ انکار کرنا ناممکن ہے ۔ یہ ناممکن ہے کہ ان دنوں کی کارگذاری کو کوئی مرد اپنی خود پسندی کے زعم میں قلمزن کر دے گویا اس کا کبھی وجود ہی نہ تھا ۔ یہ بروئے کار آئی ہے تاکہ اب نشوونما پاتی جائے ۔"

خواتینِ ایران

۲۳ ۔جنوری ۱۹۳۱ء سے ۳۰ ۔جنوری تک لاہور میں تمام ایشیا کی خواتین کی ایک کانفرنس منعقد ہونے والی ہے ۔ اس کے سلسلہ میں تمام ایشیائی ممالک کی نسوانی انجمنوں کو دعوت نامے بھیجے گئے ہیں ۔ ان میں سے ایران کی ایک قومی نسوانی انجمن کی سکرٹری منصورہ افشار نے کانفرنس کی سکرٹری کو ایک خط لکھا ہے جس میں انہوں نے ایرانی خواتین کی موجودہ حالت کو بیان کیا ہے ۔ یہ خط جس کا اقتباس ہم یہاں درج کر رہے ہیں رسالہ "ستری دھرم" میں چھپا ہے :۔

"اگرچہ اعلیٰ حضرت نے ہمیں ہر جگہ بے نقاب آنے جانے کی اجازت دے دی ہے اور ایرانی خواتین اپنے شوہروں کے ساتھ تھیئیٹر سنیما ناچ اور اسی قسم کے دوسرے مجمعوں میں جا سکتی ہیں لیکن میں بڑے افسوس سے یہ بات لکھ رہی ہوں کہ پیرس کے نئے نئے فیشنوں کی نقل اتارنے کے شوق میں وہ اپنی خانگی اصلاح سے بالکل بے پروا ہو رہی ہیں ۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن کو اپنے تمدنی و معاشرتی حقوق اور رعایات کا بھی خیال نہیں رہا ۔ یہ ہمارے ملک کی صرف چند گنتی کی خواتین کی کوشش اور حسنِ عمل کا نتیجہ ہے کہ یورپ اور ایشیا کی مختلف انجمنوں کی توجہ ہماری طرف ہو گئی ہے ، اور ہمارے اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے اگر ہماری انجمن کی بعض خواتین کا عزم و

ایک گمنام شاعر

شیخ سعدی علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں۔

نامِ نیکِ رفتگاں ضائع مکن　　　تا بماند نامِ نیکت برقرار

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اِس شعر میں "رفتگاں" کی تخصیص کیوں کی گئی ہے۔ ہاں شاید اس وجہ سے ہو کہ ہم مشرقی لوگ "مردہ پرست" ہیں، زندوں کی قدر نہیں کرتے، مُردوں کو بانس پر چڑھا دیتے ہیں۔ غالب کو بھی یہی شکوہ تھا۔ شعر کہتے تھے، کوئی سُنتا نہ تھا۔ سر پیٹ کر فرماتے ہیں۔

تو اے کہ محو سخن گسترانِ پیشینی
مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست

کچھ یہی سبب ہے کہ علی شبیر صاحب شبیر اپنی قلم سے دریا بہاتے ہیں، لیکن وہ سارے کا سارا پانی ساحل میں جذب ہو کر رہ جاتا ہے۔ دریائے فکر میں غوطے لگا کر دُرِ شاہوار نکال لاتے ہیں، لیکن وہ سب کے سب یا تو سیپیوں کے ساتھ کوڑے کرکٹ میں پھینک دیئے جاتے ہیں، یا پس کر سرمہ بنائے جاتے ہیں اپنے گلستانِ خیال سے گلِ فردوس چن کر لاتے ہیں۔ لیکن وہ یا تو یونہی پڑے پڑے مرجھا جاتے ہیں یا کسی قبر پر چڑھانے کے کام آتے ہیں۔"

آج کل ایسے شاعروں کا کلام جو خوش مذاقی کے رنگ میں کچھ لکھتے ہیں بڑی دھوم دھام سے شائع ہوتا اور بڑے شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ میں نے خود اس قسم کے کئی تذکرے پڑھے مگر مجھے دیکھ کر تعجب ہوا کہ شبیر جیسے خوش کلام شاعر کا اس میں ذکر تک نہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ ان کا کلام چھپ چکا ہے اور ہزاروں کی تعداد میں بک چکا ہے۔ ہے یہ کہ بڑا ہونا ایک چیز ہے اور بڑا بن جانا یا بنا دیا جانا دوسری چیز۔ پہلی صورت خدا کی دین ہے اور دوسری شکل دوستوں اور یاروں کا پروپیگنڈا۔ آزاد نہ ہوتے تو ہندوستان میں آتش کا نام تک کوئی نہ جانتا۔ لیجیئے میں آپ لوگوں سے علی شبیر صاحب کا تعارف کراتا ہوں اگرچہ ظاہر ہے کہ میں کیا اور میری سفارش کیا۔ اگر کلام آپ کو پسند آئے تو آپ بھی میری ہاں میں

ہاں ملائیے نہیں تو مجھکو اور اُن کو دونوں کو بھول جائیے اور سمجھ لیجیے کہ مضمون لکھکر خواہ مخواہ اپنا اور ہمارا وقت ضائع کیا۔

توضیح۔ ان کا نام علی شبیر ہے۔ تخلص شبیر کرتے ہیں۔ آگرہ کے رہنے والے ہیں۔ گھر بار چھوڑ حیدرآباد میں آبسے ہیں۔ کئی بھائی تھے۔ ایک تو آگرہ کی زمین کی نذر ہوئے دوسرے کو حیدرآباد کی مٹی کھا گئی۔ اب خدا معلوم یہ کہاں آخری گھر بساتے ہیں۔

سیدوں کا خاندان ہے۔ بلحاظ اپنی سُسرال کے شیعہ ہیں، بلحاظ اپنے خاندان کے سُنّی، بلحاظ اپنے خیالات کے صوفی، بلحاظ اپنی تحریر کے وہابی اور بلحاظ اپنی تقریر کے کچھ بھی نہیں۔ جس طرح مذہب نہ اِلیٰ اللہ نہ اُل اللذی ہے اسی طرح دنیاوی کاموں میں بھی طبیعت کو قرار نہیں۔ بہروپیا بننے میں ان کو شرم نہیں ایکٹر ہونے میں ان کو دریغ نہیں۔ ہزل گوئی میں ان کو باک نہیں۔ کسی کو بنانے میں یہ نہیں چوکتے۔ ملاحیاں اڑانے میں یہ نہیں رُکتے۔ غرض عجیب شگفتہ طبیعت لیکر آئے ہیں۔ مگر بال بچوں کے جھگڑوں نے ذرا انجر پنجر ڈھیلے کردیے ہیں۔

مدتوں لنڈورے پھرا کیے، عمر سے اُتر کر شادی کی، بال بچوں نے دماغ پریشان کردیا۔ رفتہ رفتہ خود داری کو چھوڑنا آزادی سے منہ موڑنا اور نوکری کی ذلتوں کو رونا پڑا۔ اپنی ہائے دوسروں پر گنوائی۔ یار کے پردہ میں خود اپنی بپتا اس طرح سناتے ہیں۔

اک مرے دوست نہایت ہی تھے آزاد منش ——— ناک پر بیٹھنے دیتے نہ تھے مکھی زنہار
سہہ نہ سکتے تھے ذرا بات کسی افسر کی ——— مارنے مرنے پہ ہوجاتے تھے فوراً تیار
جس جگہ نوکری کرتے تھے وہاں سے آخر ——— تھوڑے ہی دن میں نکل جاتے تھے کرکے تکرار
الغرض تفرقہ تقدیر نے ڈالا ایسا ——— یہاں دکھن میں رہے ہم، وہ گئے گنگا پار
دس برس بعد جو پھر اُن سے ملاقات ہوئی ——— اور ہی کچھ نظر آئے مجھے ان کے اطوار
میں نے پوچھا کہو کس طرح سے گزری اب تک ——— اس قدر عرصہ میں کس کس سے کی جوتی پیزار
اتنی مدت میں کہو کتنے سرشتے دیکھے ——— آخر اب کون سے دفتر میں لیا تم نے قرار
تم کسی شخص کو سرکار نہ کہتے تھے کبھی ——— اب بھی کیا اس کو سمجھتے ہو وہی ذلت و عار
بھر کے اک آہ کہا "میری کہانی نہ سنو ——— عرض کیا تم سے کروں اپنی میں اب حالتِ زار

آ ئی شامت تو یہاں آن کے شادی کرلی
خانہ داری کے بکھیڑوں نے پھر ایسا گھیرا
ڈاکٹر خانہ سے ملتی نہیں فرصت مجھ کو
جب تلک تھا تن تنہا مجھے کچھ فکر نہ تھی
نوکری چھوڑنا اک کھیل نظر آتا تھا
اب اگر نوکری چھوڑوں تو قیامت ہو جائے
ایک سو دس مجھے ملتے ہیں عدالت میں یہاں
سخت افلاس سے بس اس میں بسر ہوتی ہے
چھ برس گزرے کہ دانتوں سے اسے پکڑے ہوں
حیف صد حیف زمانہ نے مرا بل توڑا

اس پہ طرہ یہ ہوا، ہو گئے بچے دو چار
رات دن پیچھا نہیں چھوڑتے گھر کے افکار
لڑکی بیمار تھی کل، آج ہے لڑکا بیمار
پیٹ کا پالنا اپنے نہ تھا کچھ بھی دشوار
فکر ہوتی نہ تھی، رہتا تھا مہینوں بیکار
پاس کوڑی نہیں، بیکار کو دے کون ادھار
نوکری اس کو کہوں یا کہ خدا کی پھٹکار
بیس دن بعد سے کرتا ہوں میں پہلی کا شمار
سنتا رہتا ہوں ہر اک چھوٹے بڑے کی دھتکار
نہ وہ صورت رہی باقی، نہ وہ سیرت، نہ شعار

اب تو یہ حال ہے شبیر کہ چپڑاسی بھی
مجھ کو آواز اگر دے تو کہوں "جی سرکار"

خیر غنیمت ہے کہ ایک لڑکا ایسا نکل آیا ہے کہ ذرا آنسو پچھ گئے ہیں ورنہ شاید دیوانے ہو جاتے۔ ان کی صورت دیکھکر ہرگز کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ اس بلا کا آدمی ہے۔ چہرہ پہ بجائے تیزی کے نہایت بھوندا پن برستا ہے۔ موٹا موٹا نقشہ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، پھلکی جیسی ناک۔ اس ناک پر عینک عجب بہار دیتی ہے۔ پڑھنے میں عینک کچھ کام دیتی ہو تو دیتی ہو۔ ہم نے تو ہمیشہ اس کو ناک کے نکڑ ہی پر رکھا دیکھا۔ جب باتیں کرتے ہیں تو عینک کے اوپر سے جھانکتے رہتے ہیں۔ گھڑی گھڑی اوپر کو اُٹھاتے ہیں مگر وہ ناک کے ڈھلاؤ سے پھسل کر پھر پھننگ پر آجاتی ہے۔ جسم بھاری ہے اس لئے ذرا کھسنا ہاتھی کی طرح جھول کر چلتے ہیں۔ اکثر چھتری یا بہت موٹی بانس کی لکڑی ہاتھ میں رہتی ہے۔ کام پڑ جائے تو شاید اس کے چلانے میں بھی نہ چوکیں۔ مگر خدا بچائے ان کی زبان کی مار لکڑی کی مار سے کہیں زیادہ ہے۔

خیر یہ تو ان کی ظاہری حالت ہوئی۔ اب ان کی طبیعت کی تیزی اور براقی ملاحظہ ہو۔ نثر یہ لکھیں نظم یہ لکھیں، تاریخ میں ان کو دخل، مذہب میں ان کو دخل، کبھی انگریزی نظموں کو اردو میں نظم کر رہے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ ایک لفظ نہ چھوٹے اور محاورہ میں پوری اُتریں کبھی برک ہارٹ کے سفرنامہ کا ترجمہ کر رہے

ہیں اور اس پر ایسے ایسے نوٹ لکھ رہے ہیں کہ دیکھکر طبیعت لوٹ ہو جائے۔ کبھی ابن سعود کا خلعت زیب تن کئے اور سلطان حجاز کی سند ہاتھ میں لئے وہابی سلطنت کی خوبیوں کا پرچار کر رہے ہیں۔ لیکن سب سے مزیدار ان کی دو چیزیں ہیں۔ ایک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نعتیں اور مدینہ منورہ کی گلیوں میں پھرنے کا شوق اور دوسرے زمانہ کی حالت کا خوش مذاقی میں نقشہ۔ میں پہلے ان کی خوش مذاقی کے کچھ اشعار لکھتا ہوں۔ آپ خود دیکھیں گے کہ اکبر کے بعد اگر اس رنگ میں کوئی لکھنے والا ہے تو وہ صرف یہی حضرت ہیں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ ایک بڑھ کر اردو لٹریچر کا درخشان ستارہ ہو گیا اور یہ اسی طرح گوشۂ گمنامی میں پڑے رہے۔ اکبر کی کتابیں چھپیں اور تمام ہندوستان میں پھیل گئیں۔ ان کی کتابیں چھپیں مگر یاروں کے حلقہ میں تھوڑے دن چکر کھا کر ردّی کی ٹوکریوں کی نذر ہو گئیں۔

طالع شہرتِ رسوائی مجنوں بیش است ۔۔۔ ورنہ طشتِ من و او ہر دو زیک بام افتاد

اچھا تو اب ان کا رنگ ملاحظہ فرمایئے۔

سرکاری ملازمت میں دو طرح کے آدمی ہوتے ہیں: ایک وہ جو خوب کھاتے ہیں اور خوب مزے اڑاتے ہیں دوسرے وہ جو ہائے مفلسی ہائے مفلسی ہی کرتے کرتے ختم ہو جاتے ہیں۔ پہلی شق میں تحصیلدار سب سے اوّل نمبر پر ہیں اور دوسری فہرست میں مولوی علی شبیر صاحب۔ دیکھئے ان دونوں صورتوں کو کن خوبصورت الفاظ میں ادا کیا ہے۔

بہ مانا ہاتھ میں خنجر لئے حکام بیٹھے ہیں ۔۔۔ مگر جیبیں بچائے سیٹھ دولت رام بیٹھے ہیں
خدا کے واسطے راجہ ذرا ہم سے الگ بیٹھو ۔۔۔ کہ ہم تو پہلے ہی ہو کر بہت بدنام بیٹھے ہیں
عجب اک کیمیا ہے خدمتِ تحصیلداری بھی ۔۔۔ منائے خیر اس کی ہم تو صبح و شام بیٹھے ہیں

حساب اب کچھ نہ پوچھو تم مکان و باغ و موٹر کا
کہ ان دو سو میں ہم بھی کر کے کیا کیا کام بیٹھے ہیں

تحصیل کی کچہری کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ سبحان اللہ۔ جو ہے اپنا حق طلب کر رہا ہے۔ چپراسی اپنا حق مانگ رہے ہیں۔ اہلکار اپنے حق کے طالب ہیں۔ غرض ساری کچہری حقداروں سے بھری پڑی ہے۔ لکھتے ہیں

میں نے سرِ راہ کل یہ دیکھا منظر ۔۔۔ حق حق کی صدا سے گونجتا ہے اک گھر
میں سمجھا، فقیر کا ہے تکیہ شاید ۔۔۔ پوچھا تو وہ تحصیل کا نکلا دفتر

تحصیل کا رنگ دیکھ چکے اب رجسٹری کے محکمہ کو ملاحظہ کیجئے۔ کیا صحیح واقعات بیان کئے ہیں۔ دیکھتے سب ہیں مگر لکھتا کوئی نہیں۔

اس محکمے کے نوکر، ہر اک کے ہیں پڑوسی ۔۔۔ بائع کا ہے جو کوئی تو کوئی مشتری کا
بن جائیگا شناسا، آٹھ آنے جس کو دیدو ۔۔۔ ہے، شہر بھر سے واقف، عملہ رجسٹری کا

کبھی کسی کاغذ کی رجسٹری کرانے جاؤ تو اِن شعروں کا مزا آئے۔

اب عام دفتر والوں کی حالت دیکھئے۔

ہر طرح سے چونکہ اپنا دعوئے حق ہے ۔۔۔ ناحق کا بھی نام ہم نے رکھا حق ہے
ہم ہیں غرض اہلِ دفتر اصلی حقدار ۔۔۔ حق پہنچے کسی کو سب میں اپنا حق ہے

واقعہ ہے یا نہیں؟ کوئی جینے کوئی ہارے دفتر والوں کے دونوں میٹھے۔ عہدہ داروں کی جو حالت ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ان کی ترقی کے زینے غرور کی سیڑھی ہوتے ہیں۔ جتنے اونچے ہوتے جاتے ہیں اتنا ہی ان کا سر پھرتا جاتا ہے۔ کوئی عالی ظرف ہی ہوگا جو بلندی پر پہنچ کر اپنے پہلے ساتھیوں کو پہچان سکے۔ نہیں تو ہوتا یہی ہے کہ ترقی پائی اور اپنی نئی دنیا بسائی۔

چڑھ گئے ہیں اک بڑے مینار پر قسمت سے ہم ۔۔۔ کچھ نظر آتی نہیں نیچے کی حالت صاف صاف
ہم کو تم معذور سمجھو گر نہ پہچانیں تمہیں ۔۔۔ اب نہیں دکھلائی دیتی ہم کو صورت صاف صاف

اس بلندی سے اگر لڑھکیں تو پھر سوجھے ہمیں
سب کی رنگت صاف صاف اک اک کی ہیئت صاف صاف

اور صاحب بات یہ ہے کہ از ماست کہ بر ماست ہم خود خوشامدیں کر کے ان لوگوں کے دماغ خراب کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میاں کیا کیا جائے نوکری ہے۔

پڑتے پانی میں بھی آجائیں گے بھاگے بھاگے ۔۔۔ بے ضرورت بھی اگر ہم کو پکاریں سرکار
ہونگے کل تک بھی پھریرے نہ ہمارے کپڑے ۔۔۔ زیب تن سوٹ کریں بال سنواریں سرکار
ہم بھی کیچڑ میں چلے جائیں گے گرتے پڑتے ۔۔۔ گاڑی دروازہ پہ حاضر ہے سدھاریں سرکار

اس نوکری کا رونا دوسری جگہ رویا ہے۔ مرے جاتے ہیں مگر نوکری چھوڑنے کا نام نہیں لیتے۔

اب امتحاں کیا دوں کہ حکومت کا نہیں شوق ۔۔۔ خامی تو یہ ہے پر اسی خامی ہی میں خوش ہوں

ہے منصفی اک چیز مگر مجھ سے نہ ہو گی | میں دفترِ خدامِ گرامی ہی میں خوش ہوں
آزاد نہ کیجے مجھے اب دے کے وظیفہ | سرکار میں اس قیدِ غلامی ہی میں خوش ہوں

نوکری کے بعد یہ نہیں کہ دفتر گئے کام کیا چلے آئے۔ اس کے ساتھ بنگلہ کے چکروں کی بھی قید لگی ہوئی ہے۔ دیکھنا کس خوبصورتی سے اس مضمون کو ادا کیا ہے۔

مانا کہ تم کام میں اپنے بڑے ہشیار | لیکن کبھی سرکار کو صورت بھی دکھاؤ
صورت سے وہ اندازۂ سیرت بھی کرینگے | لائق ہو مگر اپنی لیاقت تو جتاؤ
وہ دن گئے جب ملتی تھی گھر بیٹھے ترقی | اب تم درِ حکام کے چکر بھی لگاؤ
اخلاقِ الٰہی کے مقلد نہیں حاکم | بنگلہ ہے یہ، مسجد نہیں، جاؤ کہ نہ جاؤ

مگر مشکل یہ ہے کہ جاؤ تو سرکار سے ملنا مشکل۔ سب سے پہلے چپراسی اور بہرا سے ٹکر ہوتی ہے۔

کیوں نہ اس مغرور جاہل کو کہیں شدادِ وقت | جس کے در پر ہوں معین ایسے دربانِ شدید
جو نہ پہنچائیں کسی کا اس کمینہ تک پیام | جو نہ لاکر دیں کسی کے رقعہ و خط کی رسید
آتی ہو صادق سگ و دربان پہ جس کے یہ مثل | آستینش این گرفت و آن گریبانش درید

اگر خدا خدا کرکے ان دربانوں سے پیچھا چھوٹا اور اندر اطلاع ہوئی تو اس اطلاع کا جواب سنیئے۔

بعض حکام کی عادت ہے کہ جب ان سے کوئی | ملنے جاتا ہے تو فرماتے ہیں "ہم کام میں ہیں"
جمعہ کے جمعہ ہوا کرتی ہے ان کی اصلاح | اور دن جاؤ تو کہہ دیتے ہیں "حمام میں ہیں"
الغرض ان کو ملاقات کی فرصت ہی نہیں | وہ گرفتارِ عجب گردشِ ایام میں ہیں
مقبرے پر بھی جب ان کے کوئی دستک دیگا | تو یہ فرمائیں گے "سرکار ابھی آرام میں ہیں"

ہے یہ کہ غریبوں کی ہر طرح مشکل ہے۔ واقعی سچ کہا ہے کہ

جن کے گھر دفتر کے پاس اور آنا جانا ہاتھ میں | موٹریں ان کو عطا کیں دریہ گاڑی باندھ دی
دور گھر، تنخواہ تھوڑی، حاضری کی قید سخت | مفلسوں کی یوں اگاڑی اور پچھاڑی باندھ دی

یہ تو ملازمان کا رنگ ہوا۔ اب امیروں کو دیکھئے تو ان کی عجب حالت ہے۔ جو بیچارے غریب شومیٔ قسمت سے ان کے دست نگر ہو گئے ہیں بس ان کا خدا ہی مالک ہے۔ ایک قطعہ میں یہ رنگ بھی دکھائے گئے ہیں۔ فرماتے ہیں:-

امیر! تم کو برا ہم کہیں خدا نہ کرے — بگاڑ اپنے خدا سے کریں خدا نہ کرے
خطا ہماری، ہمارا گنہ، ہمارا قصور — تمہارے عدل پہ تہمت دھریں خدا نہ کرے
جو تم کہوگے ملا دینگے ہاں میں ہاں ہم بھی — تمہاری بات کو ہم کاٹ دیں خدا نہ کرے
رہیں گے ظلّ ہمایوں میں ٹھوکریں کھاتے — تمہارے سایہ سے بچکر چلیں خدا نہ کرے
تم ان کو آگ میں جھونکو غلام حاضر ہیں — تمہارے دھوپ میں دشمن پھریں خدا نہ کرے
ہماری ٹانگیں جو ٹوٹیں تو ٹوٹیں جوتی سے — تمہارے گھوڑوں کے پاؤں دکھیں خدا نہ کرے

ان عہدہ داروں اور امیروں کو خواہ کچھ بھی کہو یہ ماننا پڑے گا کہ غرض مند ان کو اتنا دق کرتے ہیں کہ وہ بھی اپنی جان سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ یک انار و صد بیمار کی کیفیت ہوتی ہے۔ کسی کو یونہی ٹال دیتے ہیں کسی سے آئندہ کا وعدہ کرکے چھٹکارا پاتے ہیں۔ کسی سے جھوٹ بول کر گلو خلاصی کرتے ہیں۔ اس واقعہ کو مذاقیہ پہلو میں اس طرح ادا کیا ہے۔

گھیرتے ہیں مجھکو آکر رات دن اہلِ غرض — پھنس گیا ہوں میں خداوندا عجب جنجال میں
جھوٹ بن تسکین ان لوگوں کی ہوتی ہی نہیں — خوش یہ ہوتے ہیں بناوٹ ہو اگر اقوال میں
جب یہ دیکھا سچ سے کوئی مطمئن ہوتا نہیں — جھوٹ سے لینے لگا ہوں کام قیل و قال میں
مصلحت آمیز اب ہوتی ہے میری گفتگو — چکنی چپڑی باتوں سے دیتا ہوں سب کو ٹال میں
دھوکے میں رکھتا ہوں برسوں، سچ مگر کہتا نہیں — ڈر ہے امیدوں کو ان کی کر نہ دوں پامال میں
چونکہ نیت میں مری ہرگز نہیں کوئی فساد — بلکہ منظور ان کی دلجوئی ہے یاں ہر حال میں
درگزر فرمائے گا تو اس سے مجھ کو ہے یقین — فرق جو کچھ ہو میرے اقوال اور افعال میں
ان کی خاطر جس قدر دن رات میں بکتا ہوں جھوٹ — لکھیو یارب تو انہیں کے نامۂ اعمال میں

اس سلسلہ میں ایک پرانے گھاگ عہدہ دار کی نصیحت بھی سن لیجیے۔ کام آئیگی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت اہلکاری کی خدمت سے ترقی کرکے عہدہ داری کے درجہ پر پہنچے ہیں اور اپنے تجربات کی بناء پر کسی اپنے چاہیتے اہلکار کو ملازمت کے نشیب و فراز سمجھا رہے ہیں۔

کرتے ہیں نصیحت مجھے سرکار ہمیشہ — تنخواہ سے تم رکھو سروکار ہمیشہ
جھگڑے کبھی دفتر کے تو فیصل ہی نہ ہوں گے — کیوں ڈالتے ہو اپنے پہ تم بار ہمیشہ

ہونے کا ہے جو کام وہ ہوتا ہی رہے گا
آپس میں عبث کرتے ہو تکرار ہمیشہ

ہو باپ بھی افسر تو بھروسا نہ کرو تم
حربوں سے رہو اس کے خبردار ہمیشہ

شاگرد ہو حاکم، تو نہ کہنا اسے شاگرد
ہو یار تو سمجھو نہ اسے یار ہمیشہ

جا جا کے امیروں کو دو اس طرح دعائیں
"قائم رہے یہ آس کا دربار ہمیشہ"

سمجھا کریں حکام تمہیں تاکہ مقطع
لازم ہے کہ رکھا[1] کرو دستار ہمیشہ

جب سامنے جاؤ تو کبھی آپ نہ بولو
تقصیر[2] ہمیشہ کہو، سرکار ہمیشہ

دو گالیاں دل میں یہ کہو منہ سے نہ اک حرف
سنتے رہو حکام کی دھتکار ہمیشہ

لو جب کبھی رخصت تو کرو عذر علالت
اپنے کو بنائے رہو بیمار ہمیشہ

روتے رہو اک سے کہ ہے کام کی کثرت
رہتا ہوں مصیبت میں گرفتار ہمیشہ

رکھا کرو پھیلائے ہوئے میز پہ کاغذ
مثلوں کا لگائے رہو انبار ہمیشہ

تا لکا کرو ڈینگیں کہ میں ایسا ہوں میں ایسا
ظاہر کرو اپنے تئیں ہشیار ہمیشہ

پابند رہو وقت کے ہاں بیچ میں غائب
ہو سکتے ہو اک روز میں دو بار ہمیشہ

دفتر میں کبھی اہل غرض سے نہ ملو تم
گھر پر کرو اس قسم کا بیوپار ہمیشہ

تحفہ کوئی دیدے تو اسے چپکے سے لیلو
ہاں نقدی سے کرتے رہو انکار ہمیشہ

القصہ چلو میری نصیحت پہ جو شبیر
تم خوش رہو، خوش تم سے ہو سرکار ہمیشہ

اب میں اس سلسلہ وار مضمون کو چھوڑ کر متفرق مضامین پر علی شبیر صاحب کے اشعار پیش کرتا ہوں اور سب سے پہلے ان کے مذہبی خیالات لیتا ہوں۔ انہوں نے مذاق ہی مذاق میں یہ بیان کیا ہے کہ حضرت سید الشہداء کے واقعہ کو لوگوں نے کیا سے کیا کر دیا ہے۔ واقعہ کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے مگر راویوں اور مرثیہ نویسوں نے دماغ سے اتار اتار کر وہ باتیں بیان کی ہیں کہ واقعہ ایک قصہ

---

[1] حیدرآبادی پگڑی کو دستار کہتے ہیں اور اس کے لئے بجائے پہننے کے رکھنا آتا ہے

[2] یہ بہت پرانا حیدرآبادی لفظ ہے حضور اور سرکار کے معنوں میں بولا جاتا ہے۔

ہوگیا ہے۔

کارنامہ تھا یزیدِ روسیہ کا نام | راویوں نے درج لیکن کُل مراتب کردیئے
پھر بھی کچھ خانے سعارہ گئے تھے جابجا | مرثیئے لکھ لکھ کے ہم نے وہ بھی آخر بھردیئے

یہاں یہ بتائے دیتا ہوں کہ حیدرآباد میں سروس بُک کو کارنامہ کہتے ہیں اور ممالکِ متحدہ کی پولیس میں اس کا نام اعمال نامہ ہے۔

آج کل اردو زبان میں ناول جس طرح حشرات الارض کی طرح نکل رہے ہیں ان کا اس خوبی سے خاکا اڑایا ہے کہ تعریف نہیں ہوسکتی۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ ان لکھنے والوں کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ ہماری یہ غلط سلط تحریریں ہماری قوم کو کس طرح بدنام کریں گی اور اس سے ہماری قوم کے عادات و اطوار پر کیا اثر پڑے گا فرماتے ہیں۔

ترقی علم نے کی یاں تک اس زمانے میں | کہ دیکھے جاتے ہیں ناول زنانخانے میں
برا نہ مانئے ناول نویس صاحب تم | جو فقرہ ہم کوئی کہہ بیٹھیں دوستانے میں
بنانا جانتے ہو بات کا بتنگڑ خوب | کمال رکھتے ہو تم حاشیہ چڑھانے میں
جو پڑھ کے ان کو نہ بہکے قصور ہے اسکا | بھرا ہے تم نے تو جادو ہر اک فسانے میں
حرم سرا سے بہو بیٹیوں کو تا بازار | کیا نہ تم نے تامل گھسیٹ لانے میں
شریف زادیوں پر تم نے باندھے وہ طوفاں | سنے نہ دیکھے جواب تک کسی گھرانے میں
اڑا کے لاتے تھے لوگ اگلے قاف سے پریاں | نہ چوکے پردہ نشینوں کے تم اڑانے میں
تمہارے علم و لیاقت کے جایئے صدقے | دکھایا خوب ہنر مال و زر کمانے میں

تمہاری قوم جو رسوا ہوئی تو جوتی سے
تمہارا بِک گیا ناول تو چار آنے میں

آج کل کے فیشن کے دلدادہ لوگوں کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ ذرا قافیے اور ردیف ملاحظہ ہوں۔

آج کل تقلید انگریزی تو ہم پر فرض ہے | گرچہ اس میں منزل اپنی ہوتی ہے کھوٹی ضرور
سختی کے مارے سوڑے خواہ چھل ہی کیوں نہ جائیں | کھائیں گے ہر روز ہم سوکھی ڈبل۔ روٹی ضرور

شوربے کے چھینٹوں سے افشاں منہ پہ ہوتی ہے تو ہو — ہم چھری کانٹے سے کاٹیں گے مگر بوٹی ضرور

اُس کی ٹانگوں پر بلا سے مکھیاں بھنکا کریں
کاٹ کر کر دیں گے ہم گھوڑے کی دُم چھوٹی ضرور

ایک نظم میں راستہ کے چلنے والوں کا فوٹو کھینچا ہے اور اس میں اہلکاروں کے متعلق جو قطعہ لکھا ہے وہ لاجواب ہے۔ اس نظم کو لے کر ذرا سڑک کے کونے پر کھڑے ہو جایئے اور لوگوں کی حالت دیکھ دیکھ کر اس سے مقابلہ کیجئے اس وقت مزا آئے گا۔

اک گاڑی والے سے کسی منشی نے یہ کہا — تم لوگوں کے ستم سے بہت دلفگار ہیں
تم ہانکتے ہو گاڑی سدا اس بُری طرح — جو زد پہ آ گئے وہ تمہارے شکار ہیں
کی عرض گاڑی والے نے اس اعتراض سے — ثابت ہوا کہ آپ بہت ہوشیار ہیں
حضرت اہیں صدہا قسم کے رہرو جہان میں — کس کس کو ہم بچائیں کہ بے اختیار ہیں
کرتے ہیں باتیں بیچ سڑک میں کھڑے ہوئے — اس قسم کے گدھے بھی کوئی دس ہزار ہیں
آواز دو تو کان پہ چلتی نہیں ہے جوں — کہہ بیٹھو کچھ تو مستعدِ کارزار ہیں
فکر اپنے مرنے جینے کی انکو نہیں ہے کچھ — گویا کہ اُن کی جان کے ہم ذمہ دار ہیں
بہرے بھی ہیں بہت سے بہت سے ہیں باؤلے — کچھ کھاتے ہیں افیم تو کچھ بادہ خوار ہیں
معذور لنگڑے لولوں کا نمبر اس کے بعد — جو یاں گھسٹتے پھرتے سر رہگذار ہیں
بن دیکھے جو اِدھر سے اُدھر رستہ کاٹ کر — مرتے ہیں آ کے، ایسے بہت نابکار ہیں
بچوں کو چھوڑ دیتے ہیں سڑکوں پہ کھیلنے — ان شہریوں میں ایسے بھی بعضے گنوار ہیں
اس خوف سے کہ دیر پہنچنے میں ہو نہ جائے — ق — چلتے عجیب ڈھنگ سے بعض اہلکار ہیں
بند آنکھیں ہوش باختہ سر جھاڑ منہ کو پھاڑ — دفتر کو جاتے جوں شترِ بے مہار ہیں
رہتی ہے جن کی ناک پہ عینک چڑھی ہوئی — اس وضع کے بھی کو نہ نظر بے شمار ہیں

القصہ آپ ہانکئے گاڑی تو ہو خبر
ہے سوجھتا جو ایک تو اندھے ہزار ہیں

انشا کا رنگ دیکھئے۔ کس خوبی سے حلوائیوں کی زبان استعمال کی ہے اور کیا اچھی طرح تلازمہ برت گئے ہیں خود ہی اس نظم کے لکھنے کی وجہ بیان کی ہے۔ واقعہ سمجھنے کے لئے میں بھی اس کو نقل کئے دیتا ہوں۔

"۱۹۰۱ء میں نیازمند نے بعض احباب کی فرمائش سے ایک مسجد کے خائن متولی کے واقعات زندگی مثمن ترجیع بند میں نظم کئے تھے یہ نظم اس کا ایک بند ہے۔ متولی مذکور پر مسلمانوں نے حساب فہمی کا دعویٰ دائر کیا تھا اس کے متعلق مسجد کی دوکان کے کرایہ دار ہر پرشاد حلوائی کا خیال اس نظم میں ظاہر کیا گیا ہے اور خصوصیت کے ساتھ حلوائی کا تلازمہ و لہجہ برتا گیا ہے۔ بظاہر الفاظ و محاورات مستعملہ زبان بھاشا کے معلوم ہوتے ہیں مگر وہ اردو میں رائج ہیں۔ اس قسم کے بعض الفاظ کی تشریح یہ ہے۔

کھوب۔ خوب + جے۔ یہ + سباد۔ سواد (مزا) + جے ہی۔ یہ ہی + میٹھا۔ فائدہ + مھجد۔ مسجد + کھاتر خاطر + پھساد۔ فساد + آجابیگا۔ آجائیگا + سیکھ جی۔ شیخ جی + ربڑی۔ ریوڑی +

یہ خبر سُن کر کہ یہ ابنِ زیاد — مالِ مسجد کھا گیا حد سے زیاد
بولا ہر پرشاد حلوائی کہ کھوب — پڑ گیا تھا جے میاں جی کو سباد
جے ہی تو میٹھا تھا مھجد کا انہیں — اسی کھاتر کرتے تھے دنگا پھساد
اب تلک تو ان کی پانچوں گھی میں تھیں — اب چھٹی کا دودھ آجابے گا یاد

سیکھ جی آکر پھنسے ہیں دیر میں
اب پڑے ہیں ربڑی کے پھیر میں

اب ان کی دو غزلیں لکھ کر مضمون ختم کرتا ہوں۔ غزلیں بھی مذاقیہ لیتا ہوں تاکہ اُن کی طبیعت کا ایک رنگ اچھی طرح معلوم ہو جائے۔ اگر زمانہ نے فرصت اور دماغ نے کام دیا تو پھر کبھی دکھاؤں گا کہ ان کا متین رنگ بھی کچھ مزاحیہ رنگ سے کم نہیں ہے۔ ان کا قلم مذہبی مضامین پر بھی ایسا ہی چلتا ہے جیسا مذاقیہ مضامین پر اور وہ نثر بھی ایسی ہی دلکش اور دلچسپ لکھتے ہیں جیسی نظم۔ اور اگر خدانخواستہ آپ میں سے کسی کا ان سے ملنا ہو تو آپ دیکھیں گے کہ ان کی زبان بھی ایسی ہی چلتی ہے جیسے ان کا قلم۔

ایک دم میں موت ہے اک میں حیات — یہ ہے دنیا اور اس کی کائنات
جس پہ ہم بھولے تھے وہ موسم کہاں — دن ہیں اگلے سے نہ ہے اگلی سی رات
السلام اے وقتِ جاہ و مال و زر — الوداع اے دورِ اصل و نسل و ذات

کم نہ ہوگی رونقِ دنیا کبھی — کیا کمی کووں کی گر باقی ہے بھات
شیخ کی جب دسترس سے دُور ہو — دولتِ دنیا پہ کیوں مارے نہ لات
نشۂ دولت سے اب تو مست ہو — ق — جانتے ہو فرض سارے رسمیات
پھر دکھانا تم یہی جوش و خروش — اک ذرا بیٹی کی آجائے برات
بڑھ گئی الحمدللہ اب خوشی — ق — کم نہیں شادی سے تقریبِ وفات
کون مرنے کا کسی کے غم کرے — کھانے پر ماریں گے سب بڑھ بڑھ کے ہات

ہو تمہیں شبیر خود واہی تبھی
کہتے رسموں کو ناحق واہیات

کیوں نہ اُس ظالم کی ساری سلطنت برباد ہو — اہلِ کار ایک ایک جس کا غیرتِ شداد ہو
کوئی بھی اغوائے شیطانی سے بچ سکتا نہیں — اور خصوصاً حضرتِ آدم کی جو اولاد ہو
دخل دینے سے پرائے کام میں حاصل ہو یہ — جرم ناحق سر پڑے نیکی الگ برباد ہو
ہاتھ پاؤں جب تلک چلتے ہیں کچھ کر لیجئے — پھر خدا معلوم کیا پیش آئے کیا افتاد ہو
عاصیوں پر تو بہت کچھ آپ سے دے کر چکے — حضرتِ واعظ، کچھ اپنے حق میں بھی ارشاد ہو
ہیچ سمجھے راز جوئی عالمِ اسباب کی — جس کو اپنی ابتدا و انتہا کچھ یاد ہو

کنجِ تنہائی میں بھی شبیر کچھ راحت نہیں
قیدِ ہستی سے جو چھوٹے، فکر سے آزاد ہو

میں نے اس مضمون میں بڑے بڑے قطعات جان کر ترک کر دیئے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ بے مزا تھے بلکہ اس لئے کہ مضمون بہت بڑھ جاتا اور آپ پڑھتے پڑھتے اکتا جاتے۔ خیر کیا ڈر ہے۔ یار زندہ صحبت باقی۔ پھر کبھی دیکھا جائے گا۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

خاتونِ مغرب

جب ضمیرِ حق میں انساں کا ہیولیٰ بن چکا / مرد کو فصلِ خزاں کی دھوپ سے پیدا کیا

اور عورت کو بنایا اک سبک رَو نہر سے / موسمِ گُل کی معطّر چاندنی کی لہر سے

مرد کو تحفے میں دی شمشیر و تدبیرِ حیات / اور عورت کو چراغ و بربط و قند و نبات

راستے میں مرد کے ڈالے گئے تیر و تبر / اور عورت کی طرف پھینکے گئے گلبرگِ تر

مرد کے اعضا کو بخشا سنگ و آہن کا جلال / اور عورت کو صبا کا لوچ، شبنم کا جمال

مرد کو بخشا لہو، افشردۂ میدانِ جنگ / اور عورت کو ملا پگھلے ہوئے سونے کا رنگ

اُس کو بخشی سنگ کی تعمیر، صرصر کا جلال / اور اسے طبعِ حریر و مستیٔ بادِ شمال

اُس نے صولت پائی، اِس نے جلوۂ محفل طراز / اُس کو محنت دی گئی اِس کو محبّت کا گداز

اُس کو طبلِ جنگ کا ہنگامۂ دہشت فزا / اِس کو ہلکی نرم کلیوں کے چٹکنے کی صدا

اُس کو طوفاں گاہِ بیداری، اسے خواب و خیال / اُس کو چشمِ ضیغم و شاہیں، اسے چشمِ غزال

اُس کو شانِ مہر، اِس کو جلوۂ ماہِ مُنیر / اُس کو سنگ آشوب تیشہ، اسکو رقصِ جوئے شیر

اس کو تاجِ غزنوی، اِس کو خمِ زلفِ ایاز / اُس کے ماتھے کو شکن، اس کے لبوں کو موجِ ناز

اُس کو شورِ حرب، اِس کو شوخیٔ گفتار دی / تیغ کی اُس کو، اِسے پازیب کی جھنکار دی

اُس کو چھانٹا زخمِ دندانِ کے تلاطم کیلئے / اِس کو رکھا پاک بچّوں کے تبسّم کے لئے

مرد کے زانو کی جنّت بن گیا عورت کا سر

چند دن چلتی رہی دنیا اِسی انداز پر

لیکن اک شب دفعتہً تاریکیوں کے درمیاں — جب فرازِ چرخ پر منڈلا رہی تھیں بدلیاں

تنگ تھا دنیا کے ننھے سے کُرے کا عرض و طول — ہو رہا تھا چرخ سے اوہامِ باطل کا نزول

رات یوں تاریک تھی جس طرح مجرم کا ضمیر — سَر کیا شیطان نے عورت کی جانب ایک تیر

سُرخ تیر، افسردہ تاریکی میں سنّاتا ہؤا — آتے ہی عورت کے سینے میں ترازو ہو گیا

تیر کھانا تھا کہ روحِ ناز بل کھانے لگی

مرد بننے کی تمنّا دل کو تڑپانے لگی

دی صدا عورت نے اِس نرمی کو کھونا چاہیئے — مرد کا مدِّ مقابل مجھ کو ہونا چاہیئے

ناز کی ہے اک اہانت آفریں افتادگی — مسکراتی ہوگی میرے حال پر مردانگی

مرد و عورت، دو ہیں رخ، اور ایک ہی تصویر ہے — یہ لچک دراصل میری ذات کی تحقیر ہے

ابنِ آدم کی مٹا دیں نازشِ تاب و تواں — مرد بن جائیں اگر حوّا کی نازک بیٹیاں

مادرِ انساں کے غنچوں کو بھی کھِلنا چاہیئے — ہم کو بھی حق مرد کے مانند ملنا چاہیئے

روح پر عورت کے یہ دیوانگی جب چھا گئی

لو سحر ہوتے ہی وہ مردوں کی صف میں آ گئی!

آئی اور خم ٹھونک کر آئی مثالِ پہلواں — پنڈلیاں ہیں گاؤ دُم شانوں پر اُبھری مچھلیاں

ترک کر بیٹھی ادا و ناز کا "شغلِ رکیک" — اب ہے وہ دنیا کی ہر مردانہ ورزش میں شریک

باگ پر ہے ہات اور ترشی ہوئی زلفوں پہ گرد — تن کے کہتی ہے کہ دیکھو زن سی یوں بنتے ہیں مرد

لیکن اس دریا میں ہے زہرآب کی بھی ایک موج
کس گراں قیمت پہ عورت نے خریدا ہے یہ اَوج!!

اپنے سینے کا خزانہ، اپنی فطرت کا جمال — مرد بننے کی ہوس میں کر دیا ہے پائمال

کر چکی ہے بے طرح محرومِ چشمِ التفات — اپنے اُس شیریں تبسّم کو کہ تھا اک کائنات

یوں بغاوت پر ہوا آمادہ فطرت سے شباب — پڑ گئے رخسار پھیکے، جل گئی چہرے کی آب

زلف چھوٹی ہو گئی، اور دست و پا کھنچ کر طویل — بجھ گئی برنائی، روڑھا ہو گیا رُوئے جمیل

ہو گئی مردانگی کے ولولوں سے دردمند — جُنبشِ مژگاں کی موسیقی تبسُّم کی کمند

جلد کی سختی کے اندر لوچ پنہاں ہو گیا — ایک سیٹھا پن سا ہونٹوں پر نمایاں ہو گیا

خستہ چینی کی کھنک گم ہو گئی گفتار سے — ابر کی سی شوخیاں جاتی رہیں رفتار سے

ہو گیا سنگِ خرد سے شیشہ بھولے پن کا چُور — مر گیا آنکھوں کا پانی، اُڑ گیا چہرے کا نُور

جنتِ ارضی کو دوزخ کا نمونہ کر دیا — چشمکِ بیباک نے آنکھوں کو سُونا کر دیا

بن گئی القصہ اک ایسا سوالِ ناصواب — عشق کے ہونٹوں سے مل سکتا نہیں جس کا جواب

نازکی، عزت، محبت، آرزو کچھ بھی نہیں
نام تو ہے پھول لیکن رنگ و بو کچھ بھی نہیں

جوش

سمرقند

دنیا کے بعض شہر اپنے حسن اور خوبصورتی، تاریخی اہمیت اور قدامت کے باعث اُن قوموں کے تہذیب و تمدن کی جنھوں نے انہیں آباد کیا تھا، شاندار اور قابلِ فخر یادگار ہیں۔ یہ شکستہ شہر آج شان و شوکت، قوت و عظمت اور تہذیب و شائستگی کے زندہ ثبوت ہیں، اور دنیا کے لئے اپنی تاریخ کے مفید معلومات اور حیرت انگیز انکشافات فراہم کرتے ہیں۔

سمرقند جو غالباً دنیا کے حسین ترین شہروں میں شمار کیا جاتا ہے، اپنی تاریخی اور اقتصادی اہمیتوں کے باعث مملکتِ ازبکستان کا دار السلطنت بن گیا۔ یہ شہر اُن قدیم ایشیائی فنون کی زندہ یادگار ہے جو ہمیشہ ایشیا والوں کے لئے مایۂ ناز اور باعثِ فخر رہے ہیں۔

سمرقند کا شمار قدیم ترین شہروں میں ہے۔ کارتھیج، تھیبس اور بابل زمانے کے ہاتھوں پامال ہو گئے اور چند کھنڈروں کے سوا اب ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں لیکن سمرقند آج تک موجود ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ شہر اُس جگہ تو واقع نہیں جہاں کبھی تھا، کیونکہ دنیا کے اور شہروں کی طرح سمرقند بھی برباد ہو کر پھر آباد ہوا ہے، تاہم مغلوں کے حملوں سے قبل گریکو بکٹری اور عربی زمانہ کی بنیادیں آج بھی موجودہ شہر کے قریب دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس شہر کی ابتدائی تاریخ اس کی انتہائی قدامت کے باعث ایک رازِ مخفی ہو کر رہ گئی ہے اور یہ بھی صحیح طور پر اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ اس کی بنیاد کس زمانہ میں اور کن ہاتھوں سے رکھی گئی تھی۔ جو کچھ بھی تحقیقات نے ہمارے لئے معلومات فراہم کئے ہیں وہ اس سے زیادہ نہیں کہ سکندرِ اعظم شہنشاہِ مقدونیہ کے عہد میں اس کا شمار دنیا کے متمدن اور مہذب شہروں میں تھا اور مال و دولت کے باعث یہ شہر حملہ آوروں کی آرزوؤں اور امیدوں کا مرکز بن گیا تھا۔ اس زمانہ میں اور ساتویں صدی سے نویں صدی تک سمرقند اپنی دولت اور زرخیزی کے باعث تمام دنیا کو متحیر اور متعجب کئے رہا۔

شاید دنیا کے کم شہروں کو سمرقند جیسی آب و ہوا نصیب ہوئی ہوگی۔ معتدل آب و ہوا ہے۔ اردگرد کے خوشنما پہاڑ اس کی آب و ہوا میں برودت پیدا کرتے اور بادِ سموم کے تند جھونکوں کو نسیم کے روح پرور اور عطر بیز جھونکوں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ یہ شہر عہدِ قدیم سے اپنے لذیذ اور با افراط میووں کی وجہ سے شہرۂ آفاق رہا ہے،

جو بغداد اور اس کے قرب وجوار میں نہایت کثرت سے بھیجے جاتے ہیں۔ یہاں کے کسان نہایت محنتی مستقل مزاج اور جفاکش ہوتے ہیں۔ فنِ زراعت سے خوب واقف ہوتے ہیں۔ چاول، گندم، مکّا اور روئی کی کثرت انہیں کی قوتِ بازو اور مشقت کی مرہونِ منت ہے۔ قرب وجوار کی سرسبز و شاداب وادیاں جواہرات کی کانوں سے مالامال ہیں اور یہ شہر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے کہ یہ کسی بیرونی تجارت کا دست نگر اور محتاج نہیں۔ قدرت نے اس کے لئے تمام ضروریاتِ زندگی مہیا کر دی ہیں۔

یوں تو سمرقند کا کوئی موسم بھی ایسا نہیں جو خوشگوار اور دلفریب نہ ہو، لیکن بہار کا موسم اپنی رنگینیوں کے باعث سوئٹزرلینڈ کے پُرفضا اور روح پرور آبشاروں اور سبزہ زاروں اور کشمیر اور کولو کے زرخیز اور سرسبز میدانوں اور پہاڑوں سے بھی زیادہ دلکش ہوتا ہے۔ صدہا انواع و اقسام کے پھول اور اخروٹ کے چمکدار اور خوبصورت درخت نظر کے لئے حیرت اور دل کے لئے جوش و ہیجان کا سامان پیدا کر دیتے ہیں۔ معطّر اور خوشگوار ہوائیں روح کو تازہ کر دیتی ہیں۔

یہ امر کچھ کم حیرت انگیز نہیں کہ سمرقند کی قدیم اور عجیب و غریب عمارات کی یادگاروں کا آفتابِ شہرت پانچ صدیوں کے انقلاب اور گردشِ زمانہ سے بھی گرد آلود نہ ہو سکا۔ اس کے مہمان نواز اور حسین، سرخ و سپید تاجیکی اور بخارسکی باشندے اپنے روئی اور ریشم کے بھڑکیلے شوخ رنگ کے چغے زیبِ تن کئے ہوئے بازاروں اور عام شاہراہوں پر آمد و رفت کرتے نظر آتے ہیں۔ نغمہ و سرود اور چنگ و رباب کی دلکش آوازیں اُن کے قہوہ خانوں سے نکلتی ہیں اور وہاں کی رنگین مزاجی، نازک خیالی، عیش و عشرت اور پُرکیف زندگی کا پورا پورا ثبوت دیتی ہیں۔ یقیناً یہی وجہ ہے کہ سمرقند کی دلفریبی نے مشرق و مغرب کے شعرا کو اپنے جذبات کے اظہار کے لئے مجبور کیا۔ حافظِ شیرازی بھی اگر کسی کے خال کے بدلے میں کوئی چیز انتخاب کرتے ہیں تو وہ یہی سمرقند ہے۔ انیسویں صدی کا مشہور و معروف انگلستانی شاعر طامس مور بھی اپنی شہرۂ آفاق نظم "لالہ رخ" میں سمرقند کی دلکشی اور دلفریبی کے راگ الاپنے لگتا ہے!!

یوں تو تیمور لنگ کے ظلم و ستم اور سفاکیوں کے بیان سے صفحاتِ تاریخ سیاہ ہیں لیکن تیمور ہی کی بدولت سمرقند کی شہرت تمام دنیا میں پھیل گئی اور اس کی شان و شوکت میں چار چاند لگ گئے۔ سمرقند کے عروج کا غالباً سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ تیمور نے اسے اپنی عظیم الشان اور وسیع سلطنت کا پایۂ تخت بنایا تھا، جو نہ صرف ہندوستان اور فارس تک پھیلی ہوئی تھی بلکہ اس میں اور بھی ممالک شامل تھے۔ اِس عہد میں یہاں بڑے

بڑے علما اور حکما جمع تھے اور تیمور کی علمی قدردانیوں اور فنِ تعمیرات کی سرپرستیوں نے سمرقند کو علم و فن کا مرکز بنا دیا تھا۔ فنِ تعمیر کی سرپرستی کی بدولت جو عمارات اور مقبرے تعمیر ہوئے وہ آج تک اسلامی دنیا بلکہ تمام مشرق کے لئے مایۂ صد فخر و ناز ہیں، اُن کی شہرت تمام دنیا میں پھیل گئی اور ہر ملک میں ان کی عظمت اور اہمیّت کا سکّہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھ گیا۔

اِن تمام بیش بہا اور لاثانی عمارات میں سب سے مشہور اور فنِ تعمیر کا بہترین نمونہ تیمور کا اپنا مقبرہ ہے جو "گورِ امیر" کے نام سے مشہور ہے۔ فنِ تعمیر کے مشہور و زبردست ماہر روسی وتیکن کی تحقیقات نے اُسے اس نتیجہ پر پہنچایا کہ "گورِ امیر" کو خود تیمور نے تقریباً ۱۴۰۴ء میں تعمیر کرایا تھا۔ اس میں بہترین قسم کا مسالہ مجولیا استعمال کیا گیا ہے۔ صاف اور نیلگوں ایشیائی آسمان کے نیچے اس کے برج چمکتے اور جگمگاتے ہیں۔ یہ اس خوبی اور عمدگی سے بنایا گیا ہے کہ آج تک اپنی اصلی حالت پر قائم ہے۔ اس کے دروازے پر نہایت نفیس سنگِ مرمر کا کام کیا گیا ہے جو بے حد باریک اور نازک ہے اور جسے دیکھتے ہی قدیم فنِ تعمیر کے کمال کی بے اختیار داد دینی پڑتی ہے!

اس عمارت کے بعد حسن و خوبصورتی اور اہمیت کے لحاظ سے "بی بی خانم" کی مسجد ہے۔ اگرچہ یہ عمارت اپنی قدامت اور ساتھ ہی ساتھ بے التفاتی کی وجہ سے جگہ جگہ سے شکستہ ہوتی جا رہی ہے لیکن اس کی سنگِ مرمر کی چھت زمانہ کے انقلابات کے باوجود اپنے نقش و نگار اور گلکاریوں کا بہترین نمونہ پیش کرتی ہے۔ غالباً یہ بھی تیمور لنگ کی ہی کاوشوں کا نتیجہ ہے اگرچہ ایک مشہور افسانہ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسے اس کی چینی بیوی "بی بی خانم" نے بنوایا۔

"بی بی خانم" سے کچھ فاصلہ پر مشہور و معروف "شاہ زند" قبرستان ہے جو سینکڑوں روضوں اور مقبروں سے بھرا پڑا ہے۔ یہ سب مقبرے اور یادگاریں تیمور لنگ کے امرا کی بیویوں اور شاہی بیگمات کی ہیں۔ یہ عمارتیں اتنی حسین، نازک اور نفیس ہیں کہ اگر انہیں قابلِ قدر اور لاثانی اسلامی مقبروں اور عمارتوں میں شمار نہ کیا جائے تو یقیناً ایک بڑی فروگذاشت ہوگی۔

باوجود پانچ سو برس کے طویل زمانہ کے جس میں سیکڑوں انقلابات ہوئے اور سمرقند کی فضا میں بیسیوں تبدیلیاں ہوئیں، ان عمارات کا کام اور نقش و نگار اتنے نئے ہیں کہ یہ گمان ہوتا ہے کہ ابھی کل ہی بن کر تیار ہوئی ہیں۔ یورپ کے فنِ تعمیر کی یادگاروں اور مقبروں کے خلاف، ان عمارتوں کو انقلابِ زمانہ کا زبردست ہاتھ پامال نہ کر سکا اور آج تک دنیا کے بڑے بڑے ماہرینِ فن ان کی غیر فانی زندگی اور ابدی شباب سے متحیر ہیں۔

اس حیرت انگیز شہر کی قدیم یادگاروں میں دارالعلوم کی وہ عمارت بھی ہے جو تیمور کے پوتے الغ بیگ کی تعمیر کردہ ہے۔ اسے ۱۹۰۸ء میں وتیکن نے دریافت کیا تھا۔ یہ ایک عمیق اور زبردست غار میں بنائی گئی ہے۔ سنگِ مرمر کا ایک نہایت طویل زینہ اندر کے کمروں تک تعمیر کیا گیا ہے۔ ایک زبردست میز پر، جو پہاڑوں کو تراش کر بنائی گئی ہے، نظامِ شمسی کے نشانات اور نقشے ہیں۔ جن کی بدولت الغ بیگ کی شہرت نہ صرف مشرق میں ہوئی بلکہ مغرب میں بھی اس زبردست کارنامہ نے اُس کو آسمانِ شہرت کا آفتاب بناکر چمکا دیا۔

شہر سمرقند کے وسط میں ایک بڑی چہار دیواری ہے جو "ریگستان" کہلاتی ہے۔ اس کے متعلق ایم مین کا خیال ہے کہ یہ چاردیواری چودھویں صدی کے وسط میں عالمِ وجود میں آئی ہوگی۔ اس کے اندر تین مدرسے یعنی قدیم اسلامی یونیورسٹیاں ہیں۔ ان تینوں میں سب سے پہلی عمارت وہ ہے جس کا نام "مدرسۂ الغ بیگ" ہے۔ اسے غالباً ۱۴۲۰ء میں مکمل کیا گیا ہوگا۔ یہ تینوں میں سب سے خوبصورت اور بہتر ہے۔ یہ اُس حیرت انگیز قدیم فنِ تعمیر کی یادگار ہے جس کے انتہائی عروج پر آج تک تمام دنیا انگشت بدنداں ہے۔

"مدرسۂ شیر دور" کو پندرھویں صدی کی ابتدا میں امام قلی خاں نے تعمیر کرایا تھا اور یہ وسطِ ایشیا کے مشہور فنِ تعمیر کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ اس کے متعلق وی۔ وتیکن رقمطراز ہے کہ "وہ اپنے زمانہ کی بہترین یادگار ہے۔ اس کی شکستہ عمارات زمانۂ سلف کی نقاشی اور قدامت کا نشان، بے اندازہ ایشیائی دولت کا ثبوت جو صدیوں اسرارِ مخفی کی طرح شاہانِ سلف نے بڑے بڑے خزانوں میں جمع کی تھی، اور عالمگیر شہرت کی شہادت ہیں۔ لیکن "شیر دور" اپنی پرانی شان و شوکت، حسن اور آب و تاب سے محروم ہے اور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس کی تعمیر ناقص اور دیواروں کی ساخت بے ترتیب ہے اور خصوصاً اس میں مسالہ اور سامانِ تعمیر بھی بہت ناقص اور جلد خراب ہو جانے والا استعمال کیا گیا ہے۔" اس کے در و دیوار پر گلکاریاں، نقش و نگار اور جانوروں کی تصاویر ہیں جو بڑی کامیابی اور نفاست سے بنائی گئی ہیں، اگرچہ قرآن جانداروں کی تصاویر بنانے کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ اساتذہ اور طلبہ کے لئے کمرے اور آرامگاہیں چہار دیواری کے وسط میں تعمیر کی گئی ہیں۔

تیسرا مدرسہ بھی کچھ کم دلچسپ اور اپنی صنعت اور ساخت کے لحاظ سے کم قابلِ تعریف و ستائش نہیں۔ اس کی تعمیر "شیر دور" کے بارہ سال بعد یعنی ۱۶۳۰ء میں ہوئی تھی۔ اس کے نقش و نگار، پچیکاری اور رنگ و روغن

آج بھی قدیم فنِ تعمیر کا بہترین نمونہ ہیں اور سیّاحوں اور ماہرینِ فن کے لئے باعثِ حیرت و استعجاب ہیں۔ دیگر اسلامی عمارات کی طرح اس "مدرسہ" کی عمارت میں بھی ایک رفیع الشان اور بلند دروازہ ہے جو نوکیلا اور محراب دار ہے اور عمارت کی شان و شوکت بڑھا رہا ہے۔

ازبک حکومت کی بے التفاتی بلکہ ظلم و زیادتی تھی کہ زمانۂ سلف کی یہ عظیم الشان قابلِ قدر اور بیش بہا عمارات اب تک کس مپرسی کی حالت میں پڑی تھیں لیکن خوش قسمتی سے حال ہی میں خود بخود، حکومت کی توجہ ادھر مبذول ہوگئی ہے اور ایک خاص کمیٹی فنِ تعمیر اور قدیم یادگاروں کے قائم رکھنے کے لئے بنائی گئی ہے جس کا صدر مقام تاشقند ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور ازبکستان کمیٹی فنِ تعمیر کی قدیم اور بیش بہا یادگاروں کے قائم رکھنے کے لئے بنائی گئی ہے۔ گویا اس ملک کے باشندوں نے فنِ تعمیر کی اُن شاندار اور زبردست یادگاروں کو بربادی اور انہدام سے بچا لیا جو ان کی قوم کے لئے مایۂ صد فخر و ناز ہیں اور ان کے اسلاف کی قدردانیوں اور کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔

آج تمام ایشیا بلکہ مشرق ان قدیم یادگاروں پر فخر کرتا ہے۔ یورپ کا فنِ تعمیر ہمیشہ ایشیائی اور اسلامی فنون کا خوشہ چین رہا ہے اور آج بھی وہ ان کی تقلید کرنے اور اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کے لئے مجبور ہے!

مقبول الرحمن اثر

نالۂ غنچہ ہے صرف یہی ہستیٔ تصویرِ حیات
لازمہ ہے کچھ افزائشِ رونقِ حیات
جب تک نہ ہوا خلاقِ نگہ کو کا روغن
ممکن نہیں آرائشِ تصویرِ حیات

نجم ندوی

غزل

امید و بیم کے جھگڑوں کا فیصلہ ہوں میں
کہ اُس کا نقشِ قدم بن کے مٹ گیا ہوں میں

تلاشِ یار کی نوبت ابھی کہاں آئی
ابھی تو کھو کے خود اپنے کو ڈھونڈتا ہوں میں

جسے وصال کے پہلو میں بھی نہ چین آیا
غمِ فراق کا وہ لذّت آشنا ہوں میں

کہاں یہ وسعتِ جلوہ کہاں یہ گوشۂ تنگ
کبھی تو دل کو کبھی تجھ کو دیکھتا ہوں میں

ہے مدّ و جزرِ حقیقت مرا وجود و عدم
نہیں ہوں میں تو نہ سمجھو کہ مٹ گیا ہوں میں

تری نظر ہے وہ عبرت کا آئنہ جس میں
خود اپنے حالِ پریشاں کو دیکھتا ہوں میں

ہلاک ہو کے بھی شکوہ نہ لب تک آئے گا
وفا شناس بہ اندازۂ جفا ہوں میں

دلیلِ راہِ محبّت ہے بے خودی میری
کوئی نہ مجھ کو یہ سمجھے کہ کھو گیا ہوں میں

فریبِ جلوہ نہ سمجھوں تو کیا کہوں اس کو
کہ اپنی ہستیٔ باطل کو جانتا ہوں میں

مرا وجود بھی تھا کوئی چیز کیا معلوم
اس اعتبار سے پہلے ہی مٹ چکا ہوں میں

جو بے زباں ہیں نگاہوں سے کام لے لیں گے
یہ سچ نہیں ہے کہ محرومِ التجا ہوں میں

ڈبو رہا ہوں تو ہادیؔ کسی سے کیا سروکار
خود اپنی کشتیٔ ہمّت کا ناخدا ہوں میں

ہادیؔ مچھلی شہری

انجیلِ عمل

ترقی کی راہ میں خواہ کتنی ہی خوفناک اور ہوش ربا مشکلات سدِّ راہ کیوں نہ ہوں ہم اپنی بلند ہمتی اور تگ و دو کے ذریعہ سے فائز المنزل ہو سکتے ہیں۔ سست و کوتاہ عمل انسان پہلی ہی منزل میں ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

وہ انسان جو اپنے میں کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، یقیناً کامیاب و کامران ہو کر رہتے ہیں۔ تگ و دو سے زندگی کی خوابیدہ روح بیدار ہو جاتی ہے۔

سعی و عمل بوڑھوں کے لئے عصا اور جوانوں کے دو دھاری تلوار ہے، بیمار و علیل انسانوں کے لئے اکسیر سے بڑھ کر ہے۔ سست و کوتاہ عمل انسانوں کے لئے عرصۂ حیات ایک خارستان ہے اور ایک باعمل انسان کے لئے عرصۂ حیات ایک چمنستان ہے۔

سیزر ایک بار اپنے دوستوں کے ساتھ ملک اسپین میں بیٹھا سکندرِ اعظم کی فتوحات کا مطالعہ کر رہا تھا کہ یکایک رونے لگا۔ مصاحبین نے حیرت و اضطراب کے عالم میں پوچھا "اے شاہِ زمن آپ کیوں روتے ہیں؟"

سیزر نے جواب دیا: "سکندرِ اعظم مجھ سے عمر میں چھوٹا تھا، لیکن مجھ سے زیادہ جواں ہمت تھا، اُس نے وہ وہ فتوحات کیں جو مجھ سے بڑھاپے تک نہیں ہو سکیں۔ میں اپنی پست ہمتی پر روتا ہوں"!

سیزر کے اس ملال کو زندگی کہتے ہیں۔ سعید ہیں اس نوع کے غموم و ہموم۔ مبارک ہیں اس قسم کے افکار و آلام۔

بائیس سال کی عمر میں ملٹن ایک معرکۃ الآرا نظم لکھ کر مشہور انام ہو چکا تھا، لیکن اُسے افسوس تھا کہ اُس نے اپنی عمر کے اتنے سال کیوں خاموش رہ کر گزارے۔ مشاہیرِ دہر میں ملٹن ہو یا سیزر، جس زبردست شخصیت نے بھی تاریخ کے صفحات پر اپنا نام لکھا ہے اُس نے اپنا خون پسینہ ایک کر کے شہرتِ دوام حاصل کی ہے۔

کامیابی و کامرانی وہی ہے جو انسان کو اپنی اَن تھک کوششوں کی وجہ سے حاصل ہو۔ مسرت و انبساط کا حصول آسان نہیں۔ سچی خوشی ایک قیمتی پتھر ہے جو اُس معدن میں ملتا ہے جسے انسانی ہاتھوں نے تدبر و تفکر

کے ساتھ کھودا ہو۔ انسان کا جسم ایک مشین کے مانند ہے اگر مشین سے صحیح طور پر کام نہ لیا جائے تو اُس کی کلیں بگڑ جاتی ہیں، نقائص واقع ہو جاتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ایک بے کار نکمے انسان کا حشر ہوتا ہے۔ حرکت میں برکت ہوتی ہے۔ خدا کی یہی عادت ہے جسے بہت سے انسان بھولے ہوئے ہیں۔ بعض انسانوں کو قدرت نے تندرستی اور مال و منال دیا ہے۔ لیکن کوشش کے فقدان نے انہیں چمکنے نہیں دیا۔ اس کے برخلاف بعض بہرے، گونگے، اندھے اپنی محنت پژوہی اور کدوکاوش کے باعث سیاسیات، ادبیات وغیرہ میں ممتاز شخصیت کے مالک ہیں۔

تسلسلِ کار کے باعث انسان ضرور کامیاب ہو جاتا ہے، ایک بار نپولین نے کہا تھا کہ:-

"میرے حریف تسلسلِ کار کے راز سے ناواقف ہیں وہ پانچ سات لمحات کو بالکل حقیر سا وقت سمجھتے ہیں۔ اور میں اس 'حقیر وقت' کی قدر و قیمت سے پُورے طور پر آگاہ ہوں۔ اس لئے میرے حریف مجھ پر غالب نہیں آسکتے ——"

ایک نوجوان مصوّر چاہتا تھا کہ ایک ملکہ کی تصویر بنائے۔ بڑی تگ و دو کے بعد اسے ملکہ نے تصویر کشی کا موقع دیا۔ جب وقت آیا تو مصوّر دیر کر کے پہنچا۔ ملکہ مصوّر کا انتظار کر کے واپس چلی گئی۔ مصوّر کو عمر بھر اس نادر موقع کے ضائع ہو جانے کا افسوس رہا۔ جو شخص ہاتھ آئے ہوئے موقع ضائع کرتا ہے وہ ذلیل و رسوا ہوتا ہے۔

نوجوانو! موقعوں کا انتظار چھوڑو، خود موقع پیدا کرو۔ اگر تم میں کوئی جوہر ہے تو اُس کو جذبۂ عمل سے نمایاں کرو۔ ولیم پٹ نے چودہ سال کی عمر میں ایک المیہ لکھی تھی۔ شلر اور پوپ نے اسی عمر میں آغازِ نگارش کیا تھا۔ گروٹس نے پندرہ سال کی عمر میں ایک انسائیکلو پیڈیا مرتب کی تھی، اسی عمر میں وکٹر ہیوگو نے اپنی شہرۂ آفاق نظم اکیڈمی میں پیش کی تھی۔

سولہ کے سن میں بیکن نے حکیم ارسطا طالیس کی فلاسفی کے اغلاط نمایاں کئے تھے۔ سکندرِ اعظم سولہ سال کی عمر میں اپنے باپ کی فوج میں قائدِ اعظم تھا۔

سترہ کی عمر میں انجیلو ایک چابک دست مصوّر تھا، اور گلیلیو پیسا کے کلیسا میں تجربات کر رہا تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں پادری چارلس سپرجن ایک خوش گفتار واعظ تھا اور مجذرۂ عظمیٰ ژان دارک بڑے بڑے معرکے سر کر رہی تھی۔

انیسؔ سال کی عمر میں جارج واشنگٹن ملک بھر کا معتمد انسان تھا اور سٹیفنسن سٹیم انجن کی ایجاد میں مصروف تھا۔
بیس سال کی عمر میں رابرٹ ہال ایک بہت بڑا لیڈر تھا اور واشنگٹن اردنگ ایک کامیاب مصنف تھا
اکیس سال کی عمر میں بیتھووَن ایک مشہور موسیقی دان تھا، ولبرفورس پارلیمنٹ کا ممبر تھا اور میزینی اخبارات میں سیاسیات پر ہنگامہ پرور مقالات لکھتا تھا۔
بائیس سال کی عمر میں الفریڈ اعظم اپنی پبلک زندگی کا آغاز کر رہا تھا۔ اور شلر اپنی شہرۂ آفاق نظم "دی بابر" لکھ چکا تھا۔
تیئیس سال کی عمر میں سیزر ایک بڑی شخصی سلطنت کا فرمانروا تھا، برونگ اپنی نظموں کا پہلا مجموعہ شائع کر چکا تھا اور وہائیٹ فیلڈ لندن کے گرجا میں وعظ کہا کرتا تھا۔
چوبیس سال کی عمر میں ڈانٹے صاحبِ سیف وقلم تھا۔ رسکن اپنی تصنیف "عصرِ حاضر کے مصوّر" مرتب کر چکا تھا، اور نیوٹن کششِ ثقل کے تجربات میں مصروف تھا۔
پچیس سال کی عمر میں جان کیٹس دنیائے شاعری میں نام کر کے اپنی مرگِ بے ہنگام کے قریب تھا، کالرج "ملّاحوں کی کہانیاں" لکھ چکا تھا اور جادو نگار سودی کا کلام کئی جلدوں میں چھپ چکا تھا۔
عصرِ حاضر کی شائستگی و عمرانیت کا اقتضا یہ ہے کہ انسان فوراً اپنے مقصدِ حیات کے لئے تگ و پو شروع کر دے، جس نے ذرا بھی ہیچر میچر کی ترقی کی دوڑ میں رہ گیا۔ ترقی کی راہیں کسی زمانہ میں مسدود نہیں ہوئیں علم وادب، مذہب وسیاست، موسیقی و مصوری میں ابھی اختراعاتِ فائقہ کی ضرورت ہے۔ ایک کوتاہ عمل انسان کی زندگی کا وہ دور قابلِ رحم ہوتا ہے جب وہ اپنی غفلت و سستی کے باعث ناکامِ حیات ہو اور اس کے چہرے پر افسردگی و کہولت کے نشان ہویدا ہوں۔ سب سے بدبخت وہ انسان ہے جس کے گرد و پیش کے حالات بھی موافق ہوں، زمانہ بھی ممد و معاون ہو لیکن وہ گوشۂ گمنامی میں گھُٹ گھُٹ کر مر جائے۔ قبروں میں ایسے ایسے گمنام انسان محوِ خواب ہیں جو چاہتے تو تھوڑی سی کوشش سے آسمانِ شہرت پر آفتاب و ماہتاب ہو کر چمکتے۔ ہم طبعاً بعض کاموں میں گہرا شغف رکھتے ہیں۔ اس لئے اگر ہم اپنے رجحان و میلان کا صحیح طور پر اندازہ کر کے اُس کام کا آغاز کر دیں جس کے ہم اہل ہیں تو سرخروئی اور کامرانی یقینی ہے۔ صرف نظرِ انتخاب اور دانش مندی کی ضرورت ہے۔
اگر ہم مشاہیر کے سبق آموز سوانحی حالات کا مطالعہ کریں تو ہمیں ان کے بچپن کے حالات میں بلند ارادے، رفعتِ فکر، اعتلائے خیال کی مثالیں ملتی ہیں۔ نیک اور شستہ ارادوں اور خیالوں کی تکمیل تجربہ، تعلیم و تربیت،

مطالعۂ کتب، تقاریر، دوستی وغیرہ کے ذریعہ سے ہوجاتی ہے صرف ضرورت ہے کہ اپنے دلوں میں بلند ارادے اور شستہ خیال پیدا کریں۔ بلند ارادے ہی انسان کو دنیا میں کامیاب و کامران کرتے ہیں۔ جھونپڑی میں رہ کر محلوں کے خواب دیکھنا ایک "جوہر گراں مایہ" کا کام ہے۔ جب ہمیں اپنی طبع کا رجحان و میلان معلوم ہوجائے تو صمیمیت قلب کے ساتھ اُس پیشے کی تکمیل کے لئے مصروفِ کار ہوجانا چاہئے۔ کارلائل کا قول ہے:-

"جس شخص نے اپنے لئے کوئی کام انتخاب کرلیا ہے، وہ نفوسِ قدسیہ میں سے ہے۔ خدا کی برکت ہو اُس پر جس نے اپنا مقصدِ حیات سمجھ لیا ہے۔ زندگی عمل کا نام ہے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ زمانہ بھر میں عزیز و مقبول ہو تو کسبِ کمال کرو۔ کیا ہوا اگر تمہارے کمال کی داد زر و مال سے نہ ملی، اہلِ کمال ہمیشہ آشفتہ حال رہے ہیں۔"

رابرٹ لوئی سٹیونسن نے ابنائے روزگار کی شکایت کرتے ہوئے ایک بار کہا تھا "میں اپنے کمالِ فن پر تو مسرور و مفتخر ہوں۔"

بلند ارادوں کے ساتھ دلوں میں ذوقِ کار پیدا کرو، ارادوں کی بلندی قطعاً حرص و ہوس کے معنی نہیں رکھتی۔

دل میں کوئی خواہش پیدا کرو، جب وہ پوری ہوجائے گی تو خود بخود دوسری خواہش تمہارے دل میں پیدا ہوجائیگی دل ایسا بحرِ بیکراں ہے جس میں صرف خواہشات کا مدہی پیدا ہوتا ہے جزر کبھی نہیں ہوتا۔

اڈیسن جب اپنی اولیں ایجاد دنیا کے سامنے پیش کرچکا، تو پھر اُس کے لئے نچلا بیٹھنا دشوار ہوگیا۔ وہ اپنی مسلسل ایجادات کے ذریعہ سے اب تک دنیا کو حیرت زدہ کئے ہوئے ہے۔

اگر ہم نے اپنا منشائے تخلیق اور مدعائے حیات سمجھ لیا ہے تو ہمیں اپنے دل میں کوئی زبردست خواہش پیدا کرنی چاہئے، پھر اس کو پورا کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش ہمارا فرض ہے۔ قدرت ہماری ممد و موید ہے۔

بے مدعا زندگی بھی کوئی زندگی ہے؟ بعض آدمی بغیر کسی مدعا کے عرصۂ زندگی میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ اس قطع و قماش کے لوگوں کی حالت ایسی ہے جیسے ایک دیدۂ کور اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا ہے۔

قدرت ستم ظریف نہیں، ہم جس کے قابل ہوتے ہیں ہمیں وہی کچھ ملتا ہے پھر اپنی اپنی کوشش اور تگ و دو ہوتی ہے۔ ہاتھ پاؤں تو ہر شخص رکھتا ہے لیکن ان سے کام لینا کسی شخص کو آتا ہے۔

جس کام کے تم اہل نہیں، اس کو تم فوراً ترک کردو، ورنہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ ناکامی انسان کو قنوطیت کے قریب کردیتی ہے، قنوطیت ذوقِ کار اور ذوقِ یقین کو دلوں سے مٹا دیتی ہے۔ ذوقِ کار اور ذوقِ یقین کے مٹتے ہی انسان مٹ جاتا ہے۔

صادق ایوبی

غزل

جسے سب رہروانِ آخرت منزل سمجھتے ہیں
اُسے اہلِ محبّت آستانِ دل سمجھتے ہیں

وہ اپنے ہر نفس کو جادۂ منزل سمجھتے ہیں
جنھیں ہے معرفت اپنی جو رازِ دل سمجھتے ہیں

نظر دیکھی نہیں اُس کی کسی نے اور یہ عالم ہے
سب اہلِ بزم اپنے آپ کو بسمل سمجھتے ہیں

وہ خواہانِ ستم بیداد گر کیونکر کہیں تجھ کو
جو برقِ ناز کو شمعِ حریمِ دل سمجھتے ہیں

ہمیں بحرِ محبت ایک آغوشِ محبّت ہے
کہ ہر ہر موج کو ہم دامنِ ساحل سمجھتے ہیں

جفائے اہلِ دنیا پر خیالِ شکوہ کیا معنی
اسے ہم امتحانِ جوہرِ کامل سمجھتے ہیں

تجھی سے رونقِ ہنگامۂ اسرارِ ہستی ہے
تجھی کو کار فرمائے جہاں اے دل سمجھتے ہیں

خیالِ ایذائے دشمن کا بھی آجائے نہیں ممکن
کہ ہر سینے میں ہم مستور اپنا دل سمجھتے ہیں

جھلک اس میں کسی کے حسن کی کچھ کچھ نمایاں ہے
وگرنہ ہم تو نقشِ دہر کو باطل سمجھتے ہیں

کسی کے سایۂ دیوار میں ہر دم گزرتا ہے
یہی ہم زندگی کی آخری منزل سمجھتے ہیں

نہیں ہے دردِ دل ساری اگر تیرے رگ و پے میں
تو اے انساں تجھے ہم مشتِ آب و گل سمجھتے ہیں

کسی کی فکرِ رفعِ درد میں جو دم گزرتا ہے
اُسی کو اے جگر ہم زیست کا حاصل سمجھتے ہیں

جگر بریلوی

چہیتا بھائی

(۱)

جن دنوں میرے ابا ضلع بھنڈ ریاست گوالیار کے اے، وی، ایم اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے تو میں بالکل بچہ تھا۔ جب سات سال کا ہوا اور مجھے کچھ کچھ ہوش آنے لگا تو ایک روز کا ذکر ہے۔ کوئی نو ساڑھے نو بجے کا وقت ہوگا میں اور میری چھوٹی بہن گھر کی انگنائی میں کھیل رہے تھے ایک دم بی اماں کے رونے کی سی آواز آئی ہم بہن بھائیوں کے ننھے ننھے سے کلیجے دھک سے رہ گئے۔ کھیل ویل پر خاک ڈال بے تحاشا دوڑے کمرے کی طرف۔

حق حیران پریشان رہ گئے۔ ایک خط پڑا ہوا تھا اور بی اماں تخت پر بیٹھی اس قدر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں کہ شاید ایسے تو ہم بھی نہ روتے ہونگے۔ اُن کے نزدیک کھڑی جعفر کی ماں ہماری ماما بھی جو میں کی رہنے والی تھی "میری بائی۔ میری بائی" کہہ کہہ کر بُری طرح دھاڑیں مار رہی تھی۔

یہ دیکھ کر میں تو ہکا بکا سا کھڑا رہ گیا۔ بہن تیز نکلی۔ بلا سوچے سمجھے جاتے ہی بی اماں کی گردن میں بانہیں ڈال بلک بلک کر رونے لگی۔ میں پھر لڑکا تھا۔ فوراً ہی آنسو نہ نکلے۔ ذرا سوچنے لگا۔ یا اللہ یہ آج رو یا کیوں جا رہا ہے۔ نہ جانے بی اماں کو کس نے مارا جو ایسی رو رہی ہیں۔ اور فکر یہ ہی تھی کہ پوچھوں۔ لیکن انہوں نے اتنا موقع ہی نہ دیا۔ دھائیں دھائیں روئے ہی تو چلی گئیں۔ ماں کو روتا دیکھ کر بچہ کہاں تک صبر کر سکتا ہے۔ آخر مجھے بھی رونا آہی گیا۔ لیکن اب بھی پوچھنے کو جی چاہ رہا تھا۔ بہن کی طرح نہیں کہ خواہ مخواہ سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔

دو عورتوں اور دو بچوّں کے رونے سے جو کمرہ گونجا۔ پاس پڑوس کی عورتیں ہنڈیا چولہا چھوڑ ہمارے گھر میں آموجود ہوئیں۔ اجی دیکھو ہائیں! ہائیں!! کرتی باولیوں کی طرح دوڑی چلی آتی ہے۔ اے بہن۔ لے ہے بہن خیر تو ہے؟ اے کیا ہوا۔ واسطہ خدا کا کچھ کہو گی بھی۔ کس دکھیا کی کوک اُجڑ گئی۔ کسے بن مانگی آئی۔ ہمارا ہی مرا منہ دیکھو جو نہ بتاؤ۔ کہو بہن کس گھر کو آگ لگی۔ ہائے کس سہاگن کی چوڑیاں ٹھنڈی ہوگئیں۔ اے بہن! جی نڈھال ہو جائے گا۔ بی صبر کرو۔ ان بچوّں کی طرف دیکھو۔ یہ نگوڑے معصوم دہلے جاتے ہیں۔

رونے دھونے سے دل کی کچھ بھڑاس نکلی۔ اڑوسنوں پڑوسنوں کے دم دلاسوں سے بی اماں کسی قدر سنبھل چلی تھیں۔ کچھ ڈھارس بندھی تھی۔ اتنے میں بھاری بھاری گھاگھرے پہنے چوندریاں اوڑھے پڑوس کی ہندوانیاں بھی آگئیں۔ لینے کے دینے پڑ گئے۔ اب بھلا بی اماں کو کون سنبھال سکتا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی امنڈ ہی تو پڑیں۔ ایسی روئیں ایسی روئیں رو رو کر گھر بھر دیا۔

روتے روتے بہن کی آدھی جان رہ گئی۔ بی اماں ہلکان ہو گئیں۔ میرا منہ اتنا سا نکل آیا اور بی اماں سے چمٹ کر ہچکیاں لینے لگا۔ بڑی دیر بعد انہوں نے میری پیٹھ تھپتھپا کر کہا۔ ہائے اس کی خالا سدھار گئیں اری میری بدرن اب تجھے کہاں پاؤں گی۔ خدایا کیا کروں۔ کہاں ڈھونڈنے جاؤں۔ ارے میری گودوں کی کھلائی خاک میں مل گئی۔ ہائے تیرے ننھے ننھے بچوں کو کون سنبھالے گا۔ میری بہن۔ ارے ان معصوموں کو کس پہ چھوڑ گئی۔

دنیا دکھوں سے بھری ہوئی ہے۔ ہر گھر میں موتیں ہوتی ہیں۔ کس کے پیارے نہیں مرتے۔ بی اماں کے بین سن سن کر عورتوں کے کلیجے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے جاتے تھے۔ کون سی ہندو مسلمان عورت تھی جس نے سر نہ پیٹ لیا ہو۔ اپنے اپنے مرے ہوؤں کو یاد کر کر کے سب نے واویلا مچا دی۔ ایسا کہرام ہوا محلہ میں قیامت آگئی۔

اُس روز ہمارا چولہا ٹھنڈا رہا۔ قاضی جی اور مولوی سعد اللہ خاں صاحب کے گھروں سے کھچڑی آئی۔ جب کہیں جا کر ہمارے منہ میں رزق پڑا۔

(۲)

سندلی خالہ بی کے انتقال کو ایک سال گزرا ہوگا۔ وہیں بھنڈ میں میرا منجھلا بھائی میرزا سلیم پیدا ہوا اور ہم دو بھائی ایک بہن اپنے ماں باپ کے تین بچے ہو گئے۔ کچھ مہینے بعد میرے ابا کا جورا علاپور کو تبادلہ ہو گیا۔

راستے میں ہم سب کنبے کی دادی اماں کے گھر گوالیار میں اترے۔ وہاں سے دو تین میل پر لشکر ہے۔ لشکر میں میرے خالو جان رہتے تھے۔ اس لئے میری چھوٹی خالا بھی یہیں تھیں۔ اور اُن کے ساتھ خدا بخشے سندلی خالہ بی کا بڑا بچہ سید احتشام علی بھی تھا۔

گوالیار میں چھوٹی خالا بی کو مہمان بلایا گیا۔ خالو جان، خالا بی، ماموں باسط علی صاحب اور احتشام ہمارے گھر آئے۔ میں نے ان سب کو ہوش میں پہلی مرتبہ دیکھا۔ آہا ہا ہا اس وقت ہم کیسے خوش ہوئے تھے

بڑے بوڑھوں نے مجھے اور بہن کو خوب چمٹا چمٹا کر پیار کیا۔ خالا بی بار بار خوش ہو ہو کر جھٹ جھٹ ہماری بلائیں لیتی تھیں۔ انہوں نے اچھی اچھی چیزیں دیں۔ بہن کو اپنے ہاتھ سے مٹھائی کھلائی۔

نئی نئی جگہ اور نئے نئے آدمی دیکھ دیکھ کر احتشام خالا بی سے جو اس کی سگی چچی اماں تھیں شرما شرما کر لپٹا جاتا تھا۔ انہوں نے ہم سے کہا۔ دیکھو یہ تمہارا بھائی ہے۔ ننھا منا سا گورا چٹا احتشام کلابتونی ٹوپی پہنے کیسا پیارا پیارا چینی کا سا کھلونا لگتا تھا۔ بی اماں نے مارے محبت کے بے قرار ہو کر چھاتی سے لگا لیا اور وہ مڑ مڑ ہمیں دیکھنے لگا۔ جب ہم نے دیکھا تو شرما کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور جوں ہی ہماری نظر بچی تو پھر وہ ہمیں دیکھ رہا تھا۔

اتنے میں بہن اور میں پھدک پھدک کر کیاری کے پاس جا کھڑے ہوئے اور آپس میں صلاحیں کرنے لگے۔ میں نے کہا بہن یہ بھیا تو بڑا اچھا ہے۔ بہن بولی۔ بھائی صاحب اجانے بی اماں سے کہہ اسے اپنے پاس ہی رکھ لیں تو کیسا ہو۔ میں نے جواب دیا۔ ہاں۔ ہاں!! اسے بھی جو راعلا پور اپنے ساتھ لے چلیں گے۔ وہ کہنے لگی۔ تو بھائی صاحب ذرا بلاؤ تو اس کو۔ باہر نہ لے جانا یہیں باتیں کریں گے۔ دیکھیں یہ کیسی باتیں کرتا ہے۔

ویسے تو جب سے اس کی ماں کا انتقال ہوا تھا چھوٹی خالا بی کی محبت کے سبب سے وہ ماں سمجھ کر انہیں کے پاس رہتا تھا لیکن جب اُسے معلوم ہوا کہ ہم دونوں بہن بھائی بھی کوئی غیر نہیں اُس کی خالا اماں کے بچے ہیں تو مارے خوشی کے اس کا چہرہ کھل گیا اور اسی واسطے مسکرا مسکرا کر ہماری طرف دیکھ رہا تھا کہ ہم اُسے بلا کر اپنے ساتھ کھلائیں۔

عجیب سیر تھی۔ بی اماں اور خالا بی ایک دوسری کو دیکھ کر پھولی نہیں سماتیں۔ خواہ مخواہ ہنسی آئی جاتی ہے۔ ادھر ہم بہن بھائی نئے بھائی کو دیکھ کر آپے سے باہر ہیں۔ دوسری طرف احتشام بھی یہ حال اللہ اللہ بتاشے پھوٹ رہے ہیں، مصری گھل رہی ہے، دل ہی دل میں مزے لے رہا ہے۔ نہ جانے کیا کیا منصوبے گانٹھ رہا ہو گا۔ پائنتی پر سر نیچا کئے بیٹھا بیٹھا زمین پر پیروں سے لکیریں کاڑھ رہا تھا۔

میں نے پھر ایک دفعہ بہن سے کہا "بہن ذرا بلا لیجیے"۔ اُس نے شرما کر جواب دیا "واہ ——— میں کیوں بلاؤں . . . اپنے آپ کیوں نہیں بلا لیتے۔ کیا خبر جنے آئے گا بھی کہ نہیں"۔

صاف بات ہے جھجھکتا میں بھی تھا، جان نہ پہچان، نئے بھائی کو کس طرح آواز دوں۔ کیا کہہ کر بلاؤں۔ اور یہ جو خالا بی آئی ہوئی ہیں کہیں ناراض نہ ہو جائیں۔ گھُرک دیا تو کیا ہو گا۔ پھر سوچتا تھا، ناراض کیوں ہونے

لگیں۔ لو ابھی تو بہن کو مٹھائی کھلا رہی تھیں۔ پیار کیا تھا۔ اچھا اور بلانا ولانا کاہے کا، بھائی تو ہے ہی اپنا، یوں گلے میں ہاتھ ڈال دیئے جائیں تو کیسا ہے۔

اسی سوچ بچار میں آہستہ آہستہ طوطے کے پنجرے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ بہن بھی وہیں آ گئی۔ ہمیں دیکھ وہ پرپھٹ پھٹا پھٹ پھٹا کر لگا ٹیں ٹیں کرنے۔ چونچ سے پنجرے کے تار پکڑ الٹا لٹک لٹک جاتا تھا۔ جھوم جھوم کر تیلیوں سے جھانکتا تھا اور زور زور سے ٹیں ٹیں کرتا تھا۔

میں نے چمکار کر کہا۔ میاں مٹھو!

بہن نے جو اسے ایک چھوارا دکھایا۔ لگا چونچ پھاڑنے۔ جب وہ اسے چھوارا دینے لگی اور ٹیں کر کے وہ لپکا تو جلدی سے بہن نے چھوارا چھوڑ دیا۔ کہ کلموا کہیں کاٹ نہ کھائے۔ طوطے نے پنجرے میں گرنے سے پہلے لپک لیا اور پنجے میں داب کر کڑ کڑ کرنے لگا۔ بہن بڑی خوش ہوئی۔ "آہا ہمارا طوطا تو چھوارا بھی کھاتا ہے۔ واہ بھئی وا۔ دیکھو بھائی صاحب۔ کیسا چھوارا کھا رہا ہے کڑ کڑ۔

میں نے کہا "ارے ہے بہن۔ بچارے کی پیالی جنے کب سے سوکھی پڑی ہے۔ ایک بوند پانی نہیں۔ کیا خبر پیاسا ہو گا۔ جب ہی تو ٹیں ٹیں کر رہا تھا۔ اے لو وہ چھوارا گرا دیا"۔

بہن بولی "اچھا تو لاؤں پانی؟ بھائی صاحب آج اسے نہلائیں گے بھی۔

ابھی وہ گھڑونچی تک پہنچی بھی نہ تھی۔ چارپائی سے کود احتشام ننگے پاؤں دوڑا اور جلدی سے لوٹا اٹھا کر کہا۔ نہیں نہیں میں ڈالوں گا پانی۔ ہمارے ہاں بساورے میں بھی طوطا تھا۔

اس بات پر بہن نے ہنس کر میری طرف دیکھا۔ بڑی خوش ہوئی اور کودتی ہوئی پنجرے کے پاس آ گئی۔ احتشام نے ٹُل ٹُل دھار جو باندھی، پیالی تو پیالی طوطے کو بھی نہلا دیا۔ بہن اور میں خوش ہو رہے تھے۔ احتشام طوطے کو نہلا رہا تھا۔

ہمارے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ طوطا نئے بھائی سے دوستی کرا دے گا۔ بن بلائے احتشام آ گیا اور لگا پٹ پٹ باتیں کرنے۔ ذرا سی دیر میں ہم سب ایسے گھُل مل گئے جیسے ایک ماں باپ کے بچے ہوں۔

ہم بہن بھائی اسے اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔ اس لئے محبت بڑھانے کی غرض سے ہم بڑی پیار کی باتیں کرنے لگے۔ "تو ہمارا بھائی ہے کیوں؟ بس اب یہیں رہا کیجیو، اچھا، آ تجھے اپنے کھلونے دکھائیں۔ جب ہمیں چیز ملا کرے گی تو اس میں سے تجھے برابر کا حصہ دیا کریں گے۔ کیوں بہن! یہ اپنا بھائی ہے نا۔ اس نے بھی سر ہلا دیا

کہ ہاں ہاں!! ہے ہی چوسہی - اور بے حد خوش ہو رہی تھی کہ بھائی صاحب بہت اچھا کر رہے ہیں - اب یہ یہاں رہ جائے گا - شاید - اللہ کرے یہیں رہے تو اچھا ہے -

شام تک وہ ہمارا ایسا دوست ہوگیا گویا ہمیشہ ہمارے ہی ساتھ رہتا تھا - اب اُس کا دل خالا بی کے ساتھ رہنے کو نہ چاہتا تھا - اس سبب سے کہ وہاں تو سوائے اُس کے کوئی بچہ تھا نہیں - یہاں ہم دو بہن بھائی تو یہ، تیسرا منجھلا بھائی میرزا اسلیم جو ابھی گھٹنوں چلتا تھا - بھلا ایسے مزے چھوڑ کر وہ خالا بی کے ساتھ کیوں جاتا -

اب خیال ہے کہ شاید ایک مہینہ ہم گوالیار رہے - اتنے دن میں احتشام ہم سے بالکل گھل مل چکا تھا چلتے وقت بڑی دقت ہوئی - خالا بی اُسے اپنے پاس رکھنا چاہتی تھیں اور اگر ان کا بس چلتا تو ہرگز نہ چھوڑتیں - چاہے کتنا ہی روتا - لیکن بڑے بڑوں میں بات پہنچ چکی تھی - میری بی اماں نے احتشام کو جدا کرنا نہ چاہا - دونوں بہنوں میں بڑی بحث ہوئی - جس وقت بی اماں نے اسے جورا علاپور لے جانے کا ذکر کیا تو خالا بی بڑی گھبرائیں کہنے لگیں - "آپا! میرے منہ میں خاک - اے چشم بد دور تمہارے آگے تو خدا رکھے ایک چھوڑ تین بچے ہیں - مری مٹی کی نشانی میرا یہ ہی ایک کھلونا ہے - آپا اسے تو میرے ہی پاس رہنے دو - اسے دیکھ دیکھ مجھے تسلی ہوتی ہے - یہاں رہا یا وہاں رہا، کوئی دوسری بات تھوڑا ہی ہے - دعا کرتی ہوں خدا کرے دولہا بھائی (میرے ابا سے مراد کی تھی) یہیں بدلی ہو جائے اور ہم دونوں بہنیں ایک ہی گھر میں رہا کریں"۔

خالا بی نے کیا کیا نہ کیا - ہزار کوششوں پر بھی بی اماں نے نہ سنی - کہا "چھوٹن! کیا میں کوئی غیر ہوں جو ایسی باتیں کر رہی ہو - جیسے اس پر تمہارا زور ہے ویسے میرا - آخر میں بھی تو اس کی کچھ لگتی ہوں - کیا میرا کچھ بھی حق نہیں بہن اتنے دن تمہارے پاس رہا اب کچھ روز میرا ارمان پورا ہونے دو - میرا ارادہ ہے اس کے خالو میاں سے اسے انگریزی پڑھواؤں - فکر نہ کرو، خدا نے بھی چاہا، بن میا کا بچہ ہے کلیجے سے لگا کر رکھوں گی - یہ مجھے اپنے بچوں سے سوا ہے

(۳)

اللہ اللہ بچپن بھی کیسی نعمت ہے - بڑے ہو کر انسان سمجھتا ہے کہ ہائے ایک بادشاہت جو لُٹ گئی - لاکھ سر پٹکو وہ وقت پھر نہیں ملتا -

جب احتشام ہمارے ساتھ رہنے سہنے لگا اور اچھی طرح مل جل گئے تو دوستی کے ساتھ ساتھ ہماری لڑائیاں بھی ہونے لگیں -

سردیوں میں ہم ایک چارپائی پر سلائے جاتے تھے - باتیں کرتے کرتے سو گئے - سوتے سوتے اک دم ہمارے

کشتم کشتا اور گتھم گتھا ہونے لگی۔ یہ اُسے نوچتا ہے وہ اسے گھسوٹتا ہے۔ کس بات پر؟ گدھے تو نے ساری رضائی کھینچ لی۔ مجھے نہیں اڑھاتا۔ دوسرا کہتا ہے۔ الّو کہیں کا۔ مارے سردی کے ٹھٹھرا جاتا ہوں، چھوڑ رضائی، ہٹ اُدھر۔ بڑا ہٹ والا آیا، دوں گا ایک دھکا ابھی اُدھر گرے گا۔ ہائیں نہیں مانتا، لگاؤں ایک۔ اس کھینچ تان میں رضائی نیچے جا پڑی۔ ہم دونوں بھائی غنٹ پٹ ہو رہے ہیں۔

اس چیخ پکار میں کہیں بی اماں یا ابا کی آنکھ کھل گئی اور انہوں نے جو گھر کا تو لگے ایک دوسرے کی جھوٹی سچی شکایتیں کرنے۔ اس پر دونوں کے کان ملے گئے۔ الگ الگ رضائی دبکا کر کہا گیا۔ خبردار جو کسی نے چوں کی۔ زبان ہلی کہ شامت آئی۔ کمبختوں کو رات میں بھی چین نہیں۔ خبردار آواز نکلی تو یاد رکھنا۔ انگنائی میں سے جا کر کھڑے کر دیئے جاؤ گے۔

پھر کیا تھا گویا سانپ سونگھ گیا۔ مارے ڈر کے چپ چاپ سناٹا کھینچ کر رہ گئے۔ اور لگی جو سردی کہاں کی لڑائی بھڑائی۔ آہستہ آہستہ سرک ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ سوئے ہے۔

اُس وقت بڑی سبیر ہوتی تھی جب گھر میں نیاز دلتی تھی۔ بی اماں مٹھائی پر بیٹھتیں، ابّا، بہن، ہم اور احتشام فاتحہ پڑھنے کھڑے ہوتے۔ ہاتھ اُٹھے ہیں، فاتحہ پڑھی جا رہی ہے۔ ایک نے دھکیلا، دوسرے نے چپکے ہی سے کہنی رسید کی۔ اِدھر بی اماں نے دیدے پھاڑ کر دیکھا۔ وہاں کے وہیں سہم گئے۔ پھر جو ذرا نظر بچی، ہوئے ہی سے اس نے اُس کے پاؤں پر پاؤں رکھ دیا۔ اتنے میں فاتحہ ختم کر کے ابّا نے شرارت کرنے والے کے چپت مار کان پکڑ دالان سے نکال باہر کیا۔

افوہ! کیسا رونا آتا تھا۔ پٹنے پر نہیں۔ اس غم میں کہ ہائے کہیں حصہ میں کسر نہ پڑ جائے۔ برس کے برس دن کچھ بدشگونی سمجھ کر کچھ رونے دھونے پر بی اماں کو ترس آیا، ممتا نے جوش کھایا۔ خوشی کے وقت ہائے ہائے اچھی نہیں، گھر کی شے اڑ جاتی ہے۔ ابا سے سفارش کرنے لگیں۔ خیر خیر بچّہ ہے۔ اب کی بار معاف کر دینا چاہئے ابّا نے جھڑک کر کہا۔ نالائق! جب دیکھو شرارت، جب دیکھو شرارت۔ شیطان کہیں کا۔ یہاں تو بھرے ہی ہوئے تھے۔ بہل بہل آنسو بہا کر لگے ہاتھ جوڑ جوڑ کر معافی مانگنے۔ اب ایسا کبھی نہیں کروں گا۔ قصور ہوا۔ بڑی مشکل سے تین چار کن پکڑیوں کے بعد معافی ہوتی۔ آنسو پونچھتے، سسکیاں لیتے، آہستہ آہستہ دالان کی طرف بڑھے۔

دوسرا اتنا سا حصہ بٹتے وقت ہوتا تھا۔ ہم، احتشام اور بہن مٹھائی کے دھیان میں بے قرار ہیں۔ ارے

رسے رسے رال ٹپکی پڑتی ہے۔ طبیعتیں مُربُرا رہی ہیں۔ یا اللہ کتنی دیر ہوگئی۔ جلیبیاں ٹھنڈی ہوئی جاتی ہیں۔ اُٹھتے ہیں بیٹھتے ہیں کسی کل چین نہیں۔

خدا خدا کرکے دعا قبول ہوئی۔ بی اماں نے برابر برابر کے تین حصّے لگا کر کہا۔ لو بچو، اٹھا لو اپنا اپنا حصّہ آہاہا جان پڑ گئی۔ لیکن بی اماں کا اندازہ کمال تھا۔ افوہ وہ جانچ کر حصّے لگاتیں مشکل پڑ جاتی کون سا لیا جائے۔ ہم سب نے ہاتھ اٹھائے۔ ترچھے سیدھے ہو ہو کر نگاہوں ہی نگاہوں میں تولنے لگے۔ میں ہر حصّے کو بار بار تاک رہا ہوں اور سمجھ کام نہیں کرتی۔ بہن اور احتشام بلبلائے جاتے ہیں کب بھائی صاحب اپنے حصّے پر ہاتھ رکھیں اور کب ہم مٹھائی پر قبضہ کریں۔ یہاں دُبدا لگی ہوئی ہے کس پر ہاتھ رکھا جائے۔

بہن کی طرف جلیبی کی ایک شاخ بڑھتی میں ہے۔ ادھر کے لڈّو ذرا بھاری معلوم ہوتے ہیں۔ نہیں نہیں شاید وہ سا بڑا ہوگا۔ سوچتے سوچتے جب صبر نہ ہوسکا آہستہ سے ایک طرف ذرا ہاتھ جھکایا۔ بہن اور احتشام کو کہاں تاب تھی۔ جلدی جلدی جھپٹے مارے۔ یہاں فوراً دل میں بے ایمانی آگئی۔ بُری طرح چیخا "نہیں نہیں ٹھہرو۔ ابھی کی نہیں ہے واہ میں تو یہ سا لوں گا۔ اٹھا ہاتھ۔ چھوڑ میرا حصہ" یہاں تک کہ کبھی کبھی بہن اور احتشام اپنے اپنے حصّے اٹھا کر میری طرف والے کو دیکھتے تو پھر میری نیت ڈانواں ڈول ہوتی۔ گھبرا کر کہتا۔ "ہائیں! ہائیں!! بس اُدھر ہی رہنا۔ خبردار جو میرے حصّے کو ہاتھ لگایا۔ میں تو یہ سا لینے والا تھا۔

کہاں تو حصّے کے لئے ایسی بے چینی ہوتی تھی کہ بلبلائے جاتے تھے معلوم ہوتا جھٹ پٹ کھا پی برابر کر دیا جائیگا کہاں یہ حال کہ جب مل گیا تو مٹّر مٹّر چینگ رہے ہیں کہ ذرا دیر تک مزا آئے۔ واہ کیا سیر ہے۔ میں ایک لفظی زبان کی نوک سے آہستہ آہستہ تالو پر پھیل رہا ہوں۔ بہن دونے کے پتّے کا چمچہ بنا کر مزے مزے سے جلیبیوں کا شیرہ چاٹ رہی ہے۔ احتشام سب سے نرالا نکلا کبھی ایک دانہ چکھ لیا پھر لڈّو اچھال اچھال کر لپکنے لگا۔ یہاں اپنا حصہ ہوتے ہوئے یہ نیّت کہ بس چلے تو میں اوپر ہی اوپر سے لپک کر کھا جاؤں اور یہ بلبلاتا رہ جائے۔

ایک دفعہ کیا ہوا جب ہم سب اپنا اپنا حصہ ختم کر چکے اور تھوڑی دیر ہوگئی تو بہن نے کہا۔ "دیکھنا! دیکھنا!! بھائی جان احتشام کے پاس برفی۔ وہ کھا رہا ہے" ارے بھئی واہ۔ میں تو تلملا گیا۔ پرائے مال پر کیا زور تھا منت سے پوچھا "کیوں بھئی یہ برفی کہاں سے آئی؟" اُس نے ذرا سی برفی کتر کر بڑی شان سے جواب دیا۔ "آہنہ!! اپنے پاس کیا فیول کی کیا کمی ہے۔ ایسی ایسی لاکھوں برفیاں پڑی رہتی ہیں ہمارے پاس" ایک بار زبان سے چاٹ کر آہا کیا خوشبو ہے۔ سبحان اللہ اسے کہتے ہیں برفی"

یا اللہ! میرا تو برا حال ہوگیا۔ ہائے احتشام برفی کھائے اور میں منہ تکوں۔ مجبوراً خوشامد کرنے لگا۔ لا یار ذرا سی ہمیں بھی دے۔ اب کے نیاز دلے گی تو لے لیجیو۔ اور آج ہم ایک مزیدار کہانی بھی سنائیں گے۔ بھائی کیسا۔ لا ذرا سی"۔ لو بھلا احتشام ایسا کہاں تھا کہ میری باتوں میں آجاتا۔ الٹا میرے جلانے کے لئے برفی کی طرف دیکھ کر زور زور سے منہ چلانے لگا۔

آگ ہی تو لگ گئی تن بدن میں۔ لو خبیث کی باتیں۔ لپکا اُس کی طرف "ہمیں چڑاتا ہے ٹھہر تو جا ذرا"۔ وہ کیا کم تھا۔ ارے اللہ کہہ کر بی اماں سے جا لپٹا۔ اور چلایا۔ "دیکھو لو خالا اماں فہیم بھیا میری برفی چھینتے ہیں۔ ارے وہ آئے"۔ انہوں نے یا اللہ خیر کہہ کر فوراً ایک ہاتھ سے احتشام کی اُٹ کر لی اور دوسرے سے ہائیں ہائیں کرکے مجھے روکا۔

ہائے اب میں بے بس ہوگیا۔ احتشام نے جو دیکھا فہیم بھیا اب میرا کچھ نہیں بنا سکتے چاہے کتنے ہی تلملائیں تو ذرا دور ہاتھ کر کے آہستہ سے کہتا کیا ہے "چاہیئے"۔ توبہ لالچ بھی انسان کو کیسا ذلیل کرتا ہے۔ میں لگا ہاتھ بڑھانے۔ وہ پٹھا غپ سے برفی منہ میں رکھ گیا۔ اُس وقت کوئی میری صورت دیکھتا۔ آئے ہائے کیسے کیسے بل کھائے ہیں۔ کس کس طرح مچلا ہوں۔ کیا کروں بی اماں نہ ہوتیں تو خبر پڑتی۔ اس کی اور اپنی جان ایک نہ کر ڈالتا تو نام نہیں۔

(۴)

آگرہ سے ہم سفید بلی کا ایک بچّہ لائے تھے، جسے ساتھ سُلایا جاتا تھا۔ اس کے نرم نرم بالوں پر ہاتھ پھیرنے سے بڑا مزا آتا تھا۔ جب وہ پیار میں آکر غُر غُر غُر غُر کرتا تو ہمیں بہت اچھا معلوم ہوتا تھا۔ ہر ایک کی یہ ہی خواہش ہوتی تھی ہمارے پاس رہے۔ ساتھ سوئے اور دن رات ہمیں اسے گود میں لئے رہیں۔ اس واسطے اکثر ہم میں کشتم کشتا ہوا کرتی تھی۔ ہماری چھینا جھپٹی سے تنگ آکر وہ ہمیں کاٹ کاٹ کھاتا تھا۔ اس کے تیز نہنوں سے ہم لہولہان ہو ہو جاتے تھے۔ لیکن کچھ پروا نہیں چھیننا فرض تھا یہ سمجھ کر کہ بعد میں اسے مار مار کر کسر نکال لی جائے گی۔

جو کہیں وہ چھوٹ کر نیم پر چڑھنے لگتا، تو فوراً دُم پکڑ کر کھینچ لیتے۔ وہ "میاں" کر کے زور سی کاٹ کر چھت پر بھاگتا۔ اِدھر ہم بھی گرتے پڑتے پہنچتے۔ ہمارے ڈر سے بیچارا منڈیر منڈیر بھاگتا پھرتا تھا لیکن ہم اس کا پیچھا نہ چھوڑتے تھے۔

اکثر ایسا بھی ہوا ہے۔ کہ وہ موری میں گھس گیا۔ ہم بانس ڈال ڈال کر اُسے نکالنا چاہ رہے ہیں کہ بہن نے

شکایت کردی یا بی اماں اور ابا میں سے کسی نے دیکھ لیا۔ اس پر ہمیں ٹپنا پڑا۔ گھڑی دو گھڑی ذرا امن رہا۔ پھر وہی باتیں ہونے لگیں۔

بلّی ہی کے بچے پر کیا ہے بعض وقت گود کے بھائی میرزا سلیم کے سبب سے بھی ہم دونوں بھائیوں میں جھگڑا ہو جاتا تھا۔ وہ اس طرح کہ ویسے اُسے کھلانے کی بلا بہن کے سر ڈالی جاتی تھی۔ ہمیں اتنی توفیق کہاں کہ بھائی کو لادے لادے پھریں۔ پھر بھی کہاں تک۔ آخر تھے تو بھائی ہی نا! کبھی کبھی نہائے دھوئے صاف ستھرے اُجلے اُجلے کپڑے پہنے ہوئے ننھے سے بھائی کو دیکھ کر للک اُٹھ ہی آتی تھی۔ اُس کی بھولی بھالی پیاری پیاری صورت اچھی لگتی تھی تو ہیجڑا پھٹنے لگتا تھا۔ اسے گود میں لے کر پیار کرنے اور کھلانے کو جی چاہتا تھا۔ اسی میں میری اور احتشام کی بحثا بحثی ہو جاتی تھی۔ مارے ضد کے یہ چاہتا تھا میرے پاس رہے۔ وہ چاہتا تھا میں کھلاؤں۔ ناسمجھ سلیم کیا کرے۔ اِدھر رہے تو مصیبت اُدھر جائے تو آفت۔ بلّی کے بچے کی طرح اُس کے ننھے ننھے سے ہاتھ پاؤں پکڑ پکڑ کر کھینچے جاتے تھے۔ بیچارے کی بری طرح شامت آتی تھی۔ بیچارا گھبرا گھبرا کر بلبلاتا تھا۔ وہ پریشان ہے ہماری لڑائیاں ہو رہی ہیں۔ جب دیکھا ذرا زور سے رونے لگا۔ چمکار چمکار کر بہلا لیا اور گود میں لینے کے لئے بڑے مزے سے ہاتھ بڑھائے۔ ہاں! میرا بھیّا آ۔ آجا میری گود میں۔ یہ تو ایسا ہی ہے۔ ہمیشہ تجھے رلایا کرتا ہے۔ اِدھر آ میں تجھے کندھے پر بٹھا کر دوڑوں۔ آئی شاباش وہ آتا ہے۔ میرے پاس۔ ارے بھئی چھوڑ دے اس کو۔

اُس نے جلدی سے چمٹا لیا۔ اور پیٹھ تھپتھپا کر بہلانے لگا۔ سوجا میرے بھیّا۔ سوجا۔ فوراً دوسرے صاحب کاٹنے کو دوڑے۔ ہاں! ہاں! سوجا کا بچہ۔ کیوں سوئے۔ نہیں سونا۔ ابھی تو بیچارا سو سو کر اٹھا ہے۔ ہر وقت سونا، ہر وقت سونا۔ نیستی پھیلا رکھی ہے۔ وہ تو مزے سے جاگ رہا ہے۔ دیکھ تو کیا کٹورا سی آنکھیں کھلی ہیں۔ تجھے کیوں دوبھر ہو گیا۔ لا مجھے دے۔ میں کھلاؤں بھیّا کو۔ وہ چھینا دیکھ لو خالا اماں یہ نہیں مانتے۔ اسے ستاتے ہیں۔ پھر وہ روئے گا۔ میں نہیں جانتا۔

اور جو کہیں وہ ایک کے پاس سے دوسرے کی طرف جانے لگتا کمیٹی کے ووٹروں کی طرح مزا آتا۔ خوب بہکایا جاتا۔ خبردار اُدھر نہ جائیو۔ پٹے گا۔ نہیں نہیں یہ تو بہکا رہا ہے۔ شاباش آجا دوڑ کر۔ ارے بھئی چھوڑ، چھوڑتا کیوں نہیں۔ ذرا اس کے پیر کھلنے دے۔ تھوڑی دور چلنے ہی سے تو بچوں میں طاقت آتی ہے۔

پیاں! پیاں! پیاں!!! پیاں!!!! آ ہا ہا۔ چلا آ۔ یہ۔ ہاں میری اُنگلی پکڑ لے۔ جوں ہی وہ آنے کو ہوتا، اُس کی گود سے اتر

کر زمین پر قدم رکھتا - وہ صاحب جل جاتے اور فرماتے اچھا جا - کالا منہ کر - اب آئیو ہمارے پاس - چاہے کتنا ہی روئے ہم تجھے کبھی چیز نہ دیں گے - جب گود میں لے جانے کی کہے گا اُس وقت دیکھیں گے -

یہ ہی نہیں کہ میں اور احتشام ہی لڑتے ہوں - بہن اور احتشام میں بھی لڑائی جھگڑے ہؤا کرتے تھے - لیکن جہاں تک یاد ہے مجھے کبھی اس بات کا خیال تک نہیں ہؤا کہ احتشام میرا بھائی تھوڑا ہی ہے یہ میری سگی بہن سے لڑنے والا کون - وہ اسی طرح بہن سے بھی لڑتا تھا جس طرح مجھ سے - ہاں اس لڑائی میں اتنا فرق ضرور تھا کہ بھائی اور چھوٹا ہونے کے سبب سے میرے مقابلہ میں تو وہ جان لڑا لڑا دیتا تھا لیکن چونکہ بہن اور وہ عمر میں برابر سرابر تھے دوسرے وہ بہن تھی اس لئے لڑکی سمجھ کر وہ اس کی رعایت کرتا تھا - جہاں تک ہوتا ہاتھ نہ اٹھاتا - بلکہ میں جانوں شاید اُس نے بہن کو مارا تو کبھی بھی نہ ہو گا - اپنے بچاؤ میں کہیں دھکیل دھکال دیا ہو تو اور بات ہے - البتہ اس کے منہ چڑانے یا دق کرنے پر بہن ہی اکثر جھنجھلا کر ایک آدھ رسید کر دیتی تھی - سو بھلا اس کا احتشام پر کیا اثر ہوتا تھا - ذرا دُھول جھڑ گئی اور کیا ہؤا - بعض وقت بہن سے پٹ کر وہ اسے زور سے جھنجھوڑ دیا کرتا تھا - اُفوہ اتنی ہی بات وہ اس قدر واویلا مچاتی تھی کہ الٰہی توبہ - اور خوب کوستی تھی " کلموئے، غارت گئے - خدا کرے تیرے ہاتھ ٹوٹیں - تو مرے اللہ کرے " احتشام اور چڑانے کے لئے کہتا " ہم کیوں مریں - نہیں مرتے - تو ہی نہ مرے اللہ کرے "

(۵)

تلے اوپر کے بہن بھائی سدا لڑتے جھگڑتے آئے ہیں - اور ہمیشہ لڑتے رہیں گے - گھروں کی رونق بچوں کی چیاؤں پیاؤں سے ہی ہے - وہ مکان ویران ہی جہاں بچے نہ ہوں - خدایا کوئی گھر بچوں کی چیخ پکار سے خالی نہ رکھیو - الٰہی سب کو آس اولاد والا بنائیو اور ننھے ننھے معصوموں کی لڑائیاں دکھائیو - آمین!

غرض احتشام اور میں اکثر جھگڑا کرتے تھے - لیکن خدانخواستہ ہم میں بڑے آدمیوں کی طرح بیر نہیں پڑے ہوئے تھے - یا کچھ سچ مچ کی دشمنی تو تھی ہی نہیں کہ دلوں میں گانٹھیں بندھ جائیں، ہر بات ذرا سی دیر کے لئے ہوا کرتی تھی جس طرح آپس میں لڑتے تھے اسی طرح ایک دوسرے کو چاہتے بھی تھے - ایک کے بیمار ہونے سے دوسرا سست سست سا ہو جاتا تھا، اور سارے گھر میں چیخ پکار کی بجائے اداسی پھیل جاتی تھی -

ایک دفعہ کا ذکر ہے - ہم میں خوب لڑائی ہوئی - احتشام نے میرے گھونسا مارا میں نے اُسے چارپائی سے نیچے گرا دیا - وہ جو لوٹ پوٹ کر اٹھا - اک دم میرا منہ نوچ ڈالا - بندر کے سے بڑے بڑے ناخونوں کے ایسے نشٹے مارے خون نکال دیا - مارے تاؤ کے میں نے ایک پٹخنی دے کر اس زور سے اُس کا گلا گھونٹا عوعو کرنے لگا - اتنے میں ابّا نے جوڈیوڑھی سے گھر کا ہم دونوں فوراً الگ الگ کھڑے ہو گئے - اس لئے کہ ذرا ہی دیر پہلے لڑنے پر ہم خوب اچھی طرح

پٹ چکے تھے۔ ابّا گھر میں آئے اور للکار کر کہا۔ کیوں بے شیطانو! پھر لڑے۔ نہیں مانو گے۔ اچھا ٹھہر جاؤ۔

بی اماں نے خیال کیا۔ اب خیر نہیں نہ جانے بیچاروں کی کیسی شامت آئے۔ ابّا سے کچھ پوچھنے لگیں، جس سے ان کا خیال بٹ گیا اور ہمارے سر سے آئی بلا ٹل گئی۔ لیکن ایسے ہی بھلے آدمی ہوتے تو رونا ہی کاہے کا تھا۔ ابّا اُدھر باتوں میں لگے اِدھر فوراً ہمارے تیور بدلے۔ احتشام کی تو احتشام جانے اپنی کہہ سکتا ہوں۔ ذرا اور ابّا نہ آتے تو منہ نوچنے کا مزا چکھاتا۔ خیر کیا ڈر ہے۔ دیکھا جائے گا کبھی نہ کبھی۔

کھانا کھانے کا وقت تھا۔ بی اماں نے بات ٹالنے کے لئے کہا "ارے احتشام! جا ذرا گوبندا (ہمارے گھر کے پاس کا حلوائی) سے پاؤ بھر دہی تو لے آ۔ ہاں اور فہیم تو بھی اس کے ساتھ چلا جا۔ خبردار جو رستے میں لڑے تو یاد رکھنا۔"

ابھی ابھی کی بات۔ تازہ تازہ لڑائی۔ اُس وقت میں غصہ کے مارے آگ بگولا ہو رہا تھا۔ منہ پھلا کر رہ گیا۔ احتشام کی بن آئی۔ باہر جانے کی خوشی میں اچھل کر بولا۔ نہیں نہیں خالا اماں یہ چار قدم پر تو دوکان ہے۔ میں اکیلا ہی لئے آتا ہوں۔ ابھی ابھی۔ اور پیسے لے پٹھا ایک ٹانگ سے کودتا باہر چلا گیا۔ خیر سے کوئی منٹ بھی نہ گزرے ہونگے یا اللہ خیر کہہ بی اماں بیٹھے سے کھڑی ہو گئیں۔ بہن چلّائی۔ ارے بھائی صاحب ذرا دیکھنا احتشام کو کیا ہوا۔ جیسے کسی کا دودھ ابھن جائے اور وہ گھبرا کر چولہے کی طرف دوڑے میں نے اک کی نہ ڈھک ایک فلانچ مار جھم سے باہر دیکھتا کیا ہوں احتشام کیچڑ میں لت پت بری طرح روتا بلبلاتا چلا آتا ہے۔ ارے! بچارے کے لگ گئی۔ جی سنسنا گیا۔ دل الٹ پلٹ ہونے لگا۔ نہ جانے کتنی چوٹ آئی ہو گی۔ "احتشام! احتشام!! کیا ہوا؟ کیوں کیوں؟ کہاں گر پڑا؟ ارے بھئی کس نے گرا دیا تجھے؟"

ابّا بھی چمکارتے دلاسا دیتے باہر آئے۔ احتشام کے گھٹنے سے خون جاری تھا۔ بلبلایا۔ "خالو میاں! خالو میاں! مجھے ایک آدمی نے دھکیل دیا کیچڑ میں۔ اور دہی بھی گر پڑا۔ اتنا سنتے ہی میرا خون کھولنے لگا۔ سارے بدن میں بجلی سی دوڑ گئی۔ فوراً ایک پتھر اٹھا کر پوچھا "احتشام کیوں بھیّا وہ آدمی کہاں ہے؟" بس جی چاہتا تھا اگر وہ مل جائے تو کچا ہی چبا جاؤں، اُسے جس نے میرے بھائی کو گرایا ہے۔ مارے پتھر کے چٹاخ سے ٹانگ توڑ ڈالی ہو۔ میرا منہ بندر کی طرح لال ہو گیا۔ احتشام کا بدلہ لینے کے لئے میری روح بے چین تھی۔

ابّا کو میری طرح غصہ نہ آیا۔ سمجھانے لگے۔ "خیر خیر کچھ نہیں۔ رہنے دے۔ بچّے گرتے ہی رہتے ہیں۔" اُس کے آنسو پونچھے، پیار کیا، اور پکڑ کر کہا۔ آ چل گھر میں۔ اُن کے سمجھانے سے وہ تو ذرا میں بہل گیا اور لنگڑا لنگڑا کر چلنے لگا۔

اُس آدمی سے بدلہ لینے کا خیال بھول کر میں نے جھٹ پٹ احتشام کی بغل میں ہاتھ ڈال دیا اور اچھی طرح سنبھال کر محبت سے گھر میں لے چلا۔

اندر پہنچے تو بہن کھڑی کھڑی رو رہی تھی۔ بی اماں دعائیں مانگ رہی تھیں۔ خدایا بچے کی خیر، پرائی امانت ہے۔ کالا منہ نہ کرائیو۔ بن میّا کا بچہ ہے۔

ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی چمکار کر بی اماں نے کہا "صدقے گئی۔ احتشام کیا ہوا۔ دشمنوں کے کہاں لگ گئی۔ خدانخواستہ کہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔ اے ہے میرے بچے" کہہ کر اُسے کلیجے سے لگالیا اور سیڑھی کے پاس لے جا کر کہا، "لے یہاں بیٹھ جا۔ میں تیری چوٹ دھلاؤں" بہن دوڑ کر پانی کا لوٹا لائی۔ میں اُس کے ہاتھ سے لے کر پانی ڈالنے لگا۔ بی اماں احتشام کی چوٹ دھلا رہی تھیں۔ بہن اُس کا گورا گورا پاؤں سہلاتی جاتی تھی۔

(۶)

جوراعلاپور میں ہم قصبہ کے سرے پر رہتے تھے۔ ہمارے گھر کی کھڑکیوں سے پچھواڑے کی ہری بھری کھیتیاں نظر آیا کرتی تھیں۔ چھت پر چڑھیں تو کتنی ہی سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی ٹیڑھی سیدھی سفید سفید سڑکیں، چھوٹی چھوٹی پلیاں اور دور دور کا ڈراؤنا جنگل دکھائی دیا کرتا تھا۔

بڑی سیر تھی کسی سڑک پر چھکڑوں کی قطار چلی جا رہی ہے۔ کہیں گائے بھینسیں چرتی پھرتی ہیں کسی کھیت کی مینڈھ پر ایک بڈھا گھوڑی پر سوار چلا جا رہا ہے اور گھوڑی کا ننھا سا بچہ اُس کے ساتھ بھاگتا دکھائی دیتا ہے۔

ہمارے پڑوسی گنواروں کے بچے جن میں سے بعض ہم سے بھی چھوٹے تھے جنگل میں اپنے جانور چراتے کھیت رکھاتے، لکڑیاں چنتے اور سڑکوں پر کھیلتے پھرتے تھے۔ لیکن میری بی اماں کو جو شہر کی رہنے والی پردہ نشین خاتون تھیں جنگل سے ہول اُٹھتا تھا۔ کیا مجال جو ہم کہیں دہلیز سے باہر قدم رکھیں۔ مدرسے بھی ابا کے ہی ساتھ جایا کرتے تھے۔ کبھی گھر آنے کا کوئی کام نکلتا تو کسی بڑے لڑکے کو ہمارے ساتھ کر دیا جاتا۔ اگر ابا گھر میں نہ ہوتے اور اُن کے کوئی ملنے والے آتے تو ہم پوچھتے۔ کیوں بی اماں ذرا دیکھیں کون صاحب تشریف لائے ہیں۔ وہ کہتیں ہاں ہاں سمجھتی ہوں باہر جانے کو جی چاہتا ہوگا۔ کچھ ضرورت نہیں یہیں سے جواب دے دو۔ جب وہاں سے بات نہ بنتی اور باہر جائے بغیر کام نہ چلتا۔ پھر بھی بی اماں سے اجازت لے کر نکلتے۔ اور جو کہیں اس بہانے گلی میں کھیلنے لگتے یا ذرا دیر ہو جاتی تو ہم پر بڑی جھڑکیاں پڑتیں۔ لیکن صاف بات ہے دن میں دو ایک دفعہ یہ قصور ہم سے ضرور ہو جاتا تھا۔ اور ہر مرتبہ خبر بھی خوب لی جاتی تھی۔

ایک بار کیا ہوا کسی صاحب نے دروازے پر دستک دی۔ بی اماں باورچی خانہ میں تھیں۔ میں اور حشمت چپکے چپکے دبے پاؤں باہر جانے لگے۔ اتنے میں کہیں بہن کی نظر پڑ گئی۔ فوراً چغلی لگائی۔ "دیکھنا بی اماں وہ چلے باہر"۔ بی اماں ہائیں ہائیں کرتی رہ گئیں۔ لیکن سنتا کون تھا۔ جھم سے باہر ہو گئے۔

پھر جھٹ پٹ گھر میں آ کر بی اماں کو کیا سمجھاتے ہیں۔ "بی اماں! بی اماں! وہ بابو جی آئے ہیں۔ ابا کے دوست۔ انہیں اس وقت ابا سے بڑا ضروری کام ہے اور وہ مولوی صاحب کے یہاں گئے ہیں۔ ہم انہیں اُن کے گھر پہنچا آئیں۔ کیا؟ ابھی ابھی آجائیں گے۔

بی اماں نے کہا۔ "کیا انہیں مولوی صاحب کا گھر نہیں معلوم۔ بس پتہ بتا دو۔ ساتھ جانے کی کیا ضرورت"
میں نے جواب دیا۔ "یہ بیچارے ان کا گھر کہاں جانتے ہیں جب ہی تو ساتھ جانا پڑے گا"۔

خدا جنت نصیب کرے۔ میری بی اماں اگلے لوگوں کی طرح نہایت سیدھی تھیں۔ ہماری باتوں میں آ گئیں۔ کہا "اچھا خیر چلے جاؤ۔ جلدی سے آجانا۔ اور خبردار رستے میں لڑنا نہیں۔ یاد رکھو دیر لگی تو کمبختی آجائیگی"
پھر کیا تھا مارے خوشی کے پھول کر کُپا ہو گئے۔ دونوں بھائی خوشی خوشی بابو جی کے ساتھ ہو لئے "تشریف لائیے صاحب، آپ کو ابا کے پاس لے چلیں"۔ انھوں نے کہا "ماسٹر صاحب کہاں ہیں۔ ہمیں بتا دو۔ ہم خود چلے جائیں گے"۔ لیکن یہاں کون بتاتا تھا۔ جواب دیا۔ "نہیں نہیں جناب ہم آپ کو پہنچانے چلیں گے ہم نے بی اماں سے اجازت لے لی ہے۔ آیئے۔ تشریف لائیے"۔ نہایت ادب سے ایک اِدھر ایک اُدھر منکر نکیر کی طرح اُن کے ساتھ ہو لئے۔ جب مولوی صاحب کے یہاں پہنچے۔ تو ابا نے کہا۔ "رہا ہیں۔ اکیلا گھر چھوڑ کر دونوں چلے آئے۔ اچھا خیر اب سیدھے چلے جاؤ۔ کہیں کھیلتے نہ رہ جانا۔

اس قدر تاکید کی گئی۔ ناراضگی کا خوف۔ پٹنے کا ڈر۔ لیکن کیا کریں سیر سپاٹے کو جی چاہ رہا تھا۔ گھر کیسے چلے جاتے۔ ویسے آئے تو ہم اسی طرف مگر ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ میں ڈالے باتیں کرتے ذرا آگے تک نکلے چلے گئے کہ ابھی ابھی لوٹ آئیں گے۔ جب تک ابا تھوڑا ہی آئے جاتے ہیں۔

ہمارے گھر سے دو تین فرلانگ پر سڑک کے کنارے ایک بہت بڑا پکا کنواں تھا۔ وہاں پہنچے۔ اور ٹھی جو ترنگ۔ اِدھر اُدھر دیکھ جھٹ منہ سے اس کی جگت پر چڑھ گئے۔ اس کنوئیں میں بہ یہ بڑے بہت سے مینڈک تھے۔ مزا آرہا تھا۔ کوئی آہستہ آہستہ اوپر آرہا تھا۔ کوئی غڑپ سے غوطہ مار گیا۔ دو مینڈک آپس میں لڑ رہے ہیں کوئی ہاتھ پیر چھوڑے منہ اٹھائے ایک جگہ لٹکا سا نظر آتا ہے۔ بعضے بعضے چکر باندھ کر تیرتے پھرتے ہیں۔ آئے جو مزے

میں ہم دونوں مینڈکوں کا تماشا دیکھنے کے لئے پیٹ کے بل جگت پر لیٹ گئے۔

کنوئیں کی گہرائی دیکھ کر مجھے جو ہول اُٹھا۔ احتشام سے پوچھا۔ "کیوں بھئی احتشام۔ یار اگر میں کنوئیں میں گر پڑوں۔ تو تو کیا کرے؟" کہتا کیا ہے کڑک کر۔ "میں بھی گر پڑوں"۔

"واہ بھئی واہ۔ ہے نا گدھا۔ بیوقوف کہیں کا۔ ارے تو کیوں گر پڑے۔ جانے دونوں ڈوب جائیں"۔

"پھر بھیّا چاہے کچھ ہو۔ میں تو دھڑام سے کود ہی پڑوں"۔

کیونکہ میں بڑا ہونے کے سبب سے کسی قدر سمجھ دار تھا۔ "سمجھایا" نہیں نہیں بھائی احتشام کودنا نہیں چاہئے"۔

"تو کیا کروں اِنہ کودوں؟"

"ہاں ہاں اگر میں گر پڑوں تو تو ہرگز نہ کودیو۔ زور زور سے غل مچائیو۔ خوب چلّائیو۔ ارے دوڑنا۔ ارے دوڑنا۔ ارے فہیم بھیّا کوئیں میں گر پڑے۔ ہائے کوئی ان کو نکالیو۔ ارے وہ کنوئیں میں ڈوب رہے ہیں۔ ارے دوڑیو وہ کنوئیں میں ڈوبے جاتے ہیں۔ ارے فہیم بھیّا کو جلدی نکالو۔ ہائے وہ ڈوبے دوڑنا۔ بس تیرا شور سُن کر تمام لوگ کھیت چھوڑ چھاڑ کر دوڑ پڑیں گے اور جلدی سے رسّے ڈال ڈال کر مجھے نکال لیں گے۔ سمجھا احتشام"۔

یہ سُن کر احتشام بہت خوش ہوا۔ مسکرا کر کہا "ہاں ہاں بھیّا ٹھیک ہے۔ کودنے سے کچھ فائدہ نہیں"۔ پھر ایک پھریری لے کر بولا۔ "لیکن گرو ہی کیوں۔ واہ۔ اتنا گہرا تو کنواں ہے۔ اللہ بچائے کس قدر زور زور سے ہوا چل رہی ہے۔ کہیں گر ہی نہ پڑیں۔ چلو بھیّا!"

(۷)

کچھ مہینے بعد میرے ابّا کا تبادلہ گوالیار ہو گیا۔ اس تبادلے سے جوراعلاپور والوں کو بڑا افسوس ہوا۔ چھوٹے بڑے تمام ملنے جلنے والوں کو رنج تھا کہ افسوس ایسا ہنس مکھ، میرزا منش، نیک مزاج اور مہربان استاد ہم سے جدا ہوتا ہے۔ ادھر ہمیں سالے گھر کو گھڑیاں کاٹنی مشکل ہو گئیں۔ جی چاہتا تھا کب پَر لگا کر اڑ جائیں۔

گوالیار میں میرے کنبے کی دادی اماں کا گھر موجود ہی تھا۔ چارج دینے اور سامان درست کرنے میں کچھ زیادہ دن نہ لگے۔ ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ میں ہم سب گوالیار پہنچ گئے۔

اب میں قریب قریب گیارہ سال کا ہو گیا تھا اور احتشام نو ساڑھے نو سال کا۔ ہم میں اچھی خاصی سمجھ

پیدا ہوگئی تھی۔ اس واسطے بات بات پر لڑائی جھگڑا نہ ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ایک آدھ جھڑپ ہوجایا کرتی تھی۔ یہاں اس قسم کا صرف ایک واقعہ لکھنا کافی ہوگا۔ اس سے ہماری حالت اور بی اماں کی طبیعت کا اچھی طرح اندازہ لگایا جاسکے گا۔

مذیں ہوگئیں لڑکپن کی باتیں کہاں یاد رہتی ہیں لیکن یہ قصہ مجھے خوب یاد ہے اور عمر بھر نہ بھولوں گا کہ ایک روز جب ہم دادی اماں کے گھر میں رہتے تھے اور چھوٹی خالا بی بھی مہمان آئی ہوئی تھیں کسی بات پر ہم بھائیوں میں جھگڑا ہوا میں احتشام کو دے دے مارتا تھا۔ مگر تو بہ صاحب وہ تو کچھ ایسا بلا ہو کر چمٹا۔ لپٹ پڑا چھڑائے نہ چھوٹے میں نے اُسے بیسیوں ہی تو پٹخنیاں دی ہونگی اور اُس نے بھی مجھے نہ جانے کتنی مرتبہ کاٹا ہوگا۔ لڑائی سے پیٹ نہ بھرا مرغوں کی طرح غٹ پٹ ہوتے رہے۔

ایک دفعہ احتشام نکل کر بھاگا میں اس کے پیچھے لپکا۔ وہ کونے میں کھڑی ہوئی چارپائیوں کی آڑ میں چھپنے لگا۔ جوں ہیں نے جاکر دبوچنا چاہا دباؤ میں آکر اُس نے میری آنکھ میں ایسی زور سے انگلی بھونکی معلوم ہوا ڈھیلا نکل پڑا۔ میں ہائے کرکے چیخا۔ میری آواز سن کر تو چل میں چل گھر کا گھر دوڑ پڑا۔

ایک تو سخت درد دوسرے حمایتی وکھائی دیئے گئے تیسرے غصہ چوتھے بدلہ لینے کا خیال۔ میں بی اماں سے لپٹ کر اس زور سے رویا کہ یہ احتشام کو خوب ماریں اور مجھے یقین تھا کہ اب اس کی اچھی طرح خبر لی جائیگی۔ بچہ یاد کرے گا۔

بچے کی تکلیف سے ماں کے جی پر کیا گذر جاتی ہے۔ جناب آپے میں نہیں رہتی۔ بی اماں میری حالت دیکھ کر بے قرار ہوگئیں چھوٹی خالا بی اس وقت خاموش کھڑی تھیں۔ الٰہی احتشام کی خیر۔ اب آئی کمبختی۔ دکھیا وہ ڈر رہی تھیں کہ اگر آپا نے اس کو مارا تو میں کس طرح ان کا ہاتھ پکڑ سکتی ہوں۔ یا اللہ تو ہی بچانے والا ہے اس بچارے کو۔

ادھر احتشام نے جو بی اماں کی ٹیڑھی نظر دیکھی بلی کی طرح کان ڈال کر وہیں کا وہیں دبک گیا۔ ایسی صورت بنا لی کہ تن بدن میں جان ہی نہیں۔ میں احتشام کے پٹنے کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن کیسا مارنا کیسا پٹنا۔ بی اماں نے تو مجھے چھوڑ اُسے چھاتی سے لگا لیا۔ "ہے ہے میرے کلیجے کیوں سہما جاتا ہے" چمکار کر۔ "ارے بھلا میں تجھے کیوں مارنے لگی تھی"۔ اُس کا ہاتھ اپنے منہ پر مل مل کر پیار کرنے لگیں۔ "نہیں نہیں بچے کیا ہوا، وہ بھی تو تجھے مار دیتا ہے"۔

ہائے میرا حلق پھاڑ پھاڑ کر رونا دھرا رہ گیا۔ بی اماں نے احتشام کو انگلی تک چھوائی۔

خدا بخشے ایسا معلوم ہوتا ہے اس کی مایوس صورت دیکھ کر بی اماں کا دل موم ہوگیا، اور میری سندلی خالا بی احتشام کی ماں اپنی مرحومہ بہن کی یاد نے انہیں اُس وقت بے چین کر دیا۔ شاید بی اماں کو خیال ہوا ہو کہ ہائے بچارا ابن مبّا کا بچہ ہے اسے کس دل سے ماروں۔ آج کو اس کی ماں زندہ ہوتی تو حمایت کرتی مجھ سے لڑتی۔ اور یہ بھی اُس پر ناز کرتا۔ اب یہ بچارا کس

کا سہارا ہے۔ وہ مرگئی اور مجھے مرنا ہے حشر میں کیا منہ لے کر جاؤں گی۔ جب وہ کہے گی کیوں آپا تو نے میرے بچّے کو ستایا تھا تو کیا جواب دوں گی۔ اس کا ننھا سا دل دکھا ہوا ہے۔ خدا کسی بچّے کو ماں کا غم نہ دکھائے۔ اگر میں نے اس کا صبر سمیٹا تو میری آس اولاد کے آگے آئے گا۔ غریب کی ہائے آسمان میں چھید کر دیتی ہے۔

اتنی اونچ نیچ تو میں اب سمجھتا ہوں۔ اس وقت بچّہ تھا۔ جب مجھ میں اتنی عقل کہاں تھی کہ کسی بات پر غور کرتا۔ بی اماں کو احتشام کی حمایت کرتے دیکھا بہت بری طرح رویا کہ شاید میرے رونے دھونے پر انہیں ترس آئے اور وہ اُسے خوب دُھنیں۔ لیکن تو بہ صاحب اُن کا دل تو میری طرف سے سخت پتھر ہو گیا تھا۔ ذرا رحم نہ آیا بلکہ الٹا مجھی کو سمجھانے لگیں کس طرح تیرے دل میں دل ڈالوں۔ کیسے سمجھاؤں۔ تو ہر وقت اُس سے لڑتا رہتا ہے۔ چھوٹا بھائی ہے۔ چل اب رہنے بھی دے۔ تجھے تو اس سے پیار کرنا چاہئے۔ دونوں میل ملاپ سے رہو تو کیسا اچھا ہو۔ دیکھ تو ذرا بچارا کیسا دبکا ہوا بیٹھا ہے۔ بس رہنے بھی دے میں اُسے ماروں گی۔

یہ تمام باتیں منٹ دو منٹ میں ختم ہو گئیں۔ احتشام کی طرف سے اطمینان ہوتے ہی۔ چھوٹی خالا بی مجھے چمٹا کر پیار کرنے لگیں۔ آنچل کا گپھا بنا کر پھونکوں سے آنکھ سینکنے لگیں۔ دادی اماں جو دوڑیں "ہے ہے میرے بچّے کو کیا ہوا۔ اے لوگو ذرا ہٹ جاؤ۔ اے ذرا مجھ دکھیا کو بھی دیکھنے دو۔ بیٹا ہٹا ہاتھ دیکھوں کیسی چوٹ لگی" آنکھ ہے کہ مارے درد کے کھولے نہیں کھلتی۔ دادی اماں اس کے پیچھے پڑ گئیں۔ اے ذرا دکھا تو۔ اے ذرا دکھا تو۔ کہہ کہہ کر میرا ہاتھ ہٹا رہی ہیں۔

تھوڑی دیر میں کہیں کی کہیں بات جا پڑی۔ سارے گھر نے میری چارپائی گھیر لی۔ احتشام سے اُس وقت تو غصّے میں غلطی ہو گئی۔ اب بچارا بڑا اکڑھ رہا تھا۔ میری تکلیف سے اس کے بھی آنسو نکلے پڑیں۔ اُس کا بس ہوتا تو ضرور میرا درد بٹا لیتا۔ سوائے اس کے کیا کر سکتا تھا کہ دوڑا دوڑا پھرے۔ اسی غم میں غریب نے رات کو پیٹ بھر کھانا بھی نہ کھایا۔ میرا سر دباتا رہا اور رات کو چمٹ چمٹ کر ساتھ سویا۔

انسان کچھ سوچتا ہے کچھ ہوتا ہے۔ یہ دعا تو خدا نے قبول کی کہ تبادلہ ہو گیا۔ اور ہم سب گوالیار آگئے لیکن بی اماں اور خالا بی کو ساتھ رہنے کا جو ارمان تھا وہ پورا نہ ہو سکا۔ اس لئے کہ قبلہ خالو جان صاحب لشکر کی سوار فوج میں ملازم تھے ابا گوالیار اسکول میں ماسٹر۔ پرائی تابعداری کئی میل کا فاصلہ نوکری کا معاملہ ٹھہرا۔ گھر جانی من مانی تو کچھ ہے نہیں کہ انسان خوشی خواہ جو چاہے کرے۔ مجبوراً علیحدہ علیحدہ ہی رہنا پڑا۔ گوالیار آنے سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ کبھی خالا بی ہمارے گھر چلی آتیں کبھی ہم اُن کے یہاں۔

رہا احتشام تو اس کا یہ تھا کہ یہاں رہے یا وہاں۔ چنانچہ پہلے تو بہت عرصہ تک وہ ہمارے پاس رہا پھر خالابی جو مہمان آئیں اُسے اپنے ساتھ لے گئیں۔ اور وہ انہیں کے گھر رہ پڑا۔

چند سال بعد گوالیار میں میرا چھوٹا بھائی میرزا حلیم عرف میرزا مغل پیدا ہوا اور ہم چار سگے بہن بھائی ہو گئے۔

یہاں سے قصہ مختصر کئے دیتا ہوں۔ اس لئے کہ کہیں پڑھنے والے اکتا نہ جائیں۔

جی! تو ابھی میرزا مغل گود ہی میں تھا۔ بی اماں بیمار ہوئیں۔ اپنی حیثیت کے مطابق ابا نے سب ہی کچھ دوا دارو کی۔ دوڑے دوڑے پھرے۔ بیماری الجھ گئی۔ دن بدن مرض بڑھتا گیا۔ کچھ فائدہ نہ ہوا۔ یہاں تک کہ ہم چار بہن بھائیوں کو چھوڑ کر خدا کے گھر سدھار گئیں۔

سبحان اللہ بی اماں کے دم سے خدا کی رحمت برس رہی تھی۔ ان کی آنکھ بند ہوتے ہی خیر برکت اٹھ گئی۔ بھرا گھر دن دہاڑے بھائیں بھائیں کرنے لگا۔ ہر طرف حسرت برستی تھی اُن کے انتقال سے ہم پر وہ مصیبت آپڑی خدا دشمن پر نہ ڈالے۔ منجھلا بھائی میرزا سلیم کسی قدر بڑا ہو گیا تھا۔ ابا اور میں مدرسے جاتے تو ذرا دل بہلانے کے لئے اُسے بھی ساتھ لے جاتے چھوٹے بھائی کی مشکل تھی۔ اتنے سے بچے کو کہاں کہاں اٹھائے اٹھائے پھریں۔ گھر میں بہن اور چھوٹے بھائی کی کھلائی "چندو باٸی میو" اتنی وقت کاٹا کرتے تھے۔ خدا جانتا ہے کہ وہ گھڑیاں ہم پر کیسی کٹھن گذری ہیں۔

گھر بار کا انتظام شریف بیبیاں ہی خوب کرتی ہیں۔ مرد ان باتوں کو کیا جانے۔ ابا کو ہم بچوں کا سنبھالنا دشوار ہو گیا آخر چھٹی لی اور ہم سب کو لے کر منجھلی خالابی کے گھر آگرہ گئے۔ وہاں سے مجھے چچا میاں کے ساتھ بدایوں بھیج دیا بہن کو خالابی کے یہاں چھوڑا سلیم اور حلیم کو ساتھ لے کر گوالیار چلے گئے۔

ان صدموں سے چڑھتے خون اٹھتی جوانی میں میری تندرستی کا ستیاناس ہو گیا۔ خاص معدہ کی کچھ ایسی کل بگڑی آج تک درست نہ ہوئی۔ ہر وقت پیٹ پکڑے پھرتا ہوں۔

اس کے بعد گوالیار سے ابا کا بھانڈیر کو تبادلہ ہو گیا۔ وہ سلیم اور حلیم کو لے کر وہاں چلے گئے۔ مجھے وکٹوریہ کالج لشکر میں داخل کرا دیا تھا۔ میں وہاں سروے اور ڈرائنگ کا کام سیکھنے لگا۔ پھر ایک بار ہم سب چچا میاں کے پاس بدایوں گئے۔ اتفاقاً ریاست کی پولیس کے افسر اعلیٰ جوزف فیلوز عرف جوجو بابا کے دفتر میں اسسٹنٹ ہیڈ کلرک کی جگہ خالی ہوئی۔ جوجو بابا اور ابا میں مدتوں یعنی بھنڈ سے اچھے تعلقات چلے آتے تھے۔ انہوں نے ابا کو اپنے محکمہ میں لے لیا۔

اس وقت ابا گوالیار رہنے لگے۔ بہن منجھلی خالابی کے ساتھ آگرہ میں تھی۔ میں کالج کمپاؤنڈ بورڈنگ لشکر میں

احتشام بھوپال جاکر پی۔ ڈبلیو۔ ڈی میں ملازم ہوگیا تھا۔ چھوٹی خالا بی کے گھر خط بھیجا کرتا تھا۔ خیر خبر معلوم ہو جاتی تھی۔ میری اس کی خط و کتابت نہیں ہوئی نہ اُس نے خط بھیجا نہ میں نے اُسے کچھ لکھا۔

یہ ہے دنیا کی حالت۔ یا تو ہم سب ایک جگہ رہتے سہتے تھے یا ایسے تین تیرہ ہوگئے۔

(۹)

سال ڈیڑھ سال بعد احتشام بھوپال سے آیا۔ اب سوائے چھوٹی خالا بی کے کہاں رہ سکتا تھا۔ بی اماں کے انتقال سے ہم اس لائق نہ رہے تھے کہ اُسے اپنے پاس رکھتے۔ ابا دفتر جاتے تھے۔ میں ملازمت کی تلاش میں ڈانواں ڈول پھرتا تھا۔ خالی گھر میں چھوٹے بھائی کیا کرتے۔ اسکول چلے گئے، دادی اماں کو سلام کر آئے، اِدھر اُدھر کھیلتے پھرے۔ شام کو سرائے کے مسافروں کی طرح ہم سب جمع ہو کر کھانا ساتھ کھا لیا کرتے تھے۔ رات کو ایک جگہ پڑ رہے۔ صبح ہوتے کوئی کہیں گیا کوئی کہیں گیا۔

اب میں اور احتشام دونوں بھائی بڑے ہوگئے تھے۔ اپنا ذکر فضول ہے۔ احتشام جوان ہو کر سانچے میں ڈھل گیا۔ ماشا اللہ کیا ہاتھ پیر نکالے ہیں۔ بنیر سا سیدھا قد، چکلے ہاڑ پیر، چھریرا بدن، چوڑا سینہ، کشادہ پیشانی، صراحی دار گردن، کھنچی ہوئی بھویں، صاف شفاف آنکھوں میں ہاشمی خون کے سرخ سرخ ڈورے چھوٹے ہوئے، ستواں ناک، گلاب کی پنکھڑی کے مانند مڑے ہوئے پتلے پتلے ہونٹ جن پر ہلکی ہلکی مسیں بہار دے رہی ہوں۔ اجلے اجلے کپڑے بدلتا تو معلوم ہوتا اڑ جائے گا۔ دیکھنے والے دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ جاتے۔ جس طرف نکل جاتا انگلیاں اُٹھتیں۔ اس کی الہڑ چال پر دل لوٹ ہو جاتے۔

لشکر میں مہاراجہ گوالیار کا بہت بڑا امبلوں لمبا چوڑا ایک باغ ہے جسے پھول باغ کہتے ہیں۔ اس میں موتی محل، جل محل، پنتوبن، بےبلاس، نیل خانہ، اٹھارہ تلاؤ، رادھا باغ، اندر بھون، عجائب گھر، ناہر خانہ، مدگھر وغیرہ وغیرہ بہت سے محلات اور بڑی بڑی عمارتیں ہیں۔ بیچ بیچ سرخ سفید سڑکوں کی گود میں جابجا پھلواریوں نے اس باغ کو جنت کا نمونہ بنا رکھا ہے۔ اور رونق بڑھانے کے لئے مہاراجہ نے کتنے ہی محکموں کے دفاتر اس باغ میں قائم کر دیئے ہیں۔ دن بھر لوگوں کی آمد و رفت سے ایک میلہ سا بھرا رہتا ہے۔

میں نے اُدھر سے گذرتے ہوئے اکثر احتشام کو درختوں کی آڑ میں جلتے ہوئے دیکھا ہے۔ معلوم ہوتا تھا چھتری لگائے کوئی سنگِ مرمر کا پتلا باغ کی سیر کرتا پھرتا ہے۔ جب کبھی اچانک میرا اس کا سامنا ہو جاتا بے قرار ہو کر لپٹ پڑتا۔ شاید وہ مجھے دیکھ کر آپے میں نہ رہتا تھا۔ بار بار میری خیر و عافیت پوچھتا۔ کہتا خالو میاں تو اچھے ہیں۔ بہت دن سے سلیم حلیم کے دیکھنے کو بڑا جی چاہتا ہے۔

وہ ہی احتشام جو لڑکپن میں مجھ سے لڑا کرتا تھا بڑا ہو کر خاندانی تہذیب کا اعلیٰ نمونہ بن گیا۔ کیسا بُرد بار نکلا ہے کہ کیا کہنا۔ وہ صرف ایک خوبصورت سجیلا جوان ہی نہیں تھا اس میں اخلاقی خوبیاں بھی اس قدر جمع ہوگئی تھیں جو آج کل بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔

فہیم بھیّا میں تو خیر اُس سے ردوبدل نہ ہوسکا لیکن آپ جناب کے سوائے بات نہ کرتا تھا۔ ابّا تو ابّا کبھی میرے سامنے بھی ادب کے سبب سے قہقہہ مار کر نہ ہنستا تھا۔ حالانکہ مجھے دیکھ کر اُس کو ایسی خوشی ہوتی تھی کہ بات بات پر اس کی باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ گویا کسی کے گدگدانے سے اُسے بے اختیار ہنسی آرہی ہے۔

یوں تو راہ چلتا بھی مل جاتا تو مجھ سے سایہ کی طرح لپٹتا تھا لیکن اگر کوئی صاحب میرے ساتھ ہوتے تو بالکل خاموش رہتا اور بڑا بھائی سمجھ کر ہمیشہ ڈیڑھ قدم پیچھے چلتا۔ کتنی ہی بار ایسا بھی ہُوا ہے کہ ہم دونوں کسی محفل میں گئے اور باتوں میں مجھے خیال نہ رہا تو دوست اصرار کر رہے ہیں احتشام نہیں بیٹھتا۔ جب میں نے کہا بیٹھ جاؤ میاں! اُس وقت آداب بجا لاکر نہایت ادب سے بیٹھا۔ ویسے تو وہ تنہائی میں بھی کبھی زور زور سے نہ بولتا تھا لیکن محفل میں خاص کر میرے سامنے کبھی بلند آواز سے بات نہ کرتا تھا۔

اول تو بیچارے کو فرصت ہی کہاں ملتی تھی۔ کبھی کبھی موقع پاکر دفتر سے اُٹھ کر ہمارے گھر گوالیار چلا آتا تھا۔ آتے ہی دھوم مچا دیتا۔ میں اور ابّا تو اکثر نہیں بھی ملتے تھے ہمیں آتے آتے دیر ہو جایا کرتی تھی اگر سلیم حلیم بھی گھر پر نہ ہوتے تو کھانا پکانے والی بڑی بی کی کمبختی آتی ”کہاں گئے ہونگے کس جگہ ڈھونڈوں۔ تم نے انہیں کیوں جانے دیا۔ دونوں وقت ملنے کو آئے۔ وہ ابھی تک کہاں کھیلتے پھر رہے ہیں“۔ بڑی بی کا ناک میں دم کر دیتا کہ کسی طرح سلیم حلیم کو ملا دو۔ انہیں دیکھ وہ پھولا نہ سماتا۔ اور ایسی میٹھی میٹھی مزے دار باتیں کرتا۔ جیسے کوئی مامتا کی ماری ماں اپنے ننھے بچّوں کو بہلا رہی ہو۔

رات کو ہم ایک جگہ کھانا کھانے بیٹھتے اُس وقت دیکھتا کوئی احتشام کو مجھ سے پلٹے، ابّا سے غالو میاں غالو میاں کہہ کہہ کر باتیں کرے، چھوٹے بھائیوں کو چمکارے، سر پر ہاتھ پھیرے، کیا کرے کیا نہ کرے، بوکھلایا جاتا ہے۔ بچارے کی ایسی حالت ہوتی تھی جیسی کسی بھنور میں پڑے ہوئے آدمی کی ہو۔

(۱۰)

جی گھبرانے لگا۔ اب میں آخری بات کہہ کے اپنی رام کہانی ختم کئے دیتا ہوں۔ لوگ پڑھیں اور مجھ بدنصیب کی غفلت پر سر دھنیں۔ آہ! انسان کیسا غافل ہے۔ وقت کی قدر نہیں کرتا۔ پھر پچھتاتا ہے۔

گوالیار ایک خشک پہاڑی علاقہ ہے۔ وہاں کی گرمی سے خدا بچائے۔ زمین آسمان تپتے ہیں۔ ایسی سخت گرمی تو شاید افریقہ میں بھی نہ پڑتی ہوگی۔

ایک روز ایسی لُو چلی منہ پھیر پھیر دیا۔ دن پہاڑ ہوگیا کہ کاٹے نہ کٹے۔ خدا خدا کر کے شام ہوئی تو ہوا بند۔ یا اللہ پتہ نہ ہلے۔

درخت سناٹا کھینچے کھڑے ہیں۔ کیا آدمی کیا جانور بے حال ہوئے جاتے ہیں۔ اِدھر پانی پیا اُدھر پسینہ بن کے نکل گیا۔ پیٹ پھٹا جاتا ہے پیاس نہیں بجھتی۔

بڑی مصیبت سے رات ہوئی۔ کھانا کس سے کھایا جاتا تھا۔ دو دو چار چار نوالے اتار کر گھڑوں پانی پی گئے۔ پھر بھی پیاس نہ بجھی۔ اندر باہر چین تو کہیں نہیں تھا لیکن یہ سوچ کر کہ شاید باہر کچھ ہوا لگے ہم دونوں بھائی میں اور احتشام ٹہلتے ٹہلتے اپنے گھر کے قریب کی اُس ندی کے پل سے جو برسات میں آفت جوت دیتی ہے اور اس وقت خشک پڑی تھی گذرتے۔ اسپتال کے آگے سے ہوتے ہوئے سڑک سڑک دور تک چلے گئے۔ ہوا چلنی تھی نہ چلی۔ آخر مایوس ہو کر گھر لوٹے۔

پتھر کا مکان تنور کی طرح ڈنڈک رہا تھا۔ پکی چھتوں سے گرم گرم بھاپیں اُٹھ رہی تھیں۔ بڑا مکان تھا۔ اس کے دوسرے حصہ میں دو تین چارپائیاں ڈال رکھی تھیں۔ میں اور احتشام اُدھر گئے، اور میں ایک چارپائی پر پڑ رہا۔ احتشام بھی اُسی پر آ بیٹھا اور باتوں کا تار باندھ دیا۔ نہ جانے کہاں کہاں کے قصے چھیڑ دیئے۔ مارے گرمی کے دم گھٹا جاتا تھا۔ میں نے کہا "میاں یہ تو حال ہو رہا ہے، تم چمٹے جاتے ہو، بھائی اُس چارپائی پر بیٹھو۔"

اس نے گویا سنا ہی نہیں۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کر وہ تو آہستہ سے میرے پاس ہی لیٹ رہا۔ میں نے بات کاٹ کر کہا "احتشام اتنا بڑا ہو گیا۔ پسینے میں نہا رہے ہیں چمٹا کیوں جاتا ہے۔ جا اپنی چارپائی پر۔ کیا وہاں سے باتیں نہیں ہو سکتیں۔" اُس نے ذرا یوں ہی سی ہوں ہاں کر کے پھر مجھے باتوں میں لگا لیا۔ آہ! میں اس کو کس کس طرح ٹال رہا تھا۔ وہ غیر تنومند ہونے کے باوجود میری جھڑکیوں کا مطلق خیال نہ کر کے مجھ سے لپٹ لپٹ جاتا تھا۔ نہ جانے اس وقت اس کے دل کی کیا حالت ہو گی جب جھڑکتا ہوں وہ لپٹا جاتا ہے۔ "فہیم بھیا ناراض ہو گئے۔ واہ بھیا میں روز روز تھوڑا ہی آتا ہوں۔" پھر مَیں خاموش ہو جاتا اور وہ کبھی میرے گال چھوتا کبھی میری چھوٹی چھوٹی مونچھوں سے کھیلنے لگتا۔ مجھے غصہ تو بڑا آتا لیکن بھائی ہونے کے سبب سے کیا کر سکتا تھا۔

گھنٹوں بعد بڑی مشکلوں سے میں نے بک جھک کر اُسے اُٹھایا۔ میری سختی سے چاہیئے تو یہ تھا کہ وہ بُرا مان جاتا برخلاف اس کے اُس نے کیا کیا اپنی چارپائی گھسیٹ کر پٹی سے پٹی ملا دی۔ اس پر مجھے بڑا تاؤ آیا۔ "کیسا ہے مانتا ہی نہیں۔ احتشام آج تجھے کیا ہو گیا۔ بیوی والا ہو کر بچوں کی سی باتیں کر رہا ہے۔ تجھ میں کب عقل آئے گی۔ کیا اب تیرے سینگ نکلیں گے۔ پسینہ پسینہ ہوئے جاتے ہیں۔ ذرا ہٹ کر چارپائی بچھا۔"

اس پر وہ چپ چاپ دم سادھ کر رہ گیا۔ مجبوراً میں نے ہی اُٹھ کر اپنی چارپائی دو ایک قدم فاصلہ پر کر لی۔

تین چار گھنٹے بعد جو اتفاقاً میری آنکھ کھلی تو دیکھتا کیا ہوں۔ چاندنی نے کھیت کیا ہے پشت پر چاند تھا سامنے میری چارپائی پر مجھ سے بھڑا ہوا احتشام نظر آیا۔ میرے آنکھ کھولتے ہی جیسے بجلی کے دو لیمپ گل ہو جائیں یا کسی بنگلے کی کھڑکیاں بند ہونے سے جنگل میں اندھیرا پھیلے احتشام نے لمبی لمبی پلکوں والی آنکھیں بند کر لیں۔ کیسا خوشنما نظارہ تھا جس کو میں عمر بھر کے لئے ترس گیا۔ اس وقت میں نے

کچھ قدر نہ کی۔ بلکہ سخت ناراض ہؤا۔ بے غیرت کس طرح سمجھاؤں، اتنا منع کرنے پر بھی باز نہیں آتا۔ جا اپنی چارپائی پر"
اُس وقت بھی وہ میرے پاس سے ہرگز نہ اٹھنا چاہتا تھا بلکہ مجھے یقین ہے کہ اگر اس کا بس چلتا تو ضرور مجھ سے لپٹ جاتا۔ اس کی صورت پر کچھ حسرت سی برس رہی تھی لیکن بڑے بھائی فہیم بھیا کا کہنا نہ ٹال سکا۔ کلیجے پر پتھر رکھ کر اٹھا اور مُردوں کی طرح دھڑام سے دوسری چارپائی پر گر پڑا۔ تھوڑی دیر میں مارے گرمی کے پھر جو میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ وہ بالکل صاف دیدوں سے ٹکٹکی باندھے میری صورت دیکھ رہا ہے۔ یہاں تک کہ صبح بھی اسی کروٹ سوتا پایا گیا۔

مجھے کسی صاحب سے ملنے جانا تھا۔ چارپائی سے اُٹھ جلدی جلدی ضروریات سے فارغ ہو کر چلا گیا۔ وہاں سے آیا تو احتشام دفتر جا چکا تھا۔ معلوم ہؤا بہت بہت سلام کہہ گیا ہے۔

کتنے ہی دن گذر گئے۔ احتشام گوالیار نہ آیا۔ ایک روز رات کو میں پنڈت سورج پرشاد صاحب کے گھر بیٹھا دوستوں سے باتیں کر رہا تھا میرا چھوٹا بھائی میرزا مغل آیا اور مجھ سے کچھ کہا۔ سوائے لفظ احتشام کے میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ میں نے کہا اچّھا۔ یہ سمجھ کر کہ احتشام آیا ہوگا اور آتے ہی اُس نے گڑبڑ مچائی ہوگی فہیم بھیا کہاں ہیں۔ انہیں جلدی سے بلا لا"۔ عجیب آدمی ہے۔ یہ پٹھا جب آتا ہے ایسا ہی کرتا ہے۔ اب اس کے سبب سے ملنا جلنا چھوڑ دوں۔

دو ایک باتیں کی ہونگی۔ پھر حلیم نے وہی کہا اور اس مرتبہ میں نے سنا۔

"بھائی صاحب! احتشام بھائی کا انتقال ہو گیا"۔

"ہائے"۔ چھاتی پر گولا لگا۔ دل پاش پاش ہو گیا۔ سینے سے دھواں سا اٹھا۔ آنکھوں میں زمرے پڑ گئے۔ "اے احتشام مر گیا۔ مغلا کیا کہتا ہے! احتشام مر گیا؟"

"جی ہاں انہیں ہیضہ ہؤا تھا۔ وہ ایک گھنٹے میں چٹ پٹ ہو کر رہ گئے۔۔۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

میرا منجھلا بھائی میرزا سلیم بیگ بھی ۱۹۲۵ء میں انتقال کر چکا ہے۔ اب میں اور میرزا حلیم زندہ ہیں۔ ان کے علاوہ خدا کے فضل سے میرے چھ چچا زاد بھائی موجود ہیں اور مجھے ان سب سے محبت ہے۔ یہ بھی مجھے چاہتے ہیں لیکن احتشام احتشام تھا۔ اس کی بات اُس کے ساتھ گئی۔ یہ سب مجھ سے بہت چھوٹے ہیں۔ میرزا حلیم اور چچیرے بھائی میری گود کے کھلائے ہوئے ہیں۔ دل میں کتنا ہی خون جوش مارے۔ کتنا ہی مجھے چاہیں لیکن تہذیب انہیں مجھ سے لپٹنے نہیں دیتی۔ احتشام جہاں مجھ سے دو ڈھائی سال چھوٹا تھا وہاں ساتھ کا کھیلا ہؤا اور برابر سے لڑا ہؤا بھی تو تھا۔ ان میں سے ایسا کوئی نہیں۔

کیوں صاحب اگر احتشام اس وقت مل جائے تو میں کیا کروں؟ آزار دیکھوں نہ بازار بس تو دور سے دیکھتے ہی دوڑ کر لپٹ جاؤں چاہے وہ مجھ سے ناراض ہو کر بچپن کی طرح سر بازار لڑنے ہی لگے لیکن اُسے گود میں اٹھا لوں اور کہوں کہاں چلا گیا تھا اتنے دن سے نہیں ملا۔ نہ کوئی خط بھیجا۔ احتشام گھر چل ہم سب تجھے یاد کیا کرتے تھے۔ تو نے تو ہمیں بالکل چھوڑ ہی دیا۔

میرزا فہیم بیگ

علم و عرفان

کوئی دیکھے تو اس دنیا میں بھی کیا کیا نظارے ہیں
زمیں ہے آسماں ہے چاند ہے سورج ہے تارے ہیں

یہ تارے کیا ہیں تاروں میں ہزاروں ماہ پارے ہیں
یہ سورج کیا ہے اک سورج ہے اور لاکھوں شرارے ہیں

کوئی دیکھے تو اس دنیا میں بھی کیا کیا نظارے ہیں!

کوئی سمجھے تو دل میں بھی ہیں کیا کیا قوتیں پنہاں
ارادے، آرزوئیں، ولولے، بے تابیاں، ارماں

ارادہ ہو تو اک دل لاکھ عالم کا کرے ساماں
تمنا ہو تو فرشِ زندگی ہو عرشِ صد امکاں

کوئی سمجھے تو دل میں بھی ہیں کیا کیا قوتیں پنہاں!

کوئی جانے تو اس ہستی میں بھی اسرار ہیں کیا کیا
خرد بے کار ہے کیسی عمل پُرکار ہیں کیا کیا

کبھی خودداریوں میں کبر کے اظہار ہیں کیا کیا
کبھی کمزوریوں کو عجز کے اقرار ہیں کیا کیا

کوئی جانے تو اس ہستی میں بھی اسرار ہیں کیا کیا!

کوئی دیکھے تو ہر شے میں اُسے سب کچھ نظر آئے
نظر آ کے لیکن آہ اِن نظروں سے چھپ جائے

کوئی سمجھے تو اپنی کُنہ اک اک چیز سمجھائے
سمجھ کر لاکھ چاہے پر کہ بتلائے نہ بتلائے

کوئی دیکھے تو خود دیکھے کوئی جانے تو خود جانے!

کوئی سمجھے تو خود سمجھے کوئی مانے تو خود مانے!

د ۔ ل

چائے کی ایک پیالی

روزمیری فیل بہت زیادہ حسین نہ تھی۔ ہاں اس کے اعضا کو فرداً فرداً دیکھا جاتا تو وہ خوش وضع ضرور کہلا سکتی تھی لیکن اس ظلم کی کیا ضرورت ہے، کہ ناحق کسی جسم کے حصے بخرے کر دیئے جائیں۔ وہ نوجوان تھی، ذہین تھی، تہذیبِ جدید سے پوری طرح بہرہ مند تھی، غیر معمولی طور پر خوش پوش تھی اور نئی سے نئی کتابوں کا مطالعہ اُس کے حیرت انگیز ذوقِ ادب کا شاہد تھا۔

اس کی شادی کو دو سال گزرے تھے اور اُس کا شوہر سچے دل سے اس کا پرستار تھا۔ اُن کا ایک ننھا بچہ بھی تھا جس کا نام مائیکل تھا۔ وہ محض خوشحال ہی نہ تھے بلکہ نہایت امیر تھے۔ روزمیری خرید و فروخت کے لئے پیرس جایا کرتی تھی جس طرح ہم لوگ ذرا بازار تک جاتے ہیں۔ اگر اسے پھول درکار ہوتے تو اُس کی موٹر کار ریجینٹ سٹریٹ میں پھولوں کی عظیم الشان دوکان پر جا ٹھہرتی۔ وہاں وہ سر اٹھا کر نہایت مطمئن لہجے میں پکارتی جاتی "مجھے وہ پھول چاہئیں اور وہ اور وہ۔ ہاں چار گچھے ان پھولوں کے اور وہ گلدان۔ اس گلدان میں جتنے گلاب کے پھول ہیں تمام میں لوں گی۔ بکائن نہیں۔ مجھے بکائن سے نفرت ہے۔ اس کی کوئی وضع ہی نہیں"۔ دکان کا پیش خدمت ادب سے سر جھکاتے اٹھتا اور بکائن کے پھولوں کو نظروں سے اس طرح اوجھل کر دیتا گویا اس کے قول کی صحت میں کوئی کلام ہی نہیں اور بکائن واقعی خوفناک طور پر بدوضع ہے"۔ "ہاں وہ لالے کے چھوٹے چھوٹے پھول میں ضرور لوں گی۔ وہ سرخ اور سفید"۔

اس کے بعد موٹر تک اس کے پیچھے پیچھے دکان کی پتلی دبلی خادمہ پھولوں کے بوجھ تلے ڈگمگاتی ہوئی آتی دکھائی دیتی۔

موسم سرما کی ایک شام کا ذکر ہے کہ وہ قدیم نادراشیا کی ایک دکان پر دیر تک خرید و فروخت میں مصروف رہی۔ یہ دکان اسے بہت پسند تھی۔ دکان کا مالک بھی غیر معمولی طور پر اس سے عقیدت رکھتا تھا اور اس کی خدمت سے محظوظ ہوتا تھا۔ وہ جب کبھی آتی دکان دار کا چہرہ چمک اُٹھتا۔ وہ اپنے ہاتھ باندھ لیتا اور تشکر آمیز جذبات کے غلبہ سے اُس کی قوتِ گویائی سلب ہو جاتی۔ خوشامد، ہاں مگر اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں کچھ نہ کچھ بات ضرور تھی۔

وہ فرطِ ادب سے آہستہ آہستہ بولتا اور کہتا "مادام آپ جانتی ہیں مجھے اپنی چیزوں سے محبت ہے۔ ناشناس ہاتھوں میں دینے پر

ہیں اس بات کو ترجیح دیتا ہوں کہ یہ چیزیں فروخت ہی نہ ہوں۔ آہ دنیا میں لطیف الاحساس لوگوں کی کتنی کمی ہے" اس نے گہری سانس لیتے ہوئے نیلی مخمل کا ایک رومال کھول کر اس کے سامنے رکھا۔

آج اس میں ایک ڈبیا تھی۔ وہ اس نے خاص طور پر روزمیری کے لئے رکھی تھی اور اب تک کسی کو نہ دکھائی تھی یہ چاندی کی تھی اور اس قدر نفیس تھی گویا اسے بالائی میں گوندھا گیا ہے۔ اس کے ڈھکنے پر پھولوں کے ایک ننھے سے درخت کے نیچے ایک نہایت ننھا سا نوجوان کھڑا تھا اور ایک اس سے بھی چھوٹی عورت اُس کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہوئے نظر آتی تھی۔ اس کی ٹوپی جو بشکل پھول کے زیرہ کے برابر تھی ایک ٹہنی پر ٹنگی تھی۔ ٹوپی کے گرد سرخ فیتہ لگا ہؤا تھا۔ اُن کے سروں کے اوپر گلابی بادل کا ایک ننھا سا ٹکڑا تیرتا ہؤا دکھائی دیتا۔ روزمیری اس ڈبیا پر فریفتہ ہو گئی۔ یہ ایک نایاب تحفہ تھا۔ اُس نے حسبِ عادت اپنے دستانے اتار دیئے۔ اور متعدد بار ڈبیا کو اپنے ہاتھوں سے کھولا اور بند کیا۔ اس اثنا میں وہ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ اس کے ہاتھ نیلی مخمل کے رومال کے اوپر بے انتہا پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ ممکن ہے دکاندار نے بھی اپنے دل کے کسی عمیق اور پوشیدہ گوشے میں یہ خیال لانے کی جرات کی ہو۔ کیونکہ اُس نے پنسل ہاتھ میں لی اور میز پر جھکتے ہوئے اپنی زرد اور نحیف انگلیاں ڈرتے ڈرتے اُن نورانی انگلیوں کے قریب لا کر دھیمی آواز میں کہا۔ "کیا میں مادام کو ننھی خاتون کے گون کے پھولوں کی طرف توجہ دلانے کی جرات کر سکتا ہوں"۔ روزمیری نے پُرجوش آواز میں پھولوں کی تعریف کرتے ہوئے ڈبیا کی قیمت دریافت کی۔ ایک لمحے تک دوکان دار خاموش رہا گویا اُس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ اس کے بعد روزمیری کے کانوں میں اُس کے گنگنانے کی آواز آئی "اٹھائیس اشرفیاں مادام"

"اٹھائیس اشرفیاں" روزمیری کچھ دیر ساکت کھڑی رہی۔ اُس نے ڈبیا نیچے رکھ دی اور دوبارہ اپنے دستانے پہن لئے۔ خواہ آدمی امیر ہی ہو مگر پھر بھی اٹھائیس اشرفیاں . . . وہ متحیر سی نظر آتی تھی۔

پھر اُس نے کہا "اچھا یہ میرے لئے رکھو —— رکھو گے؟ میں پھر . . ."

لیکن دکان دار پہلے ہی سرِ تسلیم خم کر چکا تھا۔ گویا ڈبیا کا اس کے لئے رکھنا ہی انسانی آرزوؤں کی معراج تھا۔ بلا شبہ وہ یہ ڈبیا ہمیشہ کے لئے اس کی خاطر رکھنے کو تیار تھا۔

دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ اب وہ دکان سے سیڑھیوں پر موسم سرما کی شام کا نظارہ کر رہی تھی۔ بارش ہو رہی تھی اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ بارش کے ساتھ ہی تاریکی بھی سیاہ راکھ کی طرح زمین پر گرتی اور چھائی جا رہی ہے۔ ہوا میں تکلیف دہ خنکی پیدا ہو چکی تھی اور شام کے چراغ افسردہ سے معلوم ہوتے تھے۔ مقابل کے گھروں میں روشنی بھی افسردہ سی نظر آتی تھی۔ چراغوں کی لَو مدھم معلوم ہوتی تھی گویا وہ کسی بات پر افسوس کر رہی ہے۔ لوگ اپنی چھتریوں کی اوٹ میں

بھاگے بھاگے جا رہے تھے۔ روزمیری کے دل میں اس وقت درد سا پیدا ہوا۔ اُس نے اپنا گلوبند درست کیا اس وقت اُس نے سوچا کاش وہ چھوٹی سی ڈبیا میں نے خرید لی ہوتی۔ موٹر کار سامنے کھڑی تھی چند قدم اٹھا کر وہ اس میں بیٹھ سکتی تھی مگر وہ وہیں کھڑی رہی۔ انسان کی زندگی میں بعض لمحے ایسے بھی آتے ہیں جب بلا وجہ وہ اپنی پُرامن جائے پناہ سے سر نکال کر باہر کے خوفناک حالات سے دوچار ہونا چاہتا ہے۔ حالانکہ چاہئے تو یہ کہ انسان ان حالات کے تاثر سے بچے اور سیدھا گھر پہنچ کر نفیس چائے کے ایک پیالے سے لذت اندوز ہو لیکن اس خیال کے آنے کے ساتھ ہی اس کی نظر ایک دبلی پتلی سیاہ بالوں والی نوجوان لڑکی پر پڑی۔ معلوم نہیں وہ کہاں سے آئی تھی لیکن وہ روزمیری کے بالکل قریب کھڑی تھی۔ اُس نے کہا "مادام کیا میں آپ سے ایک التجا کر سکتی ہوں"

روزمیری نے اس کی طرف متوجہ ہو کر کہا "مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو؟"

لڑکی کا لباس پھٹا پرانا تھا۔ اس کی آنکھیں بہت بڑی بڑی تھیں۔ وہ بالکل نوجوان تھی، تقریباً روزمیری کی ہم عمر۔ وہ سردی سے اس طرح کانپ رہی تھی گویا ابھی پانی میں سے نکل کر آئی ہے۔

آخر اُس نے رکتے رکتے کہا "مادام کیا آپ مجھے چائے کی ایک پیالی کی قیمت دے سکتی ہیں؟"

"چائے کی ایک پیالی" اس کے الفاظ میں سادگی اور صداقت پائی جاتی تھی۔ یہ کسی گداگر کی آواز نہ تھی۔ روزمیری نے اس سے دریافت کیا "اچھا کیا تمہارے پاس بالکل کچھ بھی نہیں؟"

اُس نے نفی میں جواب دیا۔

"کتنا تعجب ہے" روزمیری نے دھند کی تاریکی میں اس لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھا اور لڑکی نے اُس پر نظر ڈالی۔ روزمیری کو اس لڑکی کی ملاقات ایک دلچسپ اور غیر معمولی واقعہ معلوم ہونے لگی۔ دھند میں اس لڑکی کی مڈبھیڑ اسے ڈاسٹاوسکی کے کسی ناول کا ایک حصّہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ اگر میں اس کو گھر لے جاؤں اور اس قسم کا کوئی کام کروں جو اکثر ناولوں میں یا اسٹیج وغیرہ پر دیکھنے میں آتا ہے تو کیسا لطف ہو۔ اور پھر تصور ہی تصور میں اُس نے اپنے آپ کو اپنے متحیر احباب سے یہ فقرہ کہتے ہوئے سنا "میں اسے صرف اپنے ساتھ گھر تک لے آئی تھی" اس کے ساتھ ہی اُس نے قدم اٹھایا اور لڑکی سے کہا "چلو میرے ساتھ میں تمہیں گھر پر چائے پلاؤں گی"

لڑکی جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔ ایک لمحہ کے لئے اُسکے جسم کی کپکپی بھی موقوف ہو گئی۔ روزمیری نے اپنا ہاتھ بڑھا کر لڑکی کے بازو پر رکھ دیا اور مسکراتے ہوئے کہا "نہیں میں سچ کہہ رہی ہوں۔ تم میرے ساتھ میری موٹر کار میں بیٹھ کر چلو۔ میں تمہیں اپنے گھر لے جا کر چائے پلاؤں گی۔

لڑکی نے دردبھری آواز سے کہا "مادام آپ مجھ سے مذاق کر رہی ہیں۔
روزمیری نے کہا "نہیں میں مذاق نہیں کرتی۔ آؤ تم میری خاطر سے میرے ساتھ چلو۔"
لڑکی نے اپنا ہاتھ اپنے منہ پر رکھ دیا۔ خوف سے اس کی آنکھیں کھل کر بہت بڑی بڑی ہوگئیں آخر اُس نے ڈرتے ڈرتے روزمیری سے کہا "آپ مجھے پولیس کے حوالے کرنا چاہتی ہیں؟"
روزمیری نے ہنس کر کہا "نہیں میں ایسی ظالم نہیں ہوں۔ میں تمہیں آرام پہنچانا اور تم سے تمہاری داستان سننا چاہتی ہوں۔
ایک لمحہ کے بعد وہ دونوں موٹر کار میں سوار ہو چکی تھیں جو دھند کو چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔
روزمیری ایک فاتح کے انداز سے بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کے دل میں رحم اور رقت کے جذبات موجزن تھے۔ وہ اس غریب لڑکی پر یہ ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ روزانہ زندگی ہی میں عجیب سے عجیب واقعات پیش آسکتے ہیں۔ بعض اوقات انسانی بھیس میں فرشتے مدد کو آموجود ہوتے ہیں —— امرا کے سینے میں بھی دل ہوتا ہے اور تمام عورتیں آخر بہنیں بہنیں ہیں چنانچہ اُس نے لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھ کر پُرجوش آواز میں کہا "تم بالکل نہ ڈرو۔ آخر اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ کیا ہم دونوں عورتیں نہیں ہیں۔ اگر میں زیادہ خوش قسمت ہوں تو تم کو توقع ۔۔۔۔۔۔"
اس وقت حسنِ اتفاق سے موٹر کھڑی ہوگئی کیونکہ روزمیری کو اپنا فقرہ پورا کرنے میں دقت محسوس ہو رہی تھی۔
گھنٹی بجا کر دروازہ کھلوایا گیا اور روزمیری لڑکی کو ایک نہایت دلآویز اور سرپرستانہ انداز سے تقریباً اپنے آغوش میں لیئے ہوئے ہال میں داخل ہوئی۔
گرمی، نرمی، روشنی، خوشبو وغیرہ جو روزمیری کے لئے معمولی اور اس لئے ناقابلِ توجہ تھیں لڑکی کے لئے بالکل غیر متوقع تھیں چنانچہ روزمیری نہایت اشتیاق کے ساتھ اُس کے چہرے کے اثرات کا مطالعہ کر رہی تھی۔ یہ منظر سحر آلود معلوم ہوتا تھا۔ وہ ایک امیر ننھی بچّی کی طرح تھی جو اپنی پرورش گاہ میں آزاد ہو اور اپنی مرضی سے ہر الماری کھول سکے اور ہر صندوق سے چیزیں نکال سکے۔
پھر روزمیری نے لڑکی سے کہا "چلو اوپر کی منزل میں میں تمہیں اپنے کمرے میں لے جاتی ہوں۔" اس سے نہ صرف اُسے اپنی فراخ حوصلگی کا اظہار مقصود تھا بلکہ وہ اس غریب لڑکی کو نوکروں کی متجسّس نگاہوں کا ہدف بننے سے محفوظ رکھنا چاہتی تھی۔ اسی مقصد سے اُس نے اپنا لباس تبدیل کرنے کے لئے خادمہ کو بھی نہ بلایا۔
آخر روزمیری اپنی خواب گاہ کے وسیع کمرے میں داخل ہوئی۔ دروازوں پر پردے کھنچے ہوئے تھے۔ آتش دان میں

آگ دہک رہی تھی اور کمرے کا شاندار ساز و سامان جگمگا رہا تھا۔ لڑکی دروازہ میں آکر رک گئی۔ اس کی آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں لیکن روزمیری نے اس کا کچھ خیال نہ کیا۔ اُس نے اپنی بڑی آرام کرسی کھینچ کر آگ کے نزدیک کی اور لڑکی سے پکار کر کہا "آؤ یہاں بیٹھو۔ تمہیں بہت سردی محسوس ہو رہی ہے"

لڑکی پیچھے ہٹ گئی اور بولی "مادام میں یہ جرأت نہیں کر سکتی"

روزمیری نے آگے بڑھ کر اس کو بازو سے پکڑ لیا اور کہا "تم ناحق اتنا جھجکتی ہو اس میں بات ہی کیا ہے۔ ذرا دم لو میں کپڑے اتار لوں پھر دوسرے کمرے میں جا کر ہم آرام سے چاء پئیں گے۔ تم ڈرتی کیوں ہو" یہ کہہ کر اُس نے اسے خود کرسی پر بٹھا دیا۔

لڑکی بالکل خاموش تھی جس طرح روزمیری نے اُس کو کرسی پر ڈالا تھا وہ اسی طرح بے حس و حرکت پڑی رہی وہ کچھ حواس باختہ سی معلوم ہوتی تھی لیکن روزمیری نے اس کا کچھ خیال نہ کیا اور اس سے کہا "ٹوپی اتار دو تمہارے خوبصورت بال بھیگ رہے ہیں۔ ٹوپی پہنے رہنا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے نا؟"

ہلکی سی آواز آئی "بہت خوب مادام" اور پھٹی پرانی ٹوپی اتار دی گئی۔

پھر روزمیری نے کہا "اٹھو میں تمہارا کوٹ اتروا دوں"

لڑکی اُٹھ کر کھڑی ہو گئی مگر ایک ہاتھ سے اُس نے کرسی کو پکڑے رکھا۔ روزمیری نے کھینچ کھینچ کر بمشکل اس کا کوٹ اتارا۔ اس کے بعد اُس نے آتش دان کے چھجے پر سے سگرٹ کا ڈبہ اٹھانے کو ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اسے لڑکی کی آواز سنائی دی "مادام میں معافی چاہتی ہوں مگر میں غش کھانے کے قریب ہوں۔ اگر مجھے کھانے کو کوئی چیز نہ ملی تو شاید میری جان نکل جائے گی۔

روزمیری چونک کر بولی "اُف میں کتنی بے پروا ہوں مجھے خیال ہی نہیں آیا" اس کے بعد اُس نے جلدی سے گھنٹی بجائی "چاء ــــ فوراً . . . اور کچھ برانڈی ــــ بھاگ کر لاؤ"

خادمہ چلی گئی۔ لڑکی نے چلا کر کہا "نہیں میں برانڈی نہیں پیوں گی میں کبھی برانڈی نہیں پیتی۔ مجھے صرف چاء درکار ہے" یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔

یہ نہایت متاثر کرنے والا نظارہ تھا۔ روزمیری اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اُسے تسلی دینے لگی "بچی مت روؤ" پھر اُس نے اپنا زرنگار رومال اُسے دیا اور اپنی باہیں اُس کے دبلے پرندہ نما کندھوں کے گرد حمائل کر دیں۔ آ خر لڑکی کو بھی کچھ لمحوں کے لئے اپنا شرمیلا پن بھول گیا۔ وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگی "میں یہ مصیبت برداشت

نہیں کر سکتی۔ میں اپنا خاتمہ کر لوں گی۔ اب مجھ میں حوصلہ نہیں رہا۔"

روزمیری نے شفقت آمیز لہجے میں اُسے تسلّی دی اور کہا "اب تمہاری مشکل کا زمانہ گزر گیا ہے۔ میں ہر طرح تمہارا خیال رکھوں گی۔ دیکھو کیسی اچھی بات ہوئی کہ تم مجھے مل گئیں۔ ہم ابھی چاء پئیں گے پھر تم مجھے اپنی سرگذشت سنانا میں تمہارے لئے ضرور کچھ نہ کچھ انتظام کر دوں گی۔ تم رونا موقوف کرو اس سے سخت کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔ خدا کے لئے چپ رہو۔"

اُس نے رونا بند کیا اور روزمیری اٹھی ہی تھی کہ خادمہ چاء لے کر آگئی۔ روزمیری نہایت مدارات سے ہر چیز مکھن توس، کیک وغیرہ اسے پیش کرتی رہی اور جتنی دفعہ اس کی پیالی چاء سے خالی ہوئی اُسے چاء، شکر اور بالائی سے بھرتی رہی۔ خود اُس نے کچھ نہ کھایا بلکہ دوسری طرف منہ کر کے سگرٹ کے کش لگاتی رہی تاکہ لڑکی شرم کی وجہ سے اپنا ہاتھ نہ روکے اس تھوڑی سی خوراک نے فی الواقع حیرت انگیز اثر ظاہر کیا۔ جب چاء کے برتن اٹھائے گئے تو کرسی پر ایک نئی ہستی۔ ایک ہلکی پھلکی کشیدہ قامت، گھونگھریالے بالوں، سرخ گلابی ہونٹوں اور بڑی بڑی روشن آنکھوں والی لڑکی سیری کے عشرت آفریں احساسات میں غرق بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ روزمیری نے ایک اور سگرٹ سلگایا۔ اب گفتگو کا موقع تھا۔

اُس نے نرمی سے پوچھا "تم نے آخری دفعہ کب کھانا کھایا تھا؟"

اِس وقت دروازے کا ہنڈل گھوما اور آواز آئی "روزمیری میں آسکتا ہوں؟" یہ فلپ تھا

"یقیناً"

وہ اندر داخل ہوتے ہوتے لڑکی کو دیکھ کر رک گیا اور بولا "اوہ مجھے افسوس ہے۔"

روزمیری نے مسکرا کر کہا "کچھ حرج نہیں یہ میری سہیلی مس ——

"سمتھ مادام" لڑکی نے بغیر جھجکے غیر معمولی طور پر مطمئن انداز سے اپنا نام بتا کر روزمیری کا فقرہ پورا کیا۔

روزمیری نے کہا "ہم مختصر سی گفتگو کر رہے ہیں۔"

"ضرور" فلپ نے یہ کہا اور اس کے ساتھ ہی اُس کی نظر لڑکی کے کوٹ اور ٹوپی پر پڑی۔ یہ دونوں چیزیں فرش پر پڑی ہوئی تھیں وہ آگ کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو گیا اور بولا "کس قدر تکلیف دہ سردی ہے۔" اس کے بعد اُس نے لڑکی کے ہاتھوں اور جوتے پر نظر ڈالی اور پھر روزمیری کی طرف دیکھا۔

روزمیری نے کہا "ہاں آج کی شام خوفناک ہے۔ کیوں ہے نا؟"

فلپ کے چہرے پر ایک دلفریب مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ پھر اُس نے کہا "بات یہ ہے کہ میں چند لمحوں کے لئے تم کو لائبریری تک آنے کی تکلیف دینا چاہتا تھا۔ کیا تم آسکتی ہو؟ امید ہے کہ مس سمتھ ہمیں معاف فرمائیں گی۔

لڑکی نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے فلپ کی طرف دیکھا لیکن روزمیری نے اس کے بجائے جواب دیا۔ "یقیناً وہ ہمیں معذور سمجھے گی"

تنہائی میں پہنچ کر فلپ نے کہا "میں کہتا ہوں یہ ہے کون؟ میری سمجھ میں نہیں آیا یہ کیا معاملہ ہے مجھے سمجھاؤ تو"

روزمیری نے ہنستے ہوئے دروازے کا سہارا لیا اور بولی یہ مجھے کرزن سٹریٹ میں ملی تھی۔ دیکھو کیسی اچھی لڑکی ہے۔ اس نے مجھ سے چائے کی ایک پیالی کی قیمت مانگی تھی مگر میں اُسے اپنے ساتھ لے آئی"

فلپ نے حیران ہو کر کہا "مگر تمہارا مقصد کیا ہے۔ تم اسے کیا کرو گی؟"

روزمیری نے کہا "میں اس سے شفقت کروں گی۔ بے انتہا شفقت کروں گی۔ اس کی نگہبان بنوں گی۔ ابھی میں کہہ نہیں سکتی کس طرح کیونکہ ابھی ہم نے اس کے متعلق گفتگو نہیں کی۔ مگر تم بھی اس سے اس طرح سلوک کرو اسی طرح پیش آؤ کہ اسے محسوس ہو . . . "

فلپ نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "پیاری لڑکی تم دیوانی ہو رہی ہو۔ یہ ناممکن ہے"

روزمیری نے کہا "مجھے پہلے ہی معلوم تھا تم اس طرح کہو گے۔ آخر کیوں ناممکن ہے۔ میری یہ خواہش ہے اور یہی اس کے لئے ایک محکم دلیل ہے۔ ہم اس قسم کے قصے کہانیاں پڑھتے رہتے ہیں۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں۔

فلپ نے آہستہ سے کہا "لیکن" پھر سگار کا سرا کاٹ کر بولا "وہ حیرت انگیز طور پر حسین ہے"

روزمیری کے رخساروں پر سرخی آگئی اور بولی "حسین؟ تمہارا یہ خیال ہے۔ میں نے تو یہ نہیں سوچا تھا"

فلپ نے دیا سلائی سلگاتے ہوئے کہا "سبحان اللہ" اس کی صورت بے انتہا پیاری ہے۔ میری بنو ذرا پھر غور سے اس کا چہرہ دیکھو۔ جب میں تمہارے کمرے میں داخل ہوا تو مجھ پر از خود رفتگی طاری ہو گئی تھی۔ خیر میرے خیال میں تو تم نے غلطی کی ہے مگر ہاں یہ تو بتاؤ کیا مس سمتھ رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں گی کیا اتنا وقت ہے کہ میں ذرا اخبار دیکھ لوں؟

روزمیری اس کو پاگل کہہ کر لائبریری میں سے چلی گئی، مگر خواب گاہ کی طرف نہیں بلکہ اپنے لکھنے کے کمرے میں۔ وہاں وہ اپنے میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی "حسین! بے انتہا پیاری! از خود رفتگی طاری ہو گئی!" اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا "حسین! بے انتہا پیاری" پھر اُس نے اپنی چیک بک نکالی مگر آخر یہ سوچ کر کہ چیک بے کار ہو گئے اُس نے پانچ پاؤنڈ کے نوٹ نکالے پھر اُن پر ایک نظر ڈالی اور دو نوٹ واپس دراز میں

ڈال دئیے۔ باقی تین ہاتھ میں لے کر وہ خواب گاہ کی طرف گئی۔

آدھ گھنٹے کے بعد وہ پھر لائبریری میں داخل ہوئی۔ فلپ ابھی وہیں تھا۔

اُس نے اپنے شوہر سے کہا "میں تم کو صرف یہ بتانا چاہتی تھی کہ مس سمتھ آج رات ہمارے ساتھ کھانا نہ کھائیں گی۔"

فلپ نے اخبار رکھ دیا اور کہا "اچھا! کیوں؟ کیا پہلے ہی وہ کہیں مدعو تھیں؟

روزمیری فلپ کے گھٹنے پر بیٹھ کر بولی "وہ جانے پر اصرار کرتی تھی اس لئے میں نے اُس کو کچھ نقد روپیہ دے دیا۔ میں اُسے اس کی خواہش کے خلاف نہ روکنا چاہتی تھی۔ تمہیں بتاؤ کیا یہ مناسب تھا؟"

روزمیری نے ابھی ابھی اپنے بالوں کو آراستہ اور اپنی آنکھوں کو سرمے سے ذرا سیاہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ اُس نے اپنا موتیوں کا مالا پہن لیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے فلپ کے چہرے کو چھوا۔ پھر اس نے اپنی دھیمی اور شیریں آواز میں فلپ سے پوچھا "کیا میں تمہیں پسند ہوں"۔

"میری پسند کی بھی کوئی حد ہے"۔ یہ کہہ کر اُس نے اُسے مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لیا "مجھے پیار کرو"۔

ایک لمحہ تک خاموشی طاری رہی۔

اس کے بعد روزمیری نے خواب آلود آواز میں کہا "آج میں نے ایک نہایت نفیس چھوٹی سی ڈبیا دیکھی تھی۔ اس کی قیمت اٹھائیس اشرفیاں ہے۔ کیا میں وہ لے سکتی ہوں"

فلپ اُسے اپنے گھٹنے سے اچھالتے ہوئے بولا "ہاں فضول خرچ بچی تم وہ ضرور لے سکتی ہو"۔

لیکن درحقیقت روزمیری یہ نہ پوچھنا چاہتی تھی۔ اُس نے اپنا سر فلپ کے سینے سے لگایا اور آہستہ سے کہا "کیا میں خوبصورت ہوں؟"

کیتھرین مینسفیلڈ

"خسرو"

محفلِ ادب

وجدانیات

یوں تو کیا کیا نظر نہیں آتا — کوئی تم سا نظر نہیں آتا
ڈھونڈتی ہیں جسے مری آنکھیں — وہ تماشا نظر نہیں آتا
اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھوں گا — مجھے ایسا نظر نہیں آتا
ہو چلی ختم انتظار میں عمر — کوئی آتا نظر نہیں آتا
جھولیاں سب کی بھرتی جاتی ہیں — دینے والا نظر نہیں آتا
جو نظر آتے ہیں، نہیں اپنے — جو ہے اپنا نظر نہیں آتا

زیرِ سایہ ہوں اُس کے اے امجدؔ
جس کا سایہ نظر نہیں آتا

"مکتبہ"

سکندر اور ہندی فلسفی

اپنے حملہ کے دوران میں سکندر نے دس ہندی فلسفی گرفتار کئے جو سندھیوں کو اس کے مقابلہ کے لئے اکسا رہے تھے۔ فلسفی دانائی اور حاضر جوابی میں عدیم النظیر تھے۔ سکندر نے اس بات کا امتحان کرنا چاہا اور ہر ایک سے سوال کئے۔ اور کہا اگر جواب غلط ہوا تو قتل کر دیئے جاؤ گے۔ پہلے ایک فلسفی سے پوچھا گیا کہ مُردوں کی تعداد زیادہ ہے یا زندوں کی۔ جواب ملا کہ زندہ انسانوں کی کیونکہ مُردوں کا شمار ہی کیا ہے۔ پھر حسبِ ذیل گفتگو ہوئی۔

سکندر۔ سب سے بڑے جانور کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ زمین پر یا سمندر میں۔
دوسرا فلسفی۔ زمین پر۔ کیونکہ سمندر بھی زمین کا ایک حصہ ہے۔
سکندر۔ سب سے دانا جانور کون سا ہے؟
تیسرا فلسفی۔ جو کسی نے آج تک نہیں دیکھا۔
سکندر۔ تم نے سندھیوں کو کیا کہہ کر لڑائی کے لئے ابھارا تھا؟
چوتھا فلسفی۔ صرف یہ کہ "یا باعزت زندگی بسر کرو یا مردوں کی طرح کٹ مرو۔"

سکندر۔ دن بڑا ہے یا رات ؟

پانچواں فلسفی۔ دن بڑا ہے۔ کم از کم ایک دن۔

سکندر۔ انسان ہر دلعزیز کیسے ہو سکتا ہے ؟

چھٹا فلسفی۔ طاقتور بن کر۔ لیکن لوگوں کو مرعوب نہیں کرنا چاہئے۔

سکندر۔ انسان دیوتا کیسے بن سکتا ہے ؟

ساتواں فلسفی۔ دیوتا بننے کے لئے وہ کام کرنا چاہئے جو انسانوں کے لئے ناممکن ہے۔

سکندر۔ موت ہمہ گیر ہے یا زندگی ؟

آٹھواں فلسفی۔ زندگی موت سے طاقتور ہے۔ کیونکہ یہ اپنے ساتھ لاکھوں حوادث و بلیّات لاتی ہے۔

ایک ہندوستانی فلسفی نے سکندر کو نظم و نسق مملکت کے لئے ایک نصیحت کی اور وہ یہ تھی۔ ایک پُر شکن خشک کھال کو زمین پر بچھایا اور اس کے کناروں کو روندا جب کھال کے ایک کنارے پر دباؤ پڑتا تو یہ دوسری جگہوں سے ابھرتی۔ آخر کار اس نے اپنا پاؤں عین درمیان میں دھرا اور کھال زمین کے ساتھ ہموار ہو گئی۔ اس تمثیل سے اس نکتہ کی طرف اشارا تھا کہ بادشاہ کو سلطنت کے عین وسط میں سرحدوں سے زیادہ وقت صرف کرنا چاہئے "ادبی دنیا"

انگلستان میں افسانوں کی حیات

انگلستان میں جس کثرت سے ہر سال نئے ناول شائع ہوتے ہیں اور جس تیزی سے وہ فنا ہو جاتے ہیں اس کا اندازہ مسٹر ہیو والپول کی رائے سے ہو گا جو انہوں نے حال میں رسالہ ویک اِنڈ ریویو میں ظاہر کی ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ پڑھنے والوں کو پڑھنے کی فرصت نہیں، تنقید کرنے والوں کو تنقید کرنے کی مہلت نہیں، کتب فروشوں کو کتابیں رکھنے کی چھٹی نہیں۔ ہر سال انگلستان میں ۴۴۰۰۰ ناول شائع ہوتے ہیں۔ اس زبردست تعداد میں سے تقریباً ۲۰ کو دو ماہ سے زیادہ کا قیام نصیب ہوتا ہے۔

مثلاً مس گرسی اسمتھ اپنی شاندار زندگی کا ایک سال صرف کر کے "سیب اور سنترے" لکھتی ہیں۔ کتاب دلچسپ ہے اور ایک ناشر اسے قبول کر لیتا ہے۔ اس پر متعدد تنقیدیں بھی ہوتی ہیں۔ اہلِ قلم تعریفیں لکھتے ہیں۔ مس اسمتھ کی خوشی کا کیا پوچھنا معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص انہیں کا ذکر کر رہا ہے۔ دو ہفتوں کے بعد اُن کی کتاب فنا ہو جاتی ہے" اس لئے کہ اس درمیان میں نصف درجن دوسرے ناول جو اسی قدر دلچسپ ہیں شائع ہو جاتے ہیں۔ تنقید کرنے والوں نے ان کی بھی زوردار الفاظ میں تعریفیں کی ہیں۔ دو ماہ کے بعد مس اسمتھ اپنی کتاب کی فروخت کے متعلق دریافت فرماتی ہیں۔ جواب ملتا ہے کہ چند جلدیں کتب خانوں میں گئیں اور دو ایک کتب فروشوں کے ہاں ہیں۔ یہ تجربہ مس صاحبہ کو تین چار بار پیش آتا ہے۔ آخر وہ شادی کر لیتی ہیں، اور بجائے ناولوں کے بچے پیدا کرنے کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں۔ "معارف"

نئے رسالے

آج کل کے زمانے میں جب کہ پنجابی یہ کہہ کر اردو زبان پر اپنا حق جتاتے ہیں کہ وہ پنجاب سے پیدا ہوئی یہ کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ اردو کو چھوڑ کر پنجابی میں ادب پیدا کریں۔ ہمارے خیال میں تو اردو پنجابی اور ایسی ہی بعض دوسری زبانوں کی ترقی یافتہ اور شائستہ شکل ہے اور اب اس کی بجائے اُن غیر ترقی یافتہ زبانوں کی ترقی کی کوشش کرنا تضیعِ اوقات سے کم نہیں۔

اس مہینے ہمیں پنجابی زبان کے دو رسالے اظہار رائے کے لئے وصول ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک تو "پنجابی دربار" ہے جو پہلی جلد کا دسواں نمبر ہے اور دوسرا سارنگ جو اسی مہینے نکلا ہے "پنجابی دربار" کے متعلق تو ہمیں معلوم نہیں کہ اس کا اجرا کن مقاصد کو لے کر ہوا تھا لیکن ہمیں خوشی ہے کہ "سارنگ" کا بھی مقصد یہ نہیں ہے کہ اردو کو مٹا کر پنجابی کو اُس کی جگہ دی جائے۔ چنانچہ اُس کے افتتاحی مقالے میں لکھا ہے کہ ہم نہیں چاہتے کہ اُس مشترکہ بولی (اردو) کو جو ہندوستان کے رنگا رنگ موتیوں کو ایک لڑی میں پرونے کے لئے اک دھاگا ہے کوئی نقصان پہنچایا جائے یہی وہ زبان ہے جس میں ہمیں فیڈرل اسمبلی میں مباحثے کرنے ہیں، اسی میں ہمیں اپنا پالیٹکس بنانا ہے اور اسی پر ہمیں ہندوستان کے قومی اتحاد کی بنیاد رکھنی ہے لیکن پنجابی کو اپنی جائز جگہ ضرور ملنی چاہیئے۔

دونوں رسالوں میں بڑے بڑے آدمیوں کے علمی، ادبی، تنقیدی مضامین اور تراجم درج ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر شعبے میں زبان کو ترقی دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اندازِ تحریر کے متعلق ہم اس امر کی صراحت ضروری سمجھتے ہیں کہ "پنجابی دربار" کی زبان شہری روزمرہ کے مطابق ہے اور سارنگ کی زبان میں ہندی کے ایسے الفاظ بہت ہیں جو عام طور پر استعمال نہیں ہوتے اور اُن کا مفہوم بھی عام طور پر نہیں سمجھا جا سکتا "پنجابی دربار" کا حجم ۴۰ صفحے اور چندہ سالانہ تین روپے ہے۔ پتہ دفتر "پنجابی دربار" لاہور کافی ہے۔ "سارنگ" بڑی تقطیع کے ۸۰ صفحات پر شائع ہوا ہے، اس میں متعدد سہ رنگ و یک رنگ تصویریں بھی ہیں۔ سالانہ قیمت چھ روپے ہے۔ پتہ دفتر "سارنگ" ۱۴ لاج روڈ لاہور

"رُوحِ ادب" محمد نصیر حسین مرزا صاحب نصیر اور مرزا محمد تقی صاحب مشرب کی ادارت میں ماہ اکتوبر ۱۹۳ء میں لاہور سے نکلا ہے۔ قابل مدیروں نے اس میں بعض بلند پایہ ادیبوں کے مضامینِ نظم و نثر جمع کئے ہیں لیکن ان میں سے چند پہلے بھی ہماری نظر سے گزر چکے ہیں۔ تین خوبصورت تصویریں بھی اس نمبر کی زینت ہیں۔ حجم ۸۴ صفحات اور سالانہ چندہ چار روپے ہے۔ پتہ: مینجر "رُوحِ ادب" لٹن روڈ۔ لاہور

"چاند" کے چندے میں خاص رعایت

"چاند" کی کثیر اشاعت کو اور بھی زیادہ بڑھانے کے لئے اور بہت سے لوگوں کے اصرار پر ہم نے یہ طے کیا ہے کہ جو لوگ ۳۱ دسمبر ۱۹۳۰ء تک اپنا نام سالانہ خریداروں میں درج کرالیں گے ان کو بجائے آٹھ روپے سالانہ کے صرف

۶ روپے میں چاند سال بھر تک دیا جائے گا

"چاند" کی کسی خصوصیت میں فرق نہ ہوگا

"چاند" بہ اعتبار مضامین ضخامت تصاویر وغیرہ ہندوستان کا سب سے اعلیٰ رسالہ ہے۔ اور یہ رعایت صرف تھوڑے ہی دن رہے گی۔

اپنا نام فوراً فہرست خریداران میں درج کرا لیجئے!

منیجر "چاند" (اُردو) الہ آباد

ٹیلیفون نمبر ۲۰۵

نوٹ:۔ جملہ مضامین نظم و نثر بنام منشی کنھیا لال صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی ایڈوکیٹ ایڈیٹر "چاند" (اُردو) چندر لوک الہ آباد ہونا چاہیے +
جن صاحبان کے پاس پرانی قلمی اردو اور فارسی کی کتابیں ہوں اور وہ انہیں نکالنا چاہتے ہوں وہ بھی منشی صاحب مذکور سے خط و کتابت کریں۔

"چاند" کے اسپیشل نمبر

کی

مختصر فہرست مضامین

۲۴	نظم	منشی سکھ دیو پرشاد بسمل الہ آبادی سابق ایڈیٹر "طوفان" الہ آباد
۲۵	نظم	ایڈیٹر صاحبان "ادیب" پشاور
۲۶	مضمون	جناب معین الدین حارث ایڈیٹر "اجمل" (روزانہ) بمبئی
۲۷	غزل	حضرت نوح ناروی سابق ایڈیٹر "بہارستان" الہ آباد
۲۸	نظم	ایڈیٹر صاحب "دکن پنچ" حیدرآباد
۲۹	مضمون	پنڈت امرناتھ جھا ایڈیٹر "الہ آباد یونیورسٹی میگزین" الہ آباد
۳۰	مضمون	ایڈیٹر صاحب "علی گڑھ میگزین" علی گڈھ
۳۱	افسانہ	جناب شاہد احمد ایڈیٹر "ساقی" دہلی
۳۲	افسانہ	جناب نسیم انہونوی ایڈیٹر رسالہ "انکشاف" لکھنؤ
۳۳	مضمون	جناب محمود علی خاں چیف ایڈیٹر "اکبر" الہ آباد
۳۴	افسانہ	جناب سید اعظم حسین ایڈیٹر "ادب" لکھنؤ
۳۵	مضمون	جناب اشرف صبوحی ایڈیٹر رسالہ "ارمغان" دہلی
۳۶	افسانہ	منشی پریم چند ایڈیٹر "مادھوری" لکھنؤ
۳۷	مضمون	جناب عبدالقادر سروری ایڈیٹر "مکتبہ" حیدرآباد
۳۸	مضمون	جناب امین سلونوی سابق ایڈیٹر "ناظر" لکھنؤ
۳۹	مضمون	جناب نیاز فتحپوری ایڈیٹر "نگار" لکھنؤ
۴۰	نظم	حضرت ہنر انوری ایڈیٹر "چمن" امرتسر
۴۱	نظم	جناب ظفر مہدی ایڈیٹر "سہیل یمن" لکھنؤ
۴۲	ڈرامہ	ایڈیٹر صاحب "ریاست" دہلی
۴۳	غزل	جناب سائل دہلوی سابق ایڈیٹر
۴۴	مضمون	جناب محمد وحید کیلانی ایڈیٹر "قوس قزح" لاہور
۴۵	مزاحیہ	جناب شوکت تھانوی سابق مدیر و معاون "ہمدم" لکھنؤ
۴۶	مضمون	ایڈیٹر صاحب "ادبی دنیا" لکھنؤ
۴۷	مضمون	ایڈیٹر صاحب "تاریخ" حیدرآباد
۴۸	مضمون	جناب میاں بشیر احمد ایڈیٹر "ہمایوں" لاہور
۴۹	مضمون	جناب رام رکھا سنگھ سہگل ایڈیٹر "چاند" (ہندی) الہ آباد
۵۰	غزل	جناب اصغر گونڈوی ایڈیٹر "ہندوستانی اکیڈمی جنرل" الہ آباد
۵۱	نظم	پروفیسر سید ضامن علی صاحب رکن ادارت "ہندوستانی اکیڈمی جنرل" الہ آباد
۵۲	نظم	جناب حامد علی صاحب ایڈیٹر "بال سکھا" الہ آباد
۵۳	مضمون	خواجہ حسن نظامی چیف ایڈیٹر متعدد رسالہ جات
۵۴	افسانہ	حکیم محمد یوسف حسن صاحب چیف ایڈیٹر "نیرنگ خیال" لاہور
۵۵	غزل	مولانا عزیز لکھنوی سابق ایڈیٹر "الواعظ"

وغیرہ وغیرہ

دوزخ والوں کو فرشتہ بہشت کا پیغام

اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ بیماری اور کمزوری کی زندگی بھی دوزخ کی سی تکلیف رساں ہے اگر آپ بیمار اور کمزور ہیں تو آتشک نگرہ گولیاں کا استعمال کریں یہ گولیاں فرشتہ بہشت کا کام کریں گی چند ہی ایام میں قبض بدہضمی خون اور مادہ تولید کی خرابی وغیرہ کی تکالیف سے نجات دلا کر اعلیٰ درجہ کی طاقت و توانائی عطا کر کے لذت دنیوی سے مالا مال کر دیں گی اور آپ پوری صحت وتندرستی حاصل کر کے بہشت کی سی مسرت حاصل کریں گے۔ قیمت فی ڈبیہ ۳۲ گولیاں صرف ایک روپیہ۔ پانچ ڈبیاں چار روپے علاوہ محصولڈاک ۔

امرتار نوا ولیہہ یعنی بحر آبحیات } نحیف الجسم ضعیف الدماغ وقویٰ کے لئے یہ اولیہ (لعوق) ہمہ صفت موصوف ہے جسم سے گرمی کی زیادتی دور کر کے خون کی تپش کو دور کر کے دل و دماغ اور معدہ کو اعلیٰ درجہ کی قوت دیتا ہے۔ خون کو زیادہ کر کے جسم کو معقول فربہی دیکر قبل از وقت کی ضعیفی کو دور کر کے قوی الجسم بنا دیتا ہے مرد عورت۔ بچے۔ نوجوان۔ بڈھے استعمال کر کے یکساں فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دماغی کام کرنیوالوں کے لئے واقعی آبحیات ہے نہایت مقوی ایورویدک جڑی بوٹیوں سے بنا ہے لذیذ اور پر ذائقہ ہوتا ہے۔ صبح ایک ایک تولہ بطور ناشتہ نوش کر سکتے ہیں قیمت فی ڈبیہ ۲۰ تولہ والی صرف دو روپیہ (عہ)

بال متر گولیاں یعنی ہمدرد اطفال } بچوں کی ناساز طبیعت سے والدین کو سخت تکلیف ہوتی ہے اور گھر بے رونق ہو جاتا ہے لیکن یہی نونہالان تندرستی کی حالت میں ہر ایک کی مسرت کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ جو شخص لڑکپن ہی سے بیمار ہے اس کی جوانی کیسی ہوگی اور کیا کر سکے گا۔ اس لئے بیمار بچوں کو تندرست اور تندرست بچوں کو طاقت ور بنانے کیلئے بال متر گولیوں کا استعمال کراویں۔ یہ گولیاں بچوں کی جملہ شکائتوں کو دور کرتی ہے۔ دست کا زیادہ آنا قے کا ہونا شکم کا بڑھنا جسم کا زرد پڑ جانا۔ تلی سستی۔ کاہلی۔ ڈھیلاپن وغیرہ دور کر پوری صحت اور تندرستی چستی چالاکی حاصل ہوتی ہے۔ قیمت فی ڈبیہ تین گولیوں کی صرف ایک روپیہ۔

ملنے کا پتہ:۔ ویدشاستری منی شنکر گووندرام جی جام نگر کاٹھیاواڑ۔

ایجنٹ لالہ جگت رام پوری اینڈ سنز سوتر منڈی لاہور

اکمل سرپ یعنی سبز شربت رجسٹرڈ

اس کی پہلی ہی خوراک ہر قسم کی کھانسی کو دبا دیتی ہے۔ کف کو پتلا کرتی ہے۔ بری کھانسی جس کے ساتھ خون۔ بلغم۔ پیپ کف آتا ہو اور ساتھ ہی دم بھی پھولتا ہو اور نیز نزلہ ہو یا زکام۔ خونی دست آتے ہوں۔

ننھے بچوں کی کمزوری کو جو سبز رنگ کے دستوں سے دانت نکالنے کے زمانے میں یا کسی اور سبب سے اور دماغی کام کرنیوالوں کو جن کو نزلہ یا زکام اکثر ستاتا ہو سبز شربت کے استعمال سے بالکل آرام ہو جاتا ہے۔ اور زیادہ خوبی یہ ہے کہ ہر ایک طبیعت کے موافق ہے گرم بالکل نہیں ہے۔ بلکہ معتدل سبز شربت بہت ہی خوش ذائقہ اور لذیذ ہے بچوں اور بوڑھوں کے موافق ہے کیونکہ ہندوستان کی ادویات سے تیار کیا ہوا ہے ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ جتنا سبز شربت مذکورہ بالا امراض کو مفید ثابت ہوا ہے دوسرا نہ ہوگا پرچہ ترکیب استعمال ہمراہ ہوگا قیمت فی شیشی خورد ۸ر قیمت فی شیشی کلاں ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصول ڈاک ۔

ملنے کا پتہ:۔ مینیجر اکمل یونانی شفاخانہ باغیچی صمدو۔ اندرون اکبری دروازہ لاہور

افغانستان

سے کم قیمت کا وی۔پی ارسال نہیں کیا جائیگا۔ اگر ایک روپیہ سے کم قیمت کی کتابیں خریدنا چاہیں تو قیمت کتب بمعہ محصول بذریعہ ٹکٹ بھیجکر منگوائیے

جواہرات کا خزانہ

منہاج الحکمت (عرف خزانہ حکمت)

مصنف نے اسکو مکمل اور پرمعنی بنانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ اس کتاب میں بہت سی مہلک امراض کے سینہ بسینہ نسخہ کئی ایک کوڑیوں کے مول والی بیش بہا ادویات کا راز کھول کر رکھ دیا ہے۔ جسقدر بیماریاں ہیں۔ ان سب کا علاج اس رسالہ کی مدد سے کم خواندہ بھی بخوبی کرسکتا ہے۔ یہ ایک ہی رسالہ تمام ضروریات پوری کردیگا۔ اور آپ اسی سے حکیم بن جائینگے۔ اصل قیمت (عہ) رعایتی (۸ر) آٹھ آنے۔

بوٹی پرکاش (جسمیں ہرایک قسم کی بوٹیوں کی تصویریں)

بوٹی شناخت۔ خواص، رنگ وفایدے استعمال کے طریقے۔ خلاصہ طور پر درج کئے گئے ہیں جنکا جاننا ہر ایک حکیم ہمدرد کیلئے ضروری اور کار آمد ہے ہر ایک زبان میں انکا نام بھی درج ہے۔ اصل قیمت (عہ) رعایتی (۱۲ر) بارہ آنے۔

دولت کی کان (المعروف بہ معلم صنعت وحرفت)

ناظرین یوں تو آپ نے بہت سے رسالہ صنعت وحرفت دیکھے ہونگے۔ مگر ایسا آسان اور مکمل جو کہ انجان کی سمجھ میں آسکے نہیں دیکھا ہوگا۔ اسمیں حسب ذیل نسخہ جات درج ہیں۔ دیا سلائی تیار کرنا مصنوعی چاندی مصنوعی سونا۔ کئی قسم کشتہ جات۔ ہر قسم دیسی۔ انگریزی صابون۔ حجامت کیلئے صابون طلسمی انگوٹھی پیپرمنٹ۔ موم جامہ۔ خوشبودار تیل۔ کٹھیا کا تیل کئی قسم اچار مربے۔ شربت چٹنیاں بال سیاہ کرنے کا خضاب۔ گندھک کا تور کا کشتہ وغیرہ وغیرہ نسخہ درج ہیں۔ اصل قیمت (عہ) رعایتی (۸ر) آٹھ آنے۔

کروڑپتی بنجاؤ (اسمیں دہ دہ نسخہ درج ہیں جن کے ذریعہ ایک معمولی شخص بھی کروڑپتی بن سکتا ہے)

اسکے آٹھ ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگئے۔ اب نواں ایڈیشن بھی ختم ہونے کو ہے جلدی کیجئے منگوائیے۔ اسمیں مشہور و معروف نسخہ آزمودہ جات بھی لکھا گیا ہے۔ فہرست ہزارہا ترکیبوں میں سے چند حسب ذیل ہیں۔ بال عمر بھر پیدا نہ ہونے کا مجرب نسخہ۔ بال اڑانیکا عرق۔ دو منٹ میں بال سیاہ کرنے کا خضاب۔ ربڑ کی مہریں کھانا پکانے کی ترکیب۔ اچار مربہ چٹنیاں۔ ربڑ کی اسٹامپ۔ موم بتیاں۔ ہرقسم کی سیاہی وغیرہ بنانا غرضیکہ ہزاروں ترکیبیں درج ہیں اصل قیمت ہر سہ حصہ (عا) رعایتی (عہ) ایک روپیہ آٹھ آنے۔

مانی جادو (المعروف چین ور ہما کا جادو) یعنی تسخیر عملیات

وہ بدولت زمانہ سابق کے لوگ کشف و کرامات کا بھنڈار بنے ہوئے تھے۔ اسمیں عملیات تسخیر کئی قسم کے درج ہیں۔ جو بلا تکلیف حل ہوسکتے ہیں۔ الغرض جو کچھ کہ اسمیں مندرجہ منتر وں کے ذریعہ سدھ کرلیوے وہ گھر بیٹھا ہی نشہ کے سبب۔ کابلی انگور قندھار کے انار اور دیگر نعمات کے عجیب وغریب تحفے بلا دولت منگا سکتا ہے۔ ہر ایک ہمیشہ کیلئے خادم بنکر رہتی ہے۔ اور ہر طرح کی خواہش کو پورا کرتی ہے۔ ہزار انسان کی خوراک ایک چھوٹے سے برتن میں بہم پہنچانا۔ ہر ایک انسان کو اپنا مطیع وحلقہ بگوش بنانا پردیس گئے ہوئے رشتہ داروں کو واپس بلانا۔ جو کچھ عمر کا حال ہو کرنا۔ ذرا سی بدلا کے تمام عمل کا تکلف کرنا سب کچھ اس کے ذریعہ سے ہوسکتا ہے۔ علاوہ ازیں ایک جگہ سے دوسری جگہ ہزاروں کوس کی مسافت چند منٹ میں طے کرنا۔ تمام مخلوق کو دیکھنا۔ خود کسی کو نظر نہ آنا ہزار دشمن پر اکیلے غالب آنا۔ وغیرہ وغیرہ نکلواکر آزمائشے۔ اصل قیمت (عہ) رعایتی (عا) ہندی (عہ) گورمکھی (عا)

شہنشاہ تجارت

فن تجارت کے متعلق ایک بہت مفید کتاب ہے۔ اسمیں تجارت کے بیش بہا راز و نکات کفایت شعاری۔ منافع طریق تجارت کے اصول وغیرہ بتائے گئے ہیں۔ مختلف اقسام کی تجارتی معلومات۔ ضروریات بھی درج کی گئی ہیں۔ یہ بھی بتایا گیا ہے۔ کہ کون کونسی اشیاء ہندوستان کے کن شہروں میں پہنچتی۔ پیدا یا فروخت ہوتی ہیں۔ ہندوستان کے ہر ایک بڑے شہر وقصبہ کی تجارت کا نقشہ بھی دیا گیا ہے۔ حجم ۵۰۰ صفحات سائز ۲۲×۱۸ اصل قیمت (للعہ) رعایتی (عا) دو روپے۔

مداری کا تھیلا (عرف میجک پروفیسر)

اس کتاب میں مندرجہ ذیل مداری ہیں تماشوں کے متعلق کئی قسم کے کھیل ہتھیلی میں انڈا گم کرنا۔ رومال میں روپیہ گم کرنا۔ بھوسہ کھاکر رنگ برنگ کے کاغذ کئی گز لمبے منہ سے نکالنا۔ پھونک مارکر رنگ برنگ کے شعلے منہ سے نکالنا۔ ہونٹے کے گلے میں چھری مارنا۔ ڈبہ میں آدمی گم کرکے جانور نکالنا۔ گلاس میں مچھلی دکھانا۔ بیل کے سر پر مانگ سیدھی کرنا۔ سینگ بدل دینا۔ بنگترہ سے روپیہ نکالنا وغیرہ وغیرہ۔ اصل قیمت (عہ) رعایتی (۱۴ر)

ڈرائی کار ماسٹر (خشک رنگ بنانے کا استاد)

ناظرین ہمنے یہ کتاب بڑی محنت وزر کثیر صرف کرکے تیار کی ہے۔ بیشک آپنے ایسی کوئی کتاب نہ دیکھی ہوگی۔ ہر ایک بشر جانتا ہے۔ کہ رنگ بنانے کا ہنر سوائے جرمنی کے اور کسی ملک میں نہیں۔ کیونکہ جرمنی سے وہ ملک اس فن میں استاد مانا گیا ہے۔ آجکل ہر ایک ہندوستانی بھائی اس فن سے واقف ہونے کا شوق کمال رکھتا ہے اسلئے ہمنے انکی خواہش پوری کرنے کی غرض سے اس کتاب کو تیار کردیا ہے۔ اس کتاب میں کئی اقسام کے خشک وتر رنگ۔ ہر ایک قسم کے کپڑے رنگنا سوتی۔ اونی۔ ریشمی وغیرہ وغیرہ اقسام کے کپڑوں کو رنگنا وغیرہ وغیرہ۔ کئی اور مفید ہدایات درج کرکے کتاب کو دُرِ نایاب بنادیا ہے۔ آرڈر بھیجکر بہت جلد طلب فرمائیے۔ اصل قیمت (عہ) رعایتی (عا) ایک روپیہ۔

نام کتاب	اصل	رعایتی	نام کتاب	اصل	رعایتی
نئی طبیب کامل	عہ	عا	رسالہ سل دق	۶ر	۴ر
تحفہ لقمان	عہ	۱۲ر	علاج بذریعہ پانی	۴ر	۳ر
عجیب الحیوانات	عہ	عا	علاج آسان نقشہ	عہ	عا
گنج نہاں عرف کشتہ جات لاثانی	عہ	عا	علاج الاطفال	۴ر	۳ر
حکیم حاذق	۲	عا	علاج بواسیر	۴ر	۳ر
ذیابیطس کا علاج ہردو حصہ	عہ	عا	علاج مارگزیدہ	۴ر	۳ر
مخزن حکمت	عا	عہ	علاج چشم کامل دفتر	۶ر	۴ر
مفردات الامکمل	عا	عہ	رسالہ قسمت سرکار	عا	۱۲ر
ڈاکٹر ہر دو حصہ	عہ	۱۲ر	یونانی بیدک دوائی	عا	عہ
طب متفقہ علم الادویہ	عا	۱۲ر	ساری حصہ دوم	۱۲ر	۸ر
محب مسیان	عا	۱۲ر	تریاق اعظم	۶ر	۴ر
حفظ صحت جوان	۱۲ر	۸ر	آئینہ تشخیص امراض	۴ر	۳ر
مجربات لقمان	۱۲ر	۸ر	جراحی پرکاش	عہ	عا
دارالشفاء مجلد	۸ر	۶ر	رسالہ حسن شباب	۴ر	۳ر
علم الکیمیا ہردو حصہ	عہ	عا	زینت شباب	۴ر	۳ر
لائق حکیم	عہ	عا	سانپ کاٹے کا علاج	۴ر	۳ر
تریاق مفلوج	۴ر	۳ر	گنج حکمت	عا	۱۲ر
سدا جوانی	۴ر	۳ر	انتخاب الحکمت	۶ر	۵ر
آئینہ قوت باہ	عا	۱۲ر	یونانی ویدک دوا	عہ	عا
علاج بے دوا	۸ر	۶ر	ساری حصہ اول	۶ر	۴ر
قرابادین ویدک	۸ر	۶ر	بارہ اکسیروں کا علاج	۶ر	۴ر
رسالہ کشتہ جات	۸ر	۶ر	جیبی طبیب	۴ر	۳ر
لغات کلاں ہندی	عہ	عا	پاکٹ فارما	۸ر	۶ر
آئینہ امراض	۶ر	۴ر	کوبیا کلاں	۸ر	۶ر

نام کتاب	اصل	رعایتی	نام کتاب	اصل	رعایتی
بجلی گائیڈ	عہ	عا	گھر کا درزی	۸ر	۶ر
گورمکھی	عہ	عا	تیل پھلیل سی جن	۴ر	۳ر
ہندی	عہ	عا	رسویا بھوجن	عہ	۱۲ر
آئینہ کاشتکاری	عا	عہ	پرکاش		
پالش بک	۱۲ر	۸ر	باورچی یا اسرار کھانا	عہ	۱۲ر
سیاہی بنانے کا کارخانہ	۱۲ر	۸ر	سوپ		
مکمل فوٹو گرافی	عہ	عا	ہر قسم کے معجون گلقند	۸ر	۶ر
لیتھو فوٹو گرافی	عہ	عا	ہر قسم کے عرق شربت	۴ر	۳ر
فن آتشبازی	عہ	عا	بجلی تیج		
رسالہ رنگسازی	عہ	عا	ربڑ سٹیمپ میکر	۴ر	۳ر
صابون گری مکمل	۱۲ر	۸ر	لکڑی کا بکس	۴ر	۳ر
شیشہ گری	۱۲ر	۸ر	عبدالحلیم شرر کے ناول		
عطر سازی و گندھی	۱۲ر	۸ر	منصور موہنا	۸ر	۶ر
علم کیمیا ویدک	۱۲ر	۸ر	حسن انجلینا	۸ر	۶ر
بیکری یعنی نان خطائی	عہ	عا	ملک العزیز ورجنا	عہ	۸ر
حلوائے برقی	عہ	عا	فردوس بریں	عہ	۶ر
حلوائی			دلکش ہردو حصہ	عہ	عا
مجموعہ ایجادات	۸ر	۶ر	حسن بن صباح	۱۲ر	۸ر
			شہید وفا	۶ر	۴ر

نام کتاب	اصل	رعایتی	نام کتاب	اصل	رعایتی
مردہ روحوں سے ملاقات	عا	۱۲ر	افریقہ کا جادو	عہ	عا
			طلسمات سکندری	عہ	۱۲ر
بنگال کا جادو	۱۲ر	۸ر	کھیل مداریان	عہ	۱۲ر
فارس کا جادو	۱۲ر	۸ر	مکمل لاگبازی ہردو حصہ	عہ	۱۲ر
چلتا جادو	۱۰ر	۸ر			
تریا چتر جادو	۱۲ر	۸ر	مقفل راز عجب	۴ر	۳ر
کشمیر کا جادو	۱۲ر	۸ر	رسالہ علم غیب	۱۲ر	۸ر
مخزن مسمریزم	عہ	۱۲ر	جادو کی نئی قفل	۸ر	۴ر
ہپناٹزم	۱۲ر	۸ر	زندہ کرامات مکمل	عا	۱۲ر
ہپناٹزم کا کامل بہرتشی	۲	۲	تیر بہدف	۸ر	۶ر

ملنے کا پتہ مینیجر ایم ڈی تجارتی کتبخانہ نزد شاہ عالمی گیٹ لاہور

(اپنا پتہ صاف اور خوشخط لکھیں) (رسالہ کا حوالہ ضرور دیں) (محصولڈاک بذمہ خریدار)